

آزاد قیدی

www.pdfbooksfree.pk

②

ایم اے راحت

آزاد قیدی

پستہ پندرہ ایم اے راحت
حریسہ رخت کے اے شریف لائیں
محبہ دینے والے تھے یہ دسویں
محبہ دینے والے تھے یہ گاہِ ثوبہ



مقبول اکیڈمی سیکرٹری چوک نازکی لاہور

گل زمان اپنی فائل شہاب کی میز پر دیکھ کر چونک پڑا..... اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر فائل اٹھالی تھی..... شہاب نے توجہ بھی نہیں دی وہ کسی اور فائل کو سٹڈی کر رہا تھا۔
”ہیڈ آفس سے بھیجی گئی ہے صاحب جی؟“ گل زمان نے فائل دیکھتے ہوئے کہا۔
شہاب نے چونک کر اسے دیکھا پھر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل بند کر کے ایک جانب پٹخ دی اور گل زمان سے بولا۔
”گل زمان فائل رکھ دو۔“

”جی سر۔“ گل زمان نے جلدی سے اپنی فائل میز پر رکھ دی۔ شہاب ایک لمحے سوچتا رہا، پھر بولا۔

”اصل میں، میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جعلی ڈگریاں کیسی ہوتی ہیں۔“
”جی صاحب۔“ گل زمان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”تم نے بتایا تھا نا کہ تم نے ایف اے کی ڈگری پندرہ سو روپے میں خریدی تھی، یہ میرا دلچسپ موضوع رہا ہے گل زمان۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ جعلی ڈگریاں بنانے والے کس طرح کام کرتے ہیں..... اب دیکھو نا، باقی سارے معاملات اپنی جگہ لیکن قانون کی کچھ ذمے داریاں بھی ہوتی ہیں..... یہ تعلیمی گھیلے ماحول کو کس قدر خراب کر رہے ہیں اس کا اندازہ تمہیں بھی ہوگا۔ جعلی ڈگریوں کا کاروبار کتنے لوگوں کی حق تلفیاں کرتا ہے، جو لوگ تعلیمی منصب کے اہل نہیں ہوتے، وہ اعلیٰ ترین ڈگریاں خرید کر انہیں اعلیٰ ترین ملازمتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ لوگ اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر جس طرح کی بدعنوانیاں کرتے ہیں اس سے معاشرے کو شدید نقصان پہنچتا ہے..... اب تم نے اپنی ڈگری کی نشاندہی

کام کچھ اور ہی تھا اور اس سلسلے میں کسی نہ کسی وقت کوئی لغزش ہو سکتی تھی..... اس وقت کم از کم گل زمان کے زرخرے پر انگوٹھا رکھے رہنا ضروری تھا۔ گل زمان نے اس وقت جوش میں کہہ دیا تھا کہ اس نے ایف اے کی ڈگری پندرہ سو روپے میں خریدی تھی۔ شہاب نے اسے ہی بات آگے بڑھانے کا ذریعہ بنالیا اور کم از کم گل زمان کے خلاف ایسا ثبوت حاصل کر لیا کہ اگر وہ کبھی راستہ روکنے کی کوشش کرے تو اسے راہ راست پر لایا جاسکے..... عدنان واسطی سے بھی اس دن کے بعد ملاقات نہیں ہوئی تھی..... ویسے، مینا، شہاب کے ذہن میں بار بار آتی تھی..... اچھی شخصیت کی مالک تھی..... پھر عدنان واسطی کا فون آ ہی گیا..... شہاب آفس میں اکیلا تھا..... عدنان واسطی کی آواز سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”سر میرا نام عدنان واسطی ہے۔“

”ارے واسطی صاحب، خیریت..... آپ مجھے سر کہہ کر نہ مخاطب کیا کریں۔“ جواب میں عدنان واسطی کی ہلکی سی ہنسی سنائی دی۔ پھر اس نے کہا۔

”امید نہیں تھی شہاب صاحب کہ اس طرح نظر انداز کر دیں گے۔“

”کیا مطلب؟“

”اس دن کے بعد سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہوا۔“

”جی ہاں اللہ کے فضل سے بارہ دری تھانے کی رپورٹ پولیس ہیڈ آفس میں سب سے اچھی جارہی ہے، اس کے لئے تھوڑی بہت محنت تو کرنی ہی ہوتی ہے۔“

”لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسان عقل

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے“

محبت کرنے والوں سے اس طرح اجتناب ظلم ہوتا ہے۔ ہم تو انتظار کرتے رہے..... اپنی اوقات کو مد نظر رکھ کر آپ کو مخاطب کرنے کی ہمت نہ پڑی لیکن اب جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو سوچا کہ کچھ نہ کچھ کیا ہی جائے۔“

”آپ نے واقعی مجھے شرمندہ کر دیا..... میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں..... جہاں حکم دیں، حاضر ہو جاؤں..... بس اتنا ہی ازالہ کر سکتا ہوں اپنی اس کوتاہی کا۔“

”سوچ لیجئے شہاب صاحب! بڑے مختلف انداز میں گفتگو کر رہے ہیں، ہم چھوٹے لوگ فوراً ہی منہ لگنے لگتے ہیں۔“

کی تھی تو میں نے یہ تمہاری فائل ہیڈ آفس سے نکلا کر اس میں جعلی ڈگری کا جائزہ لیا ہے۔ میرے ذہن میں بہت عرصے سے یہ پروگرام تھا کہ اس سلسلے میں کام کروں۔“ گل زمان کا چہرہ اتر گیا..... اس نے آہستہ سے کہا۔

”تو صاحب جی کام کی ابتدا آپ نے ہم سے ہی کر دی۔“

”ایک بات قانون کے علم میں آئی ہے گل زمان تو بہر حال اس پر توجہ تو دینی ہی ہے، میں نے اس ڈگری کا بغور جائزہ لیا ہے، بالکل اصل کے مطابق ہے لیکن آخر کار میں نے اس میں نقل پکڑ ہی لی ہے۔ اب ذرا اس پر ریسرچ کر کے اس سلسلے میں کارروائی کرنی ہے۔“

”صاب جی ہمیں کیوں بے موت مار رہے ہیں؟“ گل زمان نے عاجزی سے کہا اور شہاب کے چہرے پر ایک سنگین خاموشی طاری ہو گئی..... کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

”بہر حال گل زمان، یہ بات ہے تو حقیقت کہ تم نے یہ نوکری جعلی ڈگری کے ذریعے حاصل کی ہے۔ اصولی طور پر یہ بات علم میں آ جانے کے بعد مجھے اس سلسلے میں کارروائی کرنی چاہئے لیکن تم میرے دوست ہو..... میں کم از کم تمہارے ساتھ یہ سب کچھ نہیں کروں گا لیکن جعلی ڈگریوں کے سلسلے میں کچھ عرصے کے بعد ہم کارروائی ضرور شروع کریں گے۔“

”صاب جی، آخر کیا ضرورت ہے اس کی، کیا کسی نے ایف آئی آر درج کرائی ہے؟“

جن لوگوں کا کام ہے انہیں ان کا کام کرنے دیجئے۔ اب اس طرح تو جعلی کاروبار جتنے ہو رہے ہیں آپ کو خود بھی اس کا اندازہ ہے..... ایسی چیزیں جی جو کسی کی نوکری میں بٹہ لگا دیں، رہنے دی جائیں تو زیادہ اچھا ہے۔“

”سوچیں گے اس موضوع پر گل زمان۔“

”صاحب جی! یہ میری فائل تو ہیڈ آفس بھجوا دیجئے..... میں تو سمجھا تھا کہ آپ شاید میری ترقی کی فکر میں ہیں۔“

”ترقی بھی ہو جائے گی گل زمان لیکن یہ ڈگری..... خیر تم فکر مند نہ ہو، میں کم از کم اس فائل کے بارے میں کوئی رپورٹ نہیں تیار کر رہا۔“

”شکریہ صاب جی۔“ گل زمان نے منہ لٹکا کر کہا..... اس کے فرشتے بھی نہیں سمجھ پائے تھے کہ شہاب ثاقب نے اس کی فائل کیوں منگوائی ہے۔ اصل میں گل زمان پولیس کے رواج کا آدمی تھا اور شہاب کو کسی بھی لمحے اس سے کوئی خطرہ پیش آ سکتا تھا..... شہاب کا اصل

”گھسیٹ لیجئے کانٹوں میں جتنا گھسیٹ سکتے ہیں..... آپ کی وجہ سے تو مجھے اعتماد ملا ہے شہاب صاحب۔ آپ یقین کیجئے، اپنا یہ پہلا کارنامہ سرانجام دے کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں شرلاک ہو مز بن گئی ہوں، بلکہ ڈاکٹر وائسن ہوں میں۔“

”اچھا اچھا گویا شرلاک ہو مز کا عہدہ ہمیں دے دیا گیا ہے۔“ یہ دلچسپ گفتگو چند لمحات جاری رہی، اس کے بعد عدنان واسطی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”زمانہ طالب علمی ہی سے میرے ذہن میں یہ تصور موجود تھا شہاب صاحب کہ میں کچھ ایسے کام کروں جن کا تعلق انسانیت کی بہتری سے ہو..... بات یہ نہیں تھی کہ میں محسن انسانیت بننا چاہتا تھا، بس کچھ جذبے تھے جو عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہوئے تھے۔ بہت غور و خوض کرنے کے بعد میں نے وکالت کا پیشہ اپنایا..... اس وقت بھی ایک حادثے نے مجھے متاثر کیا تھا اور میں نے یہ سوچا تھا کہ ضرورتیں بھی ختم نہ ہونے والی چیزیں ہیں..... ہر چیز کو حاصل کرنے کے بعد ایک نئی چیز کا تصور ذہن میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور انسان اس کے حصول کے لئے سرگرداں ہو جاتا ہے، چنانچہ ضرورتیں بس اسی حد تک پوری کی جائیں کہ کسی پریشانی کا امکان نہ رہے..... بس یوں سمجھ لیجئے، یہی میرا محور رہا اور اسی میں، میں نے زندگی گزار دی..... مینا کی تشکیل جس انداز میں ہوئی ہے اس کا بھی آپ نے تھوڑا بہت اندازہ لگالیا ہو گا..... میں یہ چاہتا ہوں کہ کچھ ایسے لوگ جو بالکل ہی بے بسی کا شکار ہو جائیں، اگر ہمارے ذریعے اپنی منزل پالیں تو ہم ہر لالچ سے بے نیاز ہو کر ان کے لئے کام کریں..... اس میں کسی بڑے چھوٹے کی تفریق نہ ہو، میں وکیل ہوں عدالتی معاملات میرے سپرد کر دیئے جائیں..... آپ ایک باختیار پولیس آفیسر ہیں دوسرے معاملات آپ سنبھال لیں، مینا کو آپ نے دیکھ ہی لیا ہے نڈر اور دلیر لڑکی ہے..... آگ کے سمندر میں چھلانگ لگانے کو ہمیشہ تیار رہتی ہے..... اس کی شکل و صورت پر نہ جائیں، اگر آپ کہیں گے کہ انسانوں، بلکہ برے انسانوں پر موت کا بادل بن کر برسے تو آپ یقین کریں آپ اسے اتنا خو نوار پائیں گے کہ شاید آپ تصور بھی نہ کر پائیں..... ہم زیادہ افراد نہیں ہیں اور ہمارے اختیارات محدود ہیں لیکن جذبے محدود نہیں ہوتے۔“

”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں اور یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ایسے کسی معاملے میں آپ نے مجھے آگے بڑھایا تو کبھی پیچھے نہیں پائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے..... آپ کو حق حاصل ہے کہ جس طرح چاہیں مجھے شرمندہ کریں۔“

”تو پھر آج یوں کیجئے کہ رات کا کھانا غریب خانے پر کھا لیجئے۔ ہم سمجھیں گے کہ ہم واقعی غلط فہمی کا شکار تھے۔“ شہاب ہنسنے لگا، پھر بولا۔

”ذرا تفصیل سے پتا سمجھا دیجئے۔ آفس تک تو پہنچ سکتا ہوں لیکن رات کا کھانا ظاہر ہے آپ آفس میں نہیں کھلائیں گے۔“

رات کو وعدے کے مطابق شہاب سادہ لباس میں عدنان واسطی کے گھر پہنچ گیا..... یہ دو منزلہ چھوٹے سے پلاٹ پر بنا ہوا مکان تھا، عدنان واسطی کی شخصیت سے مکمل طور پر ہم آہنگ۔ شہاب کے دل میں ان لوگوں کے لئے بڑے اچھے جذبے پیدا ہو چکے تھے اور وہ انہیں دل سے پسند کرنے لگا تھا..... غالباً اوپر کی منزل سے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا کیونکہ وہ دروازے پر رک ہی تھا کہ دروازہ کھل گیا..... عدنان واسطی نے استقبال کیا تھا، پھر وہ شہاب کو بڑی اپنائیت کے ساتھ اندر لے گیا۔ مسز واسطی سے ملاقات ہوئی، مینا نے آکر سلام کیا اور عدنان واسطی نے اسے ایک کمرے میں بٹھایا۔

مینا چائے لے کر آگئی اور عدنان واسطی نے کہا۔ ”بھئی مینا اب تمہاری موجودگی ضروری ہے..... کھانے وغیرہ کا مسئلہ تو میرے خیال میں حل ہو ہی چکا ہے۔“

”بالکل ابو، باقی دیکھ بھال امی کر رہی ہیں اور انہوں نے مجھے فرصت دے دی ہے..... آپ دیکھ لیجئے اس کا ثبوت چائے کی یہ تین بیالیاں ہیں۔“ مینا نے کہا اور مسکراتی ہوئی سامنے بیٹھ گئی۔ چائے سرد کر دی گئی اور شہاب نے مینا سے اس کی خیریت پوچھی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ ابو کے سارے کام نمٹا دیئے گئے ہیں، اس خیال کے ساتھ کہ ہو سکتا ہے آپ کی طرف سے کال آجائے..... کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں آپ کے معیار پر پوری نہیں اتر سکی۔“

”بھئی آپ سب لوگ مجھے بڑا شرمندہ کر رہے ہیں..... اصل میں مس مینا، بات یہ نہیں ہے بلکہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کے خوف سے جرائم پیشہ افراد کان دبا کر بیٹھ گئے ہیں..... انہیں یہ احساس ہو گیا ہو گا کہ ایک وکیل صاحبہ جاسوسی کے میدان میں بھی اتر آئی ہیں۔“

شہاب نے کہا اور عدنان واسطی اور مینا ہنسنے لگے۔ مینا ہنستی ہوئی بولی۔

”لیکن اس کی وجہ واسطی صاحب؟“ شہاب نے پوچھا اور واسطی صاحب نے مغموم انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
”باپ سے سرکشی، نافرمانی۔“

”اس حد تک کہ اس سرکشی کی وجہ سے باپ اپنے بیٹے کو پاگل قرار دے دے؟“
”ہاں، اس حد تک..... بس یوں سمجھ لو کہ میں اس سے متعلق ایک اور کردار سے ملا تھا جس نے مجھے مکمل تفصیل سمجھائی۔ بعد میں، میں نے دماغی ہسپتال میں رحمان علی سے بھی ملاقات کی، جس شخص سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی وہ بھی امیر علی کے سامنے بے بس اور خود امیر علی کا بیٹا رحمان علی بھی یہ کہتا ہے کہ اب ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے حالات کو ہموار کیا جاسکے..... اس کے پس پردہ ایک کہانی ہے شہاب صاحب بشرطیکہ آپ اس کہانی کی طوالت سے بور نہ ہو جائیں۔“

”نہیں، واسطی صاحب بات بہت دلچسپ ہے..... بیٹوں کو عاق تو کیا جاسکتا ہے، نافرمانی کے نتیجے میں انہیں اپنی دولت اور جائیداد سے محروم بھی کیا جاسکتا ہے اور باپ کے لئے یہ مشکل نہیں ہے لیکن اسے اس طرح دیوانہ قرار دے کر کسی پاگل خانے میں زندگی گزارنے کے لئے مجبور کرنے کا مطلب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک کہتے ہیں آپ، ایسی ہی بات ہے۔“

”تب تو یہ کہانی واقعی بہت دلچسپ ہوگی۔“

”لیکن شرط یہ ہے کہ شکم سیری کے بعد اس کا آغاز ہو۔“

شہاب ہنسنے لگا، پھر بولا۔

”آپ کی خوشی ہے جسے پورا کرنا میرے لئے سعادت، ورنہ کھانا تو زندگی کے معمولی

لوازمات میں سے ہے۔“

”تو پھر کھانے کا بندوبست کر لیا جائے، اس کے بعد ہی ہم لوگ اس موضوع پر بات

کریں گے۔“ کھانے کا انتظام کیا گیا..... شہاب نے اس بات پر بہت مسرت کا اظہار کیا کہ

کھانے میں کسی خصوصی اہتمام سے کام نہیں لیا گیا تھا..... واسطی صاحب کہنے لگے۔

”حالانکہ محترمہ مینا اس کی مخالف تھیں..... ان کا خیال تھا کہ بھرپور اہتمام کیا جائے

لیکن میں نے اپنی روایت کو قائم رکھا ہے۔“

”مجھ پورا پورا یقین ہے..... چلے چھوڑیے، طوالت میں جانے کے بجائے میں براہ راست آپ کے ساتھ ان روابط کے آغاز کے لئے جو کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ رہا ہوں..... ایک آبادی ہے یہاں سے کچھ فاصلے پر، بہت زیادہ فاصلہ بھی نہیں ہے..... یوں سمجھ لیجئے شہر سے اس کا براہ راست راستہ ہے اور وہاں کے لوگ دن رات یہاں آتے جاتے رہتے ہیں..... شاہ پور نام ہے اس کا اور ایک قدیم خاندان کی ملکیت ہے..... بڑی جائیدادیں ہیں، بڑی زمینیں ہیں اس خاندان کی وہاں اور یہ سمجھ لیجئے کہ ایک طرح سے وہاں اس کی حکومت قائم ہے..... میں نے اس کی قدامت کے بارے میں تو کوئی اندازہ نہیں لگایا لیکن اتنا علم ہے کہ طویل عرصے سے یہ اسی خاندان کی ملکیت چلی آرہی ہے اور اس کا موجودہ مالک امیر علی شاہ ہے..... امیر علی شاہ کے چار بیٹے ہیں شاد علی، رحمان علی، گلزار علی اور فیاض علی..... ان میں سے رحمان علی شاہ جو دوسرے نمبر پر ہے، اس وقت پاگل خانے میں ہے..... ایک ایسے دماغی ہسپتال میں جو پرائیویٹ ہے اور بڑے بڑے لوگوں کی امداد سے چل رہا ہے..... رحمان علی شاہ کو ایک خطرناک پاگل کی حیثیت سے طویل عرصے سے اس پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا ہے، لیکن وہ بے حد ہوش مند نوجوان ہے اور بے کسی کے عالم میں وقت گزار رہا ہے..... باقی امیر علی شاہ کے تینوں بیٹے عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“ شہاب نے حیرانی سے یہ انوکھی داستان سنی، پھر آہستہ سے بولا۔

”لیکن رحمان علی شاہ پاگل خانے میں کیوں ہے؟“

”اسے اس کے باپ نے اس پاگل خانے میں داخل کرایا ہے اور امیر علی شاہ کے اثرات

ہر طرح کے سرکاری محکموں پر ہیں..... بہت بڑا آدمی ہے وہ، اگر ایک باپ اپنے بیٹے کو پاگل

قرار دے کر پاگل خانے میں داخل کر دیتا ہے اور اس کے اختیارات ہیں بھی اس قدر وسیع ہیں

پھر کون ہے جو اسے پاگل خانے سے نکال لے..... ڈاکٹروں کی رپورٹوں کی پوری فائل موجود

ہے جس میں انہوں نے اسے ایسے دماغی دوروں کا مریض جاکر بیٹھے ہوئے بھی وقت خطرناک

نوعیت کے حامل ہو سکتے ہیں اور وہ کسی بھی انسان کی زندگی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ممکن

امیر علی نے اپنے اس بیٹے کے پاگل پن کا باقاعدہ سوگ منایا ہو اور دنیا کو یہ باور کر دیا ہو کہ

بجائے مجبوری اپنے لخت جگر کو پاگل خانے میں داخل کر رہا ہے، لیکن یہ بہت بڑی سچائی

میں درحقیقت رحمان علی پاگل نہیں ہے۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا۔“ شہاب نے کہا۔
مزر واسطی سے بھی ملاقات ہوئی..... سادہ سی فطرت کی ایک گھریلو خاتون تھیں.....
کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ایک بار پھر نشست جم گئی اور آگے کی کہانی کا آغاز ہو گیا..... واسطی صاحب نے اس کہانی کو دوبارہ شروع کرتے ہوئے بتایا۔
”ہو سکتا ہے اس کی نوعیت کچھ ڈرامائی ہو جائے لیکن بات کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔“
”آپ بالکل بے تکلفی سے مجھے اس کے بارے میں بتائیے، میں مکمل طور سے فرصت میں ہوں اور وقت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ شہاب نے جواب دیا..... مینا بھی اس گفتگو میں پوری طرح محو تھی..... واسطی صاحب کچھ دیر خاموش رہے، پھر انہوں نے کہا۔
”شاہ پور میں، جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، امیر علی کا خاندان سب سے بڑی حیثیت کا حامل ہے..... اس کے اشاروں پر وہاں ہر کام ہوتا ہے..... مقامی طور پر بھی اس کے تعلقات اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ وہ جو چاہے کر لیتا ہے اور اس سے کوئی انحراف نہیں کرتا..... امیر علی شاہ کے بیٹے شاہ پور کا نظام سنبھالے ہوئے ہیں..... چوتھا بیٹا فیاض علی بیس شہر میں رہتا ہے اور کاروبار کرتا ہے..... بد قسمتی سے امیر علی شاہ کی کوئی بیٹی نہیں ہے ورنہ اس کے دل کے گوشے نرم ہوتے اور وہ بیٹیوں کی عزت اور قدر و قیمت جانتا..... چار بیٹیوں کا یہ باپ ہر طرح سے حالات کو اپنے حق میں رکھتا ہے..... اسی ہستی کا ایک کاروباری آدمی غیاث بیگ اس کا شکار ہو گیا..... غیاث بیگ بھی ایک معزز آدمی تھا اور اچھا کھانا پیتا تصور کیا جاتا تھا..... شہر سے اس کے کاروباری روابط تھے..... وہ اپنی بیوی، بیٹی اور بیٹے کے ساتھ پرکھوں سے شاہ پور میں ہی رہتا تھا اور اس کا امیر علی شاہ کے خاندان سے کوئی ایسا جھگڑا نہیں تھا جو کبھی کسی کے لئے باعث پریشانی بنتا لیکن پھر یہ سلسلہ شروع ہو گیا..... امیر علی شاہ کا دوسرا بیٹا رحمان علی، غیاث بیگ کی بیٹی ناہید کے ساتھ شاہ پور کے سکول میں ہی پڑھتا تھا بلکہ یہی لڑکا ٹھیک ٹھاک پڑھ لکھ گیا اور اس کے باقی بیٹیوں سے اچھی حیثیت کا حامل رہا..... رحمان علی بچپن ہی سے ناہید سے متاثر تھا..... دونوں ساتھ کھیلتے تھے، ساتھ پڑھتے تھے اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے بہت گنجائش تھی۔ یہ بات بنائے محاسنت نہیں بن سکی لیکن جب رحمان علی تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر آیا تو اسے ناہید سے دور ہونے کا بہت دکھ تھا، چونکہ پڑھنے لکھنے میں یہ لڑکا شاہ پور کے ہائی سکول میں نمایاں حیثیت کا حامل رہا تھا، اس

لئے امیر علی نے اسے مزید تعلیم کے لئے شہر بھیج دیا..... پھر امیر علی نے محسوس کیا کہ رحمان جب بھی آتا ہے اپنے گھر سے زیادہ غیث بیگ کے گھر میں وقت گزارتا ہے..... اسے ذرا سی تشویش ہوئی اور اس نے اس سلسلے میں معلومات کرائیں تو اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ رحمان علی، غیث بیگ کی بیٹی سے متاثر تھا..... امیر علی سوچ میں ڈوب گیا..... اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے، کیانہ کرے۔ بات غیث بیگ سے کہنے کی بھی نہیں تھی..... پھر اس نے اپنے بیٹے رحمان علی کو بھی سمجھایا کہ وہ ناہید سے نہ ملا کرے..... رحمان علی نے اس سلسلے میں باپ سے سوالات کئے اور امیر علی جو آمرانہ ذہنیت کا مالک تھا، ان سوال و جواب سے چڑ گیا..... بیٹا اس طرح سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرے گا، اس کا اسے اندازہ نہیں تھا، چنانچہ اس نے بیٹے کو سخت سرزنش کی اور وارننگ دی کہ اگر شہر کی پڑھائی اسی طرح مزاج بگاڑ دیتی ہے تو بہت جلد وہ اس کی پڑھائی کا سلسلہ ختم کر دے گا لیکن رحمان علی سرکش تھا، باپ کی بات کو خاطر میں نہیں لایا اور اس کے بعد بھی جب وہ شہر سے واپس آتا تو غیث بیگ کے گھر پر زیادہ وقت گزارتا..... یہ حالت مجبوری امیر علی نے ایک بار رحمان علی کے جانے کے بعد غیث بیگ کو بلا لیا اور اسے سمجھایا کہ اپنی بیٹی کو سنبھال کر رکھے..... بعد میں کہیں یہ نہ ہو کہ کوئی ایسا المیہ بن جائے جو ان کے سنبھالنے نہ سنبھلے..... غیث بیگ نے وعدہ کر لیا تھا کہ آئندہ وہ ناہید کو رحمان علی کے سامنے نہیں آنے دے گا..... رحمان علی واپس آیا تو ناہید کو اس سے نہ ملنے دیا گیا اور اس وقت رحمان علی کو احساس ہوا کہ اس کے دل میں ناہید کے لئے کیا مقام ہے۔ بہر حال، وہ چھپ کر غیث بیگ کے گھر گیا، ناہید سے ملاقات ہوئی اور نو جوان دلوں نے اپنے لئے راستے منتخب کر لئے لیکن ان منتخب راستوں کا علم امیر علی کو ہو گیا اور اس نے غیث بیگ کو سختی کے ساتھ ہدایت کی کہ وہ ہستی چھوڑ کر نکل جائے اور اس کے بعد شاہ پور میں نظر نہ آئے..... غیث بیگ بھی ذرا سخت مزاج تھا، اس نے کہا کہ وہ خود اپنی بیٹی کی بدنامی پسند نہیں کرتا حالانکہ رحمان علی بہت اچھا نو جوان ہے، اسے روکا جائے..... بھلا شاہ پور چھوڑنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ امیر علی جو انکار سننے کا عادی نہیں تھا اور اپنی ذات میں بے حد مغرور تھا، یہ بھی جانتا تھا کہ غیث بیگ بھی معمولی نوعیت کا انسان نہیں ہے، چنانچہ اس نے کوئی گہری چال سوچی اور اس کے بعد غیث بیگ کے بیٹے ایاز بیگ کو اغوا کر لیا گیا..... ایاز بیگ، ناہید سے چھوٹا تھا اور جوانی کی سرحدوں کو چھو رہا تھا..... اس

بیگ بالکل خیریت سے ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ جب وہ صورت حال کو اپنے حق میں بالکل بہتر پائے گا تو ایاز بیگ کو رہا کر دے گا۔ ابھی وہ اسے اس لئے رہا نہیں کر سکتا کہ غیاث بیگ، امیر علی کے خلاف کوئی سازش کر سکتا ہے۔ سمجھ رہے ہونا میری بات مسٹر شہاب! ذرا غور کرو، ایک شخص نے دولت کے بل بوتے پر کیا کچھ نہیں کر ڈالا ہے۔ معصوم محبت کو اس نے ایک وحشی بھیڑیے کے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ ناہید اس کی بیوی کی حیثیت سے اس لئے زندہ ہے کہ بھائی کی زندگی چاہتی ہے۔ بے کسی کا شکار یہ خاندان جس طرح زندگی گزار رہا ہے تم اگر ان سے ملو گے تو تمہاری آنکھوں سے آنسو نکل آئیں گے۔ جوہر خاں ایک وحشی درندے کی طرح ان کا نگراں ہے اور انہیں اپنے راستے سے ایک قدم نہیں ہٹنے دیتا۔ تین افراد صبر و سکون کی زندگی گزار رہے ہیں اور ادھر وہ ہوش مند پاگل خانے میں باپ کے مظالم کا شکار ہے۔ یہ ہے وہ ڈرامائی کہانی جو میں آپ کو سنانا چاہتا تھا مسٹر شہاب۔“

شہاب کی آنکھوں میں دلچسپی کے تاثرات تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مدہم سی مسکراہٹ تھی۔ شکار اس کے مطلب کا ہی تھا۔ وہ تو صحیح معنوں میں ایسے ہی بھیڑیوں کا شکاری تھا جس پر دوسرے قابو نہ پاسکیں۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھا کہانی کے اہم پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ مینا محبت بھری نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ عقیدت تھی۔ عدنان واسطی ان لوگوں کے تصور سے غم و اندوہ کا شکار ہو گئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد شہاب نے کہا۔

”تو طے یہ ہوا کہ امیر علی شاہ نے ایک نوجوان لڑکے کو جس بے جا میں رکھا ہوا ہے، ایک لڑکی کی شادی زبردستی ایک ایسے شخص سے کرادی ہے جس سے وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مزید یہ کہ اس نے اپنے بیٹے کو اپنے وسائل سے کام لے کر پاگل خانے میں پھنسا دیا ہے۔ یہ ہے کل داستان۔ لیکن اس سلسلے میں مجھے آپ سے کچھ اہم پوائنٹس ڈسکس کرنا ہوں گے واسطی صاحب۔“

”سر، آپ کی سیکرٹری کی حیثیت سے میں یہ پوائنٹس آپ کی ہدایت کے مطابق نوٹ کرلوں۔“ شہاب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے کہا۔

”مس مینا، ایک گروپ کی فرد کے طور پر آپ میرے لئے یہ کام سرانجام دیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔“

کی اچانک گمشدگی نے غیاث بیگ کو پاگل کر دیا۔ بیٹے کی تلاش میں مایوس ہو کر وہ نیم دیوانگی کی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ امیر علی شاہ نے بھی اپنے طور پر ایاز بیگ کی تلاش کے لئے ہر ممکن کوشش کی اور غیاث بیگ کو بہت سہارا دیا۔ غیاث بیگ کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ ایسی کوئی بات ہوئی ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ غیاث بیگ بیٹے کے غم میں بری طرح نڈھال ہو گیا تھا۔ ادھر رحمان علی کو نہ جانے کیوں اس بات کا شبہ تھا کہ ایاز بیگ کی گمشدگی میں کہیں نہ کہیں امیر علی کا ہاتھ ہے۔ وہ اپنی کھوج میں لگا ہوا تھا لیکن وہ اس تلاش میں کامیاب نہ ہو سکا اور صورت حال بگڑتی چلی گئی۔ پھر ایک بار جب رحمان علی، غیاث بیگ کے گھر میں موجود تھا، امیر علی وہاں پہنچ گیا اور اس نے سر دلچے میں غیاث بیگ سے کہا کہ وعدے کے باوجود اس نے اپنی بیٹی اور رحمان علی کو ملنے کی اجازت کیوں دی ہے تو غیاث بیگ کی بجائے رحمان علی کھڑا ہو گیا اور اس نے نہایت سختی کے ساتھ باپ کا مقابلہ کیا۔

امیر علی خاموشی سے واپس چلا گیا تھا لیکن پھر جب رحمان علی گھر واپس پہنچا تو امیر علی نے اسے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا اور بیٹے سے کہا کہ وہ اب نتائج جھگڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔ پھر امیر علی، غیاث بیگ سے ملا اور اس سے کہا کہ اب بھی اس کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ وہ اب بھی اسے آگاہ کر رہا ہے کہ شاہ پور چھوڑ دے اور یہاں سے چلا جائے ورنہ اس کے بیٹے ایاز بیگ کو قتل کر دیا جائے گا۔ تب پہلی بار غیاث بیگ کو پتا چلا کہ اس کا بیٹا ایاز بیگ، امیر علی کی تحویل میں ہے۔ غیاث بیگ نے بڑی منت سماجت کی لیکن امیر علی نے کہا کہ وہ غیاث بیگ کو بے شک معاف کر دے گا اور اس کے بیٹے کو چھوڑ دے گا لیکن اس کے لئے اسے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔ پھر جوہر خان نامی ایک شخص کو جو امیر علی کا ایک ملازم خاص تھا، منتخب کیا گیا اور ایاز بیگ کے بل بوتے پر بلیک میانگ کرتے ہوئے امیر علی نے ناہید کا نکاح جوہر خاں سے پڑھوا دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے بیٹے رحمان علی کو ساری صورت حال بتادی لیکن رحمان علی یہ خبر سن کر دیوانہ ہو گیا اور اس نے بددوق نکال کر باپ پر فائر کر ڈالے۔ نتیجے میں امیر علی نے اسے پاگل قرار دے کر پاگل خانے بھجوا دیا۔ غیاث بیگ کو جوہر خان کی نگرانی میں دے کر اس کی بیوی ناہید اور غیاث بیگ کی بیوی کے ساتھ شہر بھجوا دیا گیا اور اب وہ لوگ یہیں مقیم ہیں۔ غیاث بیگ نے امیر علی خان کی لاکھ منت سماجت کی کہ اب وہ اس کے سامنے کبھی سرکشی نہیں کرے گا لیکن امیر علی شاہ کا کہنا ہے کہ ایاز

”نہیں سر، میں آپ کے ساتھ مل کر کام کرنا باعث فخر سمجھتی ہوں۔“ مینا نے ایک پیڑ اور بال پوائنٹ لیا اور کرسی لے کر ان دونوں کے قریب آ بیٹھی..... عدنان واسطی پر مسرت لہجے میں بولے۔

”مجھے شبہ تھا مسٹر شہاب کہ آپ یہ سوال کریں گے کہ ان سارے واقعات میں ایک وکیل اور ایک پولیس آفیسر کی مداخلت کا کیا جواز ہے، لیکن آپ نے ان واقعات میں دلچسپی لے کر اور ایک محور بنا کر میرا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔“ شہاب ہنسنے لگا، پھر بولا۔

”واسطی صاحب میں آپ کے ہر عمل سے مکمل تعاون کروں گا۔ آج ہی نہیں، ہمیشہ..... جب ہمارے درمیان یہ بات طے ہو گئی ہے تو پھر کسی بھی سلسلے میں سلیکشن کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا..... آپ نے جس چیز کو اس قابل سمجھا کہ اس کے لئے کام کیا جائے تو میرے خیال میں وہ یقیناً اہمیت کی حامل ہوگی..... اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھئے گا۔“ عدنان واسطی کی آنکھوں میں شکر گزاری کے آثار پیدا ہو گئے..... شہاب کچھ سوچنے لگا تھا..... کچھ دیر مکمل خاموشی رہی پھر اس کے بعد شہاب نے کہا۔

”سب سے پہلا سوال یہ ہے واسطی صاحب کہ آپ کو ان واقعات کے بارے میں کہاں سے تفصیلات معلوم ہوئیں؟“

”میں اپنے محلے کے آخری سرے پر ایک دکان سے اپنی عینک ٹیٹ کراتا ہوں اور اس دن بھی میں آنکھوں کے ٹیٹ کے لئے گیا ہوا تھا، وہاں غیاث بیگ سے ملاقات ہوئی..... اس کے چشے کا نمبر بھی خراب ہو گیا تھا..... بس وہیں پر اس سے ملاقات ہوئی..... ایسا مظلوم اور درد میں ڈوبا ہوا انسان تھا کہ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا..... پھر لاغر بھی تھا اور سب سے آخری بات یہ کہ یہاں سے کچھ فاصلے ہی پر رہتا ہے..... اس کا گھر زیادہ دور نہیں ہے..... میں اسے اس کے گھر تک چھوڑنے گیا اور چونکہ اس سے متاثر ہو گیا تھا اس لئے بعد میں کئی ملاقاتیں کیں، اس سے اور اس کے بعد آخر کار ایک بار اس کی زبان کھل ہی گئی..... اس نے اور اس کی بیوی نے مجھے اپنی مظلومیت کی مکمل داستان سنائی اور میں اسے سن کر ششدر رہ گیا..... بعد میں یہی سوچنا رہا کہ بھلا اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟ مینا کو بھی اس کے بارے میں تفصیل بتائی..... مینا بھی کوئی موثر فیصلہ نہیں کر سکی تھی لیکن یہ بات ہم نے اپنے ذہن میں رکھ لی تھی کہ جہاں بھی ہمیں موقع ملا، ہم اس کی دادرسی کریں گے۔“

”اور ان واقعات کو کتنا عرصہ گزر گیا؟“

”زیادہ نہیں، یہ تقریباً ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر کا قصہ ہے۔“ عدنان واسطی نے کہا اور شہاب پھر سوچ میں ڈوب گیا..... پھر اس نے کہا۔

”اب سوال نمبر دو یہ ہے کہ امیر علی شاہ نے اپنے بیٹے رحمان کو پاگل خانے ہی میں کیوں داخل کیا؟ وہ اس کے لئے اور بھی کوئی معقول بندوبست کر سکتا تھا۔“

”اس بارے میں جو قیاس ہے وہ یہی ہے کہ اپنے بیٹے کو بہر حال وہ اپنے ہاتھوں قتل نہیں کر سکتا تھا، حالانکہ بیٹے نے عالم جنون میں اس پر حملہ کیا تھا..... بیٹے کو بے بس کرنے اور شاید راہ راست پر لانے کے لئے اس نے اسے پاگل قرار دے کر اور اپنے اختیارات سے کام لے کر دماغی ہسپتال میں داخل کر دیا اور یقینی طور پر وہاں اس کی اتنی سخت نگرانی ہوتی ہوگی کہ وہ فرار نہیں ہو سکتا..... ایسا ہی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔“

”کیا آپ نے اس سے کوئی ملاقات کی؟“ شہاب نے سوال کیا۔

”نہیں بھئی..... اول تو یہ مشکل ہوتا، دوسری بات یہ کہ میرے ذہن میں کوئی ایسا واضح حل نہیں تھا جس کے تحت میں آگے قدم بڑھاتا..... بس جیسا کہ بتا چکا ہوں اس کے بارے میں سوچ سوچ کر ایک بے بسی کی کیفیت محسوس کرتا تھا۔“

”تو پھر اس کے بارے میں بھی آپ کو غیاث بیگ سے ہی معلوم ہوا ہو گا کہ رحمان علی شاہ پاگل خانے میں ہے؟“

”ہاں اس نے تفصیل بتائی تھی..... اسے بھی تمام تفصیل یوں معلوم ہے کہ اب یہ بات جو ہر خان اور امیر علی شاہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا۔“

”غیاث بیگ کے کہنے کے مطابق باقی بھائیوں کا اس سلسلے میں کیا رویہ ہے؟ اپنے بھائی کے خلاف اس کارروائی پر انہوں نے کوئی احتجاج تو نہیں کیا۔“

”نہیں، غیاث بیگ کا کہنا ہے کہ وہ سب خوش ہیں اور باپ کے ہمنوا ہیں..... ظاہر ہے، ایسے باپ سے ٹکر کون لے سکتا ہے؟“

”ہوں..... لیکن آپ کے کہنے کے مطابق امیر علی شاہ کی بیوی بھی ہے..... کیا ماں نے بھی اس سلسلے میں خاموشی اختیار کر رکھی ہوگی؟“

”جی سر..... اگر اور کوئی بات نہ ہو تو میں یہ پیپر آپ کو پیش کر دوں؟“ شہاب نے ہنس کر وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔

”مس بینا یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نے درحقیقت آپ کو اس سلسلے میں اس طرح اپنا مددگار سمجھا ہے..... بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک ساتھی کی حیثیت سے آپ میرے ساتھ جو بھی تعاون کریں گی، اس کے لئے میں آپ کا دلی شکر گزار ہوں گا۔“

”سر ہماری ملاقات کہاں ہو سکتی ہے؟ آپ اگر پسند فرمائیں تو آفس تشریف لے آئیے گا یا پھر مجھے حکم دیجئے، میں حاضر ہو جاؤں۔“

”کل آپ کو اس سلسلے میں تفصیل بتا دوں گا۔“ شہاب نے کہا اور پھر ان لوگوں کا انتہائی شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ وہاں سے نکل آیا..... درحقیقت جو واقعات سنائے گئے تھے وہ بڑی دلدوز نوعیت کے حامل تھے اور شہاب یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کیس پر کام کرنا اس کے مشن سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے..... گھر کے معاملات کو وہ کافی حد تک قابو میں کر چکا تھا..... اب صورت حال یہ تھی کہ گھر میں اس کے لئے بڑی خوشگوار فضا پیدا ہو گئی تھی اور غالباً گھر کے تمام افراد نے اس کے موقف کو تسلیم کر لیا تھا چنانچہ گھر میں اس کے لئے اب کوئی الجھن نہیں تھی..... باقی رہا ڈبل زیر و گروپ تو وہ لوگ بھی اپنے طور پر خاصی بہتر زندگی گزار رہے تھے اور ضرورت کے وقت ہر طرح شہاب کا ساتھ دینے کو مستعد رہتے تھے..... مزید یہ کہ مالی حالت بہتر ہونے کی وجہ سے اب ان کے وسائل مزید ترقی کرتے جا رہے تھے..... دوسرے دن تھانے کے معاملات کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد اس نے عدنان واسطی کے دفتر فون کیا، بینا سے گفتگو کی اور بینا کو ایک معروف ریسٹوران میں طلب کر لیا..... اس نے معذرت کرتے ہوئے بینا سے پوچھا۔

”مس بینا میں نہیں جانتا کہ آپ ریسٹوران وغیرہ میں آنا پسند کریں گی یا نہیں، لیکن اس وقت کچھ ایسی ہی مجبوریاں ہیں..... بہت تھوڑے ہی عرصے میں ہم کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جہاں اس قسم کی میٹنگس کی جاسکیں۔“

”سر آپ صرف حکم کیجئے، مجھے کسی بھی جگہ آنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ شہاب نے سادہ لباس میں بینا سے اس ریسٹوران میں ملاقات کی اور کچھ دیر کے بعد بینا اس مخصوص میز تک پہنچ گئی جہاں شہاب بیٹھا ہوا تھا..... میز ایک ایسی محفوظ جگہ تھی جہاں سے

”اس بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔“

”ایاز بیگ کے بارے میں ابھی تک غیث بیگ کو کوئی خاص اطلاع نہیں مل سکی ہے؟“

”صرف یہ کہ وہ زندہ ہے اور امیر علی شاہ کی تحویل میں ہے۔“

”وہی جو کچھ میں تمہیں بتا چکا ہوں..... اس کا کہنا ہے کہ حالات ہموار ہونے کے بعد وہ

ایاز بیگ کو چھوڑ دے گا لیکن شرط یہی ہے کہ اس کا اطمینان ہو نا ضروری ہے۔“

”جوہر خاں کے بارے میں آپ بتا ہی چکے ہیں کہ وہ ایک خونخوار آدمی ہے۔“

”ہاں..... وہ بہت خوفناک آدمی ہے۔“

”ساتھ ہی رہتا ہے غیث بیگ کے؟ میرا مطلب ہے اپنی بیوی کے ساتھ۔“

”بس یوں سمجھ لیجئے ایک طرح سے وہ اس کا نگراں ہے۔“

”آپ نے جوہر خاں کو دیکھا ہے؟“

”جی ہاں..... چہرے ہی سے غنڈہ معلوم ہوتا ہے..... کافی طاقتور اور خطرناک آدمی

ہے۔“

”تو پھر اب یہ بتائیے کہ اس سلسلے میں آپ کے ذہن میں ایسی کوئی تجویز ہے جس کے تحت ہم ان کے خلاف کارروائی کریں؟“

”ابھی تک کوئی تجویز نہیں ہے۔“

”ٹھیک..... تو پھر یوں کر لیتے ہیں واسطی صاحب کہ اس بارے میں، میں بھی سوچ لوں آپ بھی غور و خوض کر لیجئے کہ کام کا آغاز کہاں سے ہو..... باقی جہاں تک یہ سلسلہ ہے تو میں اس میں اتنی ہی دلچسپی لے رہا ہوں جتنی آپ اور آپ کے موقف سے میں متفق ہوں..... کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا..... اس واقعے میں بہت سے لوگ ملوث ہیں اور ایک دولت مند شخص نے اپنی دولت کے بل پر انسانیت کو غلام بنالیا ہے..... ہم انسانیت کو انسان کا غلام نہیں بننے دیں گے..... یہ ہمارا فرض ہے کہ ایسے کسی مسئلے کو بغیر لالچ کے حل کرنے کے لئے ہم اپنی تمام خدمات وقف کر دیں۔“ عدنان واسطی کی آنکھوں میں عقیدت کے آثار نظر آرہے تھے..... پھر شہاب نے کہا۔

”اب اجازت دیجئے اور مس بینا، آپ سے ایک میٹنگ کرنی ہے اس بارے میں.....

آپ نے سارے پوائنٹس تو نوٹ کر لئے ہیں نا؟“

رفتاری سے کام کرتے ہوئے رئیس احمد کے یہاں اپنے لئے جگہ بنالی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ کے وہاں پہنچنے کے بعد ہی اس مسئلے کا حل ہمیں مل سکا تھا لیکن ہر جگہ یکساں نہیں ہوتی..... کام کرنے کا ایک ہی انداز بعض اوقات سخت نقصان دہ ہو جاتا ہے..... میں اس سلسلے میں آپ کو قطعی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”سر میں بہت پر امید ہوں..... کوئی نہ کوئی ترکیب ایسی نکال لوں گی جس سے میں وہاں داخل ہو سکوں۔“

”بینا وہاں ایک سرکش درندہ ہے جو ہر قسم کے مظالم کر سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی معاف نہیں کر سکتا..... اس کے علاوہ اس سرکش درندے کی ضروریات ہیں یعنی شاہ علی شاہ، گلزار اور فیاض۔ یہ تینوں بیٹے جو باپ سے مختلف نہیں ہیں..... نہیں مس بینا، سوری..... میں عدنان واسطی صاحب کو جواب دہ ہوں آپ کے تحفظ کے لئے۔“

”سر آپ یقین کر لیجئے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔“

”مس بینا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ طریقہ کار اختیار مت کیجئے گا۔“

”ٹھیک ہے خرم، آپ حکم فرمائیے۔“ شہاب کسی سوچ میں ڈوب گیا، پھر اس نے کہا۔

”اصل مسئلہ ایاز بیگ کا ہے..... ہم اتنی برق رفتاری سے اس سارے مسئلے پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے کہ امیر علی کے فرشتوں کو بھی اس کا گمان نہ ہو..... سیدہ سیدہ ہاں نہیں گرفتار کر کے تھانے میں لاسکتا ہوں..... بعد میں جو صورت حال ہوگی، دیکھی جائے گی..... یہ کام مجھے کرنے میں مشکل نہیں ہوگی لیکن اگر اسے یہ پتا چل گیا کہ اس کے پس پردہ غیاث بیگ کا معاملہ ہے تو وہ بخت کہیں ایاز بیگ کو ہلاک نہ کر دے۔“

”اس کے امکانات ہیں سر، لیکن سر ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آتی ہے۔“

”کیا؟“

”وہ بد بخت کہیں غیاث بیگ کے گھر کا چراغ بجھانہ چکا ہو۔“

”اب یہ تصور تو ذہن میں رکھنا ہی پڑے گا مس بینا، سارے حالات ہمارے تابع تو نہیں ہوتے..... ہمیں اس قسم کے معاملات میں گنجائش رکھنی پڑتی ہے۔“

”جی سر میں جانتی ہوں، اچھی طرح جانتی ہوں یہ بات۔“

”کام تو کرنا ہے مس بینا لیکن اس انداز میں نہیں..... فی الحال ہم اس سلسلے میں ذرا سی

کوئی ان کی گفتگو نہیں سن سکتا تھا..... بینا نے ایک سادہ سا لباس پہنا ہوا تھا اور خاصی پرکشش نظر آرہی تھی..... دروازے سے یہاں تک آتے ہوئے شہاب نے گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا اور پھر پر تپاک انداز میں اس کا خیر مقدم کیا۔

”یہ بتائیے، آپ کیا بیٹیں گی؟“

”چائے۔“ بینا نے سادگی سے جواب دیا اور شہاب نے ویٹر کو طلب کر کے چائے منگوائی..... پھر اس نے بینا سے کہا۔

”یقیناً آپ نے بھی رات کو اس معاملے پر بہت کچھ سوچا ہوگا..... یہ بتائیے ہمارے پاس وہ کون سا کتہ ہے جہاں سے ہم کام کا آغاز کر سکتے ہیں؟“

”سر، میں سمجھتی ہوں اس سلسلے میں ہمارے پاس ایک اہم مہرہ امیر علی کی بیوی ہے یعنی رحمان علی شاہ کی ماں..... رحمان علی شاہ کے لالچی بھائی یا خود غرض اور ظالم باپ اس سے کتنے ہی منحرف ہو جائیں لیکن ماں کی نگاہوں میں اولاد کی حیثیت یکساں ہوتی ہے..... وہ لازمی طور پر اپنے بیٹے کے لئے مضطرب ہوگی بشرطیکہ اسے یہ معلوم ہو کہ اس کے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔“ شہاب نے تحسین آمیز نگاہوں سے بینا کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

”آپ یقین کیجئے مس بینا، میں آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا اس بات کا پورا پورا وعدہ کرتا ہوں..... میرے ذہن میں بھی یہ نکتہ آیا تھا اور رات کے پوائنٹس میں سے یہ نکتہ میرے لئے سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔“

”ٹھیک یو سر! اس کا مطلب ہے کہ میں نے صحیح لائنوں پر سوچا۔“

”میرا خیال ہے بالکل صحیح لائنوں پر سوچا ہے بینا۔“ بینا بے اختیار مسکرا پڑی، پھر اس نے کہا۔

”سر یہاں بھی ایک ماں ہے۔“

”کیا مطلب ہے؟“

”اور ماں کے دل کو مٹھی میں لینا بہت آسان ہے بشرطیکہ میں امیر علی شاہ کی کوٹھی میں اسی طرح داخل ہو جاؤں جس طرح پچھلی بار رئیس احمد خاں کی کوٹھی میں داخل ہو گئی تھی۔“ شہاب کے ہونٹ سکڑ گئے..... اس نے نیک لمحے میں نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں مس بینا، ہر جگہ کے حالات مختلف ہوتے ہیں..... آپ نے بے شک برق

”جی سر..... ویسے واقعی کوئی جگہ ایسی ہونی چاہئے جہاں ہم لوگ بے دھڑک ملاقات کر سکیں..... اب ظاہر ہے اس ہوٹل میں ہم اس سے زیادہ تفصیلی گفتگو تو نہیں کر سکتے۔“

”یقیناً مس مینا لیکن آپ اطمینان رکھیں بہت جلد ایسی کسی جگہ کا مناسب بندوبست ہو جائے گا۔ اچھا اب آپ یوں سمجھئے مجھے غیث بیگ کی رہائش گاہ کا تفصیلی پتا بتا دیجئے..... آپ کو اس کا نمبر وغیرہ یاد ہے؟“

”سر نمبر تو میں نے نہیں دیکھا۔“

”گھر دیکھا ہے؟“

”جی ہاں۔“

”تو پھر آپ میرے ساتھ چل کر مجھے اس کا گھر دکھا دیجئے، نمبر وغیرہ بھی دیکھ لیں گے۔“

”جی یہ مناسب ہے۔“ کچھ دیر کے بعد وہاں سے اٹھ گئے اور اس کے بعد مینا شہاب کے ساتھ چل پڑی..... گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے اس نے غیث بیگ کا گھر دکھایا اور شہاب نے سست رفتاری سے وہاں سے گزرتے ہوئے گھر کا نمبر اور لوکیشن وغیرہ دیکھ لی..... پھر اس کے بعد اس نے مینا کو عدنان واسطی کے آفس کے سامنے اتارا..... مینا نے اس سے کہا بھی کہ عدنان واسطی سے ملاقات کر لے لیکن شہاب نے معذرت کر لی..... مینا کو وہاں اتارنے کے بعد وہ وہاں سے چل پڑا اور اب اسے ڈبل اوگینگ کو مصروف کار کرنا تھا چنانچہ فتح محمد کے تھلے پر پہنچنے کے بعد اس نے اپنی مخصوص جگہ سے ڈبل اوگینگ کے ارکان کو مخاطب کیا..... سردار علی ڈیوٹی پر تھا..... اس نے فوراً ہی شہاب کی کال موصول کی اور شہاب نے شہنشاہ کی حیثیت سے اسے حکم دیا کہ ایک پتا نوٹ کر لے، یہاں چند افراد رہتے ہیں ان میں جو ہر خاں نامی شخص پر انہیں خاص طور سے نگاہ رکھنی ہے اور اس کی مصروفیات کا پتا چلانا ہے۔ شہاب نے شہنشاہ کی حیثیت سے سردار علی سے کہا کہ وہ کسی بھی لمحہ اس سے معلومات حاصل کر سکتا ہے..... انہیں ڈیوٹی پر متعین کرنے کے بعد شہاب نے اس کام سے بھی فراغت حاصل کر لی اور اب اسے تھانے کے معاملات دیکھنے کے لئے وہاں پہنچنا تھا چنانچہ وہ تھانے چل پڑا۔



غیث بیگ نے وضو سے فراغت حاصل کی اور جائے نماز تلاش کرنے لگا تو جو ہر خاں

معلومات کرتے ہیں مثلاً میں اس دماغی ہسپتال میں رحمان علی شاہ سے ملاقات کروں گا اور اس سے پہلے غیث بیگ سے، بشرطیکہ غیث بیگ کچھ بتانے پر تیار ہو جائے۔“

”سر مشکل ہی ہو گا کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو ہر خاں اس کی پوری پوری نگرانی کرتا ہو گا..... واسطی صاحب کو تو غیث بیگ نے ایک ہمدرد اور بے ضرر انسان پا کر یہ ساری کہانی سنائی لیکن کسی پولیس آفیسر کو وہ یہ کہانی نہیں سنائے گا۔“

”اگر وہ نہیں سنائے گا تو اس کی بیٹی ناہیدیا بیوی، کوئی نہ کوئی تو اس سلسلے میں ہماری مدد کرے گا۔“

”سر اگر آپ چاہیں تو میں اور آپ مل کر ان کی زبان کھلوا سکتے ہیں۔“

”ہاں یہ ضروری ہے..... غیث بیگ سے بہت سارے نکتے مل سکتے ہیں، ہمیں اور اس کے بعد میں رحمان علی شاہ سے ملوں گا۔“ مینا پھر مسکرا اٹھی اور اس نے کہا۔

”سر میرے ساتھ نا؟“

”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے رحمان علی شاہ سے بھی آپ میرے ساتھ ہی ملاقات کریں گے نا؟ اب دیکھئے نا، میں تو آپ کی نہایت قابل سیکرٹری ہوں۔“

”یقیناً..... یقیناً۔ اس میں کیا شک ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے سر آپ فرمائیے غیث بیگ سے کب ملاقات کریں گے؟“

”مس مینا اس سلسلے میں ہمیں تھوڑا سا وقت درکار ہو گا، ایک یا دو دن..... ہمیں یہ پتا چلنا چاہئے کہ جو ہر خاں اس وقت وہاں موجود نہیں ہے۔“

”یہ پتا تو میں دو منٹ میں چلا لوں گی سر..... اس کا فاصلہ ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے اور پھر جو ہر خاں شاید ہی پورا دن گھر پر رہتا ہو..... کچھ نہ کچھ کام تو ہوتے ہوں گے اے۔“

”اس کے لئے آپ بالکل بے فکر رہیں مس مینا۔ آج ہماری آپ کی یہ بات چیت ہو گئی، بس میں اب اس سلسلے میں کام شروع کر دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے سر! مجھ سے رابطہ کیسے رہے گا؟“

”ٹیلی فون پر۔“

کندھے پر تھیلا لٹکائے ہوئے باہر آگیا۔

”شاہ پور جا رہا ہوں چاچا جی، کل واپس آؤں گا۔۔۔ کوئی کام تو نہیں ہے۔“

”ہمیں کیا کام ہو سکتا ہے جو ہر خان۔“

”ٹھیک ہے آرام سے رہنا۔۔۔ میں نے ناہید کو پیسے دے دیئے ہیں، سودا سلف لے آنا۔۔۔ ہو سکتا ہے بڑے سرکار ایک آدھ دن کے لئے روک لیں۔۔۔ چاچا جی ایک بات کہنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جب میں یہاں موجود نہ ہوا کروں تو یہ نہ سمجھ لیا کرو کہ تمہیں آزادی مل گئی ہے۔۔۔ میں نے بندے لگا دیئے ہیں اور وہ بندے ہمیشہ تمہاری نگرانی کرتے ہیں۔۔۔ خبردار کوئی ایسی ویسی بات نہ ہونے پائے۔۔۔ تم جانتے ہو کہ تمہاری کوئی بھی غلط حرکت تمہارے لئے نقصان کا باعث بن سکتی ہے، سمجھ رہے ہونا میری بات؟“

”یہ بات کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تمہیں جو ہر خان۔۔۔ میں نے کبھی کوئی ایسی ویسی بات کی ہے؟“

”بندہ بشر ہے جی، دماغ میں کوئی خرابی آ بھی سکتی ہے لیکن اب تو میں تمہارا داماد ہوں۔۔۔ میرا فرض ہے کہ تمہیں مشکل سے بچاؤں۔۔۔ بات اگر میری ہوتی تو کوئی ہرج نہیں تھا اپنے معاملے میں خود نمٹ لیا کرتا ہوں، مگر میری بھی چاکری کا معاملہ ہے اس لئے بار بار کہنا پڑتا ہے۔“

”تم اس کی بالکل فکر نہ کرو جو ہر خان۔۔۔ ہم تو بے بس کیرٹوں کی مانند ہیں جو زمین پر ریگتے ہیں اور کسی کے بھی پاؤں تلے آکر کچلے جاتے ہیں۔۔۔ ہم بھلا سر اٹھانے کی مہلت کہاں رکھتے ہیں۔“

”او چاچا جی۔۔۔ بڑی بڑی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔۔۔ میں تو بس موٹی موٹی باتیں جانتا ہوں، آرام سے رہو، وقت کا انتظار کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ میں خود بھی کوشش کر رہا ہوں کہ بڑے سرکار کو تم پر اعتبار آجائے، بس اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے۔۔۔ زندگی گزارنے کے لئے جو کچھ چاہئے ہوتا ہے وہ تمہیں مل ہی رہا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو جو ہر خان۔“

”اچھا چلتا ہوں ناہید! خیال رکھنا ہر بات کا۔“

نوجوان خوب صورت لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جو ہر خان باہر نکل گیا۔۔۔ سیکنہ

نے جائے نماز باہر لا کر غیاث بیگ کو دیتے ہوئے کہا۔

”تم نماز پڑھ لو تو میں بھی نماز پڑھوں۔۔۔ ناہید بیٹی جاہانزی چڑھا دے۔۔۔ ناظم زیادہ

ہو جائے گا۔“

”جی اماں۔“ ناہید نے مدہم آواز میں کہا اور باورچی خانے کی جانب بڑھ گئی۔ غیاث بیگ مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گیا تھا۔۔۔ اس کی بیوی سیکینہ باہر صحن میں چارپائی پر بیٹھ گئی۔۔۔ تین افراد تھے گھر میں لیکن تینوں کے چہروں پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔۔۔ زندگی کی کوئی رمت نہ ان کے چہرے کے عضلات میں ملتی تھی اور نہ ان کی آنکھوں کی روشنی میں۔۔۔ بس ایک بے بسی کی منہ بولتی تصویر تھے تینوں۔

غیاث بیگ نماز پڑھتا رہا۔۔۔ ناہید باورچی خانے میں گوشت دھو کر چڑھانے لگی۔۔۔ پھر غیاث بیگ نماز سے فارغ ہوا وہی تھا کہ دروازے پر دستک ابھری اور غیاث بیگ چونک گیا۔۔۔ بہت کم لوگ اس سے ملنے آتے تھے۔۔۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ ہو سکتا ہے جو ہر خان کو کوئی بات یاد آگئی ہو اور وہ واپس آیا ہو چنانچہ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔۔۔ چشمہ نہیں لگایا ہوا تھا، آنکھوں میں مدہم مدہم دھندلاہٹ تھی پھر بھی ان دونوں کو دیکھ لیا۔۔۔ ایک نوجوان مرد تھا اور ایک لڑکی۔۔۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا تو لڑکی نے اسے سلام کرتے ہوئے کہا۔

”غیاث پچا میں وہ نکل والے مکان سے آئی ہوں۔۔۔ ابانے یہ کچھ چیزیں بھیجی ہیں آپ کے لئے۔“

”نکل والے مکان سے؟ بیٹا میں پہچان نہیں پایا۔۔۔ کیا چیزیں بھیجی ہیں؟“

”وہ جی ذرا نیاز کرائی تھی اور چچی جان سے بھی ملنا ہے مجھے، کچھ بات کرنی تھی۔۔۔ آپ مجھے اندر آنے دیں جی میں واسطی صاحب کی بیٹی ہوں۔“

”واسطی صاحب کی بیٹی۔۔۔ وہ بیٹا دراصل۔۔۔“ غیاث بیگ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس دوران لڑکی اندر داخل ہو گئی تھی اور اس کے پیچھے نوجوان مرد بھی۔۔۔ غیاث بیگ منہ کھول کر رہ گیا۔۔۔ ہو سکتا ہے کسی دور میں وہ اس قدر نرم مزاج نہ ہو لیکن اب اس کی فطرت میں ایک عجیب سی بے بسی پیدا ہو گئی تھی۔۔۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر دونوں کو دیکھتا رہ گیا لیکن جب مرد نے پلٹ کر دروازہ بند کیا تو اس کے حواس جواب دینے لگے۔۔۔ اس نے

گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کون ہو بھائی..... کون ہو تم لوگ، یہ..... یہ دروازہ کیوں بند کر دیا، ارے بھائی ہم خود لٹے پٹے آدمی ہیں..... یہ تم نے..... تم نے دروازہ کیوں بند کر دینا؟“
سیکنہ جو جائے نماز پر بیٹھنے ہی والی تھی، شوہر کے الفاظ سن کر گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور میں بٹھایا اور پھر اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔
خوفزدہ نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگی..... غیث سخت مضطرب نظر آ رہا تھا..... لڑکی نے آگے بڑھ کر کہا۔

”میرا نام بیٹا ہے چاچا جی اور یہ شہاب ہیں..... ہم لوگ ایک خاص کام سے آپ کے ہو جائے گی۔ ہم اصل میں یوں سمجھ لیجئے کہ امیر علی شاہ کی مذموم کارروائیوں کے خلاف کام پاس آئے ہیں..... ویسے سچی بات ہے کہ ہم نکل کے تیسرے والے مکان میں رہتے ہیں..... کرز ہے ہیں اور ہمیں اس بات کا پوری طرح علم ہو چکا ہے کہ اس نے آپ کے ساتھ کیا، کیا میرے والد کا نام واسطی ہے اور وہ آپ کو جانتے ہیں..... یہ نیاز کرائی تھی ہم نے اس کے لیے..... اگر آپ چاہیں تو پہلے اپنی کہانی ہم سے سن لیجئے، اس کے بعد ہم سے تعاون کیجئے۔“
مٹھائی لے کر آئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ سے کچھ اور باتیں بھی کرنی ہیں.....“
”اری بیٹا..... معاف کر دے ہمیں بیٹا، معاف کر دے ہمیں اللہ کے واسطے، ہمارے بیٹے کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔“
براہ کرم ہم سے تھوڑی دیر بات کر لیجئے۔“

”بی بی معاف کرنا، گھر آئے ہوئے مہمان کے ساتھ بدسلوکی کرنا گناہ ہے، لیکن.....“
بیٹی..... بیٹی میں ایک مجبور آدمی ہوں..... کسی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں محلے پڑوس کے کئی اندھیر نہیں، شاید وقت ختم ہو گیا ہے۔ بیٹھو تم لوگ آرام سے بیٹھو..... میں ہر طرح کا خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہوں..... قدرت نے اگر میری تقدیر میں بیٹے سے محرومی لکھ ہی دی.....“
”محترم بزرگ، کیا آپ اپنے بیٹے لیا خان کے بارے میں بھی کچھ جانتا نہیں چاہتے؟“
شہاب نے کہا اور غیث بیگ کا منہ حیرت سے کھل گیا..... اس کے انداز میں ایک ایسی..... تم لوگ بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ امیر علی شاہ کے خلاف تم لوگ کیا کر رہے ہو، کس لئے بیسی اور تڑپ پیدا ہوئی تھی جس نے شہاب اور بیٹا کو بہت متاثر کیا تھا..... بیٹا نے نرم لہجے میں..... تمہارا مقصد کیا ہے؟ ایک بات کا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، ہر چند کہ میں بے بسی کی انتہا کو پہنچا ہوا شخص ہوں لیکن اللہ کا بھروسہ ابھی میرے دل سے ختم نہیں ہوا ہے..... کہا۔

”چاچا جی ہم آپ سے جو باتیں کرنے آئے ہیں آپ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ لیا بیگ.....“
اس کے بارے میں پورا پورا اندازہ لگا کر آئے ہیں۔“
بیٹا کے ان الفاظ پر غیث بیگ اور اس کے بیوی کے چہرے بالکل ہی دھواں دھواں ہو کر رہ گئے تھے..... وہ دونوں کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے..... وہ دوسرے پر ہم سے گفتگو کیجئے اور جو کچھ ہم آپ سے پوچھیں اس کے بارے میں ہمیں فیصلات بتائیے..... ناہید بہن تم بھی بیٹھ جاؤ، جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ پہلے ہم آپ کو پائے تھے..... ناہید بھی باورچی خانے سے نکل آئی اور بیٹا نے افسوس بھری نگاہوں سے اسے دیکھا..... پھر وہ بولی۔

”آپ اطمینان رکھیں محترم بزرگ، درحقیقت ایسا ہی ہے اور اب آپ اللہ ہی کے.....“
اس کے بارے میں پورا پورا اندازہ لگا کر آئے ہیں۔“
بیٹا کے ان الفاظ پر غیث بیگ اور اس کے بیوی کے چہرے بالکل ہی دھواں دھواں ہو کر رہ گئے تھے..... وہ دونوں کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے..... وہ دوسرے پر ہم سے گفتگو کیجئے اور جو کچھ ہم آپ سے پوچھیں اس کے بارے میں ہمیں فیصلات بتائیے..... ناہید بہن تم بھی بیٹھ جاؤ، جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ پہلے ہم آپ کو پائے تھے..... ناہید بھی باورچی خانے سے نکل آئی اور بیٹا نے افسوس بھری نگاہوں سے اسے دیکھا..... پھر وہ بولی۔

رخساروں پر بھی آنسو بہنے لگے تھے..... شہاب نے جلدی سے کہا۔
”معافی چاہتا ہوں..... یہ سوال اس لئے ضروری تھا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں، اس میں
ہمیں مدد حاصل ہو۔“
”ہاں وہ زندہ ہے..... یہ بات جو ہر خان بھی کہتا ہے اور اگر تم میرا مذاق نہ اڑاؤ تو میرا
دل بھی۔“ غیاث بیگ نے کہا۔
”خدا کرے ایسا ہی ہو، لیکن آپ کے خیال میں اس نے ایاز بیگ کو کہاں قید کر رکھا
ہوگا؟“

”شاہ پور گئے ہو کبھی؟“ غیاث بیگ نے سوال کیا۔
”نہیں۔“

”تو پھر ایک چکر لگا لو شاہ پور کا، پتا چل جائے گا..... اس کے پاس ایسی ہزاروں جگہیں
ہیں اور پھر سب سے بڑی جگہ تو اس کی حویلی ہے..... میں نے دیکھی تو نہیں ہے لیکن سنا ہے
کہ اس کی حویلی میں ایسے قید خانے موجود ہیں جہاں ایک ایاز بیگ کیا سوا ایاز بیگ گرفتار کر کے
رکھے جاسکتے ہیں..... وہ اس سے پہلے بھی یہ عمل کرتا رہا ہے اور اس کے اپنے مجرم عموماً
پولیس کی تحویل میں نہیں پہنچ پاتے بلکہ اس کے اپنے قید خانے میں ہی ان کی سزاؤں کی
تکمیل کر دی جاتی ہے۔“

”ہوں..... چلے یہ بات بھی ختم ہوئی..... تم کچھ اور سوال کرنا چاہتی ہو بیٹا۔“ شہاب
نے کہا۔

”میں ناہید سے کچھ سوال کرنا چاہتی ہوں۔“ بیٹا بولی اور ناہید نے اسے سوالیہ نگاہوں
سے دیکھا۔

”یہاں نہیں ناہید، بس تھوڑی سی تنہائی چاہئے مجھے۔“ بیٹا کے کہنے پر ناہید اپنی جگہ
سے اٹھ گئی اور اندر ایک کمرے میں داخل ہو گئی..... غیاث بیگ اور سیکنہ بار بار مضطرب
ہو جاتے تھے اور شہاب انہیں اطمینان دلاتا تھا کہ فی الحال جو ہر خان کے آنے کی کوئی امید
نہیں ہے، وہ لوگ فکر نہ کریں..... بہت دیر تک شہاب ان لوگوں سے معلومات حاصل کرتا
رہا..... کچھ دیر کے بعد بیٹا بھی واپس آگئی تھی اور شہاب کی طرف دیکھنے لگی تھی..... پھر
شہاب نے کہا۔

”یہ مختصر سی کہانی ہے آپ کی، بتائیے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“
غیاث بیگ نے آنکھیں بند کر لیں پھر آہستہ سے بولا۔ ”ہاں یہی کہانی ہے اور یہ کہ
بالکل سچ ہے..... لیکن جیسا کہ تم نے کہا کہ تم امیر علی شاہ کے خلاف کچھ کام کر رہے ہو تو
سوال میں تم سے یہ کروں گا کہ یہ کام تم کس حیثیت سے کر رہے ہو۔“
”خدا کی فوجداری کی حیثیت سے۔“ شہاب نے جواب دیا۔
”تمہارے وسائل کیا ہیں..... کیا تم اس جیسے خطرناک آدمی کے خلاف کام کر سکتے ہو؟“
”ہاں..... مکمل طور سے اور آپ کا کوئی تصور تک اس کے علم میں لائے بغیر۔“
”ہوں، ٹھیک ہے، پوچھو مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“
”غیاث بیگ صاحب اس کہانی میں کوئی ایسا نکتہ جو ہمیں امیر علی شاہ کے خلاف
کرنے میں کامیابی دلائے۔“

”نہیں..... میرے پاس ایسا کوئی نکتہ نہیں ہے..... وہ بہترین وسائل رکھتا ہے.....
کے بیٹے مختلف افسران سے تعلق رکھتے ہیں..... شاہ پور میں بڑے بڑے افسران کی دعوت
ہوتی رہتی ہیں اور امیر علی شاہ ان دعوتوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے، کسی غر
کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جو اس امیر کے خلاف کوئی کارروائی کر سکے۔“
”آپ کے بارے میں یہ سنا تھا کہ آپ خود بھی صاحب حیثیت ہیں اور اچھی خا
دولت کے مالک..... وہ سب کچھ کہاں گیا؟“

”امیر علی شاہ کی تحویل میں..... اس نے میری جو مختصر زمینیں تھیں ان کے کاغذ
پر مجھ سے دستخط کروائے اور ان کاغذات کے مطابق زمینیں، جائیداد وغیرہ سب کچھ میں
کے ہاتھوں فروخت کر چکا ہوں اور اس سے قرض لے لے کر سب کچھ ختم کر چکا ہوں۔“
”آپ نے صرف اس لئے دستخط کر دیئے کہ ایاز بیگ ان کے قبضے میں تھا۔“
”اولاد سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز نہیں ہوتی..... بس میری ایک ہی آرزو
زندگی میں کہ میرا بیٹا مجھے زندہ سلامت واپس مل جائے۔“

”آپ کو یقین ہے کہ اس نے ایاز بیگ کو زندہ سلامت رکھا ہوگا؟“
”خدا کے لئے..... خدا کے لئے اس احساس کو میرے دل تک نہ جانے دو، ایسے اللہ
کہو..... خدا کے لئے ایسے الفاظ منہ سے مت نکالو۔“ سیکنہ نے روتے ہوئے کہا..... ناہید

تحت ہوا ہے..... ناہید کہتی ہے کہ ایجاب و قبول کے وقت اس نے صاف انکار کر دیا تھا اس کے باوجود نکاح ہو گیا اور جوہر خان اب اس کا مالک ہے..... ناہید بتاتی ہے کہ جوہر خاں کے اندر کوئی لچک نہیں ہے..... وہ سو فیصد امیر علی شاہ کا غلام ہے اور خود کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہے..... بس یہی معلومات حاصل کی تھیں میں نے اس سے۔“

”یہی معلومات مجھے درکار بھی تھیں۔“ شہاب نے پر خیال انداز میں کہا اور بیٹا بھی خاموشی سے کچھ سوچنے لگی..... پھر اس نے کہا۔

”سر پھر اب کیا حکم ہے، اس سلسلے میں کام کیسے آگے بڑھایا جائے گا؟“

”کم از کم تین دن کی خاموشی درکار ہوگی بیٹا، اس کے بعد ہم کام شروع کر سکتے ہیں۔“

”جیسا آپ پسند کریں گے سر۔“

پھر دونوں رخصت ہو گئے..... شہاب اب بڑی سنجیدگی سے یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے..... پھر دوسرا اور تیسرا دن شہاب نے پراسرار سرگرمیوں میں گزارا تھا..... تیسرے دن وہ سیٹھ جبار بیگ کے گھر میں پہنچ گیا تھا اور جبار بیگ نے معمول کے مطابق اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔

”آؤ شہاب میاں آؤ..... کہو بھی کیا کیا ہو رہا ہے۔“

”جی سر ایک درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں۔“

”ہاں ہاں کہو۔“

”ایک عمارت ہے آپ کی کریم سوسائٹی میں، کوٹھی نمبر بیس..... چار پانچ سال سے خالی پڑی ہوئی ہے اور قرب و جوار کے علاقے میں آسیب زدہ کوٹھی کہلانے لگی ہے۔“ جبار بیگ سنبھل کر بیٹھ گئے اور بولے۔

”وہاں قیام کرو گے؟“

”نہیں سر، بعض اوقات کچھ ایسے معاملات کے لئے ضرورت پیش آ جاتی ہے جن کے لئے تنہائی ضروری ہوتی ہے..... بس مجھے اپنے ایسے ہی کاموں کے لئے وہ درکار ہے۔“

”ہوں۔“ جبار بیگ نے چند لمحات خاموشی اختیار کی، پھر بولے..... ”تمہیں پتا کیسے چلا اس کے بارے میں؟“

”سر آپ نے محکمہ ہی ایسا دیا ہے کہ کوئی معلومات حاصل کر لینا مشکل نہیں ہوتا.....“

”غیاث بیگ صاحب! آپ لوگوں کو تھوڑی ہمت سے کام لینا ہوگا..... یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بد بخت کتنا عرصہ ایاز بیگ کو اپنی قید میں رکھے، میں یہ کوشش کروں گا کہ جلد از جلد ایاز بیگ کو اس کے چنگل سے رہائی دلاؤں..... آپ اس تصور کو اپنے ذہن سے بالکل نکال دیجئے کہ آپ سے کوئی آکر ملتا تھا..... کیا محلے کے لوگ جوہر خان سے شکایت کر سکتے ہیں؟“

”نہیں..... لیکن اس کا کہنا ہے کہ اس کے آدمی ہماری نگرانی کرتے رہتے ہیں..... ہم پڑوسیوں سے نہ ملا جلا کریں۔“

”آپ اس طرف سے بھی اطمینان رکھئے..... آس پاس کوئی نہیں ہے..... ہم بھرپور جائزہ لے چکے ہیں..... اول تو ہم دوبارہ آپ کے پاس آئیں گے نہیں، لیکن اگر کسی خاص ہی مسئلے میں آنے کی ضرورت پیش آئی تو پوری احتیاط کے ساتھ آئیں گے..... آپ کسی سے بھی ہماری آمد کا تذکرہ نہ کریں۔“

”ٹھیک ہے اللہ مالک ہے، ہمیں تو صرف اسی کی ذات پر بھروسہ ہے اور امید ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ ہماری مدد کے لئے آسمان کے فرشتوں کو بھیجے گا۔“



شہاب اور بیٹا پھر ایک ہوٹل میں جا بیٹھے تھے..... بیٹا نے گہری سانس لی اور شہاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہماری یہ کوشش تو نہایت کامیاب رہی سر۔“

”ہاں بیٹا..... ان لوگوں کی صورتوں پر غور کیا تھا۔“

”بس کیا بتاؤں سر، دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا..... کیسی عجیب بات ہے کچھ لوگوں کو تو اتنی فوقیت حاصل ہے کہ وہ ماحول پر پوری طرح قابض ہوتے ہیں اور کچھ اتنے بے بس کہ زندگی ان کے لئے صرف ایک گناہ، ایک عذاب ہوتی ہے۔“

”یہی گردش حالات ہے اور تاریخ کا ایک طویل سلسلہ، ظالم بھی ہوتے ہیں اور مظلوم بھی..... بس دستور دنیا ہے ویسے تم ناہید کو تنہائی میں لے گئی تھیں۔“

”جی سر، میں نے اس سے جوہر خان کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں..... جوہر خان نے اس سے باقاعدہ نکاح کیا ہے..... ہر چند کہ یہ نکاح امیر علی شاہ کے ظلم کے

ان دنوں میں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا۔“
”اچھا اچھا..... خیر ٹھیک ہے ابھی تم اسے استعمال میں رکھو..... میں ملازموں کو بھیج کر اس کی صفائی کرا دوں گا..... بعد میں دو، چار، چھ سال کے بعد جب بھی بیچوں گا تمہیں پہلے سے آگاہ کر دوں گا..... ورنہ ضروری بھی نہیں ہے۔“
”سر اس وقت تک ممکن ہے میں ہی آپ کو اس کی قیمت پیش کر دوں۔“
”ارے نہیں بھئی، بھلا تم سے کیا لینا دینا..... خیر، فی الحال تو تم اسے استعمال کرو..... کیا میں اس کی صفائی کے لئے بندوبست کر دوں؟“
”نہیں سر، بس آپ کی اجازت درکار تھی۔“ شہاب نے کہا اور کچھ دیر جبار بیگ کے ساتھ بیٹھ کر واپس آ گیا۔



ڈاکٹر نصرت کبیر باقاعدہ کلب آنے کا عادی تھا..... رات کو گیارہ، ساڑھے گیارہ بجے تک وہ اس کلب میں وقت گزارتا اور اس کے بعد خود اپنی کار ڈرائیو کرتا ہوا گھر پہنچتا تھا..... آج بھی معمول کے مطابق ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھنے کے بعد وہ دوستوں کے درمیان سے اٹھ گیا اور باہر نکل آیا..... باہر ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی..... موسم بے حد خوشگوار تھا..... ڈاکٹر نصرت کبیر اپنی کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا..... کار شارٹ کر کے ریورس کی اور ست رفتار سے گھر کی جانب چل پڑا..... اہل خانہ اس کے معمولات کے عادی تھے چنانچہ کوئی ایسی تردد کی بات نہیں تھی..... ذرا موسم سے لطف اندوز ہو لیا جائے..... اس نے ایئر کنڈیشنڈ کار کے شیشے بھی کھول دیئے اور ہلکی ہلکی بوند باندی سے لطف اندوز ہونے لگا..... کوئی کوئی چھینٹا اندر بھی آ جاتا تھا..... پھر ایک سنسان سڑک پر اچانک اس نے عقب نما آئینے میں ایک سائے کو ابھرتے ہوئے دیکھا اور اس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر لہرا گئے..... انسانی سایہ ایک دم سیدھا ہو گیا تھا اور اس نے نصرت کبیر کی گردن پر پستول کی نال رکھ دی تھی۔

”گاڑی ذرا سڑک کے کنارے کر لیجئے ڈاکٹر۔“ ایک بھاری آواز سنائی دی اور نصرت کبیر نے گاڑی کی رفتار ختم کر کے اسے سڑک کے سائیڈ میں لگالیا۔

”اب براہ کرم نیچے آجائیے، لیکن سنیئے، زندگی قیمتی چیز ہے اور اسے محفوظ رکھنا ہر حالت میں ضروری ہوتا ہے..... مجھے حکم دیا گیا ہے کہ آپ ذرا بھی کوئی غلط حرکت کریں تو آپ کو زخمی کر دیا جائے، اس طرح کہ آپ مر نہ سکیں لیکن آپ کی اس حرکت کے نتیجے میں بعد میں آپ کو موت کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔“

”میرے ساتھ آہستہ قدموں سے آجائے پلیز۔“ بڑا مہذب انداز تھا..... اگر جرائم پیشہ شخص بھی ہے تو تعلیم یافتہ معلوم ہوتا ہے..... ڈاکٹر کبیر نے سوچا پھر کئی جگہ اسے ٹھوکریں کھانی پڑیں نجائے کیسا علاقہ تھا، جگہ جگہ لوہے کی چیزوں کے انبار تھے، حالانکہ نقاب پوش اسے محتاط کرتا جا رہا تھا، لیکن پھر بھی کہیں نہ کہیں تھوڑی بہت ٹھوکر لگ ہی جاتی تھی، اس کے بعد ڈاکٹر کبیر کو کچھ دروازوں سے گزرتا پڑا اور پھر غالباً اسے کسی بڑے کمرے میں لے جایا گیا، یہاں اسے ایک کرسی پر بٹھایا گیا اور پھر اس کی آنکھیں کھول دی گئیں، ایک عجیب و غریب کمرہ تھا، بوسیدہ سا، قطعی غیر معیاری، لیکن کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی جس کی وجہ سے ڈاکٹر کبیر کی آنکھیں چونہ دھیا گئیں اور اس نے آنکھیں بند کر لیں، اس کے ہاتھ البتہ اسی طرح ہتھکڑیوں میں جکڑے رہنے دیئے گئے تھے، لیکن کرسی اس قسم کی تھی کہ ہاتھ پیچھے سے نکل گئے تھے اور اس میں اسے کوئی خاص دقت نہیں ہو رہی تھی، پھر جب اس نے روشنی میں آنکھیں کھولنے کی قدرت پالی تو آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا اور اس کے پورے بدن میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی، سامنے کئی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان کے سیٹوں پر فوجی وردی میں ملبوس چند افراد بیٹھے ہوئے تھے، سب کے سب سمارٹ اور شاندار شخصیت کے مالک، ڈاکٹر کبیر حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کے شانوں پر نگے ہوئے اعزازات دیکھنے لگا، وہ سب بڑے عہدوں کے مالک تھے، ڈاکٹر کبیر اب واقعی کچھ نروس ہو گیا تھا پھر ان میں سے ایک شخص نے کہا۔

”ڈاکٹر نصرت کبیر، یہی ہے نا آپ کا نام؟“

”جی سر۔“

”اور آپ نے یہاں ایک دماغی ہسپتال کھول رکھا ہے؟“

”جی سر۔“

”ڈاکٹر کبیر کیا آپ سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ آپ دولت کے حصول کے لئے ہر جائز اور ناجائز کام کر لیا کرتے ہیں۔“

”نہیں سر..... میں ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اگر آپ کو میرے بارے میں کسی قسم کی کوئی غلط فہمی یا شبہ ہے تو آپ میرے خاندان کی چھان بین کر سکتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ہی میرے کردار کے بارے میں بھی آپ معلومات حاصل کر سکتے ہیں.....“

”نہیں مسٹر میں جینا چاہتا ہوں۔“ نصرت کبیر نے سر دلچے میں کہا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا..... پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر وہ مناسب جسم کا مالک شخص بھی نیچے اتر آیا تھا جس نے اپنے چہرے پر نقاب چڑھایا ہوا تھا اور جو مستعد اور چاق و چوبند نظر آتا تھا..... اس نے ڈاکٹر کبیر کا شکریہ ادا کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ پشت پر کر لے..... ڈاکٹر کبیر کے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکے..... پھر اس کے بعد سائے نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی، ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالی اور اسے عقبی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے کہا..... ڈاکٹر کبیر نے خاموشی سے اس ہدایت پر بھی عمل کیا تھا..... ویسے بھی وہ ایک مہذب آدمی تھا..... جرمنی، فرانس، امریکا اور دوسرے کئی ملکوں میں برین سرجری اور دماغی امراض کے سلسلے میں بہت سی سندیں لے چکا تھا..... زندگی کا ایک طویل حصہ اس نے اپنی ان کاوشوں میں گزارا تھا..... اس زندگی کو کھونا اس کے لئے زیادہ باعث تکلیف اس لئے تھا کہ ابھی وہ اپنے مقاصد کی تکمیل نہیں کر پایا تھا..... بہر حال، اس نے سائے کی ہدایت پر عمل کیا اور سائے نے نہایت مہذب انداز میں اس کا شکریہ ادا کر کے اسٹرنگ سنبھال لیا..... کار پھر چل پڑی تھی..... ڈاکٹر کبیر کو حیرت تھی کہ کار کا گلا دروازہ بہ دستور لاک تھا پھر یہ سیاہ پوش اندر کیسے آگیا، لیکن جرائم پیشہ افراد کے لئے اس قسم کے کام مشکل نہیں ہوتے..... ڈاکٹر کبیر نے تھوڑی دیر کے بعد نقاب پوش سے سوال کیا۔

”کچھ معلومات کر سکتا ہوں مسٹر؟“

”جی فرمائیے۔“

”آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں اور کیا اس انوکھا مقصد کسی چیز کا حصول ہے؟“

”بالکل نہیں ڈاکٹر..... آپ اس غلط فہمی کو دل سے نکال دیجئے..... آپ کو کسی ایسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا جو آپ کے لئے ناقابل قبول ہو۔“

”مزید کچھ بتا سکتے ہیں؟“

”سوری۔“

کچھ دیر کے بعد کار رک گئی اور نقاب پوش نے عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا اور ڈاکٹر کبیر کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔

”اس کے بعد ڈاکٹر، کیا امیر علی شاہ کا آپ سے مسلسل رابطہ ہے؟“
”سر اس شخص کو قابو میں رکھنے کے لئے مجھے لاکھوں روپے پیش کئے گئے ہیں، ابتدا میں اس شخص نے بہت شور شرابا مچایا، مجھے متاثر کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ کیا یہ غیر انسانی عمل کر کے میں اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتا ہوں، لیکن سر بات وہی تھی، میں شدید دباؤ میں تھا اور مجھے ہدایت کر دی گئی تھی کہ کسی قیمت پر بھی اس حقیقت کو منظر عام پر نہ لایا جائے..... یہ بھی کہا گیا تھا مجھ سے کہ ایک مخصوص وقت گزرنے کے بعد اس شخص کو یہاں سے لے جایا جائے گا۔“

”ہوں، تو آپ نے اسے قابو میں کیسے کیا؟“

”سر ابتدا میں تو میں نے اسے زیادہ تر بے ہوش ہی رکھا، لیکن پھر حد سے زیادہ بے ہوشی کے اثرات خطرناک بھی ہو سکتے تھے اس لئے میں نے اس سے تعاون کی درخواست کی، وہ بہت اچھا انسان ہے..... اس نے میرے پوچھنے پر بھی مجھے کچھ نہیں بتایا اور کہا کہ بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں کوئی رشتہ قابل بھروسہ نہیں ہے اور ہر شخص دھوکا دے سکتا ہے، بہر حال ڈاکٹر میں تم سے تعاون کروں گا اور سر یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد اس نے آج تک مجھ سے تعاون کیا ہے۔“

”کیا امیر علی شاہ کا کوئی آدمی اس شخص کی نگرانی کے لئے کلینک پر موجود رہتا ہے؟“
”ابتدا میں سر دو آدمیوں کی ڈیوٹی وہاں لگائی گئی تھی، وہ باہر موجود رہا کرتے تھے لیکن بعد میں جب ان لوگوں کو یہ اطمینان ہو گیا کہ ادھر سے مکمل دیکھ بھال کی جارہی ہے تو انہوں نے یہ سلسلہ ختم کر دیا، لیکن اب بھی ہفتے میں دو ایک بار امیر علی شاہ صاحب کے فون آ جاتے ہیں اس کے علاوہ مجھے رقم بھی بھیج دی جاتی ہے۔“

”ہوں۔“ فوجی افسران نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر ان میں سے ایک نے کہا۔
”ڈاکٹر نصرت کبیر، اصولی طور پر ہمیں آپ کو زیر حراست رکھنا چاہئے کیونکہ یہ معاملہ ملک کے خلاف سرگرمیوں سے متعلق ہے، لیکن آپ نے جس طرح تعاون کیا ہے اگر آپ اسی شکل میں تعاون جاری رکھنے کی ہمت کر سکیں تو ہم آپ کو رہائی دے سکتے ہیں، ورنہ آپ کو قید رہنا پڑے گا اس وقت تک جب تک ان سرگرمیوں کا قلع قمع نہ کر دیا جائے۔“
”سر یہ فیصلہ آپ خود کیجئے گا، آپ اگر مجھ پر اعتبار کر سکیں تو مجھے مناسب احکامات

میں دنیا کے کئی ملکوں میں تعلیم حاصل کر کے اپنے وطن میں اس لئے آیا ہوں کہ وطن والوں کی خدمت کروں، آپ یقین فرمائیے میں نے اپنے ہاں علاج و معالجے کے معاوضے بھی اتنے مناسب رکھے ہیں کہ میرا کلینک ہر وقت بھرا رہتا ہے، میں صرف اتنا کماتا چاہتا ہوں سر کہ ایک خوشحال زندگی گزار سکوں، کسی جرم سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔“
”آپ غور کر لیجئے ڈاکٹر نصرت کبیر، آپ نے ایک ایسے شخص کو اپنے ہسپتال میں داخل کیا ہوا ہے جو دماغی مریض نہیں ہے۔“ ڈاکٹر کبیر کے چہرے پر تاریکی پھیل گئی، اس نے آہستہ سے کہا۔

”جی سر، اگر آپ کا اشارہ رحمن علی شاہ کی جانب ہے تو میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں، وہ واحد ایسا مریض ہے جس نے میری ذہنی حالت خراب کر کے رکھ دی ہے۔“

”ڈاکٹر کبیر، کیا آپ ہمیں اس بارے میں تفصیل بتا سکتے ہیں؟“
”سر، آپ کا تعلق جس ادارے سے ہے اس کے سامنے ایک اچھے شہری کی حیثیت سے میں جھوٹ بولنے کی جرات نہیں کر سکتا، درحقیقت اس شخص کو دماغی مریض کی حیثیت سے قبول کرنے کے لئے مجھ پر اتنا بڑا دباؤ ڈالا گیا تھا کہ میں اس سے انکار نہیں کر سکا..... میں نے اس پر احتجاج کیا تو مجھے ایک فون سننا پڑا جو امیر علی شاہ صاحب کے فون کے جواب میں موصول ہوا تھا، سر یہ فون ایک بہت بڑے آدمی کا تھا..... آپ یوں سمجھ لیجئے کہ اس شخص کے نام کے ساتھ میں امیر علی شاہ صاحب کے حکم سے انحراف کر ہی نہیں سکتا تھا۔“
”نام بتائیے جی.....“ دوسرے اعلیٰ افسر نے پتھریلے لہجے میں کہا اور ڈاکٹر نصرت کبیر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا، تب تیسرے افسر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”ڈاکٹر نصرت کبیر اصل میں صورت حال یہ ہے کہ اس شخص کو صرف زبان بندی کے لئے دیوانہ قرار دے کر آپ کے کلینک میں داخل کر لیا گیا ہے اور یہ زبان بندی کچھ ایسا اینٹی اسٹیٹ کارروائیوں کے سلسلے میں ہے جس میں فوجی حکام براہ راست ملوث ہیں، ہم یہ نہیں چاہتے کہ کوئی بے گناہ اس سازش کا شکار ہو..... یہ ایک بہت بڑی سازش ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ ملک دشمن افراد کو کسی بھی شکل میں معاف نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ اب آپ اس بڑی شخصیت کا نام بھی بتا دیجئے۔“ جواب میں ڈاکٹر نصرت کبیر نے لرزنی آواز میں اس شخصیت کا نام دہرایا تھا جسے نوٹ کر لیا گیا، پھر ڈاکٹر کبیر سے کہا گیا۔

تھا..... اس نے ڈاکٹر کبیر کو کار کی چابی دیتے ہوئے کہا۔
”اپنے اعصاب کو قابو میں رکھئے گا اور مطمئن انداز میں گھر جائیے گا، لیکن تمام ہدایات کو مد نظر رکھتے ہوئے۔“
”جی۔“ ڈاکٹر کبیر نے کپکپاتی آواز میں کہا اور چابی اگیشن میں لگا کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔



سالم ڈاکٹر نصرت کبیر کو لے کر نکل گیا تو کمرے میں موجود تمام افراد منتشر ہو گئے اور دوسرے کمرے میں جا کر اپنی اپنی فوجی وردیاں اتارنے لگے..... یہ ڈبل اوگینگ کے بقیہ افراد تھے اور شہنشاہ کی ہدایت پر انہوں نے یہ کام سرانجام دیا تھا..... یہ وردیاں بھی شہنشاہ کی طرف سے انہیں فراہم کی گئی تھیں اور درحقیقت ان کی شخصیتیں اتنی شاندار تھیں کہ ان وردیوں میں وہ اجنبی نہیں لگتے تھے، پھر جب اس کام سے فارغ ہو کر بیٹھ گئے تو انجم شیخ نے کہا۔
”حالانکہ یہ براجرم ہے ہم نے باقاعدہ فوجی اعزازات بھی استعمال کئے ہیں۔“

”لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی جرم کی تیج کنی کے لئے ہی یہ جرم کیا گیا ہے اور پھر ہم نے ان وردیوں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، ویسے اس سارے معاملے کی کوئی تفصیل ہمیں معلوم نہ جانے یہ کیا قصہ ہے۔“

”شہنشاہ اگر مناسب سمجھتا تو اس بارے میں تفصیل بھی معلوم ہو جاتی لیکن کوئی ایسا اہم مسئلہ ہو گا۔“

”ٹیپ ریکارڈر چیک کر لو۔“ انجم شیخ نے کہا اور سردار علی ایک گوشے میں رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کو اٹھا لیا اس میں لگا ہوا کیسٹ ریو اسنڈ کیا اور گفتگو سننے لگا جو ڈاکٹر نصرت کبیر کے اور ان کے درمیان ہوئی تھی..... حساس اور طاقتور ٹیپ ریکارڈر نے تمام گفتگو بڑی عمدگی سے ریکارڈ کر لی تھی، اس کے بعد وہ سالم کا انتظار کرنے لگے اور سالم تھوڑی ہی دیر کے بعد واپس پہنچ گیا..... نقاب اس نے راستے ہی میں اتار لیا تھا ان سب نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تو اس نے کہا۔

”سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔“

”پھر اب شہنشاہ کو اطلاع دے دی جائے۔“

”ہاں۔“ فراست نے جواب دیا اور وہ لوگ مخصوص ٹرانسمیٹر پر شہنشاہ کو مخاطب

دیتے اور اس کے بعد مجھے رہائی دے دیجئے، لیکن اگر میری رہائی کسی طور پر ملکی مفاد کے خلاف ہو تو پھر دوسری بار آپ سے اس کی درخواست نہیں کروں گا۔“ نصرت کبیر واقعی ایک شریف انسان تھا، فوجی افسران ایک دوسرے کی صورتیں دیکھتے رہے اور اس کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔

”میرے خیال میں ڈاکٹر کبیر کو زیر حراست رکھنا مناسب نہیں ہے، لیکن ڈاکٹر نصرت کبیر آپ کلب سے واپسی کے ان لمحات کو مکمل طور پر اپنی یادداشت کے خانوں میں محفوظ کر لیں گے، اپنے اہل خانہ کو بھی نہیں بتائیں گے کہ آپ کا یہ وقت کہاں صرف ہوا، ہو سکتا ہے ہم آپ کو اس سلسلے میں ایک آدھ بار تکلیف اور دیں، لیکن یہاں نہیں بلکہ آپ کے کلینک ہی میں آپ سے کچھ مطالبات کئے جاسکتے ہیں، کیا آپ ہم سے تعاون کریں گے؟“
”سر..... اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ آزما کر دیکھ لیجئے گا..... بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”آپ کو فوجی حکام کی مدد کرنے کے سلسلے میں اعزاز دیا جائے گا، ڈاکٹر نصرت کبیر، ہم آپ کو آپ کی شرافت اور ایمانداری پر بھروسہ کرتے ہوئے رہا کر رہے ہیں، آپ بھی خیال رکھئے کہ آپ کی یہ رہائی برقرار رہے۔“

”سر میں ایک محب وطن شہری ہوں اور وطن کے تحفظ کے لئے اپنی خدمات آپ کو پیش کر رہا ہوں آپ مطمئن رہئے میں آپ کے احکامات کی ہمیشہ تعمیل کروں گا۔“

”تب ایک لفظ یاد کر لیجئے اور وہ ہے ڈبل کر اس، ڈبل کر اس کے کوڈ ورڈز کے ساتھ آپ کو جو بھی ہدایت کی جائے آپ اس پر عمل کیجئے گا اور اطمینان رکھئے..... وہ ہدایت ایسی نہیں ہو گی جس پر آپ کو تردید پریشانی ہو۔“
”بہت بہتر جناب۔“

”ٹھیک ہے، براہ کرم اپنی آنکھوں پر پٹی بندھوا لیجئے گا۔“ وہی پٹی ڈاکٹر کبیر کی آنکھوں پر باندھ دی گئی اور اس کے بعد اسے سہارا دے کر باہر لایا گیا، ڈرائیونگ کرنے والے کے بارے میں ڈاکٹر کبیر کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ انہی میں سے کوئی ہے یا فوجی حکام کا کوئی نمائندہ، اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا، پھر ایک سنسان سڑک پر اس کی آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی اور ہاتھوں کی ہتھکڑیاں بھی کھول دی گئیں، یہ وہی نقاب پوش تھا جو اسے یہاں تک لایا

”ٹھیک ہے باقی ہدایات بعد میں دی جائیں گی، لیکن بہت جلد ہی تمہیں کچھ اور کام دیئے جائیں گے ان کے لئے تیار رہو۔“

”یس سر۔“ فرزانے جواب دیا اور دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔



بینا آٹور کشا سے نیچے اتر آئی..... رکشا والے کو پیسے دینے کے بعد اس نے یہاں بنی ہوئی کوٹھیوں کے نمبر تلاش کرنا شروع کر دیئے اور تھوڑی دور پر اسے کوٹھی نمبر بیس نظر آگئی، وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ گئی، لیکن کوٹھی کا حلیہ دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی تھی..... غیر آباد، ویران اور سنسان لیکن اندر شہاب کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی..... گاڑی کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا اس نے ذیلی کھڑکی سے اندر داخل ہونے کے بعد ادھر ادھر دیکھا کوٹھی جھاڑ جھنکار سے اٹی ہوئی تھی، لگتا تھا طویل عرصے سے اسے استعمال نہ کیا گیا ہو..... وہ آہستہ آہستہ صدر دروازے کی جانب بڑھی اور اسی وقت شہاب اندر سے باہر نکل آیا۔

”آئیے مس بینا۔“ اس نے کہا اور بینا مسکراتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

”یہ بھوت گھر آپ نے کہاں سے تلاش کر لیا۔“

”اس کا بیرونی منظر ہمارے لئے انتہائی مناسب ہے مس بینا، بس اندرونی حصے کو ذرا اپنے لئے ٹھیک ٹھاک کرانا ہے، ویسے آپ کا کیا خیال ہے ہمارے کام کے لئے موزوں جگہ ہے۔“

”آپ شاید اسے خوشامد سمجھیں گے لیکن آپ یقین کیجئے شاید میرے اندر بھی کوئی خبیث روح حلول کر گئی ہے۔ مجھے ایسی ویران جگہیں بہت پسند ہیں۔“

”ارے نہیں مس بینا آپ کی روح تو بڑی پاکیزہ ہے، آئیے اس کمرے میں آجائیے باقی عمارت کو ذرا ضروری ساز و سامان سے آراستہ کرنا ہے ویسے میں نے یہاں چند کرسیوں کے علاوہ جو ضروری انتظام کیا ہے وہ کچن کا ہے، کچن آباد ہو گیا ہے اور آپ کے انتظار میں چائے تیار ہے، آپ بھیجی خوشبو محسوس کر رہی ہوں گی۔“ بینا نے ناک سکڑ کر لمبی لمبی سانس لیں اور بولی۔

”کیا عمدہ لگ رہی ہے یہ خوشبو، لیکن آپ نے چائے پیالیوں میں تو نہ ڈالی ہو گی۔“

”اب کچھ کام آپ کے لئے بھی توجھوڑ دینا تھا۔“

کرنے کا انتظام کرنے لگے، تھوڑی ہی دیر کے بعد شہنشاہ سے رابطہ قائم ہو گیا تھا، فرزانے رسمی گفتگو کے بعد کہا۔

”کام آپ کے حسب ہدایت سر انجام دے دیا گیا ہے سر۔“

”ویری گڈ..... ذرا تفصیل میں چلے جاؤ۔“

”سر ہم نے نصرت کبیر کے اور اپنے درمیان ہونے والی گفتگو ریکارڈ کر لی ہے آپ کی اجازت ہو تو ٹیپ ریکارڈر سے آپ کو وہ گفتگو سنائی جائے۔“

”سناؤ۔“ شہنشاہ کی آواز ابھری اور فرزانے ٹیپ ریکارڈر ٹرانسمیٹر کے قریب کر کے ایک بار پھر اسے ریواسنڈ کیا اور کچھ دیر کے بعد ٹیپ ریکارڈر پر آواز ابھرنے لگی..... کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ٹیپ ریکارڈر کی آواز ٹرانسمیٹر پر صاف سنی جا رہی تھی، کچھ دیر کے بعد کیسٹ ختم ہو گیا تو فرزانے ٹرانسمیٹر آف کر دیا۔

”ہیلو۔“

”ہاں فرزانہ کیسٹ سن لی ہے میں نے۔“

”آوازیں واضح تھیں سر۔“

”ہاں۔“

”سر اس سلسلے میں ہم سے کوئی سوال؟“

”نہیں میرا خیال ہے تم نے مناسب طریقے سے اس سے گفتگو کی ہے، ویسے خود اس کے بارے میں تمہارا کیا اندازہ ہے۔“

”نہایت شریف آدمی ہے سر، پورے وثوق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے۔“

”ٹھیک..... اچھا ادھر کی سناؤ جو ہر خان کا کیا حال ہے۔“

”سر وہ گھر پر موجود ہے شوکت کی وہاں مستقل ڈیوٹی لگادی گئی ہے، ویسے اور کوئی خاص بات نہیں ہے وہاں کے معمولات جوں کے توں جاری ہیں۔“

”کوئی نئی شخصیت تو ان لوگوں سے ملنے نہیں آئی۔“

”نہیں سر بالکل نہیں بڑی خوش قسمت ہے اس گھر پر، سناٹا طاری رہتا ہے کبھی کبھی صرف غیث بیگ کچھ سوداگرکاری لینے کے لئے باہر نکل آتا ہے..... لاغر تھکا ماندہ اور اس کے بعد واپسی چلا جاتا ہے۔“

اپنا نظام قائم کریں گے اور ہمیں بہر حال ہوٹلوں کی ملاقات سے نجات مل جائے گی تو مس بینا دوسرا عمل جو میں نے کیا ہے وہ اس سلسلے میں غور کرنے کا ہے، میں کوئی صحیح راستہ منتخب کرنا چاہتا تھا، بہت غور و خوض کے بعد آخر کار میں نے ایک راہ کا تعین کیا اور اس پر قدم اٹھادیے ہیں، اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کر کے اب اس سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“

بینا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے آہستہ سے کہا۔
”سر آپ مجھے بہت عزت بخشتے ہیں۔“

”اب اس سلسلے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں بینا اسے کہنا مناسب نہیں سمجھتا کچھ باتیں دل میں رکھنے کے لئے ہوتی ہیں اور انہیں دل ہی میں رکھنا چاہئے..... بہر حال جو تفصیل میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے بہت غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں ہمارا سب سے بہترین معاون رجن شاہ ہی ہو سکتا ہے اور اس کے بغیر ہمارا آگے بڑھنا ممکن نہیں ہے۔“

بینا سنبھل کر بیٹھ گئی اور سوالیہ نگاہوں سے شہاب کو دیکھنے لگی، شہاب نے پھر کہا۔
”رجن علی شاہ اپنے باپ اور بھائیوں کے مظالم کا شکار ہے سارا معاملہ اسی سے متعلق ہے، اسے پاگل قرار دے کر دماغی ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ سخت برتی گئی ہوگی، اسے دماغی ہسپتال سے نکال کر اپنی تحویل میں لینا چاہتا ہوں۔“

”جی سر۔“ بینا آہستہ سے بولی۔

”اور اس کے لئے میں نے کام شروع کر دیا ہے۔“

”کس انداز میں سر، کیا اسے ہسپتال سے نکالنا آسان ہوگا؟“

”نہیں مس بینا، اس میں سے کوئی کام آسان نہیں ہے ہمیں مشکل کام سرانجام دینا ہوں گے..... میں نے یوں کیا مس بینا کہ اس ہسپتال کے بارے میں تمام تر معلومات حاصل کرنے کے بعد اس کے مالک نصرت کبیر کو اغوا کر لیا اور اسے شاندار طریقے سے مرعوب کرنے کے بعد میں نے اپنے مقصد کے لئے تیار کر لیا ہے، اس سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ یہ ہیں کہ نصرت کبیر ایک شریف آدمی ہے، پرائیویٹ دماغی ہسپتال کا مالک ہے، دنیا کے مختلف ملکوں سے تربیت لے کر آیا ہے، لیکن امیر علی شاہ نے اسے سخت ترین دھمکیاں دلوانے کے بعد اپنے مطلب پر لانے کا عمل کیا ہے اور وہ امیر علی شاہ سے خوف زدہ

”ٹھیک ہے آپ تشریف رکھئے میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ بینا نے کہا اور آگے بڑھی تو شہاب جلدی سے بولا۔

”میں کچن تک آپ کی رہنمائی تو کر دوں۔“

”چائے کی نفیس خوشبو میری رہنمائی کر رہی ہے..... آپ اطمینان سے بیٹھیے۔“ بینا نے کہا اور وہاں سے چلی گئی..... کچن میں پہنچنے کے بعد اس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں، ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہو رہا تھا اسے، نوجوان اور خوبصورت لڑکی تھی اور اس کو بھی میں شہاب کے ساتھ تنہا لیکن یہاں بات اپنی ذات پر خود اعتمادی کی نہیں تھی بلکہ جس شخصیت کے ساتھ وہ یہاں تھی اس پر اسے اپنے آپ سے زیادہ اعتماد ہو گیا تھا جانے کیوں؟

چائے کے لوازمات کے ساتھ مناسب برتن بھی تھے چنانچہ وہ سلیقے سے چائے نرے میں سجا کر اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں شہاب بیٹھا ہوا تھا اس کے سامنے ایک پیڑ اور بین رکھا ہوا تھا اور وہ قلم سے پیڑ پر لکھیں کھینچ رہا تھا..... بینا نے چائے کی پیالی اسے پیش کی اور دوسری پیالی خود لے کر بیٹھ گئی۔

”بہر حال آپ یقین کریں سر یہ کوئی بہت خوبصورت ہے۔“

”شکریہ مس بینا..... اصل میں ذرا مصروفیات رہیں آپ نے میری ان دنوں کی خاموشی کو محسوس تو نہیں کیا۔“

”کیا ہے سر بڑی شدت سے کیا ہے لیکن آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا، یہ سوچ کر کہ یقیناً آپ کسی اہم کام میں مصروف ہوں گے۔“

”انتہا اعتماد ہے مجھ پر بینا۔“ شہاب نے کہا

”جی سر۔“

”اس اعتماد کے لئے شکریہ، بہر حال مس بینا میں نے خاصا کام کیا ہے اور اس کی رپورٹ آپ کو دینا چاہتا ہوں۔“

بینا نے مسکرائی مسکراہٹوں سے اسے دیکھا اور چائے کے پچھو۔ لے چھوٹے سب لینے لگی، شہاب کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا، کچھ دیر کے بعد اس نے کہا۔

”اس دوران میری کئی کاوشیں رہی ہیں مس بینا، مثلاً اس کو بھی کی دریافت اور اس کا حصول، بہر حال یہ ایک مشکل کام تھا لیکن مستقبل میں ہمارے لئے نہایت ضروری یہاں ہم

ساتھ ہو، اگر کسی معاملے میں تمہیں شامل نہ کروں تو یوں سمجھ لینا کہ حالات اس کی اجازت نہ دیتے ہوں گے ورنہ میں کسی بھی طور تم سے منحرف نہیں ہوں کیا سمجھیں؟“

”سر مجھے پورا پورا اطمینان ہے۔“

”اور ایک درخواست کروں بیٹا؟“

”جی سر۔“

”مجھے سر کہنا ضروری سمجھتی ہو؟“

”جی۔“

”اگر یہ ضروری ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے ورنہ میرا نام شہاب ہے اور جس طرح میں نے روز اول سے آپ کو بے تکلفی سے بیٹا کہا ہے اگر آپ بھی وہی بے تکلفی مجھے بخش دیں گی تو مجھے خوشی ہوگی۔“ بیٹا کے چہرے پر ایک شرکین مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے آہستہ سے کہا۔

”اگر یہ آپ کا حکم ہے تو میں اس کی تعمیل کروں گی۔“

”میں آپ کو حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا مس بیٹا، البتہ درخواست ہمیشہ کی جاسکتی ہے۔“

”نہیں سر، آپ کو مجھ پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔“ بیٹا نے کہا اور شہاب کی نگاہوں کی تاب نہ لا کر نگاہیں جھکا لیں، ایک عجیب سا تاثر دونوں کے چہروں پر نمودار ہو گیا تھا۔



ڈاکٹر نصرت کبیر درحقیقت بے حد شریف انسان تھا کچھ خاندانی پس منظر بھی تھا کچھ اپنی فطرت کا خاصا بھی کہ شاید زندگی میں اس نے نہ کبھی کسی کو دھوکا دیا اور نہ کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی..... زمانہ طالب علمی میں وہ ایک ذہین طالب علم رہا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں میں اس نے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا..... سونزاوان اسے فرانس میں ملی تھی، ایک بہت ہی نیک سیرت لڑکی جو اس سے محبت کرنے لگی تھی اور نصرت کو بھی یہی احساس ہوا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں ایک گہرا مقام حاصل کر چکی ہے، چنانچہ اس نے خلوص دل سے پہلے نصرت کبیر کا مذہب اور اس کے بعد اسے اپنی زندگی میں قبول کر لیا اور نہایت ثابت قدمی کے ساتھ اس کا ساتھ نبھانے لگی..... نصرت کبیر نے اسے بتادیا تھا کہ

ہے کیونکہ امیر علی شاہ نے اس پر کچھ بہت بڑے آدمیوں سے دباؤ ڈلوایا ہے، لیکن میں نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس کے تحت اب وہ اس دباؤ سے نکل کر میرے دباؤ میں آگیا ہے، چنانچہ رحمن علی شاہ کے سلسلے میں وہ ہم سے مکمل تعاون کرے گا۔“ بیٹا کی آنکھیں چمک رہی تھیں اس نے پر شوق لہجے میں کہا۔

”ونڈر فل سر..... یہ تو واقعی ایک شاندار کارنامہ ہے آپ کا۔“

”اور اب بیٹا میں یہ چاہتا ہوں کہ اسے وہاں سے نکال کے یہاں لے آؤں اور اس سلسلے میں اسے اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار کر لوں۔“

”جی سر..... آئیڈیا بہت اچھا ہے لیکن اسے وہاں سے نکالنا اگر آپ کے لئے ممکن بھی ہے تب بھی کیا اس کی گمشدگی سے امیر علی شاہ ہوشیار نہیں ہو جائے گا..... اس نے رحمن علی کو دماغی ہسپتال میں پہنچانے کے بعد اس سے لا تعلقی تو نہ اختیار کر لی ہوگی۔“

”اس کے لئے بھی بندوبست کر لوں گا۔“

”کیا بندوبست کریں گے سر؟“

”بیٹا میرے خیال میں ہمیں ڈاکٹر نصرت کبیر کا مکمل تعاون ورکار ہو گا اور اگر ایسی ہی ضرورت پیش آئی تو خفیہ پولیس کے کسی آدمی کو میک اپ کر کے میں ہسپتال پہنچا دوں گا اور وہ رحمن علی شاہ کا کردار ادا کرے گا..... اس طرح ہم امیر علی شاہ کو شے کا موقع نہیں دیں گے۔“ بیٹا سوچ میں ڈوب گئی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”سر، رحمن علی شاہ باہر نکلنے کے بعد کیا خود پر قابو پاسکے گا..... ہو سکتا ہے وہ عالم جوش میں کوئی ایسا عمل کر بیٹھے جس کی وجہ سے ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔“

”یہ ساری باتیں بے شک بالکل درست ہیں بیٹا، لیکن ہمیں ان حالات کو کنٹرول کرنا ہو گا..... یہ رسک لئے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں ہے..... ہاں اگر تمہارے ذہن میں اور کوئی خیال ہو تو مجھے مشورہ دو؟“

”نہیں سر..... آپ نے جس حد تک کام کر لیا ہے..... بھلا اس کے بعد میری مداخلت کی کوئی گنجائش ہے، میں آپ سے مکمل اتفاق کرتی ہوں اور یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اب میری ڈیوٹی کیا ہے؟“

”بیٹا، نہایت مخلصانہ طریقے سے تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ تم ہر سلسلے میں میرے

”میں حاضر ہوں سر۔“ نصرت کبیر نے جواب دیا۔
”شکریہ..... آپ کو اصل میں اس لئے اطلاع دے دی گئی تھی کہ آپ کہیں الجھن کا شکار نہ ہوں، خدا حافظ۔“ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا اور نصرت کبیر دیر تک ریسیور ہاتھ میں لئے بیٹھا رہا پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر ریسیور رکھ دیا..... معاملہ بہت بڑے لوگوں کا ہے بھلا جس کام میں فوج سرگرم عمل ہو اس میں کیا دشواری پیش آسکتی ہے..... یہ تو وطن کا سب سے بڑا ادارہ ہوتا ہے پھر ایک ڈبلا پتلا آدمی، جو ورزشی بدن کا کسا ہوا نظر آتا تھا، نصرت کبیر کے پاس پہنچ گیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔
”ذیل کر اس۔“

نصرت کبیر اس کے پاس کمر اوغیرہ دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی آمد کے بارے میں اسے اطلاع دی گئی ہے اس نے آہستہ سے کہا۔
”تشریف لائیے سر۔“ اور وہ شخص نصرت کبیر کے ساتھ اندر چل پڑا..... ایک صاف ستھرے کمرے میں رحمان علی شاہ مسہری پر بیٹھا ہوا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا..... ان دونوں کو دیکھ کر اس نے کتاب درمیان سے کھول کر نیچے رکھ دی اور پھر نصرت کبیر کی طرف دیکھ کر بولا۔
”غالباً یہ پریس فوٹو گرافر ہیں، کیا مجھے ان کے سامنے پاگل ہونے کی اداکاری کرنی ہے..... کوئی نیا کام چاہتے ہیں میرے والد محترم؟“

”نہیں مسٹر، نہ میں پریس فوٹو گرافر ہوں اور نہ ہی میں آپ کے والد کے ایما پر یہاں آیا ہوں، مجھے آپ کی کچھ تصاویر درکار ہیں۔“

”خوب، لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں؟“
”یہ بات آپ کو بہت جلد سمجھا دی جائے گی، براہ کرم تعاون کیجئے گا۔“
”کیوں ڈاکٹر..... کیا خیال ہے، کیا میں بچوں کے بل اس شخص پر چھلانگ لگا کر اس کا منہ فوجیوں یا تصویریں بنالوں؟“

رحمن علی شاہ نے مسکرا کر ڈاکٹر کبیر سے کہا۔

”براہ کرم رحمن علی شاہ آپ تصویر بنائیجئے۔“

”بالکل ٹھیک ہے اب آپ میری تصاویر بنا سکتے ہیں جناب۔“

اس کی زندگی کا مقصد ممالک غیر میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے اہل وطن کو اپنی مہارت کی سہولتیں فراہم کرنا ہے..... سوزناوان رقیہ کی حیثیت سے نصرت کبیر کے ساتھ اس کے وطن واپس آگئی..... نصرت کبیر نے اپنا کلینک تعمیر کیا اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد شہرت کے آسمان پر پرواز کرنے لگا..... زندگی میں پہلی بار اس کے لئے یہ مشکل پیش آئی تھی، جب کسی بڑے آدمی کے زیر اثر اسے ایک ناخوشگوار فریضہ سرانجام دینا پڑا تھا..... یہ داغ اس کے ضمیر پر بہت گہرا تھا اور وہ بار بار اس کرب کا شکار ہوا تھا لیکن اپنے وطن میں آنے کے بعد وطن کے کچھ اہم امور سے آگاہ ہو چکا تھا اور اسے یہ اندازہ تھا کہ اگر اس حکم سے روگردانی کی تو زیر عتاب آجائے گا اور پھر نجانے کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اس کا رویہ رحمن علی شاہ کے ساتھ اتنا اچھا تھا کہ خود رحمن علی شاہ اس کا ممنون ہو گیا تھا لیکن جو واقعہ پچھلی رات نصرت کبیر کو پیش آیا تھا اس نے اسے بیمار ڈال دیا تھا..... معمول کے مطابق کلینک تو پہنچا تھا، لیکن کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا..... ایک عجیب سا خوف اس پر مسلط تھا، ایک بے کلی اور بے چینی، رات کو گھر واپس جا کر بھی وہ اس بے کلی کا شکار رہا حالانکہ رقیہ نے اس سے بہت سے سوالات کئے تھے لیکن صورت حال ایسی تھی کہ وہ رقیہ کو بھی تفصیل نہیں بتا سکتا تھا..... ذرا سی لغزش اس کا پورا مستقبل تباہ کر سکتی تھی..... دوسرا دن اور پھر تیسرا دن بھی گزر گیا اور پھر اس شام وہ اپنے کچھ مریضوں کا معائنہ کرنے کے بعد آفس میں آکر بیٹھا تھا کہ اسے ایک ٹیلی فون موصول ہوا..... نصرت کبیر نے بے دلی سے فون ریسیو کیا تھا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ذیل کر اس۔“

یہ جملہ نصرت کبیر کو ازبر تھا اس کا چہرہ فق ہو گیا..... دوسری طرف سے پھر آواز آئی۔
”مسٹر نصرت کبیر میں نے آپ کی آواز پہچان لی ہے اور اس لئے میں نے کوڈ دہرایا ہے۔“
”جی سر میں بول رہا ہوں۔“

”ہمارا ایک نمائندہ اب سے تھوڑی دیر کے بعد آپ کے پاس پہنچے گا، آپ اس سے تعاون کیجئے گا..... ہمیں رحمن علی شاہ کی کچھ تازہ تصاویر درکار ہیں، آپ اسے موقع دیجئے کہ وہ یہ تصاویر بنالے..... بعد میں آپ کو ایک زحمت دی جائے گی لیکن آپ ذرہ برابر فکر مند نہ ہوں آپ کو کسی بھی سلسلے میں ملوث نہیں کیا جائے گا۔“

آنے والے نے رحمن علی شاہ کی بہت سی تصاویر بنائیں اور اس کے بعد شکریہ ادا کر کے دونوں وہاں سے باہر نکل آئے، نصرت کبیر نے کہا۔
”سراسولی طور پر مجھے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں کرنی چاہئے کہ یہ ضرورت کیوں پیش آگئی، لیکن مستقبل میں حالات سے آگاہ رہنے کے لئے اگر میں یہ سوال آپ سے کر دوں تو کیا آپ اس کا جواب دینا پسند فرمائیں گے؟“
”نہیں مسٹر نصرت کبیر..... ہم لوگوں کی مختلف ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور ہم صرف انہی کے تحت کام کرتے ہیں..... ہمیں یہ نہیں بتایا جاتا کہ اس کام کی وجہ کیا ہے..... امید ہے آپ محسوس نہیں کریں گے۔“
”بالکل نہیں سر۔“
”اجازت دیجئے۔“ وہ شخص سلام کر کے باہر نکل گیا اور نصرت کبیر تھکے تھکے انداز میں سیٹ پر آ بیٹھا۔



اس گندی بستی میں، اس ٹوٹی پھوٹی عمارت کے اندر شہنشاہ نے جو عظیم الشان کارخانہ بنا رکھا تھا باہر کے لوگ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے اصل میں ان تمام کارروائیوں کی ابتداء بڑی کسمپرسی کے عالم میں ہوئی تھی..... اس وقت ان لوگوں کے پاس کچھ وسائل نہیں تھے لیکن یہ نولہ ایک ایک کر کے شہنشاہ نے جمع کیا تھا اپنے طور پر اس قدر ذہین لوگوں کا نولہ تھا کہ کوئی اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا..... ہر ایک اپنے فن کا ماہر اور محدود وسائل میں شاندار کارکردگی کا حامل..... جو کچھ ان لوگوں نے بنایا تھا اپنی ہی کاوشوں سے بنایا تھا، حالانکہ اب وقت بدل چکا تھا..... ان لوگوں کے پاس اپنی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد ڈبل اوگینگ فنڈ میں بڑی بڑی رقمیں آچکی تھیں اور ان سے ہر طرح کی آسائشیں حاصل کی جاسکتی تھیں، لیکن نہ صرف شہنشاہ کا یہ مشورہ تھا بلکہ ان کا اپنا بھی تجربہ تھا کہ جس قدر آسانیاں انہیں اس جگہ حاصل ہیں کہیں کسی شاندار عمارت میں نہیں حاصل ہو سکتیں..... بظاہر کبڑیوں کا کام کرنے والے یہ لوگ یہاں رہ کر دنیا کی نگاہوں سے محفوظ تھے اور اگر کبھی لوگ ان کے بارے میں جاننے کی کوشش بھی کریں تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ یہ ان کی رہائش گاہ ہوگی اور اس ٹوٹے پھوٹے کھنڈر نما مکان میں ایسی اعلیٰ اعلیٰ

چیزیں موجود ہوں گی جن پر رشک کیا جاسکے..... رحمن علی شاہ کی تصاویر بنانے کی ذمہ داری سالک کو اس لئے سونپی گئی تھی کہ نصرت کبیر نے سالک کی صورت نہیں دیکھی تھی، ورنہ باقی لوگوں کو وہ دیکھ چکا تھا..... سالک نے تصاویر تیار کر لیں، شہنشاہ کی طرف سے انہیں جو احکامات ملے تھے وہ ان میں ذرا بھی تساہل سے کام نہیں لے سکتے تھے..... فراز بہترین میک اپ کا ماہر تھا اور یہاں ان کے پاس میک اپ کا شاندار سامان موجود تھا، حالانکہ اس قسم کے بہروپ بدلنے کی ضرورت ایک آدھ بار ہی انہیں پیش آئی تھی لیکن بہر حال کبھی اس کی اہم ضرورت پیش آجاتی تھی..... جیسے اس بار شہنشاہ کی طرف سے انہیں ہدایت ملی تھی کہ سالک کی نشاندہی پر انہی میں سے کسی کو رحمن علی شاہ کا روپ اختیار کرنا ہے اور یہ قدم قیامت اور میک اپ کے نقطہ نگاہ سے فراست علی اس کا حقدار قرار پایا تھا اس مسئلے میں سالک کے اوپر پورا پورا بھروسہ کیا گیا تھا، چنانچہ جب تصاویر ڈیولپ ہو کر آگئیں تو فراز نے اپنی ذمہ داری سنبھال لی..... فراست علی کو بڑی مہارت کے ساتھ رحمن علی شاہ کا روپ دیا جانے لگا اور تمام لوگ اس میک اپ کے سلسلے میں اپنی ماہرانہ رائے کا اظہار کرتے رہے۔

فراز، فراست علی پر مصروف تھا اور کافی محنت کرنے کے بعد اس نے فراست علی کو رحمن علی شاہ کا روپ دے دیا..... فراز کی ماہرانہ کارکردگی کو سب ہی نے توسیعی نگاہ سے دیکھا تھا..... فراز نے سالک سے کہا۔
”میں تمہارے علاوہ کسی اور پر بھروسہ نہیں کر سکتا سالک..... پوری طرح جائزہ لے کر بتاؤ کہ کہاں کمی رہ گئی ہے..... ویسے تو میں نے تصویر کے مطابق بالوں کا سٹائل تک بدل دیا ہے، اتفاقیہ بات دیکھو کہ فراست علی کے بال بھی اس کے رنگ سے ملتے ہیں۔“
”تم یقین کرو فراز..... میں تمہارے اس فن کی صحیح معنوں میں داد بھی نہیں دے سکتا لیکن تم نے جس طرح فراست علی کو رحمن علی کا روپ دیا ہے میں خلوص دل سے تمہیں اس کی مبارکباد دیتا ہوں۔“

”گویا تم مطمئن ہو پوری طرح؟“

”ہاں۔“

”اس سلسلے میں شہنشاہ کو جوابدہ ہو سکو گے؟“

”بالکل..... ظاہر ہے مجھے جو ہدایات ملی تھیں میں نے ان کے سلسلے میں دونوں کانوں کا

دینا ہوگا، اس کے علاوہ ایک اور ہدایت ہے..... وہ یہ کہ بارہ بجنے سے پہلے آپ کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کریں گے جس کے تحت رجن علی ہمیں بے ہوش ملے..... اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ اسے کس طرح بے ہوش کرتے ہیں، ہمیں ایک یاد دہانی کے لئے اس کی بے ہوشی درکار ہے۔“

”جی..... یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے..... میں کوئی بھی طریقہ کار اختیار کر سکتا ہوں۔“

”اس سلسلے میں آپ کو کوئی اعتراض؟“

”نہیں جناب..... میں بس یہ سوچ کر مطمئن ہوں کہ ایک طرف سے اگر مجھے اس کام کے لئے مجبور کیا گیا کہ ایک صحیح الدماغ انسان کو پاگل ظاہر کر کے اپنے کلینک میں قیدی بنائے رکھوں تو دوسری جانب سے مجھے یہ احساس دلایا جا رہا ہے کہ اس عمل کے خلاف کام ہو رہا ہے۔“

”آپ بالکل مطمئن رہیں مسٹر نصرت کبیر آپ کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا جائے گا۔“

”شکریہ..... میں ان احکامات کی پابندی کے لئے حاضر ہوں۔“

نصرت کبیر کے لئے یہ کچھ بھی مشکل نہیں تھا وہ معمول کے مطابق اپنے گھر واپس گیا اور گیارہ بجے گھر سے یہ کہہ کر نکل آیا کہ ایک مریض کو رات میں دیکھنا ہے اور ایک دو گھنٹے میں واپسی ہو جائے گی پھر جب وہ رجن علی شاہ کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ پرسکون نیند سو رہا تھا، ایک ہلکی سی کوشش سے رجن علی شاہ کی نیند گہری ہو گئی اور وہ نیند سے نکل کر بے ہوشی کی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ تب بارہ بجے چند افراد اس کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں سے دو چہرے شناسا تھے، نصرت کبیر انہیں فوجی وردی میں دیکھ چکا تھا لیکن ان کے ساتھ ایک اور شخص کو دیکھ کر نصرت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، وہ متعجب نگاہوں سے کبھی بستر پر پڑے ہوئے رجن علی شاہ کو دیکھتا اور کبھی اس شخص کو جو ان لوگوں کے ساتھ آیا تھا۔ دونوں میں سر مو فرق نہ تھا..... آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

”آپ جس حیرت کا شکار ہیں نصرت کبیر صاحب وہ قطعی بجاہے، یہ رجن علی شاہ کے ہم شکل ہیں اور ہمیں کچھ وقت کے لئے انہیں رجن علی شاہ کی جگہ رکھنا ہوگا مطلب یہ ہے کہ رجن علی شاہ کو تو ہم لے جا رہے ہیں یہ صاحب یہاں اس کی جگہ رہیں گے تاکہ آپ کو کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے اور مطمئن رہیں۔ یہ رجن علی شاہ کا مکمل نعم البدل ثابت ہوں

استعمال نہیں کیا یعنی ایک سے سننا دوسرے سے اڑانا..... بلکہ ان ہدایات کے تحت میں نے پوری طرح رجن علی شاہ کا جائزہ لیا تھا اس کے بولنے کا انداز، کھڑا ہونا، چلنا، مسکرانا اور ہنسنا ساری چیزوں پر میں نے غور کیا اور یہ تصویریں جو میں نے مختلف زاویوں سے بنائی ہیں صرف اسی نظریے سے بنائی تھیں کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔“

”گویا تم مطمئن ہو۔“

”بالکل۔“

”لباس کے لئے کیا ہوگا؟“

”اس بارے میں شہنشاہ کی طرف سے مجھے کوئی ہدایت نہیں دی گئی۔“ سالک نے جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے ہم اس سے آخری ہدایت لئے لیتے ہیں۔“

”اوکے۔“

”انجم ذرا اثر انسیمیئر تیار کرو۔“ سالک نے کہا اور انجم ٹرانسمیئر کو درست کرنے لگا تاکہ شہنشاہ سے گفتگو کی جاسکے۔



نصرت کبیر خود کو ذہنی طور پر فوجی حکام سے تعاون پر تیار کر چکا تھا..... اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہے، کم از کم اسے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے..... اول تو بات فوجی حکام کی ہے اور پھر بہر حال جس سلسلے میں کام ہو رہا ہے وہ انسانی نقطہ نگاہ سے بھی غلط ہے..... رجن علی نے بحالت مجبوری یہ قید برداشت کر لی تھی کہیں اس کے لفظوں میں زہر بھرا ہوتا تھا اور اس کی باتیں نصرت کے دل پر کچھ کے لگاتی تھیں مگر وہ بھی مجبور تھا۔

اے۔ ایک بار پھر ڈبل کر اس کے کوڑے سے فون موصول ہوا اور وہ مستعد ہو گیا.....

”آپ کو پھر ایک تکلیف دی جا رہی ہے مسٹر نصرت۔“

”جی سر..... فرمائیے۔“

”رات کو آپ کس وقت تک کلینک میں رہتے ہیں؟“

”ویسے تو میں سات بجے تک ہوتا ہوں لیکن ایمر جنسی کے لئے کوئی وقت نہیں ہوتا۔“

”آج رات کو بارہ بجے ہمیں آپ کی ضرورت ہے..... آپ کو تھوڑا سا وقت ہمیں

اپنے اتنے قریب پایا ہو..... بہر حال اس کی ہدایت پر رحمن علی شاہ کو اس گاڑی میں منتقل کر دیا گیا جس پر اس وقت نمبر پلیٹ بھی نہیں لگی ہوئی تھی..... شہاب نے ہر چیز کا خیال رکھا تھا..... وہ جانتا تھا کہ اس کے ساتھی اسی وقت پوری طرح مستعد رہ سکتے ہیں جب تک وہ اس کے بارے میں کچھ نہ جانیں..... جاننے کے بعد تو حالات مناسب نہیں رہتے۔

پھر جب ویگن چلی گئی تو شہاب اپنی جگہ سے نکلا اور گاڑی میں آ بیٹھا..... اس نے پچھلی سیٹ پر لیٹے ہوئے رحمن علی شاہ کو دیکھا اور پھر گاڑی سٹارٹ کر دی..... ڈبل او گینگ کے ممبروں کی اتنی مجال نہیں تھی کہ خفیہ طریقے سے اسے دیکھنے کی کوشش کرتے، چنانچہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے شہاب نے اپنا سیاہ نقاب اتار دیا..... لباس کا کوئی مسئلہ نہیں تھا وہ اس عمارت میں جا کر بھی اتارا جاسکتا تھا لیکن ایک مناسب جگہ پہنچ کر اس نے نمبر پلیٹ واپس اس کی جگہ پر لگا دی کیونکہ رات کو گشت کرنے والی پولیس بہر طور اس کی حیثیت کو قبول نہیں کر سکتی تھی اور خاص طور سے اس وقت جب کہ عقبی سیٹ پر ایک بے ہوش آدمی بھی موجود تھا..... بہر طور گاڑی کو بھی نمبر بیس میں داخل ہو گئی جس کے برآمدے میں بیٹا واسطی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی..... شہاب نے گاڑی صدر گیٹ کے پاس روک دی اور نیچے اتر آیا..... بیٹا واسطی مسکراتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی تھی..... شہاب نے کہا۔

”آپ کو یہاں تنہا خوف تو محسوس نہیں ہوا امس بیٹا؟“

بیٹا آہستہ سے ہنس پڑی پھر بولی۔

”یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے مجھ سے۔“

”اصولی طور پر تو نہیں کیا جانا چاہئے لیکن اخلاقی طور پر کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔“ شہاب نے کہا اور پھر گاڑی کی عقبی سیٹ کا دروازہ کھول کر رحمن علی شاہ کو باہر نکالنے لگا..... اس کے بعد اس نے اسے کندھے پر ڈالا اور اندر کی جانب چل پڑا..... بیٹا نے جلدی سے دروازہ وغیرہ بند کر دیا اور پھر وہ خود بھی شہاب کے پیچھے پیچھے اندر عمارت میں داخل ہو گئی..... عمارت میں اس دوران دو انتہائی انتظامات کر لئے گئے تھے جن کی ضرورت پیش آسکتی تھی..... رحمن علی شاہ کو ایک بیڈ پر لٹا دیا گیا اور بیٹا اور شہاب اسے دیکھنے لگے..... بیٹا کو تمام صورت حال کا علم تھا..... بہر طور وہ خاصی متاثر نظر آرہی تھی۔

رحمن علی شاہ کو ہوش میں لانے کے انتظامات کئے جانے لگے..... شہاب نے اسے

گے، آپ کو کسی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

نصرت کبیر نے بڑی سنسنی محسوس کی تھی..... ایک انوکھا طریقہ کار ایک پراسرار عمل..... بہر حال اس شخص کو رحمن علی شاہ کی جگہ دے دی گئی اور آنے والے اسے لے کر چل پڑے..... تھوڑی دیر کے بعد رحمن علی شاہ کو ایک بڑی ویگن میں منتقل کر دیا گیا..... نصرت کبیر کا شکریہ ادا کیا گیا اور وہ لوگ اسے لے کر چل پڑے..... نصرت کبیر کے اعصاب شل ہو رہے تھے..... بہر طور یہ سرکاری حکام کا ایک خفیہ طریقہ کار تھا جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔



عدنان واسطی نے بڑی خوشی کے ساتھ بیٹا واسطی کو اجازت دے دی تھی اور بیٹا واسطی شہاب کے پاس پہنچ گئی تھی، شہاب نے خود عدنان واسطی سے گفتگو کرنے کی بجائے بیٹا کو ہی اس کام کے لئے کہا تھا کہ وہ رات کو کریم سوسائٹی کی کوٹھی میں موجود رہے اور دو چار دن یہاں گزارے..... بیٹا نے تو وہیں کہہ دیا تھا کہ عدنان واسطی انکار نہیں کریں گے لیکن پھر بھی شہاب نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اس بارے میں عدنان واسطی سے مشورہ لے لے..... بہر حال سارے کام خوش اسلوبی سے سرانجام پارہے تھے..... بیٹا واسطی کو کریم سوسائٹی کی کوٹھی میں چھوڑ کر شہاب نے رحمن علی شاہ کو ان لوگوں سے وصول کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور ایک گاڑی کا انتظام بھی کیا تھا اور اس وقت اس کے جسم پر ایک سیاہ لباس تھا اور چہرہ نقاب میں پوشیدہ..... ابھی وہ بیٹا کو بھی ڈبل او گینگ کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا اور ڈبل او گینگ کے افراد کو یہ کوٹھی نہیں دکھانا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے احکامات جاری کر دیئے تھے اور رحمن علی شاہ کو ایک مخصوص جگہ پہنچانے کی ہدایت کی تھی پھر وہ تیاریاں کر کے وہاں پہنچ گیا تھا جہاں ڈبل او گینگ کے ممبر رحمن علی شاہ کو لے کر پہنچنے والے تھے..... مقررہ وقت پر وہ لوگ رحمن علی شاہ کو لے کر پہنچ گئے..... رحمن علی شاہ کو ویگن سے اتار ا گیا..... شہاب نے شہنشاہ کی حیثیت سے انہیں احکامات جاری کر دیئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی جب ویگن وہاں پہنچی تھی تو اسی نے ٹارچ پر سگنل بھی دیا تھا..... وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈبل او گینگ کے وہ افراد جو رحمن علی شاہ کو لے کر یہاں آئے ہیں، شدید سنسنی کا شکار ہوں گے کیونکہ ابھی تک ایسا کوئی موقع نہیں آیا تھا جب انہوں نے شہنشاہ کو

”میرا نام بیٹا ہے۔“
”شہاب اور بیٹا..... چلے ٹھیک ہے لازمی امر ہے کہ میرا نام آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے۔“
”ہم آپ کو آپ کے نام سے مخاطب کر چکے ہیں رحمن علی شاہ صاحب۔“
”اور آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ اسکرپٹ تبدیل ہو گیا ہے اور اب اس کھیل کی تحریر کسی اور کی ہے؟“
”جی ہاں۔“
”کس کی؟“
”میری سمجھ لیجئے۔“
”تب پھر ضروری ہے کہ آپ کا مکمل تعارف ہو جائے۔“
”ابھی اتنا ہی رہنے دیجئے لیکن بس اتنا سمجھ لیجئے کہ جو کھیل آپ کے والد صاحب نے شروع کیا ہے میں اس کا اسکرپٹ پوری طرح تبدیل کر دینا چاہتا ہوں۔“
”لیکن اسکرپٹ رائٹر صاحب، آپ کا حدود اربعہ کیا ہے، کم از کم اتنا تو پتا چلنا چاہئے؟“
”اگر کوئی شخص آپ سے زبردستی مخلص ہو جائے اور آپ کے لئے کچھ کرنے پر آمادہ ہو تو آپ اسے کیا سمجھیں گے۔“
”بے وقوف۔“ رحمن علی شاہ نے فوراً جواب دیا اور بیٹا ہنس پڑی..... شہاب نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں سمجھنا تو آپ کو یہی چاہئے، لیکن رحمن علی شاہ صاحب اس دنیا میں کچھ بے وقوف ایسے ہوتے ہیں جو بہر حال اپنی حماقت کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں اور کسی کی مشکل پر کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں..... آپ فی الحال ہم دونوں کو بھی انہی بے وقوفوں میں تصور کر لیں۔“

”چلئے کر لیا لیکن کم از کم اب یہ تو بتا دیجئے کہ ہمارا اور آپ کا تعلق کیا ہے؟“
”میں رحمان علی شاہ صاحب، یوں سمجھ لیجئے کہ سرکاری طور پر آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”واہ کمال ہے بھی..... آپ کو پتا ہے کہ سرکار اس وقت کس کی ہے..... میرے والد

بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا خاصا خوب صورت نوجوان ہے۔“
”اس میں کوئی شک نہیں ہے سر لیکن ذرا سی تشویش کا شکار ہوں۔“
”کیا؟“

”کیا ہوش میں آنے کے بعد یہ ہم سے تعاون کرے گا؟“

شہاب نے ایک گہری سانس لے کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”دیکھتے ہیں کیا صورت حال رہتی ہے، ویسے ہم اسے اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کریں گے۔“ بیٹا خاموش ہو گئی..... یہ رات جاگنے کی رات تھی اور ان لوگوں نے اس کے لئے مکمل تیاریاں کر لی تھیں..... رحمن علی شاہ کو کوئی سواد و بجے ہوش آیا..... شہاب اور بیٹا وہاں موجود تھے..... کافی کا دور چل رہا تھا..... رحمن علی شاہ کی کراہ پر وہ دونوں اس کی جانب متوجہ ہو گئے اور چند لمحات کے بعد رحمن علی شاہ کو مکمل ہوش آ گیا..... چند لمحات وہ چھت کو گھورتا رہا..... پھر ادھر ادھر دیکھا اور اس کے بعد ان لوگوں پر نگاہ پڑتے ہی اُچھل کر بیٹھ گیا..... اب وہ اس پورے کمرے کے ماحول کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔
”یہ ہسپتال کا کمرہ تو نہیں ہے۔“ شہاب مسکراتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا..... بیٹا بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی تھی..... شہاب نے اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”جی رحمان علی شاہ صاحب، یہ ہسپتال کا کمرہ نہیں ہے۔“ رحمن علی شاہ چند لمحات عجیب سی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔
”کھیل میں کوئی تبدیلی پیدا کی جا رہی ہے کوئی اسکرپٹ لکھا گیا ہے؟“
”ہاں بات کچھ ایسی ہی ہے رحمن علی شاہ صاحب، لیکن اس بار اسکرپٹ رائٹر آپ کے والد امیر علی شاہ نہیں ہیں بلکہ تحریر بدل گئی ہے۔“

”آپ کون ہیں؟“

”میرا نام شہاب ہے۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر اور میڈم آپ؟“ رحمن علی شاہ مسکراتا ہوا بولا۔ اس نے اپنے ذہن پر قابو پا لیا تھا..... خاصے مضبوط اعصاب کا مالک معلوم ہوتا تھا۔

آپ کو سنبھال لیا اور مسکرانے لگا پھر آہستہ سے بولا۔
”ہم لوگوں نے گفتگو کا آغاز ہی غلط انداز سے کیا ہے..... پہلے تو میرے سوالات کا
سلسلہ شروع ہوتا ہے..... آپ لوگ کون ہیں..... یہ جگہ کون سی ہے..... کیا کلینک ہی کا
کوئی حصہ ہے یا میں وہاں سے ہٹ آیا ہوں اور اگر ہٹ آیا ہوں تو کس طرح کہ مجھے یہاں تک
پہنچنے کا علم نہیں ہو سکا..... جب کہ نہ تو میں بیمار ہوں اور نہ کسی اور ایسی کیفیت کا شکار.....
آرام سے اپنے بیڈ پر سویا تھا، یہاں آنکھ کھلی ہے..... دیکھئے نا انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ کوئی
فحص اپنے بارے میں کچھ بتانے سے پہلے وہ حالات جاننے کی کوشش کرے جو اس کے ذہن
میں واضح نہ ہوں براہ کرم آپ مجھے یہ تمام تفصیلات بتائیے تاکہ پھر میں آپ سے تعاون
کر سکوں، کیونکہ مجھے احساس ہو چکا ہے کہ آپ مجھ سے کچھ چاہتے ہیں۔“

شہاب نے خود کو سنبھال لیا اور پھر آہستہ سے بولا
”میرا نام شہاب ہے اور یہ میری ساتھی مس بیٹا ہیں..... یوں سمجھ لیجئے کہ ہم دونوں کا
تعلق سیوری کے ایک ایسے محکمے سے ہے جو بہر طور اپنے فرائض بھی پورے کرتا ہے اور
انسانیت کے راستے بھی ہموار کرتا ہے۔“
”بڑی مضحکہ خیز بات کہی ہے آپ نے۔“
”کیوں؟“ شہاب بولا۔

”میں سیوری ہی کا تو شکار ہوا ہوں کیا آپ کو یہ بات معلوم نہیں ہے..... ڈاکٹر نصرت
کبیر بے حد شریف انسان ہیں..... شاید وہ ایک لمحہ بھی مجھے اپنی قید میں رکھنا پسند نہیں کرتے
لیکن میرے والد کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ وہ تو ایک اجنبی آدمی ہے، اگر میں بھی
چاہوں تو اپنے باپ کے خلاف جنگ نہیں لڑ سکتا، آپ آخر ایسے کون سے محکمے سے متعلق
ہیں جو ان صاحب اختیار لوگوں کے زیر اثر نہیں آتا جو میرے والد کے ہمنوا ہیں۔“

شہاب نے آہستہ سے کہا۔ ”اصل میں یوں سمجھ لیجئے کہ ہم اس دور کے بے وقوف
لوگ ہیں اور ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم اپنی حماقتوں کا دائرہ محدود نہ رکھیں بلکہ جس قدر اسے
وسعت دے سکتے ہیں دیں اور حقیقی معنوں میں وہ کام کریں جو ہمارے فرائض میں داخل ہے
اسی بنیاد پر ہم لوگ کام کر رہے ہیں۔“

”کیا میرے والد کو آپ لوگوں کے بارے میں علم ہے؟“

جناب امیر علی شاہ صاحب کی..... بڑے اچھے تعلقات ہیں ان کے، بہت بڑے بڑے لوگوں
سے رابطہ ہے لیکن آپ نے بھی خاصی محنت کی ہے..... آخر مجھے کلینک سے یہاں تک لانے
میں آپ کو کام تو کرنا ہی پڑا ہوگا..... میرا خیال ہے میں آپ سے فضول باتیں کر رہا ہوں.....
چلئے پھر آپ ہی شروع ہو جائیے..... کیا ہے آپ کا اسکرپٹ مجھے سنائیے لیکن ذرا تفصیل کے
ساتھ..... ورنہ آپ کو اتنا تو علم ہوگا ہی کہ میں ایک ذہنی مریض ہوں اور کاٹ بھی سکتا
ہوں، پتھر بھی مار سکتا ہوں۔“ رحمن علی شاہ خاصی شگفتہ طبیعت کا مالک تھا۔

”آپ کا کہنا بھی کافی حد تک درست ہے مسٹر رحمن علی شاہ، لیکن آپ کو جو تمام
تفصیلات بتائی جائیں گی ان میں سے کچھ پہلو آپ کے لئے بڑے ڈکھوں کا باعث ہوں
گے..... کیا آپ ان ڈکھوں کو برداشت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں؟“

”میرے بارے میں اگر آپ تفصیل سے کچھ جانتے ہیں تو یہ سوال بے کار ہے، جو
شخص اپنی محبتیں کھو چکا ہو، جس کے وہ سہارے چھین چکے ہوں، جن سہاروں پر اسے پوری
زندگی کا انحصار کیا ہو اور اس کے باوجود اپنے آپ کو قابو میں رکھے ہوئے ہو، وہ اور کیا کر سکتا
ہے..... آپ مطمئن رہیں نہ میں جنونی قسم کا جذباتی ہوں اور نہ ہی میرے اندر اتنی ہمت ہے
اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں ایک ایسی جگہ قید رہا ہوں جہاں انسان اپنی مرضی ہی سے قید رہ سکتا
ہے..... میں کلینک سے بھاگنے کی کوشش بھی کر سکتا تھا اور اتنا بزدل یا کمزور بھی نہیں ہوں
کہ وہاں سے نہ نکل سکتا لیکن میں وہیں وقت گزارتا رہا ہوں جانتے ہیں کیوں؟ صرف اس لئے
کہ میں اپنے سہاروں کی تلاش میں تھا..... ماں، باپ زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتے
ہیں..... ذرا الٹی بات کہہ رہا ہوں، حالانکہ کہا یہ جاتا ہے کہ اولاد والدین کا سرمایہ ہوتی ہے
لیکن اولاد کے لئے بھی تو والدین کی یہی کیفیت ہوتی ہے..... میں وہ بد نصیب ہوں جو اپنے
اس سرمائے سے محروم ہو چکا ہوں اور خود میرے والدین مجھے نگاہوں سے گرا چکے ہیں.....
اس کے بعد بھلا کیا حیثیت رہ جاتی ہے میری، چنانچہ یہ سمجھ لیجئے کہ میں ایک بے حس اور
ناکارہ انسان ہو کر رہ گیا ہوں آپ کو کسی بھی طور مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے۔“ رحمن
علی شاہ کے الفاظ درد میں ڈوبے ہوئے تھے، جسے شہاب اور بیناد دونوں نے ہی محسوس کیا اور
دونوں ہی تھوڑے سے افسردہ ہو گئے۔

ایک لمحے کے لئے رحمن علی شاہ پر بھی ایک تاثر قائم ہو گیا تھا لیکن پھر اس نے اپنے

”تو پھر بہت سی باتیں آپ کو صبر و سکون سے سننا ہوں گی اور ہمیں ان کے سلسلے میں مطمئن کرنا ہوگا۔“

”آپ بہت سی گفتگو کر کے اپنے الفاظ ضائع کر رہے ہیں..... غیث بیگ کے بارے میں بتائیے۔“

”ہاں میں وہی بتا رہا ہوں..... یہ بات تو طے تھی کہ امیر علی شاہ صاحب کسی بھی قیمت پر غیث بیگ کی بیٹی ناہید کو اپنی بہو نہیں بنا سکتے تھے اس کا پس منظر کچھ بھی ہو، میں نہیں جانتا، لیکن آپ کی ضد نے حالات خراب کر دیئے اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ آپ کے علم میں ہوگا..... غیث کا بیٹا یاز بیگ ابھی تک امیر علی شاہ کی قید میں ہے اور امیر علی شاہ اس کے بل پر غیث بیگ کو زبان بندی پر مجبور کرتے رہتے ہیں، جوہر خان ناہید کی زندگی کا مالک بنا ہوا ہے..... کچھ عرصے قبل ایک شخص نے آپ سے ملاقات کی تھی..... وہ ایک مقامی ایڈووکیٹ عدنان واسطی تھے اور یہ ان کی بیٹی بینا واسطی ہیں..... یہ لوگ اپنے آپ کو نیک کاموں کے لئے وقف کر چکے ہیں..... ان کے ذریعے مجھے آپ کی یہ کہانی معلوم ہوئی اور ہم لوگوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ آپ کو اس مشکل سے نکال لیا جائے۔“

رحمان علی شاہ کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی اس نے آہستہ سے کہا۔
”کاش یہ ممکن ہوتا۔“

”ہم اسے ممکن بنانے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے۔“

”بات ابھی ختم نہیں ہوئی آپ مجھے بتائیے یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں مجھے کیسے لے آیا گیا ہے؟“

”ہم لوگوں نے اس سلسلے میں کام شروع کر دیا تھا، میں نے غیث بیگ صاحب سے بھی ملاقات کی..... ان کی بیٹی ناہید اور بیوی سکینہ سے بھی..... بہر طور وہ لوگ آج بھی اپنے بیٹے کے لئے پرامید ہیں اور یہ بات طے ہے کہ یاز بیگ ابھی تک امیر علی شاہ کے قبضے میں ہے..... پتا نہیں انہوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہو لیکن ہو سکتا ہے وہ زندہ ہی ہو۔“

”خدا کرے۔“ رحمان علی شاہ نے کہا۔

”بہر حال یہ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم نے ایک پروگرام بنایا اور آپ کو

”نہیں..... ہوگا بھی نہیں..... اگر علم ہوتا تو ہم آپ کو ڈاکٹر نصرت کبیر کے کلینک سے یہاں تک لانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔“

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے گردن ہلا کر کہا۔

”ہاں یہ تو میں مانتا ہوں لیکن معاف کیجئے گا کہ میرے دل و دماغ میں ایک ہلکا سا شبہ یہ بھی ہے کہ کہیں آپ لوگوں کے روپ میں میرے باپ نے اور کوئی نیا شوشہ نہ چھوڑا ہو۔ ممکن ہے امیر علی شاہ صاحب کے کچھ مفادات ایسے ہوں جن کا میرے ذریعے پورا ہونا ضروری ہو تو انہوں نے یہ نیا سلسلہ شروع کیا ہو..... اصل میں وہ مجھے قتل نہیں کرنا چاہتے کیونکہ بہر طور میرے والد ہیں..... مزید یہ کہ ماں پر مجھے اب بھی بھروسہ ہے..... میری ماں میرے باپ کی محکوم ہیں..... وہ ان کی مرضی کے خلاف ایک لفظ نہیں بول سکتیں اور سب کچھ میرے والد کے قبضہ قدرت میں ہے لیکن بہر طور ماں تو ماں ہی ہوتی ہے..... خیر چھوڑیے میں پتا نہیں کن اُلجھنوں میں پھنس گیا، آپ مجھے پہلے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیجئے گا تاکہ ذرا سا سکون ہو جائے۔“

”مختصر الفاظ میں اتنا تو ہم بتا چکے ہیں آپ کو کہ ہم آپ کے لئے سرگرداں نہیں ہوئے تھے بلکہ معاملہ غیث بیگ کا تھا۔“ شہاب نے کہا اور پہلی بار رحمن علی کے چہرے پر ایک تغیر نمودار ہوا وہ کسی قدر بے اختیار ہو گیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔

”اگر آپ غیث بیگ کے بارے میں جانتے ہیں تو کیا مجھے ان کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟“

”آپ یہ بتائیے کہ آپ کچھ پینا پسند کریں گے؟“

”اگر مجھے شربت سکون پلا دیا جائے تو آپ کا یہ احسان میں نہیں بھولوں گا اور آپ سے مکمل تعاون کروں گا۔“

”گویا یہ تفصیلات آپ کو بتادی جائیں..... ٹھیک ہے لیکن ایک وعدہ کرنا پڑے گا آپ کو..... آپ اپنی متحمل فطرت کا مظاہرہ کریں گے اور کوئی بھی جذباتی قدم اٹھانے کی بجائے صرف ہم سے تعاون کریں گے؟“

رحمن علی شاہ آہستہ سے ہنسا اور بولا۔ ”نہیں میں واقعی سچ کہہ رہا ہوں، میں شاید بزدل آدمی ہوں، جذباتی قدم نہیں اٹھا سکتا، یہ کمزوری نہ ہوتی میرے اندر تو شاید۔“

سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”میں سخت شرمندہ ہوں غیاث بیگ اور اس کے خاندان سے..... امیر علی شاہ میرے والد ہیں لیکن بڑے عالم انسان ہیں وہ..... انسانوں کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت کوئی قدر ہی نہیں ہے..... میرا دل اب ان کی طرف سے بالکل باغی ہو چکا ہے..... جو شخص اپنے بیٹے کے ساتھ یہ سلوک کر سکتا ہے دنیا کے ساتھ وہ کیا نہ کرتا ہوگا..... معافی چاہتا ہوں شاید میرے الفاظ غلط ہوں، مجھے اپنے آپ کو امیر علی کا بیٹا کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے اور نہایت افسوس ہوتا ہے بہر حال۔“

”اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایاز بیگ کو تلاش کرنے کی ذمہ داری آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔“ شہاب نے کہا اور رحمن علی چونک کر اسے دیکھنے لگا..... اس کی آنکھوں میں سوچ کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

کچھ دیر وہ خاموش رہا پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ ممکن ہو سکتا ہے، میں امیر علی شاہ صاحب کے ایسے خاص آدمی کو جانتا ہوں جو ان کے اس پہلو کی نگرانی کرتے ہیں، یقینی طور پر مجھے ایاز بیگ کے بارے میں ان سے معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔“

”اصل میں سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ ایاز بیگ کا پتا چل جائے اور ہم اسے بازیاب کرالیں اس طرح غیاث بیگ کی مصیبت بھی ٹل سکتی ہے، جہاں تک مسئلہ ناہید کا رہا تو اسے جوہر خان کے چنگل سے نکالنا مشکل کام نہیں ہوگا، یہ ذمہ داری ہم قبول کرتے ہیں لیکن وقت سے پہلے غیاث بیگ کو غائب کر دینے سے، امیر علی شاہ صاحب ہوشیار ہو سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے پھر ایاز زندہ حالت میں غیاث بیگ کو نہ مل پائے۔“

”نہیں خدا نہ کرے، بہت اچھا نوجوان ہے وہ، میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ وہ ذاتی طور پر کتنا نفیس انسان ہے..... آہ..... نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہوگا۔“

”تیسری بات یہ کہ آپ کی والدہ آپ سے تعاون کریں گی؟“

”میری ماں تو بڑی سمجھ لیجئے کہ بس مٹی کا بت ہے شوہر پرستی میں اس نے پوری زندگی گزاری ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ میرے لئے کس طرح غم زدہ ہوگی۔“

”اگر ممکن ہو سکے تو اپنی والدہ سے بھی اس بارے میں معلومات حاصل کیجئے، ہم آپ

یہاں لے آئے..... آپ کی جگہ ہم نے ایک ایسے شخص کو وہاں آپ کے کمرے میں منتقل کر دیا ہے جسے میک اپ کے ذریعے آپ کا ہم شکل بنادیا گیا ہے، یعنی اگر کوئی بھی یہ جانا چاہے کہ آپ کلیٹک میں موجود ہیں یا نہیں تو وہ غیر مطمئن نہیں ہوگا کیونکہ آپ کا ہم شکل آپ کا کردار بخوبی انجام دے گا۔“

رحمان علی شاہ کی آنکھوں میں دلچسپی کے آثار نمودار ہوئے اور اس نے آہستہ سے کہا۔

”اوہ ونڈر فل، ویسے کیا آپ کو اس بات کا علم ہے کہ میرا ایک بھائی فیاض علی یہیں ٹرم میں ہوتا ہے اور میری نگرانی کی ذمہ داری اسی کے سپرد کی گئی ہے؟“

”جی ہاں مجھے یہ بات معلوم ہے۔“

”اور یہ کون سی جگہ ہے؟“

”یہ میری اپنی رہائش گاہ ہے جہاں آپ کو نہایت احتیاط کے ساتھ ڈاکٹر نصرت کیر کے تعاون سے لے آیا گیا ہے۔“

”ابھی میری کچھ تصویر بنائی گئی تھیں، کوئی ایک آدھ دن پہلے کی بات ہے۔“

”جی ہاں وہ اسی سلسلے میں تھی کہ آپ کی تصویر کے ذریعے آپ کے ہم شکل کی ترتیب کی جاسکے۔“ اب رحمان علی شاہ کی آنکھوں میں مزید دلچسپی کے آثار پیدا ہو گئے تھے پھر اس نے کہا۔

”تو پھر اب..... اب آپ کا مزید پروگرام کیا ہے؟“

”دیکھئے سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ اپنی محبت کے کھونے کے بعد ذہنی طور پر کیا محسوس کرتے ہیں؟“

رحمان علی شاہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، پھر وہ بولا۔ ”میں نے اپنی محبت کھوئی کب ہے، ناہید آج بھی میرے وجود کا ایک حصہ ہے کوئی بھی انسان اپنے دل کا ٹکڑا جدا کر کے پھینک نہیں سکتا..... میرے والد نے اگر ظلم و ستم کے ذریعے ناہید کے وجود کو ایک بھیڑیے کے سپرد کر دیا ہے تو اس میں ناہید کا کوئی قصور نہیں ہے، اگر حالات مجھے موقع دیں اور میں ناہید کو واپس بھیڑیے کے چنگل سے نکال سکوں تو آپ یقین کیجئے کہ ایک پاکیزہ اور معصوم لڑکی کی حیثیت سے میں اسے ساری زندگی کے لئے اپنانے میں فخر محسوس کروں گا۔“

”ویری گڈ..... بہت بڑا مسئلہ حل کیا ہے آپ نے، دوسری بات یہ کہ ایاز بیگ کے

چاہتے ہیں تو پورے اعتماد کے ساتھ آپ مجھے اس کے لئے مخصوص کر لیجئے آپ تو میرے لئے سرگرداں ہیں اور میں اپنے لئے یہ سب کچھ کروں گا، اب اس سلسلے میں آپ جس قدر مختصر وقت میں اپنا کام شروع کر سکیں، کر ڈالیں..... امیر علی شاہ کے بارے میں مجھے اچھی طرح معلوم ہے وہ بہت اچھی پی آر رکھتے ہیں اور اپنا ہر کام با آسانی کرالیا کرتے ہیں..... ہم نے اگر انہیں سوچنے کا وقت دے دیا تو پھر یوں سمجھ لیجئے کچھ نہیں ہو سکتا، میں آپ کا موقف بھی سمجھ چکا ہوں اور آپ کی کارکردگی کا اندازہ بھی لگا چکا ہوں..... مجھے اب اس سلسلے میں آپ احکامات دیجئے کہ میں کیا کروں؟“

”ٹھیک ہے، میں صرف ذہنی طور پر آپ کو اپنے موقف کا قائل کرنا چاہتا تھا..... رحمن علی شاہ صاحب آپ بہت نارمل آدمی ہیں، جذبات سے کام لینے میں ہمیشہ نقصانات ہوتے ہیں، بالکل غیر جذباتی ہو کر اس سلسلے میں اقدامات کیجئے..... ہمیں ایک لائحہ عمل مرتب کر لینا چاہئے..... ویسے سچ بتا دوں مجھے امید نہیں تھی کہ آپ کا اس طرح تعاون حاصل ہو جائے گا۔ یہ آپ کی غیر معمولی سمجھ داری ہے کہ آپ نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھ کر یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے اس میں خاص دقت پیش نہیں آئی، بہر حال اب صورت حالت صرف یہ ہے کہ آپ کو شاہ پور روانہ ہونا ہو گا خاموشی کے ساتھ، میں آپ کو کچھ ایسے افراد مہیا کر دوں گا جو موجودہ حالت میں آپ کا تحفظ کریں گے، آپ سب سے پہلے اپنی والدہ سے ملے آپ کو یقینی طور پر اپنی حویلی کے وہ خفیہ راستے معلوم ہوں گے جہاں سے آپ اندر جاسکتے ہیں اور اگر ایسے راستے نہیں ہیں تب بھی آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ آپ کو تمام نگاہوں سے بچ کر ایاز بیگ کو تلاش کرنا ہو گا، چنانچہ میرا یہ خیال ہے کہ کل تک آپ اس کام کا آغاز کر ڈالئے، اگر گھر سے آپ کو اس بارے میں پتہ نہ چل سکے تو پھر آپ ان لوگوں کو دیکھئے جن سے آپ کو ایاز بیگ کے بارے میں معلوم ہو سکتا ہے، میرے کم از کم چار آدمی آپ کو ہر طرح کا تحفظ دیں گے۔“

”میں تیار ہوں، ایک سوال اور کر لوں؟“

”جی، جی فرمائیے؟“

”کیا، ناہید سے ایک بار مل سکتا ہوں؟“

”آپ ہزار بار ناہید سے ملے لیکن میرے خیال میں یہ قبل از وقت ہو گا..... وہ ذہنی

کو مکمل آزادی دیں گے، آپ اگر پسند کریں گے تو آپ کے ساتھ کچھ ایسے لوگوں کو بھی متعین کر دیا جائے گا جو آپ کی نگرانی اور حفاظت کریں گے، آپ کو یہ سارا کام اس انداز میں کرنا ہے۔“ رحمن علی شاہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔

”خدا کی قسم، مجھے زندگی کا خوف نہیں ہے، اصل میں میری فطرت میں محبت کا عنصر بہت زیادہ ہے، میں نے اپنے باپ پر گولی چلائی تھی اس وقت میں دیوانہ ہو گیا تھا، لیکن بعد میں بچھتا تار ہا ہوں، ہمیشہ بچھتا تار ہا ہوں کہ خدا خواستہ اگر گولی انہیں لگ ہی جاتی تو کیا ہوتا، وہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے اگر خود فنا ہو جائیں، تو بھی قسم کھا رہا ہوں کہ ذرہ برابر مجھے دکھ نہیں ہو گا۔ انسان کی گردن پر پاؤں رکھنے کا حق کسی انسان کو تو نہیں ہے، وہ کیوں اپنی دولت کے بل پر دنیا پر زندگی تنگ کئے ہوئے ہیں، انہیں اگر قدرت کی جانب سے سزا مل جائے گی تو مجھے خوشی ہو گی، بذات خود میں یہ اہلیت نہیں رکھتا اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ مجھ سے یہ کام لے لیں تو میں بخوشی اس کے لئے تیار ہوں، کیونکہ اس میں آپ کا نہیں، سارا مفاد میرا اپنا ہے۔“

”تو پھر یہ سمجھ لیجئے رحمن علی شاہ صاحب کہ آنے والے وقت میں ہمارے تعاون سے یہ سارا مسئلہ بغیر و خوبی حل ہو جائے گا۔“

”اگر آپ یہ سمجھتے ہیں تو آپ یہ بھی یقین کر لیجئے کہ میرا رواں رواں ہمیشہ آپ کا احساں مندر ہے گا، اگر آپ غیث بیگ کو اس مشکل سے نکال دیں، جہاں تک مسئلہ رہانا ہید کا تو وہ ایک مشرقی لڑکی ہے..... ہو سکتا ہے اب صورت حال یہاں تک پہنچ جانے کے بعد وہ جو ہر خانا کو چھوڑنا پسند نہ کرے تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا، میں تو اس سے محبت کرتا ہوں، محبت میں پانے کی طلب بھی ہوتی ہے لیکن دیوانگی کی حد تک نہیں، عنصر محبت ہی کا غالب ہونا ہے..... اگر وہ جو ہر خان کو پسند کرے گی اور اس سے نجات حاصل کر کے میرا قرب حاصل کرنا پسند نہیں کرے گی تو بخدا میں جو ہر خان کے لئے بھی اپنے تمام حقوق ترک کر سکتا ہوں۔“

نے عجیب سی نگاہوں سے شہاب کو دیکھا اور شہاب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں بیٹا سچی محبتوں کا یہ ہی پہلو سب سے عظیم ہوتا ہے۔“ بیٹا خاموش ہو گئی

تھوڑی دیر تک یہاں مکمل خاموشی طاری رہی، پھر رحمن علی نے کہا۔

”شہاب صاحب اس سلسلے میں آپ کے کیا نظریات ہیں، آپ نے مختصر جواب مجھے

بتایا ہے، اس سے زیادہ مجھے معلوم کرنے کی طلب بھی نہیں ہے، اگر آپ مجھ سے یہ کام

رجمان علی اپنی جگہ لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ دنیا سے اعتماد اٹھ گیا تھا..... اپنا گھر ماں باپ بہن بھائی، یہی تو محفوظ رشتے ہوتے ہیں۔ دوسرے رشتوں پر شک کیا جاسکتا ہے لیکن یہ رشتے ابھی مشکوک نہیں ہوئے۔ جہاں یہ رشتے مشکوک ہو جائیں وہاں بد قسمتی کی انتہا ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اتنا ہی بد قسمت سمجھتا تھا، بزدل یا کمزور نہیں تھا، لیکن دلیری کا مظاہرہ کرتا تو کس پر، باپ پر، بھائیوں پر، حالانکہ امیر علی شاہ نے جو کچھ کیا تھا وہ ایسا نہیں تھا کہ اس کے بعد وہ باپ بیٹے کے رشتے کو اولیت دیتا، سب کچھ چھین لیا تھا اس نے اپنی انا کی تسکین کے لئے، اتنا برا کیا تھا اس نے کہ اس کے بعد باپ کا تصور دل میں لا کر شرم محسوس ہوتی تھی، لیکن پھر بھی کبھی وہ یہ سوچتا تھا کہ اگر وقت نے اسے موقع دیا اور وہ اس جال سے نکل گیا تو باپ اور بھائیوں کے خلاف زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتا ہے، سب سے زیادہ غم تھا تو غیاث بیگ کی بربادی کا، ناہید کو اس سے محبت کی جو سزا ملی تھی، وہ تو جو کچھ تھی سو تھی ہی لیکن غیاث بیگ کی آنکھوں کی بینائی چھین لی گئی تھی اور اس کا بیٹا جس مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا اس پر رحمان علی شاہ کا دل بہت تڑپتا تھا۔ ادھر ڈاکٹر کبیر تھا ایک انتہائی شریف انسان جس پر الگ چٹا پڑی تھی اپنے باپ کو رحمان علی سے زیادہ اور کون جانتا تھا کہ اگر ڈاکٹر کبیر کسی بھی مشکل میں اس کے ساتھ کوئی رعایت کرے تو کتنی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا، لیکن اب جو صورت حال پیش آئی تھی، وہ مختلف محسوس ہوتی تھی، وہ ان لوگوں کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ ہیں کیا چیز، گفتگو بے شک ہوئی تھی، لیکن دنیا پر اعتبار نہیں رہا تھا اسے، وہ اس گفتگو کا پس منظر تلاش کرنا چاہتا تھا کون سا ایسا عمل ہے جس کی بنا پر یہ لوگ اس کے ہمدرد بنے ہیں۔ بہر حال اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ان

طور پر منتشر ہو جائے گی اور ویسے بھی ایک شخص اس پر مسلط ہے جس کا نام جوہر خان ہے اور جہاں تک ہم جوہر خان کے بارے میں معلوم کر سکتے ہیں وہ امیر علی شاہ صاحب کا خاص آدمی ہے سمجھ لیجئے بات بگڑنے کا اندیشہ ہوگا۔

”جی آپ ٹھیک کہتے ہیں، چلئے ٹھیک ہے، بہر طور میں خوش دلی کے ساتھ تیار ہوں۔“ شہاب نے گہری سانس لے کر گردن ہلائی اور بولا۔

”آپ کو صبح تک یہاں قیام کرنا ہوگا، کل کسی بھی شکل میں آپ کے شاہ پور روادار ہونے کے انتظامات کر دیئے جائیں گے۔“

”بے حد مناسب۔“ رحمن علی شاہ نے کہا پھر وہ اسے وہیں اسی کمرے میں آرام کرنے کا مشورہ دے کر باہر نکل آئے بیٹا مسکرا رہی تھی۔

”واقعی حالات حیرت انگیز طور پر ہموار ہو گئے ہمیں اس کی امید نہیں تھی۔“ شہاب پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا..... بیٹا بھی خاموش ہو گئی تھی..... دفعتاً شہاب نے چونک کر کہا۔

”آپ کو نیند تو نہیں آرہی بیٹا؟“

”نہیں..... کیا آپ کو ایسا محسوس ہوا ہے۔“

”مجھے محسوس ہونا چاہئے..... آپ کو ایک حد تک ہی پریشان کر سکتا ہوں میں۔“

بیٹا اسے دیکھ کر مسکرانے لگی، پھر بولی۔ ”جناب میری کوئی حد نہ مقرر کیجئے گا..... میں اعتراف کرتی ہوں کہ ابھی میں ایسی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکی ہوں جو آپ کو متاثر کرے لیکن مستقبل میں کچھ نہ کچھ ایسا ضرور کر کے دکھاؤں گی جس سے آپ کی نگاہوں میں اہمیت حاصل کر لوں۔“

شہاب نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا..... پھر بولا۔ ”آپ نے واقعی مجھے شرمندہ کر دیا..... اس کا اعتراف کرتا ہوں لیکن مس بیٹا، آپ کی کوئی حد نہیں ہے۔“

”تب پھر آپ ایسے کیوں سوچتے ہیں، مجھے نیند آئے گی میں آپ سے کہہ دوں گی۔“

”اوکے!“ شہاب نے کہا پھر دونوں نہ جانے کب تک بیٹھے آئندہ کے پروگرام پر بات کرتے رہے..... دونوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ ابھی بہت سے مشکل ترین کام باقی ہیں لیکن اپنے منصوبوں سے بہت پر امید تھے۔



”یہ آپ کے لئے لباس ہے، یہ کچھ رقم، اس کے علاوہ میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ آپ کے تحفظ کے لئے بھی میں نے بندوبست کر دیا ہے۔“

”کیا آپ سے یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ باقی سب کچھ کر لیجئے گا میرے تحفظ کا مسئلہ درمیان میں نہ لائیے، میں نہ تو بزدل ہوں نہ بے وقوف، اپنا پورا پورا خیال رکھوں گا۔“

”بہتر ہے، مجھے اس پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“

”تھک یو۔“ رحمان علی نے کہا اور پھر تمام تیاریوں کے بعد شہاب نے اسے خدا حافظ کہا اور باہر نکل آیا۔

دنیا کتنی عجیب و غریب لگ رہی تھی، حالانکہ بہت مختصر وقت ہوا تھا اسے، لیکن نجانے کیوں ایسا لگتا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں، سارا ماحول اجنبی اور نیا ہو، شاہ پور جانے والی کوچ میں بیٹھا وہ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ جہاں جا رہا ہے، وہاں بچپن سے جوانی تک کا ایک ایک لمحہ گزرا ہے اور ان لمحوں کی داستانیں بڑی عجیب و غریب ہیں، لیکن اب یہ یقین ہی نہیں آتا کہ ان کا خود اس کی ذات سے کوئی تعلق ہے۔

شاہ پور پہنچ گیا، ہر چیز جانی پہچانی تھی، لوگ بھی جانے پہچانے تھے، لیکن اب وہ محتاط ہو گیا تھا، جس شخص نے اسے آزادی دلا کر شاہ پور تک پہنچایا ہے اس کا مان رکھنا ضروری ہے، چنانچہ اس نے بنگلہ پوری کی طرف رخ کر لیا، بنگلہ پوری بنجر زمین کا علاقہ تھا، وہاں زیادہ تر جھاڑیاں وغیرہ اگی ہوئی تھیں اور اس زمین کو کاشتوں کے باوجود کاشت نہیں کیا جاسکتا تھا، اس زمین کی کہانی بھی عجیب تھی، قدیم زمانے کی داستانوں میں سے ایک، سنا جاتا تھا کہ یہ زمین کبھی بہت ہری بھری تھی اور سونا اُگلنے والی زمینوں میں تصور کی جاتی تھی، لیکن پرانے دور کے ایک زمیندار نے اس زمین کو اس کے اصل مالک سے چھین کر اپنی تحویل میں لے لیا اور اصل مالک کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد اس زمین پر کبھی کاشت نہ ہوئی اور ایک انوکھی داستان بن کر رہ گئی، یہ پرانی کہانی تھی اب بھی زمین جوں کی توں پڑی ہوئی تھی اور اس پر ایسے آثار نظر آتے تھے کہ جیسے کسی زمانے میں یہ بھی سرسبز ہوگی، دلوں کو دیرینہ کر دینے والے نجانے خود کس طرح اپنے گناہوں سے چھٹکارا پاتے ہیں، بہت سی ایسی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں یہاں موجود تھیں جو پرانے وقتوں کی یادگار تھیں، وہ انہی عمارتوں کا سہارا لیتا ہوا سفر کرتا رہا اور پھر ایک جگہ اس نے قیام کیا، حویلی میں داخل ہونے کے لئے رات کا وقت

سے تعاون کیا جائے، ہو سکتا ہے ایاز بیگ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو جائیں۔ ماں کا تصور بھی ذہن میں تھا۔ ابھی تک دل کو اس بات پر قرار تھا کہ ماں کو اس کی پتہ صحیح طور پر نہیں معلوم ہوگی اور وہ ضرور اس کے لئے تڑپتی ہوگی۔ باقی تینوں بھائی، وہ تو سنگدل تھے اور باپ کے ساتھ شانہ بشانہ اس کی مخالفت میں پیش پیش رہے تھے۔ غرضیکہ رحمان علی شاہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر کے ہی رہے گا۔

دوسرے دن شہاب، رحمان علی شاہ کے پاس پہنچ گیا، وہ اس کے لئے لباس لایا تھا اور ضرورت کا دوسرا سامان بھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے رحمان علی شاہ کو دیکھا اور کہا۔

”تمہاری آنکھوں کی ہلکی سی سرخی بتاتی ہے کہ رات کو بالکل نہیں سو پائے، فطری بات تھی کہ تم ہم دونوں کے بارے میں سوچتے رہے ہو گے۔ بہر حال کچھ بھی سوچو، لیکن دوست جب تک ہماری جانب سے تمہیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ ہم غلط لوگ ہیں اور کسی کے ایما پر کام کر رہے ہیں، ہم سے منحرف ہونے کی کوشش نہ کرنا، کیونکہ ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اگر تم منحرف ہو گئے تو ہمیں تو خیر شاید کوئی نقصان نہ پہنچے لیکن دوسرے چند افراد کو نقصان پہنچ جائے گا۔ تمہارے والد کے بارے میں ایسے الفاظ میں بالکل نہیں کہوں گا جو ان کی شان میں گستاخی کے مترادف ہوں لیکن وہ صاحب اختیار ہیں، جس پر بھی شبہ ہو گا اسی کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے اور اس سلسلے میں غیاث بیگ سب سے پہلا نشانہ بن سکتا ہے، کیونکہ یہ کھیل اسی کے گرد گھومتا ہے۔“ رحمان نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلائی اور بولا۔

”اصل میں مسٹر شہاب حقیقت یہ ہے کہ دنیا سے اتنا بد دل ہو گیا ہوں کہ اب اپنی ذات پر بھی اعتبار کرنے کو جی نہیں چاہتا، لیکن آپ مطمئن رہیں میری ذات سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔“

”اس بات سے میں بالکل مطمئن ہوں رحمان شاہ صاحب۔ بس فکر اس بات کی ہے کہ آپ جذباتی ہو کر اپنے طور پر کوئی غلط فیصلہ نہ کر بیٹھیں، اگر کوئی ایسا قدم اٹھانا پڑے جس کا میرے پروگرام سے کوئی تعلق نہ ہو تو براہ کرم مجھ سے مشورہ کر لیجئے۔“

”وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ چاہے زندگی سے ہاتھ دھوئے پڑیں آپ سے انحراف نہیں کروں گا، اس وقت تک جب تک کہ یہ یقین نہیں ہو جائے گا کہ میں دلدل میں پھنس چکا ہوں۔“

کوشش کرتا یا پھر گلزار علی شاہ کے سامنے ہی آجاتا لیکن حاضر دماغ انسان تھا، بھاگنے کی کوشش پر اگر گلزار علی شاہ شور مچا دیتا تو حویلی کے اور بھی بہت سے افراد نکل کر اس کا پیچھا کرتے اور کہیں نہ کہیں اسے گھیر لیا جاتا۔ یہ تو بعد کی بات تھی کہ ملازم اس کی اصلیت سے واقف ہوتے، چنانچہ اس نے ایک دم ایک بہترین ترکیب پر عمل کیا۔ پھر اے ہوئے نقوش کے ساتھ وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا گلزار علی شاہ کے سامنے سے گزر گیا۔ اس نے گردن میں نہیں موڑی تھی، ایک پتھر لایا ہوا سانداز اسے کسی غیر حقیقی مخلوق کی شکل میں پیش کر رہا تھا۔ اس نے چال کو بھی ایسا ہی رنگ دے دیا تھا جیسے اس میں زندگی کا وجود تک نہ ہو۔ گلزار علی شاہ کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا لیکن راہداری کا دوسرا موڑ گھومتے ہی رحمان علی شاہ نے برق رفتاری سے دوڑ لگا دی، اسے اپنے عقب میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تب ہی اسے وہ کھڑکی نظر آگئی جو اس کے باپ کی خواب گاہ کی کھڑکی تھی اور جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ گلزار علی شاہ کی نگاہوں سے بچنے کے لئے اس وقت یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ اس کھڑکی میں داخل ہو جائے اور اس نے اس سے گریز نہیں کیا۔ ہر طرح کا خطرہ مول لے چکا تھا وہ۔ ہو سکتا ہے اب اس کا سامنا امیر علی شاہ سے ہو جائے، لیکن تقدیر نے یہاں ساتھ دیا۔ امیر علی شاہ غسل خانے میں تھا اور غالباً وہاں کی روشنی بچھا کر باہر آہی رہا تھا اتنی دیر میں رحمان علی شاہ اس کی مسہری کے نیچے ریگ گیا اور چپت ہو کر ساکت ہو گیا۔ اس نے اپنے باپ کے پاؤں دیکھے جو آہستہ آہستہ مسہری کی جانب آرہے تھے، امیر علی شاہ مسہری پر آکر بیٹھ گیا لیکن اسی وقت اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور وہ چونک پڑا اپنی جگہ سے اٹھا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ رحمان علی شاہ سانس روکے باہر کی آہٹیں سن رہا تھا، اگر اس کا اندازہ غلط نہیں تھا تو یہ گلزار علی شاہ ہی ہو سکتا تھا، ہانپ رہا تھا اور اس کے گہرے گہرے سانسوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ امیر علی شاہ نے اس سے پوچھا تھا۔

”کیا بات ہے؟“

”باباجانی..... باباجانی۔ میں نے۔ میں نے رحمان علی شاہ کو دیکھا ہے؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟ اندر آؤ، دروازے میں کیوں کھڑے ہو۔“ امیر علی شاہ کی بھاری آواز سنائی دی۔

کر بتا سکتی ہو کہ ایاز بیگ کہاں ہے؟“

”اگر وہ اس کے بارے میں جانتے ہیں تو کبھی نہیں بتائیں گے، لیکن مجھے یقین ہے کہ خیر خان اور گل باز اس بارے میں ضرور جانتے ہوں گے وہ تو اس کے دست و بازو ہیں، میر نے ان سے بھی پوچھا کہ میرا رحمان کہاں ہے وہ بھی نہیں بتاتے، آہ میں کس سے پوچھوں کس سے معلوم کروں۔“ وہ دوپٹہ آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی، رحمان علی شاہ کا اندازہ ہو گیا تھا کہ معصوم عورت کو واقعی اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے، اسے مضطرب اور بالکل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا، چنانچہ جیسے ہی اس نے آنکھوں پر دوپٹہ رکھا وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے ہٹا اور اونچی مسہری کے نیچے داخل ہو گیا تاکہ وہ اسے خواب ہی سمجھتی رہے اور اس کا وجود مضطرب نہ ہو، ماں چند لمحات روتی رہی اور پھر اس نے جب اسے اپنے سامنے پایا تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر مسہری پر لیٹ گئی، اب اس کے بعد رحمان علی شاہ کا یہاں رہنا مناسب نہیں تھا، وہ ایک مشن پر آیا تھا اور کسی جذباتی کیفیت کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب غم زدہ عورت تھوڑا سا سکون پاگئی اور نیم غنودگی کی کیفیت کا شکار ہو گئی تو وہ خاموشی سے اپنی جگہ سے نکلا اور بے آواز چلتا ہوا اس کھڑکی تک پہنچ گیا جہاں سے وہ باہر نکل سکتا تھا۔ ایسی کھڑکیاں اس حویلی کی ہر خواب گاہ میں موجود تھیں۔ نجائے امیر علی شاہ اس طرح کی کھڑکیاں کیوں تعمیر کرائی تھیں، شاید اس لئے کہ متبادل دروازہ موجود رہے لیکن ایک طرح سے یہ کھڑکیاں مخدوش بھی تھیں، اگر صحیح طور پر بند نہ کی جاتیں تو انہیں کوئی بھی خواب گاہ کے بیرونی دروازے کے متبادل استعمال کر سکتا تھا لیکن ایسی کھڑکیاں اس وقت رحمان علی شاہ کے لئے بڑی کار آمد ثابت ہوئی تھیں..... وہ انہیں کھولنے کا صحیح طریقہ بھی جانتا تھا کیونکہ اسی حویلی کا ایک فرد تھا۔ راہداری میں پہنچنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ماں سے ملاقات ہوئی تھی۔ خیر خان اور گل باز اس کے اپنے ذہن میں بھی تھے۔ یہ امیر علی شاہ کے وہ دو خاص ملازم تھے جو اس کے بالکل خفیہ کام کیا کرتے تھے اور نہایت قریبی رازدار تصور کئے جاتے تھے۔ کسی مناسب جگہ رک کر اب رحمان علی شاہ دوسرے فیصلے کرنا چاہتا تھا۔

راہداری کے موڑ کے دوسری جانب نکلا ہی تھا کہ اچانک بائیں سمت بنے ہوئے کمرے کے دروازے سے گلزار علی شاہ باہر نکل آیا۔ جگہ ایسی تھی کہ رحمان یا تو پلٹ کر بھاگنے

”تم کیا چیز ہو گلزار علی شاہ۔ اس دور میں روحوں کی بات کرتے ہو۔“

”کچھ نہ کچھ تو ہوا ہے بابا جانی۔“

”مجھے تو صرف ایک کام لگتا ہے۔ وہ یہ کہ تمہارا دماغ اپنی جگہ سے کھسک رہا ہے۔“

”میری بات مان لیجئے۔ ہو سکتا ہے میں غلطی پر نہ ہوں۔“

”میں کیا کروں یہ بتاؤ؟“

”اے اے تلاش کرائیے، اے تلاش کرائیے بابا جانی۔“

”اور اگر وہ نہ ملا تو؟“

”کوشش تو کر لی جائے بابا جانی۔“

”ٹھیک ہے یہ کوشش تم بھی کر سکتے ہو۔ میں تمہیں اجازت دے رہا ہوں۔“

”جی بابا جانی۔“

”جادو اور اس کوشش کے نتیجے سے مجھے آگاہ کرو۔“ امیر علی شاہ نے کہا اور گلزار علی شاہ گردن جھکائے باہر نکل گیا پھر اس کے بعد بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں یہاں تک آتی رہیں اور امیر علی شاہ غالباً اپنی مسہری پر بیٹھا گلزار علی شاہ کی شاندار کارروائیوں کا انتظار کرتا رہا تھا۔ تقریباً پینتالیس منٹ تک یہ بھاگ دوڑ جاری رہی اور اس کے بعد امیر علی شاہ اپنی مسہری سے نیچے اتر آیا، دروازے پر پہنچا اور صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا پھر غالباً گلزار علی شاہ اور شاد علی شاہ دونوں ہی ساتھ ساتھ کمرے میں آئے تھے۔ امیر علی شاہ کی آواز ابھری۔

”یہ شاد علی کو گرفتار کیا ہے تم نے؟“

”بابا جانی، یہ میرے ساتھ اس کی تلاش میں شریک تھا۔“

”شاد علی۔ تم نے بھی رحمان علی شاہ کی روح کو دیکھ لیا؟“

”نہیں بابا جانی میں نے تو نہیں دیکھا، لیکن جس طرح گلزار بھائی اس بارے میں

رہے ہیں بابا جانی، اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ

سے بھی یہ بات کہی ہے کہ انہوں نے اسے دیکھا ہے۔“

”دیکھا ہے دیکھا ہے تو پھر گرفتار کیوں نہیں کیا اس کو، مطلب ہے کہ اگر کوئی شخص

ہماری حویلی میں داخل ہو جائے تو اسے گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔“

”بابا جانی۔ ع۔ خدا کی قسم وہ رحمان علی شاہ ہی تھا۔ بابا جانی۔ وہ۔۔۔۔۔ وہ یوں لگتا

جیسے کوئی روح سفر کر رہی ہو، بابا جانی میں نے اسے راہداری میں دیکھا تھا۔“

”کیا نشے میں ہو۔ امیر علی شاہ بھاری آواز میں بولا۔“

”میں آپ کی قسم کھاتا ہوں بابا جانی بالکل نشے میں نہیں ہوں میں، پورے ہوش،

حواس میں ہوں۔ اپنے کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ میں نے رحمان علی کو دیکھا۔ سیدھا سید

چلا جا رہا تھا اور بابا جانی میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے گردن گھما کر بھی میری

جانب نہیں دیکھا اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ چہرہ سامنے کی طرف تھا اور وہ اس طرف

چلا جا رہا تھا جیسے وہ کوئی زندہ انسان ہی نہ ہو۔“

”کیا بکواس کرتے ہو۔“

”بابا جانی میں جھوٹ نہیں بول رہا آپ میری بات کا یقین کیجئے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ پھر کیا ہوا؟“

”پھر ایک لمحے کے لئے تو میں بابا جانی سکتے میں رہ گیا تھا، لیکن جب مجھے سنگین صور

حال کا احساس ہوا تو میں نے دوڑ لگائی اور اس کے بعد میں نے اس کا نشان نہیں پایا۔“

”نشان نہیں پایا؟“

”ہاں بابا جانی۔“

”تو کیا وہ ہوائیں تحلیل ہو گیا؟“

”بابا جانی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”بابا جانی آپ مجھ پر یقین کر لیجئے ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ یقین کریں بابا جانی

میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”دیکھو میں ایسی فضول باتوں پر یقین نہیں کرتا اور تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا۔ کیا وہ

کیا وہ؟“

”بابا جانی خدا کے لئے آپ کچھ کیجئے۔ معلوم تو کیجئے اس کے بارے میں۔ وہ کیا۔۔۔۔۔

وہ۔۔۔۔۔ کیا وہ وہاں سے نکل بھاگا ہے۔ کیا ہوا ہے کیا بات ہے کیا وہ بابا جانی مر چکا ہے

اس کی روح نے ادھر کا رخ کیا ہے؟“

علی شاہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ شہاب نامی شخص نے جو اچانک ہی حیرت ناک طریقے سے اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا تھا اس کا ہم شکل بنا کر ہسپتال میں رکھ چھوڑا ہے، نجانے اس سلسلے میں اس نے کیا کیا کارروائیاں کی ہوں گی، ورنہ ڈاکٹر کبیر اس کے لئے آسانی سے تیار تو نہ ہوا ہوگا۔ بہر حال اب تو جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس سلسلے میں آخری کاوشیں کرنا ضروری ہیں چاہے کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑے۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ لیٹا رہا، بس یہ دعا کر رہا تھا کہ کوئی ایسی تحریک نہ ہو جائے جس کی بنا اس کی موجودگی کو یہاں محسوس کر لیا جائے۔



برائی خون سے منتقل ہوتی ہے۔ یہ کوئی ایسی منطق نہیں جس پر مکمل بھروسہ کر لیا جائے۔ انسان کی اپنی فطرت ہی حقیقت ہوتی ہے ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ ولی کے گھر شیطان اور شیطان کے گھر ولی پیدا ہو جاتا ہے۔

امیر علی شاہ خود کوئی اچھا انسان نہیں تھا لیکن اس کے بیٹوں کی فطرت میں بھی تضاد تھا البتہ یہ ممکن ہے کہ رحمان علی شاہ کے دل میں اگر محبت کا گداز نہ پیدا ہو جاتا تو ممکن ہے وہ بھی اپنے بیٹوں بھائیوں کی مانند ہی ہوتا۔ گلزار علی شاہ، شاد علی شاہ اور فیاض علی شاہ تقریباً یکساں فطرت کے مالک تھے بس رحمان علی شاہ ہی ذرا مختلف ہو گیا تھا اور اگر نہ ہوتا تو وہ بھی بھائیوں میں مقبول ہوتا۔ ان بیٹوں بھائیوں میں کافی یگانگت تھی جبکہ رحمان علی شاہ کے لئے ان کے دل میں محبت کا کوئی جذبہ نہیں تھا، پھر اس وقت سے تو ان کے دلوں میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا تھا جب رحمان علی شاہ نے شدت جوش میں آکر باپ پر فائرنگ کر ڈالی تھی۔ بہر حال یہ لوگ اب بھی باپ کا احترام کرتے تھے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ابھی باپ کی وجہ سے انہیں بہترین عیش و عشرت حاصل تھے۔ فیاض علی شاہ شہر آگیا تھا اور اس نے یہاں ایک بڑے کاروبار کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ مکمل طور پر اسے امیر علی شاہ کی پشت پناہی حاصل تھی اور شہر میں وہ ایک پروقار اور با اختیار شخصیت کا حامل تھا۔ عیش و عشرت کی زندگی اس کے قدموں میں تھی۔ باپ کی دی ہوئی مراعات سے صحیح معنوں میں فیاض علی شاہ ہی فائدہ اٹھا رہا تھا۔ شاد علی اور گلزار علی تو پھر بھی باپ کی تحویل میں تھے اور اس طرح انہیں کھل کھیلے تھے جس طرح فیاض علی شاہ نے شہر میں رونق لگا رکھی تھی لیکن اچھی طرح جانتا تھا کہ امیر علی شاہ کے احکامات کی آنکھیں بند کر کے تعمیل کرنا ہی اس عیش و عشرت کی

”بابا جانی اب کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے۔“
”ٹھیک ہے کیا کرنا چاہتے ہو مجھے بتاؤ۔“
”میرے خیال میں ابھی اور اسی وقت فیاض علی شاہ کو فون کیا جائے اور ان سے کہہ دیا جائے کہ وہ فوراً اس بات کی تحقیقات کریں۔ فوراً دیر نہ کی جائے۔“

”ہوں۔ ٹیلی فون اٹھاؤ۔“ امیر علی شاہ نجانے کیوں اس اقدام کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ ٹیلی فون اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا گیا اور اس کے بعد امیر علی شاہ نے نمبر ملا یا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسری طرف سے آواز سنائی دی تھی جس کے جواب میں امیر علی شاہ نے کہا۔

”تمہیں ابھی اور اسی وقت ایک کام کرنا ہے۔“ چند سیکنڈ انتظار کے بعد اس نے کہا۔ ہار ہسپتال چلے جاؤ اور رحمان علی شاہ کو چیک کرو۔ فوراً چیک کرو۔ تمہارے بھائیور کا خیال ہے کہ وہ ہسپتال سے بھاگ نکلا ہے لیکن دیر نہیں ہونی چاہئے ابھی اور اسی وقت.....“ اور اس کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔

”تم لوگوں پر جو دیوانگی طاری ہوئی ہے، میں اس سے اتفاق نہیں کرتا لیکن اسے باوجود اگر ایسا ہو چکا ہے تو پھر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ اب ہم اس کے سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟“
”بابا جانی اس کا وہاں سے فرار ہو جانا ہمارے لئے بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔“
”ابھی تو اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔“

”انسان کے ذہن میں کبھی اور کسی وقت بھی بہت سے خیالات آسکتے ہیں۔“
”اچھا اچھا ٹھیک ہے اب فیاض علی شاہ کی طرف سے جو کچھ بھی رپورٹ موصول مجھے اس کے بارے میں فوری طور پر اطلاع دینا۔“
”جی بابا جانی۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے کمرے میں ہی فیاض بھائی جواب کا انتظار کریں۔“

”میری بھی نیند خراب کرنا چاہتے ہو؟“
”بابا جانی مسئلہ ہی ایسا ہے۔ معافی چاہتے ہیں ہم۔“
”ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو۔“ امیر علی شاہ نے کہا اور مسہری کے نیچے ہوئے رحمان علی شاہ نے سوچا کہ اب کم از کم اس وقت تک یہاں سے گلو خاصی نہیں ہو جب تک کہ فیاض علی شاہ کی طرف سے اس سلسلے میں جواب موصول نہ ہو جائے۔

”بس اس وقت آرام سے اپنی خواب گاہ میں لیٹا ہوا تھا کہ اچانک ذہن پر خفقان طاری ہوا اور یہ خفقان کچھ ایسی شدت اختیار کر گیا کہ میں اسے دیکھنے کے لئے دوڑ پڑا۔ آئی ایم سوری ڈاکٹر۔ یہ وقت ایسا نہیں کہ مریضوں کو تکلیف دی جائے بس ایک نگاہ دیکھنا چاہتا ہوں اسے اگر آپ کی اجازت ہو تو؟“

”کیوں نہیں کیوں نہیں آپ حکم دیجئے۔ میں حاضر ہوں۔“

”بس ایک نگاہ دکھا دیجئے اسے..... میں کسی بھی طور اسے پریشان نہیں کروں گا۔“

”براہ کرم تشریف لائیے۔“ ناصر حسین نے کہا اور فیاض علی اس کے ساتھ چل پڑا۔ چند لمحات کے بعد ناصر حسین اسے لئے ہوئے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا اور بے آواز دروازہ کھول دیا پھر اس نے فیاض علی کو اشارہ کیا۔ بستر پر رحمان علی شاہ پر سکون نیند سوراہا تھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت طاری تھی اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ فیاض علی نے بغور اس کا جائزہ لیا اور اس کے دل میں غصے کی کیفیت اُبھر آئی، جانے ان لوگوں پر کیا وحشت سوار ہوئی۔ وہ تو آرام کی نیند سوراہا ہے اس نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر آنکھ کے اشارے سے ڈاکٹر ناصر حسین کو باہر نکل آنے کے لئے کہا۔ باہر نکل کر اس نے اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

”بھائی بھی کیا چیز ہوتا ہے ڈاکٹر ناصر حسین، اسے دیکھ لیا دل کو سکون ہو گیا۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں اور اس وقت تکلیف دینے کے لئے معذرت خواہ بھی۔“

”نہیں جناب ہم آپ سے بہتر تعاون کرنے کے خواہش مند ہیں۔ آپ براہ کرم جب بھی کوئی حکم دیں اس میں تکلف نہ کیجئے گا۔“ فیاض نے ایک بار پھر ناصر حسین کا شکریہ ادا کیا اور باہر آکر اپنی کار میں بیٹھ گیا، گھر واپس آتے ہوئے اس پر جھلاہٹ سوار تھی بلاوجہ ان لوگوں نے اسے بھی تنگ کیا اور اس کے ذریعے دوسرے لوگوں کو بھی۔ گھر پہنچنے کے بعد اس نے ٹیلی فون پر شاہ پور رابطہ قائم کیا اور رابطہ قائم ہونے پر بولا۔

”کون..... کون بول رہا ہے؟“

”شاد علی.....“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کیا کر رہے ہو تم لوگ؟“

”بابا جانی کے کمرے میں جمع ہیں۔“

ضمانت ہے، ورنہ باپ ان سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ رحمان علی شاہ کے لئے فیاض کے دل میں بھی کوئی محبت بھرا جذبہ نہیں تھا، اگر ایسا ہوتا تو بھائیوں میں سے ہی کوئی باپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ وہ سب ہی باپ کے فیصلے سے متفق تھے۔ نہ صرف متفق تھے بلکہ انہوں نے اس سلسلے میں باپ کی معاونت بھی کی تھی۔ چنانچہ رات کے اس حصے میں جب فیاض علی شاہ کو گلزار علی شاہ کا فون موصول ہوا اور اس نے ایک عجیب و غریب انکشاف کیا تو فیاض علی بھی حیران رہ گیا۔ بہر حال فوری تحقیق ضروری تھی چنانچہ تیاریاں کر کے نکل پڑا۔

ڈاکٹر کبیر کے کلینک کے بارے میں اسے مکمل تفصیلات معلوم تھیں نہ صرف تفصیلات معلوم تھیں بلکہ وہ یہاں حالات کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا اور ڈاکٹر کبیر سے زیادہ واسطہ اسی کار ہا کرتا تھا، چنانچہ فوری طور پر چل پڑا۔ جانتا تھا کہ اس وقت ڈاکٹر کبیر کے ماتحت بھی اس سے اچھی طرح واقف تھے اور اس کی شخصیت کو اچھی طرح تسلیم کرتے تھے۔ جس وقت وہ کلینک میں داخل ہوا تو ڈیوٹی پر ڈاکٹر کبیر کا ایک ماتحت ناصر حسین موجود تھا۔ فیاض علی نے اس سے رابطہ قائم کیا اور ناصر حسین نے اس کا پر جوش خیر مقدم کیا۔

”سر آپ اس وقت خیریت، طبیعت وغیرہ تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں ڈاکٹر طبیعت وغیرہ تو ٹھیک ہے بس بعض اوقات تھوڑا سا ذہنی بحران کا شکار ہو جاتا ہوں۔“

”براہ کرم تشریف رکھئے۔ وہ ذہنی بحران کیا ہے؟“ ڈاکٹر ناصر حسین نے ہمدردی سے پوچھا۔

”آپ جانتے ہیں کہ میرا بھائی دماغی مریض کی حیثیت سے ہسپتال میں داخل۔ اور ڈاکٹر کبیر اس کا علاج کر رہے ہیں۔“

ناصر حسین نے سنجیدگی سے گردن ہلائی۔ تھوڑی بہت حقیقت سے وہ بھی واقف تھا ”محبت تو فطرت کا ایک حصہ ہوتی ہے ڈاکٹر کبھی کبھی مجھ پر بحران طاری ہو جاتا ہے۔“

بھائی کا تصور اس طرح ذہن پر چھا جاتا ہے کہ سکون پانا مشکل ہو جائے۔ ایک نگاہ دیکھوں اسے تو تسلی ہو جاتی ہے۔

”کیوں نہیں..... خون خون ہوتا ہے۔“ ناصر حسین نے بحالت مجبوری گردن ہلائی

بارتاک میں تحریک ہوئی اور چھینک آتے آتے بچی۔ اگر اسے چھینک آجاتی تو سارا کھیل یہیں ختم ہو جاتا۔ بہر حال ایک ایک لمحہ کنھن گزرا تھا اور اس نے اپنے آپ کو پوری طرح مستعد اور چاق و چوبند رکھا تھا، پھر دوسری طرف سے ٹیلی فون پر جو گفتگو ہوئی اس کا لب لباب اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ شخص واقعی بے حد چالاک تھا جس نے اچانک ہی اس کی مدد پر کمر باندھ لی تھی۔ اس نے رحمان علی شاہ کو بتا دیا تھا کہ اس کا ہم شکل ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے تاکہ اگر کوئی اس کے بارے میں تحقیق کرنا چاہے تو اس کی تسلی ہو سکے اور پہلے ہی مرحلے پر یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اس چالاک شخص نے جو کارروائی کی ہے اس کا کیا نتیجہ نکلا پھر رحمان علی شاہ باپ کی جانب سے گلزار اور شاد علی کو جھاڑیں پڑتے سنتا رہا اور اس کے بعد امیر علی شاہ نے ان دونوں کو کمرے سے نکال دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ ہوش و حواس قائم رکھ کر اس کے سامنے آیا کریں۔ وہ بے سکی باتوں کو پسند نہیں کرتا۔ بہر حال اب بھی صورت حال مخدوش ہی تھی حالانکہ امیر علی شاہ لائٹ بجھا کر بستر پر لیٹ گیا تھا لیکن کیا کہا جاسکتا ہے کہ اسے نیند آئی گئی ہو۔

ادھر رحمان علی شاہ کی آنکھوں میں بھی کڑواہٹ پیدا ہونے لگی تھی لیکن یہ احساس اسے ہوشیار کر دیتا تھا کہ وہ جس کیفیت میں ہے اس سے بڑا محتاط رہنا ضروری ہے ایک لمحے میں کھیل بگڑ سکتا ہے۔ بہر حال یہ رات اس کے لئے آرام کی رات نہیں تھی پھر جب امیر علی شاہ کے خرائے بلند ہونے لگے تو اسے سکون ہوا۔ یہ بھی ایک اچھی بات ہے کہ امیر علی شاہ ہمیشہ سوتے میں خرائے لینے کا عادی ہے اس کی نیند کا تو پتا چلا۔ پھر انتہائی محتاط انداز میں وہ اس کھڑکی کے ذریعے باہر آگیا تھا لیکن امیر علی شاہ کے کمرے سے نکلتے ہوئے، دیوار پر لگے ہوئے چمڑے کے خوفناک ہنٹر کو وہ ساتھ لینا نہیں بھولا تھا۔ امیر علی شاہ اس ہنٹر سے اپنے بہت سے معتبوں کی کھالیں اتار چکا تھا اور آج یہ ہنٹر رحمان علی شاہ کے ہاتھ میں آگیا تھا اس نے اسے کمرے سے لپیٹ کر اس طرح بل دے لئے کہ وہ کھل نہ سکے اور اب اس کے بعد حویلی چھوڑ دینا ہی سب سے مناسب تھا، کیونکہ وہ شک دوبارہ ذہنوں میں جاگ سکتا تھا جو کچھ دیر کے لئے رحمان علی شاہ کو مصیبت میں گرفتار کر چکا تھا۔ یہ ہنٹر اس نے گل بازار اور خیر خان کے لئے لیا تھا۔ نوجوانی کی زندگی میں اس نے بھی ایک زمیندار کے نوجوان بیٹے کی حیثیت سے تھوڑے بہت اقدامات کئے تھے اور اس کی فطرت میں بھی سرکشی اور خود سری تھی لیکن اتنی

”بابا جانی کہاں ہیں؟“

”موجود ہیں۔“

”ریسیور انہیں دو۔ فیاض علی نے کہا اور چند لمحات کے بعد ریسیور پر امیر علی شاہ کی آواز سنائی دی۔“

”ہاں فیاض۔ کیا رہا، ہسپتال سے بول رہے ہو؟“

”نہیں بابا جانی..... گھر سے بول رہا ہوں۔“

”کیا ہوا، ہسپتال گئے تھے؟“

”وہیں سے واپس آ رہا ہوں۔“

”وہ وہاں موجود ہے؟“

”آرام کی نیند سو رہا ہے بابا جانی۔“

”کیا؟“

”آرام کی نیند سو رہا ہے وہ، میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں مگر بابا جانی بات

میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ لوگوں پر اس قدر خوف و دہشت کیوں طاری ہے؟“

”خوف مجھ پر سوار نہیں ہے۔ یہ گلزار جاگتے میں خواب دیکھنے لگا۔ بلاوجہ سب پریشان کر کے رکھ دیا ہے، آدھی رات گزر چکی ہے اور میں کہتا ہوں گلزار تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ امیر علی شاہ نے فون بند کئے بغیر کہا۔

”بابا جانی ان لوگوں کو سمجھائیے، وقت کی ایک حیثیت ہوتی ہے۔ میں آرام کی نیند سو رہا تھا آپ لوگوں نے نہ صرف مجھے پریشان کیا بلکہ ڈاکٹر بھی میرا مذاق اڑا رہے ہوں گے۔“

”تو نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے؟“

”بابا جانی میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں آپ کہیں تو ڈاکٹروں سے اس کا سرٹیفکیٹ دلوادوں اور اس کے علاوہ میرا دماغ بھی ٹھیک ہے۔“

”گرم مت ہو بھی، یہ ساری گلزار کی بے وقوفی ہے چل آرام سے سو جا۔“ دوسری طرف سے آواز آئی اور فیاض علی شاہ نے جھٹک کر ٹیلی فون بند کر دیا۔



بڑا صبر آزما وقت گزرا تھا۔ وہ انتہائی مخدوش حالت میں مسہری کے نیچے پڑا رہا تھا۔

باز کی آواز سنائی دی۔

”کون ہے کیا بات ہے، کیوں دروازہ توڑ رہے ہو؟“

”دروازہ جلدی کھولو خاناں، میں شاہ صاحب کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“ رحمان شاہ نے آواز بدل کر کہا۔ شاہ صاحب امیر علی شاہ کو ہی کہا جاتا تھا، اس کے نام پر دروازہ ایک دم کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا گل باز خان تھا لیکن سر کی زوردار ٹکڑ سے وہ الٹ کر پیچھے جا کر اور رحمان علی شاہ نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا، گل باز خان بھی اچھا خاصا طاقت ور آدمی تھا اور فطرتاً جتنگجو بھی، سینے پر لگنے والی زوردار ٹکڑ نے اسے تکلیف بے شک پہنچائی تھی، لیکن وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اتنی دیر میں رحمان علی شاہ نے روشنی جلا دی تھی، خیر خان بھی ہڑ بڑا کر اٹھ گیا تھا اور وہ دونوں ننڈا سی آنکھوں سے رحمان علی شاہ کو دیکھ رہے تھے۔ گل باز خان نے پہلے تو خون خوار انداز میں اسے دیکھا، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کی صورت گل باز خان کی آنکھوں میں واضح ہوتی چلی گئی اور اس نے حیران نگاہوں سے خیر خان کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔

”رحمان علی شاہ۔“

”پہچان لیا مجھے گل باز خان۔“

”چھوٹے شاہ صاحب آپ یہاں۔“ خیر خان حیرت سے بولا۔

”ہاں، پاگل خانے سے بھاگ آیا ہوں۔“ رحمان علی شاہ نے جواب دیا اور خیر خان خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ”پھر بولا۔“

”یہاں کیوں آئے ہیں چھوٹے شاہ صاحب؟“

”تم دونوں سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”لیکن آپ نے ہمارے سینے پر ٹکڑ کیوں مارا۔ چھوٹے شاہ صاحب۔“

”پاگل جو ہوں، ابھی تو دیکھو پاگل پن کی کیا کیا حرکتیں کرتا ہوں میں۔“ رحمان نے دروازہ بند کر دیا اور وہ دونوں پریشان نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے پھر ان کی نگاہیں ایک جانب اٹھ گئیں۔ غالباً یہاں کوئی دائر لیس یا ٹیلی فون موجود تھا جس پر وہ یقینی طور پر امیر علی شاہ سے رابطہ قائم کرتے ہوں گے لیکن کسی نے اس کی جانب بڑھنے کی کوشش نہیں کی، گل باز نے کہا۔

نہیں کہ سوچے سمجھے بغیر کوئی عمل کر ڈالے۔ آج پہلی بار وہ ان دو افراد کی کھالیں اتار رہا تھا۔ تھاجن کے ذریعے اور بہت سے لوگوں کی کھالیں اتاری گئی تھیں۔ ان سے لیا خان کا پتہ ضروری تھا اور اب جبکہ یہ صورت حال اس شکل میں واضح ہو گئی تھی کہ اگر وہ یہاں نظر آجائے تو اس کا ہم شکل وہاں صورت حال سنجال سکتا ہے تو رحمان علی شاہ کی اپنی صلاحیت اور فطرت بھی جاگ اٹھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ گل باز اور خیر خان کہاں ملیں گے۔ خیر خان نے اپنے لئے ایک الگ عیش گاہ بنا رکھی تھی اور وہ ناچ رنگ کے رسیا تھے۔ لڑکے، لڑکیوں لباس پہن کر خیر خان کے ڈیرے پر رقص کیا کرتے تھے اور خیر خان کے حواری وہاں ہو جاتے تھے۔ گل باز بھی اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ یہ دونوں امیر علی شاہ کی ناک کا بال بول اور امیر علی شاہ اپنے خطرناک کام انہی سے کرایا کرتا تھا لیکن نجانبے کیوں امیر علی شاہ نے دونوں کو اپنی حویلی میں رہنے کی اجازت نہیں دی تھی یا پھر یہ انہی کی خواہش تھی کہ رات وہ اپنے ڈیرے پر چلے جایا کریں۔ بہر حال رحمان علی شاہ جانتا تھا کہ ان کا ڈیرہ کہاں ہے اور ان کے قدم تیزی سے اسی جانب اٹھ رہے تھے۔

رات بہت زیادہ گزر چکی تھی اور اگر معمول کے مطابق خیر خان کے ڈیرے پر رقص موسیقی کا پروگرام جما بھی ہو گا تو اب یقیناً وہاں محفل ٹھنڈی ہو چکی ہوگی چونکہ دوسرے انہیں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے امیر علی شاہ کے پاس بھی پہنچنا ہوتا تھا۔ چنانچہ دونوں میں اتنی رات گئے تک محفل نہیں جمتی تھی اور جب طویل فاصلہ طے کر کے وہ خیر خان کے ڈیرے پر پہنچا تو صورت حال وہی تھی، ڈیرہ ٹھنڈا پڑا ہوا تھا اور خیر خان اور گل باز ڈیرے کے اندرونی حصے میں محو استراحت تھے۔ رحمان علی شاہ نے قریب وجوار کے ماحول کا جائزہ لیا، شرکائے محفل واپس جا چکے تھے، قبوے کی خالی بیالیاں اور سگریٹوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ حقہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور یہ تمام نشانات اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ آج بھی معمول کے مطابق محفل زوروں پر رہی تھی، پھر اندرونی حصے میں داخل ہو کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور اندر گل باز اور خیر خان موجود تھے دونوں یہاں اکٹھے ہی رہا کرتے تھے اور ان کا کوئی اہل خاندان وہاں نہیں تھا، اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ رحمان علی شاہ دروازے پر دستک دے، چنانچہ اس نے زور زور سے دروازہ بجایا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد ان دونوں کو جگانے میں کامیاب ہو گیا اور اسے

نہیں مانیں گے۔“

”یہ دیکھو میری کمر میں کیا لپٹا ہوا ہے؟“ رحمان علی شاہ نے کہا اور چمڑے کا چابک اپنی کمرے کھولنے لگا، پھر بولا۔

”اس چابک کو بھی پہچانتے ہو گے، یہ امیر علی شاہ کا چابک ہے۔“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہو چھوٹے شاہ صاحب؟“

”زبان کھلوئے گا یہ تمہاری اور تم بتاؤ گے کہ ایاز بیگ کہاں ہے؟“

”نہیں چھوٹے شاہ صاحب ہمیں مجبور مت کرو کہ ہم آپ کے ساتھ گستاخی کرنے۔“

”تو پھر ایسا کرو میرے ساتھ گستاخی کرو۔“ رحمان علی شاہ نے کہا اور اچانک اس نے رخ بدل لیا لیکن اس کے ساتھ ہی جب وہ پلٹا تو چمڑے کا چابک شاہ کی آواز کے ساتھ گل باز خان کی گردن اور سینے پر پڑا تھا۔ گل باز خان کے منہ سے آواز نکل گئی اس ہولناک چابک کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ رحمان علی شاہ نے پلٹ کر دوسرا چابک خیر خان کے بدن پر رسید کر دیا اور خیر خان بھی اپنا بدن سہلانے لگا، گل باز خان غرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”دیکھو چھوٹے شاہ صاحب، گستاخی پر مجبور مت کرو۔“ لیکن جواب میں چمڑے کا چابک پھر سے اس کے منہ پر پڑا اور اس بار اس کے چہرے کی کھال اتر گئی، گل باز خان نے پلٹ کر رحمان علی شاہ پر حملہ کرنا چاہا لیکن وہ غلط فہمی کا شکار تھا۔ رحمان علی شاہ اب وہ چھوٹا سا بچہ نہیں تھا جو ان کے قبضے میں آجاتا، چمڑے کا ہنر بھی استعمال کرنا آتا تھا اسے۔ چنانچہ دوسری بار ہنر گل باز کے بدن پر پڑا اور وہ سی کر کے پیچھے ہٹ گیا اور پھر تو شرا میں شرا میں کی آواز کے ساتھ گل باز اور خیر خان کے بدن پر پے در پے ہنر پڑنے لگے، وہ لوگ اب تکلف نہیں کر رہے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح چمڑے کا چابک ان کے ہاتھ میں آجائے، یا اگر چابک نہ پکڑ پائیں تو رحمان علی شاہ کو ہی پکڑ لیں لیکن رحمان علی شاہ اس جھوٹی سی جگہ میں بھی بچکی بنا ہوا تھا۔ وہ ان کے ہر ہنر سے کو نگاہ میں رکھے ہوئے تھا اور اس سے بچنے کے لیے ان پر چابکوں کی مار برسا رہا تھا۔ رحمان علی شاہ کی مسلسل ضربوں نے ان دونوں کو بو لہان کر دیا اور وہ صحیح معنوں میں حواس باختہ ہو گئے، اب وہ صرف اخلاق نہیں برت رہے تھے بلکہ اپنی وفاداری کو بھول کر رحمان علی شاہ کو پکڑ کر جان سے مار دینا چاہتے تھے، وہ اپنے ان زخموں کا بدلہ لینا چاہتے تھے، لیکن اس میں انہیں کوئی کامیابی نہیں حاصل ہو پارہی

”چھوٹے شاہ صاحب، ہم جانتا ہے کہ آپ پاگل نہیں ہو۔“

”ارے اگر تم ایسی بات کرو گے تو تمہیں بھی پاگل خانے میں داخل کر دیا جائے گا، جب مجھے میرے باپ نے پاگل قرار دے دیا ہے تو تم کون ہوتے ہو مجھے صحیح الدماغ کہنے والے۔“

”وہ آپ کا اور بڑے شاہ صاحب کا معاملہ ہے لیکن ہم جتنا ان کے نمک خوار ہیں اتنا ہی آپ کے بھی نمک خوار ہیں، چھوٹے شاہ صاحب، ہم کو معلوم ہے کہ آپ کو زبردستی ادھر پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا ہے۔“

”اچھا تو تمہیں معلوم ہے چلو یہ اور اچھی بات ہے تو اب تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا گل باز خان اور خیر خان کہ مجھے پاگل خانے میں کیوں داخل کر لیا گیا۔“

”چھوٹے شاہ صاحب، ہم تو حکم کے غلام ہیں، ہمیں اگر کچھ معلوم بھی ہوتا ہے تو ہم اس کے لئے زبان بند رکھتے ہیں۔“

”بڑے شاہ صاحب کے سامنے۔“

”ہاں۔“

”لیکن میرے سامنے تمہیں زبان کھولنی پڑے گی۔“

”ہم سمجھے نہیں چھوٹے شاہ صاحب۔“ خیر خان نے کہا۔

”خیر خان تم دونوں کو یہ بات معلوم ہے کہ مجھے پاگل کیوں قرار دیا گیا ہے، تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں نے بڑے شاہ صاحب پر گولی کیوں چلائی، یہ ساری باتیں جاننے کے بعد تمہیں یہ بھی لازمی طور پر معلوم ہو گا کہ ایاز بیگ کو کہاں پوشیدہ رکھا گیا ہے؟“

”ہمیں کیا معلوم چھوٹے شاہ صاحب؟“ گل باز نے کہا۔

”اگر تمہیں اتنی سی بات بھی نہیں معلوم تو پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم بڑے شاہ صاحب کے نمک خوار ہو؟“

”دیکھو چھوٹے شاہ صاحب، ہمیں اگر کچھ معلوم بھی ہو گا اس بارے میں تو ہم آپ کو نہیں بتا سکتے۔ بڑے شاہ صاحب کا حکم سب سے بڑی چیز ہوتا ہے ہمارے لئے، وہ اگر حکم دیں گے کہ ہم چھوٹے شاہ صاحب کی بات بھی مان لیں تو ہم مان لیں گے۔“

”نہیں آج میں تمہیں حکم دینے آیا ہوں گل باز خان۔“

”نہیں چھوٹے شاہ صاحب، ہم بڑے شاہ صاحب کی مرضی کے خلاف آپ کا کوئی حکم

چھوڑوں گا میں تمہیں، اس بات کا اچھی طرح خیال رکھنا۔“

”چھوٹے شاہ صاحب ہم پر اعتبار کرو، ہم اس بارے میں اپنی زبان کبھی نہیں کھولیں گے۔“ خیر خان نے کہا اور رحمان علی شاہ نے ہنر ہاتھ میں لپیٹا اور اس کے بعد دروازہ کھول کر باہر نکل آیا لیکن باہر سے وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔ ایاز بیگ کی تلاش میں اسے مسلسل ناکامی ہو رہی تھی، لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں معلوم کر سکتا تھا، یہ اسے پتا چل گیا تھا کہ ایاز بیگ زندہ ہے اور حویلی ہی میں ہے، اعتبار کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اب تو ایک ہوا، زیب ہو سکتی تھی کہ وہ یہی تمام کوشش اپنے باپ کے خلاف کرے اور اس کی زبان کھولے لیکن ابھی اس حد تک نوبت نہیں آئی تھی۔ پہلے اس سلسلے میں شہاب کو اطلاع دے دی جائے اس کے بعد کچھ کیا جائے گا اور پھر اس نے یہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ شہاب نے اسے جو ذریعہ بتایا تھا اس ذریعے سے وہ واپس چل پڑا۔ شاہ پور سے شہر تک کا فاصلہ اس نے نبھانے کیسے کیسے خیالات میں عبور کیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے قطعی طور پر ناواقف تھا جو مسلسل اس کا تعاقب کرتے رہے تھے، وہ عمارت بھی اس کے علم میں تھی جہاں شہاب اسے لے گیا تھا، شہاب نے اسے مکمل طور پر رازدار بنایا تھا اور اسے بتا دیا تھا کہ اسے واپس اسی عمارت میں آنا ہے۔ البتہ وقت کا کوئی تعین نہیں کیا گیا تھا کہ وہ کب تک واپس آجائے گا۔ عمارت میں پہنچنے کے بعد وہ اندر داخل ہو گیا اور اس نے ہنر وغیرہ وہیں پھینک دیا پھر! متر پر بیٹھ کر ان واقعات کے بارے میں سوچنے لگا، پتا نہیں شہاب کو اس کی واپسی کی خبر کیسے ملے گی۔ بہر حال وہ بے بسی کے عالم میں اسی بستر پر دراز ہو گیا۔ ماں کی صورت دیکھی تھی، باپ اور بھائیوں کو بھی دیکھا تھا، باپ اور بھائیوں سے توب تمام امیدیں منقطع ہو گئی تھیں، وہ سنگدل تو اسے اپنی فہرست سے ہی خارج کر چکے تھے۔ ہاں ماں کا چہرہ تھا جسے دیکھ کر اس کے دل میں ایک غیبی خلش پیدا ہو گئی تھی، وہ معصوم عورت چشم تصور میں اسے دیکھ لیا کرتی تھی اور اس وقت جب وہ اس کی نگاہوں کے سامنے پہنچا تھا، تب بھی اس نے اسے اپنا تصور ہی سمجھا تھا۔



ڈبل اوگینگ میں جتنے افراد کو شامل کیا گیا تھا یہ سب اپنے اپنے فنون کے ماہر تھے اور دنیا سے اپنا حق نہ پا کر آخر کار شہنشاہ سے رجوع ہوئے تھے اور شہنشاہ نے انہیں نبھانے کن کن

تھی۔ یہاں تک کہ مار کھا کھا کر وہ زمین پر گر پڑے، ان کا پورا جسم خون سے تر تھا۔ رحمان علی شاہ ان کے سینوں پر آکھڑا ہوا۔

”ہاں وفادار لوگو! اب بتاؤ ایاز بیگ کہاں ہے؟“

”تمہارا، چھوٹے شاہ تمہارا دماغ سچ مچ خراب ہو گیا ہے تم۔ تم۔“ لیکن جواب میں رحمان علی شاہ نے ہنر اٹھایا اور شائیں کی آواز کے ساتھ یہ ہنر گل باز کے منہ پر پڑا۔ گل باز کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی۔ خیر خان نے کہا۔

”دیکھو چھوٹے شاہ صاحب آپ یقین کرو ہمیں معلوم ایاز بیگ کو کہاں رکھا گیا ہے؟“

”بکواس کرتے ہو جھوٹ بولتے ہو، تم سے زیادہ اور کسے معلوم ہو گا۔“

”خدا کی قسم ہم کو نہیں معلوم، بس ہم اتنا جانتے ہیں کہ ایاز بیگ حویلی ہی میں کہیں موجود ہے۔“

”وہ زندہ ہے؟“

ہاں چھوٹے شاہ صاحب اسے زندہ رکھا گیا ہے، اسے اس لئے زندہ رکھا گیا ہے کہ اگر کبھی غیاث بیگ سر ابھارے تو اسے بیٹے کی آواز سنو اگر یا صورت دکھا کر خاموش کیا جائے، اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔“

”تم سب کچھ جانتے ہو کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بڑے شاہ صاحب کا تم سے زیادہ قریبی رازدار اور کوئی نہیں ہے۔“

”ہمیں بڑے شاہ صاحب کا راز صرف اتنا ہی معلوم ہے جتنا ہم نے آپ کو بتا دیا۔“

”سنو گل باز خان سنو خیر خان، اصولی طور پر تو مجھے تم لوگوں کو قتل کر دینا چاہیے چونکہ تمہیں یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ میں پاگل خانے سے بھاگ آیا ہوں لیکن میں تمہیں اس شرط پر زندہ چھوڑ رہا ہوں کہ تم بڑے شاہ صاحب کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔“

”ہماری توبہ، ہماری توبہ، ہم اپنی زبان بالکل بند رکھیں گے۔“

”اور یہی کہو گے کہ کوئی تمہارا خفیہ دشمن تھا جس نے تمہیں آکر مارا اگر اس کے خلاف کہا تم نے تو میں تمہیں ایک بات بتائے دیتا ہوں، میرا دماغ خراب ہے میں ٹھیک نہیں ہوں تم اگر ملک سے باہر بھی چلے جاؤ گے تو میں تمہیں تلاش کر کے قتل کر دوں گا۔ زندہ نہیں

غریب جگہ تک کیا جو سنان پڑی ہوئی تھی اور وہاں انہوں نے بعد میں رحمان علی شاہ کی درندگی بھی دیکھی اس نے دو آدمیوں کو ہنر مار مار کر شدید زخمی کر دیا تھا، پھر وہاں سے لے کر شہر واپسی تک انہوں نے رحمان علی شاہ کا کامیاب تعاقب کیا تھا اور ایک بار بھی اسے شبہ نہیں ہونے دیا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے ہے رحمان علی شاہ ایک عمارت میں داخل ہو گیا تھا اور یہاں سے ان کی ڈیوٹی شہنشاہ کی ہدایت کے مطابق ختم ہو جاتی تھی، لیکن ابھی شہنشاہ کو اس سلسلے میں اطلاع دینا ضروری تھا چنانچہ فراز نے یہ خدمت انجام دی اور شہنشاہ کو ٹرانسمیٹر پر کال کیا۔ وہ منتظر ہی تھا، ان لوگوں نے اسے پوری تفصیلات بتائیں اور شہنشاہ کی اطمینان بھری آواز ابھری۔

”ویری گڈ..... اور اب اس کے بعد اتنی مشقت کر کے تم لوگ یقیناً آرام کے خواہش مند ہو گے؟“

”نہیں سر ہمارے لئے اگر کوئی ہدایت ہو تو ہر کام کے لئے تیار ہیں۔“

”تمہارے لئے ہدایت یہ ہے کہ اب تم آرام کرو۔“

شہنشاہ کی طرف سے جواب ملا تھا اور اس کے بعد یہ لوگ اپنی اس آرام گاہ کی جانب چل پڑے تھے جہاں ان حالات میں انہیں قیام کرنا ہوتا تھا۔



شہاب خود بھی اس مسئلے میں پوری پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کے مسلک کا تقاضا تھا، مظلوموں کو داور سی درکار تھی اور وہ اپنی خدمات ان کے لئے پیش کر چکا تھا، حالانکہ یہ کیس عدنان واسطی نے اسے دیا تھا لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی کہ کیس کہاں سے ملا ہے بس اس کے ذہن نے یہ بات قبول کر لی تھی کہ کچھ وحشیوں نے ایک بار پھر انسانیت کی گردن دبانے کی کوشش کی ہے اور بس، اس کے ساتھ ساتھ اگر کچھ مالی مفادات بھی حاصل ہو جائیں تو وہ منافع والی بات تھی اور شہاب اس سے بھی چوکنا نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال رحمان علی شاہ کے بارے میں پروگرام کی ترتیب کر کے وہ مطمئن ہو گیا تھا، البتہ ذمہ داری تو پوری کرنی ہی تھی، چنانچہ اس کے اندازے کے مطابق اسے سب سے پہلے فراست علی کی طرف سے پیغام موصول ہوا اور فراست علی نے اسے بتایا کہ ایک شخص اس کا جائزہ لینے آیا تھا۔ وہ چوروں کی طرح ایک ڈاکٹر کے ساتھ اسے دیکھنے آیا اور پھر واپس چلا گیا۔ شہاب کو معلوم تھا کہ اصل

مشکلات سے گزارنے کے بعد نولاد بنادیا تھا اور اب وہ شہنشاہ کے افکار و خیالات سے اس تک متفق ہو گئے تھے کہ اس کے احکامات پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنا ان کا ایمان بن گیا تھا۔ بہت سے معاملات میں وہ شہنشاہ کے انسانی نکتہ نظر کے قائل ہو گئے تھے، ابتدائی حالات تو بڑے سنگین رہے تھے لیکن اب پچھلے کچھ دنوں سے مالی حالات بھی انتہائی بہتر ہو گئے تھے اور انہیں اتنے معقول معاوضے ملنے لگے تھے کہ وہ مالی طور پر بھی اب نہایت اطمینان سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ شہنشاہ کے ساتھ ہر قسم کے حالات میں تعاون کر کے اس کا اعتماد کو برقرار رکھا تھا۔ کبھی کبھی ایسے مشکل مرحلے بھی آ جاتے تھے جن میں انہیں ناواقفیت کی بنا پر شدید محنت کرنا پڑتی تھی اور ذہنی الجھنیں بھی برداشت کرنی پڑ جاتی تھیں اس وقت بھی وہ ایسی ہی الجھن کا شکار تھے۔ پوری نیم مصروف تھی، شوکت کی مسلسل مرزا غیاث بیگ کے گھر پر لگادی گئی تھی اور اسے ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ ہر قسم کے حالات سے شہنشاہ کو باخبر رکھے لیکن کچھ حالات ہی ایسے پیش نہیں آئے تھے۔ اس گھر کے افراد بڑے پر امن تھے اور شوکت ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ ان معصوم لوگوں کو لگاؤ رکھنے کا مقصد کیا ہے، بس ایک جوہر خان تھا جس کی شکل دیکھ کر ہی یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے لیکن معلومات حاصل کرنے سے یہی پتا چلا تھا کہ یہ ایک گھرانہ ہے۔ میاں بیوی اور کچھ بزرگ ساتھ رہتے ہیں لیکن بہر حال شہنشاہ کی لگائی ہوئی ڈیوٹی بے مقصد نہیں تھی۔

ادھر فراست، رحمان علی شاہ کے میک اپ میں ہسپتال میں مقیم تھا، سردار علی، فرد سالک اور انجم شیخ آؤٹ ڈور ڈیوٹی انجام دے رہے تھے اور انہوں نے شہنشاہ کی ہدایت کے مطابق نہایت محتاط طریقے سے شاہ پور تک رحمان علی ٹیپو کا تعاقب کیا تھا اور اس حویلی کے سامنے پہنچ کر بے بس ہو گئے تھے جس کے چور دروازے سے رحمان علی شاہ اندر داخل تھا۔ اس کے بعد ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہئے..... بہر حال جان بازی لگانے کے بعد سردار اور انجم اندر داخل ہوئے تھے لیکن عظیم الشان حویلی میں کسی تلاش کر لینا بھی ایک مشکل کام ہی تھا چنانچہ وہ حویلی میں چکراتے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے باہر سے فراز کی طرف سے اشارہ موصول ہوا اور وہ باہر واپس آ گئے۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ رحمان علی شاہ حویلی سے باہر آ گیا ہے، پھر انہوں نے رحمان علی شاہ کا تعاقب اس عجیب

”آپ یقین کیجئے شہاب صاحب، آپ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا اور یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ آپ سے اس وقت رابطہ قائم کیا جائے یا صبح کو۔“

”چلئے اچھی بات ہے میں حاضر ہو گیا، حالانکہ میں خود یہ سوچ رہا تھا کہ اتنی مشقت کے بعد آپ کو آرام کرنے دیا جائے لیکن میرا خیال ہے کہ آج رات آپ کی اور میری تقدیر میں آرام کی رات نہیں ہے۔“

”میں شاہ پور ہو آیا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے، آپ ساری رات مصروف عمل رہے ہیں رحمان علی شاہ صاحب۔ مجھے علم ہے کہ آپ کافی دیر اپنی حویلی میں رہے اور اس کے بعد آپ نے دو افراد کی کھال اڑھری اور پھر یہاں واپس آگئے، کہنے کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ رحمان علی شاہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

”آپ کو، آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟“

”میں آپ سے کہہ چکا تھا رحمان علی شاہ صاحب کہ میرے چار آدمی آپ کی حفاظت کریں گے۔ انہوں نے اپنے فرائض پوری طرح سرانجام دیئے ہیں۔“

”بہر حال آپ پہلے بھی میری نگاہ میں حیرت انگیز تھے اور اب بھی وہی کیفیت ہے، اب تو آپ کو کچھ بتانا ہی بیکار ہے۔ آپ کو تو سب ہی کچھ معلوم ہوگا۔“

”نہیں رحمان علی شاہ صاحب میں جادوگر تو نہیں ہوں، بس اپنے ذرائع سے تھوڑا بہت کام کر لیا کرتا ہوں۔“

”آپ کیا ہیں اور کیوں میرے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں، اب میں اس بارے میں آپ سے کوئی سوال نہیں کروں گا۔ مختصر میں آپ کو اپنی کارکردگی کی تفصیل بتائے دیتا ہوں۔“ اور پھر رحمان علی شاہ نے ساری تفصیل شہاب کو بتادی اور شہاب خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔

”سب کچھ میری توقع کے مطابق ہی ہو رہا ہے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں ایاز بیگ کی زندگی کی خوش خبری ملی ہے۔“

”ہاں، لیکن اندازہ یہ ہوتا ہے کہ خیر خان اور گل باز کو بھی وہ جگہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہے جہاں امیر علی شاہ صاحب نے ایاز بیگ کو رکھا ہوا ہے، میں سب سے زیادہ اس سلسلے

معاملہ کیا ہے، چنانچہ فراست کو اطمینان سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے کا حکم دے کر وہ اب ان لوگوں کی جانب سے انتظار کرنے لگا۔ اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ رحمان علی شاہ نے اپنا کام بخوبی سرانجام دیا ہے لیکن کوئی ایسی صورت حال بھی پیدا ہو گئی ہے کہ اس کے بارے میں کسی کو شبہ ہو گیا ہے۔ بہر حال اس کے لئے وہ پہلے سے تیار تھا پھر خاصی دیر کے بعد اسے فراز کا پیغام موصول ہوا، جس میں فراز نے اس کے تمام خیالات کی تصدیق کر دی تھی اور اسے یہ بتا دیا تھا کہ رحمان علی شاہ اپنا کام سرانجام دینے کے بعد واپس آچکا ہے، چنانچہ اب اس کے بعد رحمان علی شاہ سے ملاقات نہ کرنا شہاب کے بس کی بات نہیں تھی اور اس کے لئے وہ صبح کا انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ گھر کے تمام افراد اطمینان کی نیند سو رہے تھے ان کے مسائل سے بھی وہ پوری طرح دلچسپی رکھتا تھا اور کسی کو بھی اس سے یہ شکایت نہیں ہوئی تھی کہ وہ گھر کے معاملات سے الگ تھلگ ہو گیا ہے۔ بہن کی شادی کے انتظامات آخری حد میں داخل ہو چکے تھے۔ تمام اخراجات اس نے اپنے ذمے لے لئے تھے اور انہیں پورا کرنے میں اب اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ حالات اس طرح ہموار ہو چکے تھے کہ اب وہ آرام سے اپنے تمام کام کر سکتا تھا اور اس میں اس کا جو نظریہ تھا اس کی تکمیل بھی ہو رہی تھی لیکن اس کے نظریات کے بارے میں صرف ایک ہی شخص جانتا تھا اور وہ تھا فتح محمد، جو صحیح معنوں میں اس کا دست راست تھا اور بلاشبہ اس کے لئے مرشد کی حیثیت ہی رکھتا تھا، بہر حال تھوڑی دیر کے بعد اپنے انتظامات مکمل کر کے شہاب گھر سے باہر نکل آیا۔ چوروں کی طرح چلتا ہوا کافی دور تک پیدل گیا اور اس کے بعد ٹیکسی کی تلاش میں نگاہیں دوڑانے لگا۔ اس وقت ذرا طریقہ کار مختلف رکھنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے ٹیکسی کا ہی سفر اختیار کیا اور ٹیکسی ڈرائیور سے ایک لمبا معاہدہ کرنے کے بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چل پڑا، اب پروگرام کو آگے بڑھانے کا مسئلہ تھا اور وہ خوش اسلوبی سے اپنے پروگرام کو آخری شکل دینے کے لئے تیار تھا۔ کچھ دیر کے بعد ٹیکسی اس عمارت کے سامنے پہنچ گئی جو اس کی اپنی ملکیت تھی اس عمارت کا بیرونی حصہ درحقیقت کسی بھی گھر کا منظر پیش کرتا تھا لیکن اس کے اندر بہت کچھ تھا، ٹیکسی ڈرائیور کو انتظار کرنے کے لئے کہہ کر وہ عمارت میں داخل ہو گیا پھر کچھ دیر کے بعد رحمان علی شاہ کے سامنے موجود تھا۔ رحمان علی شاہ اسے دیکھ کر اچھل پڑا پھر مدہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”چلو ڈرائیور..... اب مجھے میری مطلوبہ جگہ چھوڑ دو..... اس کے بعد تمہاری ڈیوٹی ختم۔“ راستے میں اس نے ڈرائیور کو اس کے حساب سے دس گنا زیادہ رقم دیتے ہوئے کہا۔

”بعض اوقات ایسی ڈیوٹیاں تکلیف دہ بھی ہوتی ہیں، لیکن منافع بخش بھی، یہ تمہارا حق ہے۔“

ڈرائیور نے سلام کر کے رقم اپنی جیب میں رکھ لی تھی اور شہاب خاموشی سے ٹیکسی سے اتر کر اپنے گھر کے اس پچھلے حصے کی جانب بڑھ گیا تھا جہاں سے اسے آتے جاتے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کہیں دور مسجد سے فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔



ہے۔ میں اپنے وطن کی بہتری کے لئے اپنی معمولی سی ذات کو پیش کرتا ہوں، مجھے کتنی میں ہسپتال پہنچ جانا ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب، آپ جب ہسپتال کے گیٹ پر پہنچیں گے تو اصلی رحمان علی شاہ کو وہیں مل جائیں گے، بس اس کے بعد آپ نقلی آدمی کو روانہ کر دیجئے گا۔“

”یہ کام رات میں ہی ہو جائے تو بہتر ہے، حالانکہ صبح ہونے میں اب بہت دیر نہیں ہے۔“

”تو پھر آپ زحمت فرمائیے۔“

”میں دس منٹ کے اندر اندر پہنچ رہا ہوں آپ مطمئن رہیں۔“

”بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔“ شہاب نے کہا اور پھر وہ رحمان علی شاہ کو ٹیکسی میں چل پڑا۔

ٹیکسی سے اترنے کے بعد اس نے رحمان علی شاہ سے کہا۔

”جب آپ اپنی جگہ پہنچ جائیں تو مجھے ٹرانسمیٹر پر اطلاع دے دیں اور اس کے بعد اہم مسئلہ ہو تو پھر مجھے بتائیے گا ورنہ جب تک میں آپ کو خود کال نہ کروں، آپ خام رہئے گا اور ایک بات اور سن لیجئے میں آپ کو تین مرتبہ اشارہ دوں گا اگر آپ کسی ایسا ہوں جہاں میرا پیغام نہ موصول کر سکیں تو جواب نہ دیجئے گا، تین بار اشارہ کرنے کے میں چوتھی بار کوشش نہیں کروں گا تاکہ آپ کو پریشانی نہ ہو۔“

”یہ آپ نے بہت اچھا کیا، واقعی یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔“

پھر شہاب وہاں سے ہٹ گیا لیکن ٹیکسی میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ چند لمحات کے ڈاکٹر کبیر کی کار وہاں پہنچ گئی اور رحمان علی شاہ تاریکیوں سے نکل کر اس کے پاس آئے۔ ڈاکٹر کبیر رحمان علی شاہ کو لے کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور اپنے اسٹیرنگ اونگھ رہا تھا اور شہاب پچھلی سیٹ پر بیٹھا کھڑکی سے باہر نگاہیں جمائے ہسپتال کی جانب تھا۔ کوئی دس ہی منٹ مزید لگے اور اس کے بعد اس نے فراست کو باہر آتے ہوئے فراست غالباً سوتے سے جاگ کر آیا تھا، چنانچہ آہستہ قدموں سے وہ ایک جانب بڑھتا اس نے شاید وہاں سے نکلتے ہی اپنا میک اپ اتار دیا تھا اور یہ اس کی اپنی ذہانت تھی ورنہ نہیں کی گئی تھی۔ فراست کے نکل جانے کے بعد شہاب نے کہا۔

میں بیٹھا تھا انہیں دیکھ کر حیرت سے اُچھل پڑا پھر اس نے بھی تقریباً وہی سوالات ان سے کیے، گلزار اور شاد بھی قریب ہی موجود تھے جواب میں گل باز خان نے کہا۔

”شاہ صاحب! غلام ہیں آپ کے، وعدہ کیا تھا آپ سے کہ جب تک زندہ ہیں صرف آپ کے حکم کی تعمیل کریں گے اور کسی خطرے پر خوف زدہ نہیں ہوں گے۔“

”یہ ہوا کیا ہے یہ بتاؤ، یہ کسی حادثے کا نتیجہ ہے یا کسی دشمن کی کارروائی؟“

”یہ حادثہ ہے نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کارروائی کسی دشمن نے کی ہے، کیونکہ مالک کے بیٹے کو دشمن کہنے کے لئے ہماری زبان کبھی نہیں کھلے گی۔“

”مالک کا بیٹا؟ کیا مالک تم مجھے کہہ رہے ہو؟“

”اور کون ہے شاہ صاحب، ہم نے پوری زندگی آپ ہی کا نمک کھایا ہے، آپ کے علاوہ کسی کو اپنا آقا نہیں کہہ سکتے۔“

”مگر کس نے..... کس نے؟ امیر علی شاہ نے خونی نگاہوں سے شاد علی اور گلزار علی شاہ کو دیکھا۔“

”نہیں شاہ صاحب ان دونوں میں سے کوئی نہیں ہے۔“

”تو کیا فیاض علی شاہ..... لیکن وہ تو وہ شہر سے کب آیا؟“

”شاہ صاحب فیاض علی شاہ بھی نہیں، ہماری یہ حالت رحمان علی شاہ نے بنائی ہے۔“

خیر خان بولا اور امیر علی شاہ اُچھل پڑا، گلزار اور شاد کی بھی کیفیت اس سے مختلف نہیں ہوئی تھی، امیر علی شاہ نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا میں تمہارے دماغی توازن پر بھی شک کروں، کیا تمہارا سر بھی زخمی ہوا ہے۔“

”ہم جانتے تھے شاہ صاحب آپ اتنے ہی حیران ہوں گے، ہم بھی اتنے ہی حیران ہوئے تھے اور ابھی تک اتنے ہی حیران ہیں۔“

”کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”رحمان علی شاہ صاحب ہمارے ڈیرے پر آئے تھے ان کے پاس آپ کا چابک تھا ہم اسے اچھی طرح پہچانتے ہیں، ہمارے پاس پہنچنے کے بعد انہوں نے ہم سے ایاز بیگ کے بارے میں پوچھا لیکن ہم نہیں جانتے تھے کہ ایاز بیگ کہاں ہے۔ انہوں نے مار مار کر ہمارا یہ حال کر دیا..... آپ یقین کریں ہم نے صرف اپنا بچاؤ کیا اور ان کے ہتھروں سے بچنے کی

رات کا واقعہ درحقیقت عجیب تھا، گلزار علی شاہ کو جھاز پڑ چکی تھی، لیکن وہ اب بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ شاد کو اس نے یہ ساری حقیقت بتائی تھی، لیکن بہر حال جب ایک بار بات کی تصحیح ہو گئی تھی تو اب بار بار اپنے نکتہ نظر پر جتے رہنا مناسب نہیں تھا اور خصوصاً اب امیر علی شاہ کے سامنے تو یہ تذکرہ کرنا بھی بے کار تھا کیونکہ امیر علی شاہ خود ذہنی طور پر اس بات سے متاثر ہو گیا تھا لیکن پھر دن کو گیارہ بجے گل باز خان اور خیر خان حویلی پہنچے تو ان کی حالت دیکھ کر گلزار علی شاہ چونک پڑا، ان کے چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور انہیں کئی آدمی سہارا دے کر حویلی میں لائے تھے..... گل باز خان اور خیر خان امیر علی شاہ کے ان آدمیوں میں سے تھے جن پر امیر علی شاہ زبردست اعتبار کرتا تھا، نجانے کب سے ان دونوں اس کے لئے کام کر رہے تھے اور ان کی ذمہ داری تھی کہ ایک مقررہ وقت پر امیر علی شاہ کے پاس پہنچ جائیں آج وہ کافی دیر سے آئے تھے اور امیر علی شاہ نے دوبارہ شاد علی شاہ سے ان دونوں کے بارے میں سوال کیا تھا، لیکن وہ اس حالت میں ہوں گے، اس کا ان میں سے کسی کو پتا نہیں تھا۔ گلزار اور شاد دونوں ہی چونک پڑے تھے، پھر باقی لوگوں کو انہوں نے وہاں سے ہٹ جانے کے لئے کہا اور انہیں بٹھادیا گیا۔“

”کیا ہوا؟ کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا تم لوگوں کا، تم تو شدید زخمی ہو گئے ہو۔“

”ہم اپنے قدموں سے چل کر نہیں آسکے، ہمارے پورے بدن زخموں سے چور ہیں اور شاید اب ہماری زندگی کا چراغ بھی بجھنے والا ہے لیکن مالک سے جس وفاداری کا وعدہ کیا ہے اس سے منہ موڑنا بھی ہمارے لئے ممکن نہیں تھا، آپ ہمیں فوراً امیر علی شاہ صاحب کے پاس پہنچا دو۔“ چنانچہ انتظام کیا گیا اور امیر علی شاہ جو اس وقت اپنے مخصوص کمرہ نشین

جرت بنا ہوا تھا، اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔
”میرا ہنر دیوار سے غائب ہے۔“

”غائب ہے۔“ شادا اور گلزار دونوں چیخ پڑے پھر گلزار بولا۔

”اور رات کو میں اپنی حماقت کا کافی نقصان اٹھا چکا ہوں، مجھے برا بھلا کہا گیا تھا۔“

”لیکن فیاض علی۔“ امیر علی شاہ نے کہا اور پھر ان دونوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”تم لوگوں کی اس حالت کا مجھے بہت افسوس ہے اور بے فکر ہو جو ہوا ہے اس کی پوری پوری تحقیق ہوگی، میں نہیں سمجھ سکتا کہ تمہیں یہ نقصان کیوں پہنچایا گیا، ذرا سی تفصیل اور بتاؤ اس کے بعد تم آرام کرو اگر علاج کرانا چاہتے ہو تو میں تمہیں شہر بھجوانے کا بندوبست کر دوں، جو بھی تمہارے دل میں ہو مجھے بتاؤ۔“

”نہیں شاہ صاحب ہم ٹھیک ہیں، ٹھیک ہو جائیں گے لیکن رحمان علی شاہ صاحب ہمیں حکم دے کر گئے تھے کہ ہم آپ کو یہ بات کہیں نہ بتائیں ورنہ ہمیں اگر ملک سے باہر بھی بھیج دیا گیا تو ہماری زندگی ختم کر دی جائے گی۔“

”ارے چھوڑو خیر خان وہ کیا زندگی ختم کرے گا۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کے لئے اپنے دل کے دروازے بند کرنا پڑیں گے اور میرے دل کے دروازے بند ہو گئے تو اسے عالم بالا میں بھی پناہ نہیں مل سکے گی۔“ امیر علی شاہ نے کہا اور پھر گلزار سے بولا۔

”انہیں احتیاط کے ساتھ مناسب جگہ پہنچا دو بلکہ یوں کرو انکیسی میں ان کے لئے بندوبست کرو اور چار آدمیوں کو مسلح کر کے ڈیوٹی پر لگا دو، کوئی انہیں نقصان نہ پہنچانے پائے۔“ گلزار انتظام کرنے چلا گیا۔ امیر علی شاہ کے چہرے پر شدید ہیجان پھیلا ہوا تھا، بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی، بہر حال اس وقت تک خاموشی اختیار کی گئی جب تک کہ خیر خان اور گل باز کے لئے مناسب بندوبست نہ ہو گیا، جب گلزار نے واپس آکر یہ اطلاع دی کہ انہیں مکمل ذمہ داری کے ساتھ انکیسی میں منتقل کر دیا گیا ہے اور چار آدمیوں کو مسلح کر کے یہ ہدایت کر دی گئی ہے کہ اگر کوئی انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے تو اسے زخمی کر کے گرفتار کر لیا جائے، امیر علی شاہ نے پر خیال لہجے میں کہا۔

”بیٹھ جاؤ گلزار علی شاہ مجھے تم لوگوں سے مشورہ کرنا ہے۔“ دونوں بھائی باپ کے سامنے بیٹھ گئے امیر علی شاہ دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا تھا، پھر اس نے پریشان لہجے میں کہا۔

کوشش کرتے رہے، ایک بار بھی ہمارے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ ہم ان پر ہاتھ اٹھائیں بچتے ہوئے بھی ان کے جسم کو کوئی نقصان پہنچائیں، یہ ہماری وفاداری تھی ورنہ ہم اسے بزدل چوہے بھی نہیں ہیں۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو تم کیا کہہ رہے ہو، میرا ہنر، رحمان علی شاہ..... وہ تو ہسپتال میں ہے۔“ امیر علی شاہ بولا، لیکن پھر اس کا لہجہ خود ہی پھسپھسا ہوا گیا، رات کے پراسرار واقعات اس کے ذہن میں اب بھی گردش کر رہے تھے۔

”جو کچھ بھی ہے شاہ صاحب لیکن نہ تو ہماری آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں اور نہ ہی پاگل ہوئے ہیں جو آپ کے سامنے غلط بات کہیں، وہ رحمان علی شاہ صاحب ہی تھے۔“ خیر خان نے پوری تفصیل امیر علی شاہ کو بتادی اور امیر علی شاہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”کیا یہ سب کچھ، کیا ہے؟ کیا فیاض پاگل ہو گیا ہے اس نے کیسے تصدیق کر دی کہ ہسپتال میں موجود ہے اور پھر وہ خود جا کر دیکھ کر آیا تھا، گلزار تم ذرا میری خواب گاہ میں جاؤ دیکھو میرا ہنر موجود ہے یا نہیں یا ٹھہر میں خود ہی جاتا ہوں۔“ امیر علی شاہ نے کہا اور پھر خیر خان اٹھ کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا..... گلزار اور شاد نے ان دونوں کو ہمدردی سے بیٹھے جگہ دی تھی، دونوں کی حالت واقعی بہت خراب نظر آرہی تھی..... گلزار نے کہا۔

”خیر خان شرافت اور وفاداری اچھی چیز ہوتی ہے لیکن اس کو حماقت کی حد میں نہ شامل ہونا چاہئے۔“

”ہم سمجھے نہیں صاحب۔“

”وہ اکیلا تھا یا اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے؟“

”نہیں صاحب اکیلے ہی تھے وہ۔“

”تو تم دونوں مل کر بھی اس اکیلے کو قابو میں نہیں کر سکتے تھے، تم دونوں جن بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ دس آدمیوں پر بھاری ہو۔“

”دس آدمیوں پر ہم بھاری ہیں صاحب لیکن مالک کے بیٹے پر نہیں، آپ لوگوں بارے میں ہم صرف اپنے بڑے آقا کے حکم کی تعمیل تو کر سکتے ہیں اپنی طرف سے آپ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“

”یہ حماقت ہے۔“ تھوڑی دیر کے بعد امیر علی شاہ واپس آگیا اس کا چہرہ اب بھی تھوڑا

”اب ایاز بیگ کی رہائی سے اسے کیا ملے گا؟“

”اپنی وفاداری کا ثبوت دے گا۔“

”کس سے؟“

”معاف کیجئے گا بابا جان اپنی محبوبہ سے۔“

”اوہ ہمارے اوپر اگر کسی کو فوقیت دی جاتی ہے تو اس کے نتائج برے ہی بھگتے پڑتے ہیں۔ دیکھنا ہو گا کہ اس معاملے کو اس طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ گدھا امیر علی کے قلعے میں پھنسے ہوئے ایاز بیگ کو کیسے نکال سکتا ہے۔ ذرا ہم بھی تودیکھیں شاد علی۔ تم نے گل بازار خیر خان کی حفاظت کا معقول بندوبست کر دیا ہے؟“

”بابا جان اس کی طرف سے آپ اطمینان رکھیں۔ ہم نے صحیح طریقے سے ہدایت

کردی ہے۔“

”ہوں، تو پھر شہر چلنے کی تیاری کرو، میں خود اس بارے میں تحقیقات کروں گا، ہوشیار

رہنا ہی اصل بہادری اور طاقت ہے، کسی کو میرے خلاف سازش کرنے کی جرات ہوئی تو

میرے تو زندگی ہی بے کار ہے، میں جب تک اس سازش کا صحیح طور سے پتا نہیں لگاؤں گا چین

سے نہیں بیٹھوں گا۔ تم دونوں بھی میرے ساتھ چلو۔“

”ٹھیک ہے بابا جان۔“ دونوں وہاں سے اٹھ گئے کچھ دیر کے بعد تمام تیاریاں مکمل کر لی

گئیں اور پھر ایک شاندار اور قیمتی کار میں بیٹھ کر وہ شاہ پور سے شہر چل پڑے۔ فاصلہ زیادہ

نہیں تھا تھوڑی دیر کے بعد وہ شہر میں داخل ہو رہے تھے، گلزار علی شاہ خود کار ڈرائیو کر رہا

تھا۔ اس نے پوچھا۔

”ہمیں کہاں چلنا چاہئے بابا جان؟“

”پہلے فیاض علی شاہ کی رہائش گاہ پر۔“

ایک خوشنما اور خوب صورت سے بنگلے میں کار داخل ہوئی تو فیاض علی شاہ باہر ہی نظر

آئے۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر کہیں باہر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ باپ کی کار کو دیکھ کر وہ ایک دم

چونک پڑا اور پھر جلدی سے اپنی گاڑی سے اتر آیا۔ اس نے پر مسرت انداز میں، باپ اور بھائی

کا استقبال کیا تھا لیکن سب کے چہرے سنجیدہ دیکھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیا بات ہے بابا جان، اندر آئیے..... آپ لوگ اس قدر سنجیدہ کیسے ہیں اور رات کا

”میری عقل ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ اگر وہ کسی طرح کلینک سے نکل گیا ہے تو پھر فیاض

علی نے اس کے وہاں موجود ہونے کی تصدیق کیوں کی۔“

”بے پروائی بھی ہو سکتی ہے بابا جان۔“

”کیا مطلب؟“

”رات کا وقت تھا ہو سکتا ہے کاہلی آگئی ہو۔“ شاہ علی شاہ نے کہا اور امیر علی شاہ

چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے۔

”کسی ضروری معاملے میں کاہلی؟“ وہ بولا۔

”ہو بھی سکتا ہے بابا جان، ہر ایک کو اپنے آرام کی فکر رہتی ہے، رات کا وقت تھا،

نے سوچا ہو گا کون اٹھ کر رات میں کلینک تک جائے، گھر میں بیٹھے بیٹھے جواب دے دیا گیا۔“

”میری دولت پر عیش کرتے ہو تم لوگ اور میرے حکم کی اس طرح حکم

ہوتی ہے۔“

”ہم لوگوں کی بات مت کرو بابا جان۔ ہم نے آپ کے کون سے حکم کی عدم

پہنچائی ہے۔“ گلزار علی شاہ بولا اور امیر علی شاہ غصے سے دانت پیسنے لگا پھر اس نے کہا۔

”اگر فیاض علی شاہ نے اس طرح میرے کسی حکم سے بے پروائی برتی ہے تو اسے اس

نتیجہ بھگتنا ہو گا۔“

”بابا جان ہمیں دوسرے انداز میں بھی سوچنا چاہئے ہو سکتا ہے کسی نئی سازش نے؟“

لیا ہو۔“ شاد علی شاہ بولا۔

”کیا سازش ہو سکتی ہے اور ہمارے خلاف کون سازش کر سکتا ہے، کوئی بات سمجھ

آئے، اس وقت تک کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا جب تک یہ بات ثابت نہ ہو جائے کہ فیاض

علی شاہ نے بے پروائی برتی ہے اور ہمیں صحیح تحقیقات کر کے جواب نہیں دیا۔“

”پھر بابا جان، جیسا آپ حکم کرو۔“

”وہ اگر آزاد ہو گیا ہے یا کلینک سے نکل بھاگا ہے تو آخر وہ چاہتا کیا ہے؟“

”جو چاہتا ہے وہ تو سامنے آچکا ہے بابا جان۔“

”کیا؟“

”ایاز بیگ کی رہائی۔“

واقعہ کیا ہوا تھا۔

امیر علی شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور اندرونی عمارت کی جانب بڑھ گیا۔ تھوڑے ہی لمحے کے پیچھے پیچھے چلنے لگے تھے۔ شاد علی اور گلزار علی شاہ بھی سنجیدہ صورت بنائے ہوئے تھے اور فیاض علی شاہ کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ اندر پہنچنے کے بعد اس نے ادب سے کہا۔

”میں پریشان ہو رہا ہوں بابا جانی۔ کیا بات ہے خیر تو ہے..... کیا ہو گیا؟“

امیر علی شاہ نے بیٹھ کر اسے حور تے ہوئے کہا۔

”فیاض علی شاہ رات کو تم سے کچھ کہا گیا تھا؟“

”جی بابا جانی.....“

”کیا کہا گیا تھا؟“

”مجھے حکم ملا تھا کہ میں فوراً ہی کلینک جاؤں اور جا کر یہ دیکھوں کہ کیا رحمان علی وہاں موجود ہے۔“

”ہاں..... تو پھر تم نے کیا کیا؟“

”میں اطلاع دے چکا ہوں بابا جانی۔ میں فوراً ہی کلینک پہنچا..... وہاں ڈیوٹی پر جو موجود تھا وہ مجھے جانتا تھا اور جب میں نے اس سے ہوشیاری سے کہا کہ میں رحمان علی نام دیکھنا چاہتا ہوں تو اس نے میری خواہش کی تکمیل کی اور میں خاموشی سے رحمان علی شاہ کمرے میں پہنچ گیا۔“

”کیا رحمان علی شاہ وہاں موجود تھا؟“

”موجود تھا بابا جانی۔“

”کیا تم نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا؟“

”بالکل قریب جا کر۔ وہ آرام سے گہری نیند سو رہا تھا..... البتہ میں نے اسے جگا کر کوشش نہیں کی تھی۔“

”صحیح بول رہے ہو۔“ امیر علی شاہ نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا اور فیاض کے چہرے حیرت کے نقوش پھیل گئے پھر اس نے کہا۔

”بابا جانی آپ سے جھوٹ بولنے کی اول تو مجھے کوئی ضرورت نہیں پیش آتی۔“

آپ کیا سمجھتے ہیں اگر ضرورت ہی پیش آئے مجھے تو میں سچ بات کہنے کے بجائے آپ کو کوئی جھوٹ بات بتاؤں گا۔“

”یہی تو حیرت کی بات ہے لیکن فیاض علی کہاں جا رہے تھے؟“

”ایک کام سے جا رہا تھا بابا جانی!“

”تو ضروری کام ہے؟“

”بالکل ضروری نہیں ہے آپ حکم دیجئے۔“

”جب تم میرے ساتھ ڈاکٹر کبیر کے کلینک چلو اور وہاں جا کر ڈیوٹی ڈاکٹر سے تصدیق کراؤ۔“

”میں تیار ہوں بابا جانی۔“

”آؤ ہمیں اس سلسلے میں دیر نہیں کرنی ہے۔“

راتے میں فیاض علی نے اپنے بھائیوں سے پوچھا۔ ”مگر یہ تو بتا دو معاملہ کیا ہے؟“

”یہ معاملہ بابا جانی ہی بتا سکتے ہیں۔“ شاد علی شاہ نے سر دلچھے میں کہا۔

”ابھی تو وقف کرو، بعد میں تمہیں تفصیل بتائی جائے گی۔ پہلے اپنے اس بیان کی تصدیق کرو کہ تم نے میری ہدایت پر جو تحقیق کی تھی وہ سچ تھی یا جھوٹ.....“ فیاض علی شاہ کے چہرے پر غصے کے آثار پھیل گئے، پھر وہ کلینک تک خاموش ہی رہا تھا۔

وہ ڈیوٹی ڈاکٹر اتفاق سے کسی امیر جنسی کی وجہ سے ابھی ڈیوٹی ادا کر کے واپس نہیں گیا تھا اور وہیں مل گیا تھا۔ چنانچہ فیاض علی نے اس کی جانب اشارہ کر دیا اور اسے آواز دینے کی کوشش کی لیکن امیر علی شاہ نے اسے روک دیا اور کہا۔

”تم یہیں روکو، میں خود تحقیق کروں گا۔“ پھر وہ خود گلزار علی شاہ کو لے کر اس ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا..... امیر علی شاہ کو دیکھ کر ڈاکٹر کھڑا ہو گیا تھا۔ امیر علی شاہ نے اسے دیکھتے ہوئے اس سے اس کا نام پوچھا اور جب اس کے نام کی تصدیق ہو گئی تو اس نے کہا۔

”مجھے پہچانتے ہو ڈاکٹر؟“

”جی شاہ صاحب بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں میں آپ کو اور آپ کے ان صاحب زادوں کو بھی۔“

”رات کو میرا بیٹا فیاض علی شاہ تمہارے پاس آیا تھا؟“

”ٹھیک ہے بابا جانی، اگر میں اتنا ہی ناقابل اعتبار ہو چکا ہوں تو پھر کسی سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”فیاض علی شاہ موقع کی نزاکت کو سمجھو۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر وہ یہاں موجود ہے تو پھر وہ کون تھا، جس نے گل باز خان اور خیر خان کو مارا، جو کٹھی میں نظر آیا اور جو میرا ہنٹر لے گیا۔ آخر وہ کون تھا کیا ہو سکتا ہے یہ سب کچھ اور کیا سازش جنم لے رہی ہے، کہیں اس میں ڈاکٹر کبیر کا ہاتھ تو نہیں ہے؟“

”پہلی بات تو یہ ہے بابا جانی کہ ڈاکٹر کبیر آپ کے خلاف کیوں سازش کرنے لگا ہے اس سازش سے کیا حاصل ہو گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر کبیر کی کیا سازش ہو سکتی ہے، آپ کو جس وقت وہ شخص نظر آیا تھا اس کے تھوڑی ہی دیر کے بعد رحمان علی شاہ کو یہاں دیکھا گیا تھا اور اب اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی ہے کہ اگر ایک منٹ کے اندر اندر کوئی شاہ پور سے یہاں تک آ سکتا ہے تو ذریعہ سفر کیا ہو گا۔ ہوائی جہاز بھی اتنی جلدی اترنے اور چڑھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔“

”یہی تو حیرت کی بات ہے، پھر کیا قصہ ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ امیر علی شاہ نے کہا۔

”بابا جانی کیا ہم لوگ یہاں سے نکلیں؟“ فیاض علی شاہ نے پوچھا، کیونکہ اسٹیرنگ پر وہی بیٹھا تھا۔

”نہیں تھوڑا رکو۔ ہمیں یہاں سے کوئی فیصلہ کرنے کے بعد نکلنا چاہئے۔“

”بھلا ہم کیا فیصلہ کر سکتے ہیں بابا جانی؟“

”فیصلہ ہمیں یہ کرنا ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا فوری قدم کیا ہو؟“

”فوری قدم ہو بھی کیا سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا، اگر صورت حال کچھ گڑبڑ ہے تو یہ گڑبڑ دوبارہ بھی ہو سکتی ہے، خیر خان اور گل باز کو قتل کرنے کی دھمکی دی گئی ہے اور اگر اس سلسلے میں کسی نے کامیابی حاصل کر لی تو الزام رحمان علی شاہ پر جائے گا اور اسے قاتل قرار دے دیا جائے گا۔ اوہو، یہ سازش تو خود رحمان علی شاہ کے خلاف بھی ہو سکتی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سازش کرنے والا کون ہے؟“

”جی شاہ صاحب!“

”وقت کیا ہوا تھا؟“ ڈاکٹر نے یاد کر کے وقت بتایا پھر بولا۔

”لیکن سر بات کیا ہے؟“

”کیا اس نے رحمان علی شاہ کے کمرے میں جا کر اس بات کی تصدیق کی تھی کہ رحمان علی شاہ کمرے میں موجود ہے۔“

”جی وہ میرے ساتھ ہی گئے تھے؟“

”رحمان علی شاہ اس وقت کمرے میں تھا۔“

”جی ہاں آرام کی نیند سو رہے تھے۔“

”ہوں۔ شکریہ ڈاکٹر۔ بس اتنا ہی معلوم کرنا تھا تم سے۔ ڈاکٹر کبیر موجود ہے؟“

”جی نہیں وہ آج لیٹ ہو گئے ہیں، ویسے صبح کو سنا ہے وہ راولپنڈی پر آئے تھے۔“

”اچھا..... ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔ کیا ابھی تک ڈیوٹی پر ہو؟“

”بس دس یا پندرہ منٹ کے بعد واپس چلا جاؤں گا۔ آپ حکم دیں تو رک جاؤں؟“

”نہیں تم اپنے معمولات کو جاری رکھو۔“ امیر علی شاہ کے انداز میں پھر تبدیلی رونے ہو گئی تھی۔ اس نے ایک لمحے سوچا پھر واپسی کا اشارہ کر کے اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ کارٹر بیٹھ کر اس نے کہا۔

”فیاض علی شاہ کی بات کی تصدیق ہو گئی ہے اور اب فیاض علی شاہ کو اصل صورت حال بتادو۔“

”بہتر ہے بابا جان۔“ گلزار نے کہا اور اس کے بعد فیاض کو تمام صورت حال بتا دیا لیکن فیاض اس صورت حال سے کافی ناخوش تھا اس نے خاموشی ہی اختیار کئے رکھی۔

”تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے فیاض علی شاہ۔“

”بابا جانی میں آپ لوگوں سے ناخوش ہو گیا ہوں۔ اس کا مقصد تو یہ ہوا کہ مجھ پر بھروسہ ختم کر دیا گیا ہے۔“

”ہم لوگ اس بات سے اس قدر الجھن کا شکار ہو گئے جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے فیاض علی شاہ یہ خیال آیا تھا میرے دل میں کہ ہو سکتا ہے زیادہ رات ہونے کی وجہ سے تم کا پہلی سوار ہو گئی ہو اور تم نے گھر بیٹھے ہی اس بات کی تصدیق کر دی ہو کہ وہ موجود ہے۔“

میں بیٹھے رہنے کی ہدایت کی۔ فیاض علی پر چونکہ اس نے شک کیا تھا اور اسے احساس تھا کہ فیاض علی اس کی بات کا برا مان گیا ہوگا، چنانچہ اس وقت اس نے فیاض علی کو اہمیت دینا ضروری سمجھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ڈاکٹر کبیر کے آفس میں داخل ہو گیا۔ ڈاکٹر کبیر ان لوگوں کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا پھر اس نے جلدی سے اٹھ کر ان کا خیر مقدم کیا اور پر جوش انداز میں ان سے مصافحہ کیا۔

”میرے تصور میں بھی نہیں تھا، امیر علی شاہ صاحب کہ آپ اس طرح بغیر کسی اطلاع کے تشریف لے آئیں گے، تشریف رکھئے، خیریت بتائیے؟“

امیر علی شاہ اور فیاض علی شاہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ امیر علی شاہ نے کہا۔

”سب خیر ہے ڈاکٹر صاحب بس آپ سے کچھ کام ہے۔“

”جی فرمائیے۔ حاضر ہوں۔“

”کیا کیفیت ہے اس کی۔“ امیر علی شاہ نے ڈاکٹر کبیر کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے جناب۔ ہنوز جیسے تھے دیئے ہی ہیں۔“

”ہوں، کہیں آنے جانے کی ضد تو نہیں کرتا؟“

”نہیں۔ بس یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب وہ فطرتاً ہی گوشہ نشین ہو گئے ہوں۔“

”آپ اس کی فطرت کو کیا جانو ڈاکٹر صاحب ہم اس کے باپ ہیں ہم جانتے ہیں اسے۔“

”جی یہ بالکل درست ہے، میں صرف ان چند دنوں کی بات کر رہا ہوں جب سے وہ میرے ساتھ ہیں۔“

”کوئی غیر آدمی تو اس سے ملنے نہیں آیا؟“

”نہیں بالکل نہیں۔“

”اور وہ بھی کبھی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا۔“

”اس کے بارے میں آپ کو بتا چکا ہوں۔“

”نہیں ہے ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے ہمارے ساتھ بڑا تعاون کیا۔ ہمارے لائق اگر کوئی خدمت ہو تو فوراً بتائیے گا، جس طرح آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے اسی طرح ہم بھی آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔“

”بے حد مہربانی۔ اگر کوئی مشکل پیش آئی تو ضرور آپ کی خدمت میں حاضری دوں گا۔“

”باباجان اور کوئی نام ذہن میں آتا ہے۔“

”ویسے تو اس سلسلے میں ہم غیث بیگ کے بارے میں بھی سوچ سکتے ہیں، کیونکہ لڑکپن ہی سے وہ بیگ کو تلاش کرنے کا کام شروع کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے غیث بیگ نے اس سلسلے میں کوئی کارروائی کی ہو، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کوئی ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔“

”اگر غیث بیگ اس قدر صاحب اختیار ہو گیا ہے، ہمارے خلاف کوئی سازش یا کارروائی کرے تو پھر جوہر خان کس مرض کی دوا ہے، ہم نے اسے اتنی مراعات سے نوازا ہے۔“

”میں نے کہا نا جب تک کوئی بات سمجھ میں نہ آجائے، جب تک کوئی صحیح فیصلہ ہو جائے کوئی بھی بات وثوق سے کہنا مشکل ہے۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اس وقت ہمیں رحمان علی شاہ کو اپنی تحویل میں لے لینا چاہئے، اگر کوئی سازش کی بھی گئی ہے تو اس کا توڑ یہی ہو سکتا ہے۔“

”رحمان علی شاہ کو کہاں لے جائیں گے آپ؟“

”شاہ پور۔“

”اور کیا یہ ایک خطرناک بات نہیں ہوگی؟“

”دیکھو میں اتنا کمزور نہیں ہوں۔ میں نے رحمان علی شاہ کو کوئی جسمانی نقصان پہنچانے کے بجائے اسے صرف ایک دماغی مریض کی حیثیت دے دی ہے، اگر میں اسے نقصان پہنچانے پر اتر آیا تو اسے زمین کے کسی گوشے میں پناہ نہیں ملے گی۔ میں اسے بے رکھوں گا اور اگر اس کی سرکشی حد سے آگے بڑھی ہوئی محسوس ہوئی تو پھر.....“ امیر علی شاہ غرا کر خاموش ہو گیا۔

”ٹھیک ہے باباجانی لیکن بات ہے قابل غور، غیث بیگ اگر کوئی سازش کر سکتا ہے

جوہر خان کے علم میں وہ سازش ضرور آئی چاہئے۔“

امیر علی شاہ نے چونک کر گلزار علی شاہ کو دیکھا اور بولا۔

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں لیکن ابھی خاموش ہو جاؤ اور پھر یہ خاموشی اس دن تک طاری رہی جب تک کہ ڈاکٹر کبیر کی کارکینٹک میں داخل نہ ہو گئی۔ ڈاکٹر کبیر نے لوگوں کو نہیں دیکھا تھا وہ اپنی کار سے نیچے اتر اور پروقار قدموں سے چلتا ہوا اندر کینٹک داخل ہو گیا۔ تب امیر علی شاہ نے فیاض علی شاہ کو اشارہ کیا اور باقی دونوں بیٹوں کو گارڈی

”نہیں شاہ پور چلو۔“ امیر علی شاہ نے بھاری لہجے میں جواب دیا۔



رحمان علی شاہ کچھ دن پہلے بدل اور مایوس تھا ایک طرح سے اسے مینٹل ہاسپٹل میں قید ہی کر دیا گیا تھا لیکن اگر وہ چاہتا تو اس قید سے فرار حاصل کر سکتا تھا۔ البتہ ڈاکٹر کبیر کے شریفانہ رویے نے اسے ایسا کوئی قدم اٹھانے کی ہمت نہ ہونے دی۔ خود بھی ایک شریف نوجوان تھا اور اپنے دوسرے بھائیوں اور باپ کی نسبت بالکل مختلف فطرت کا حامل۔ دوسری بات یہ کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب زندگی کے لئے کیا کیا جائے۔ باپ کے اختیارات سے بخوبی واقف تھا، زیادہ سے زیادہ کوئی جذباتی قدم اٹھا کر اپنے لئے پھانسی کا پھندہ تیار کر لیتا اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا، لیکن دل میں ہمیشہ جوار بھالے اٹھتے رہتے تھے اور وہ سوچتا تھا کہ اس کی وجہ سے ناہید پر جو گزری ہے اور مرزا غیاث بیگ کے خاندان پر جو قہر ٹوٹا ہے وہ بے حد افسوس ناک ہے لیکن اب کیا کیا جائے۔ شاید باہمت نوجوان نہیں تھا اور حالات سے شکست قبول کر لی تھی اس نے، لیکن ایک تحریک، بس ایک تحریک ہی زندگی ہوتی ہے اور یہی تحریک اگر پیدا ہو جائے تو پھر وہ کارنامے سرانجام کراتی ہے جن پر یقین نہ آئے اور اس تحریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ وہ اجنبی شخص اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا تھا جس کا عزم جس کی ہمت دیکھ کر رحمان علی شاہ کو رشک آتا تھا۔ پتا نہیں کون تھا، کیا تھا اور کیوں اپنے آپ کو اس نے ہلاکت میں ڈال لیا تھا۔ امیر علی شاہ کا راستہ کارنا کوئی آسان بات نہیں تھی، کوئی معمولی انسان اس کی جرات نہیں کر سکتا تھا، اگر وہ امیر علی شاہ سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہو، لیکن اب جب ایک غیر شخص نے اوکھلی میں سر ڈال دیا تھا تو وہ جس کا اپنا معاملہ تھا کیسے لا تعلق رہ سکتا تھا، جو واقعات پیش آئے تھے اس میں اس نے اپنی فطرت کے خلاف بڑی مستعدی اور ہمت کا ثبوت دیا تھا اور اب اسے خود پر کافی اعتماد ہو گیا تھا۔ وہ شہاب سے تعاون کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ واپس شہاب کے پاس ہی نہ پہنچتا لیکن فطرتاً ناپاس نہیں تھا، چنانچہ شہاب کے مشورے سے سب کچھ کرنا چاہتا تھا، نجانے کیوں اسے اس بات کی توقع تھی کہ اس واقعہ کے بعد امیر علی شاہ شدت سے متحرک ہو جائے گا اور اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا تھا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ امیر علی شاہ اس تک پہنچ گیا لیکن رحمان کو یہ توقع نہیں

”بس اب ہم اسے اپنے ساتھ لئے جا رہے ہیں۔“ امیر علی شاہ نے کہا اور ڈاکٹر کبیر چونک پڑا۔ ایک لمحے اس نے امیر علی شاہ کا چہرہ دیکھا پھر آہستہ سے بولا۔

”جو آپ کا حکم، میں نے تو پہلے بھی آپ کے حکم کی ہی تعمیل کی تھی۔ ویسے بھی انہیں ہسپتال کی ضرورت نہیں ہے، یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”جو کچھ ہم جانتے ہیں یا تم جانتے ہو ڈاکٹر، بس ہم جانتے ہیں اور تم جانتے ہو کیا سمجھے؟“

”سر میں نے آج تک آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔“

”ہاں ڈاکٹر تعمیل کرنے ہی میں عزت ہے، اچھا پھر انتظام کر دو فوراً اس کا۔ زیادہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔“

”جی بہتر۔ اس کا انتظام کچھ بھی نہیں کرنا۔ بس جو سامان ہے وہ پیک کرائے دینا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا اور نرس کو بلا کر اس سلسلے میں ہدایت کر دی، حالانکہ اس کے بدن میں سنسنی دوڑ رہی تھی، جن لوگوں نے اسے اپنے کام کے لئے آمادہ کیا تھا ان سے رابطہ کا ڈاکٹر کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا، نہ ہی انہوں نے اس سلسلے میں اسے کوئی ہدایت دی تھی، اب یہ نئی صورت حال پیش آرہی ہے تو اس سلسلے میں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، جب تک کہ ادھر سے رابطہ قائم نہ ہو۔ نہ ہی وہ امیر علی شاہ کو منع کر سکتا تھا پھر کچھ دیر کے بعد رحمان علی شاہ کو باہر لے آیا گیا، اس نے کسی قسم کی مداخلت یا مداخلت نہیں کی تھی۔ امیر علی شاہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں چلنا ہے ہمارے ساتھ، کیا سمجھے؟“

رحمان علی شاہ نے نگاہیں اٹھا کر باپ کو دیکھا اور پھر خاموشی سے گردن جھکا دی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی بے تعلقی چھائی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر سے سلام دعا کرنے کے بعد امیر علی شاہ نے اپنے دونوں بیٹوں کو گہری نگاہ سے دیکھا اور وہ درمیان میں رحمان علی شاہ کو بٹھا کر اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ فیاض علی شاہ نے اسٹیرنگ سنبھال لیا اور امیر علی شاہ اس کے براہ بیٹھ گیا۔ فیاض علی شاہ کو یہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کہ اسے اپنے سارے کا چھوڑ کر خاموشی سے امیر علی شاہ کے ساتھ شاہ پور چلنا ہے اس نے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھائی البتہ باہر نکال کر اس نے پوچھا تھا۔

”بابا جانی شاہ پور چلنا ہے یا میری رہائش گاہ پر؟“

کمرے میں آگیا جسے نشست گاہ کے لئے تیار کر لیا گیا تھا، ایک صوفے پر بیٹھ کر اس نے اسے سامنے بٹھایا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”تجھے کیا ہوا ہے؟“ اس نے غرائی ہوئی آواز میں پوچھا، لیکن رحمان علی شاہ گردن جھکائے بیٹھا رہا، اس کے چہرے پر سہمے سہمے تاثرات تھے۔

”کیا ہو گیا ہے اسے؟“ امیر علی شاہ نے فیاض سے پوچھا۔

”بابا جانی کچھ پوچھ رہے ہیں جواب دو۔“ فیاض علی شاہ بولا اور رحمان علی شاہ نے سہمی ہوئی آنکھیں اوپر اٹھائیں، ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑایا۔ ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور اس کے بعد دوبارہ گردن جھکالی۔ امیر علی شاہ نے حیرت سے اپنے تینوں بیٹوں کو دیکھا اور بولا۔

”کیا بات ہے، کیا اسے کوئی دوائی استعمال کرائی جاتی رہی ہے؟“

”پتا نہیں بابا جانی۔“ امیر علی شاہ کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے، کچھ دیر وہ سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔

”رحمان میں تجھ سے کچھ پوچھ رہا ہوں گردن اوپر اٹھا۔“ رحمان علی شاہ نے پھر بہترین ادکاری کرتے ہوئے گردن اوپر اٹھائی، باپ کا چہرہ دیکھا اور پھر گردن جھکالی۔

”وہاں تیرے ساتھ کیا سلوک ہوا؟“ امیر علی شاہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بابا جان، کچھ بھی نہیں۔“ رحمان علی شاہ اتنی مدہم آواز میں بولا کہ امیر علی شاہ کی سمجھ میں بہ مشکل اس کے الفاظ آ سکے، امیر علی شاہ نے پھر حیرانی سے اس کو دیکھا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

”میں پوچھتا ہوں کیا ہوا ہے تجھے؟“

”مجھے کچھ نہیں ہوا بابا جان میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ پھر اسی مدہم آواز میں بولا۔

”زور سے کیوں نہیں بولتا؟“

”میں کسی سے زور سے نہیں بولتا بابا جانی، مجھ سے زور سے بولا نہیں جاتا۔“ وہ پھر بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا اور امیر علی شاہ نے غرائی ہوئے انداز میں فیاض علی شاہ سے کہا۔

”تو نے کیا اس کا وہاں خیال نہیں رکھا تھا؟“

تھی کہ وہ اسے کلینک سے ہی نکال لے گا، جب اسے یہ اطلاع ملی اور سوچنے کے لئے صرف ایک لمحہ درکار ہوا تھا تو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ امیر علی شاہ سے انحراف نہیں کرے گا، خاموشی سے اس کے ساتھ چلا جائے گا، البتہ شہاب نے ٹرانسمیٹر کی حفاظت کے لئے اس سے کہا تھا اور اگر شہاب سے رابطہ ٹوٹنے کا خدشہ ہوا تو پھر وہ عمل کرنا پڑے گا جو بہتوں کے لئے ناخوشگوار اور خطرناک ہو گا لیکن اس دوران کے لئے اس نے لائحہ عمل پوری طرح مرتب کر لیا تھا، اسے بہترین ادکاری کا مظاہرہ کرنا تھا اور اس نے یہ مظاہرہ شروع بھی کر دیا تھا، چنانچہ اس کے دونوں بھائی دشمنوں کی مانند اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، باپ اور تیرا بھائی سامنے تھے لیکن وہ ان سب سے بے پروا، آنکھیں بند کئے، گردن جھکائے ان دونوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا اور اس نے بدن کو اس طرح ڈھیلا ڈھالا چھوڑ دیا تھا جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ ہو، پھر شاہ پور تک کا پورا راستہ اس نے اس نیم غنودگی کیفیت میں طے کیا تھا، لیکن ذہن میں لاتعداد منصوبے بن رہے تھے اور وہ اپنے آئندہ اقدامات انہی منصوبوں کے تحت کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت چار شاطروں سے مقابلہ تھا حالانکہ وہ اپنا خون تھے لیکن اپنا خون دشمن خون نظر آ رہا تھا اور اسے ان دشمنوں سے نمٹنا تھا۔

”کیا یہ سورہا ہے۔“ شاہ پور پہنچنے کے بعد امیر علی کو ہوش آیا تھا۔

”پتا نہیں بابا جانی۔“ شاد علی نے جواب دیا۔

”ہوں۔ شرمندہ معلوم ہوتا ہے۔“ امیر علی نے خود ہی کہا۔ بیٹوں نے اس پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد کاررک گئی۔ اسے حویلی نہیں لے جایا گیا تھا بلکہ ایک اور جگہ کاررک کی تھی۔

ان لوگوں نے اسے کاررے اتارا، یہ مکان شاہ پور کے نواحی علاقے میں امیر علی شاہ کی زمینوں پر بنا ہوا تھا، اس سے تھوڑے فاصلے پر امیر علی شاہ کا ایک فارم ہاؤس بھی تھا اور رحمان علی شاہ کئی بار یہاں آچکا تھا۔ نیچے اترتے ہوئے بھی اس نے کسی قسم کا کوئی تعرض نہیں کیا اور جب اسے کاررے نیچے اتارا گیا تو وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا، پھر شاد علی نے اس کا بازو پکڑا اور وہ اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا، امیر علی شاہ بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا، لیکن رحمان نے ایک بار بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی اس نے اپنا انداز برقرار رکھا تھا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اندر پہنچ گئے، امیر علی شاہ اس بڑے

اداکاری سنی دیر چلتی ہے، تم لوگ اسے یہیں بند کر دو، رات کو ہم اسے حویلی میں منتقل کر دیں گے اور اس دوران گلزار تم اور شاد علی شاہ تم اس کے آس پاس ہی رہو، کڑی نظر رکھنا اس پر، اگر یہ بھاگنے کی کوشش کرے تو اس کے پاؤں زخمی کر دینا، میں تمہیں اس کی اجازت دیتا ہوں۔“

”نہی ہے بابا جانی اسے اندر والے کمرے میں بند کر دیا جائے۔“ گلزار علی شاہ نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد رحمان علی شاہ کو اندرونی کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ ایک ایسا کمرہ تھا جس سے بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا، پھر رحمان علی شاہ کو یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ امیر علی شاہ اور باقی بھائی ہیں یا چلے گئے ہیں، لیکن وہ اپنے بھائیوں کی غنڈی پر غور کر رہا تھا، باپ تو دیوانہ تھا ہی، اس کی ساری زندگی رحمان علی شاہ کے علم میں تھی، انسانوں پر رحم کرنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا، گھر پر بھی اس نے ایک ڈکینیٹر شپ قائم کر رکھی تھی۔ جو اس کے احکامات کا بندہ ہو اس کے لئے جینے کے بہتر مواقع تھے اور جس نے بھی اس سے انحراف کیا اس پر عرصہ حیات تنگ، لیکن اپنے بھائیوں پر اسے سخت غم ہو رہا تھا جو دشمنوں سے بدتر تھے، اس کے لئے بہر حال صبر و سکون سے ان لمحات سے گزرتا تھا اور اس نے اپنے آپ کو اس کے لئے پوری طرح تیار کر لیا تھا، چنانچہ بقیہ وقت اس نے خاموشی سے اسی کمرے میں ایک جگہ بیٹھ بیٹھ گزار دیا۔ اسے پانی تک کے لئے نہیں پوچھا گیا تھا حالانکہ وہ سخت پیاسا تھا اور رات کو اسے بھوک بھی لگنے لگی تھی، باہر بھائی موجود تھے، لیکن اس اداکاری کو قائم رکھنا اس کے لئے بے حد ضروری تھا، ماں کا غائب اس بارے میں اطلاع بھی نہیں دی گئی ہو گی کیونکہ بہر طور ماں، ماں تھی اور اس کا اندازہ وہ بخوبی لگا چکا تھا، باقی یہاں اس گھر میں اس کا کوئی اور ہمدرد نہیں تھا، وقت گزر تا رہا اور پھر اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تھے جب اسے باہر نکالا گیا اور کھانے پینے کے لئے دیا گیا۔ کھانے کی ٹرے اس کے سامنے آئی تو وہ خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ یہاں اداکاری مناسب نہیں تھی کیونکہ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے اور جسم کی توانائی برقرار رکھنے کے لئے خوراک بے حد ضروری ہوتی ہے۔ وہ دنیا سے بے نیاز کھانے میں مصروف رہا۔ پانی کا گلاس بھی پیا اور پھر جس جگہ بیٹھا تھا وہیں کروٹ لے کر دروازہ ہو گیا، لیکن گلزار علی شاہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں کیا خیال رکھتا بابا جانی، آپ نے اسے ڈاکٹر کبیر کے حوالے کر دیا ہے۔“
”مجھے تو کچھ اور ہی نگ رہا ہے۔“
”کیا؟“

”ڈاکٹر کبیر نے اسے قابو میں رکھنے کے لئے کوئی ایسی نشہ آور شے دینا شروع کر دی
ہو گی جس نے اس کے اعصاب متاثر کر دیئے ہیں، یہ توجہ مچ ہی پاگل ہو گیا ہے۔“
”ہو سکتا ہے بابا جانی، بہر طور وہ بھی مجبور تھا اسے آپ کے احکامات کی تعمیل کرنی تھی اور اس کی سرکشی کو بھی روکنا تھا۔“
”مگر یہ اس نے اچھا نہیں کیا۔“

”اب اچھا کیا ہو یا برا، یہ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں۔“
”اس نے مجھ سے بدلہ لے لیا ہے، میں نے اسے جس کام کے لئے مجبور کیا تھا اسے اس نے ایک ایسی شکل دے دی ہے کہ مجھے اس پر خون کے آنسو رونا پڑے۔“
”آپ اس کے لئے خون کے آنسو رو رہے ہیں بابا جانی جس نے آپ پر گولی چلائی تھی؟“ گلزار علی شاہ نے کہا اور امیر علی شاہ کا موڈ پھر بدل گیا۔ اس نے گلزار علی شاہ کو دیکھا اور پھر رحمان علی شاہ کو، رحمان علی شاہ کی گردن اسی طرح جھکی ہوئی تھی، پھر وہ کراخت لے لے میں بولا۔

”اوائے حال تو اس کا اس سے بھی برا ہونا چاہئے تھا، باپ ہوں اس لئے میں نے اسے موت کی سزا نہیں دی، ورنہ اچھی طرح بتا دیتا کہ میں کیا چیز ہوں، لیکن یہ..... یہ کہیں اداکاری تو نہیں کر رہا ہے بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے ہمیں۔“

”ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے بابا جانی آپ نے خود ہی یہ اپنے منہ سے کہہ دیا، ہلا بھی یہی خیال ہے، ورنہ پھر یہ اس طرح کیسے حویلی میں آتا اور آپ کا ہنر لے کر گل بازاء خیر خان کو مارتا۔“ گلزار علی شاہ بولا۔ امیر علی شاہ، فیاض علی اور شاد علی شاہ بھی رحمان علی شاہ کی صورت دیکھ رہے تھے، لیکن وہ ان لوگوں کی گفتگو سے بے تعلق، بدستور مجذوبوں کے سے انداز میں گردن جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے بھی لگتا تھا، جب امیر علی شاہ نے کہا۔

”اگر یہ اداکاری کر رہا ہے تو میں اس سے بڑا اداکار ہوں میں دیکھوں گا کہ اس کی:

اس نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوائے تجھے کیا ہو گیا ہے کچھ منہ سے نہیں پھوٹے گا، شاد علی روٹی کھائی اس نے؟“

”جی باباجانی، کھانا کھلایا گیا ہے۔“

”اوائے اس کا خیال رکھو، میں اس ڈاکٹر کے بچے سے اس کی اس کیفیت کے بارے میں ضرور معلوم کروں گا، اگر اس نے ایسا کوئی قدم اٹھایا ہے تو میری اجازت کے بغیر اٹھایا ہے، اسے یہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”میرا خیال ہے باباجانی ایک طرح سے یہ ٹھیک ہی ہے۔“

شاد علی نے کہا۔

”اوائے کیسے ٹھیک ہے؟“

”اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ نجانے کیا کر بیٹھتا؟“

”اوائے وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن پھر وہ کون تھا؟“

”یہ تو ہمیں معلوم کرنا ہو گا باباجانی۔“ شاد علی نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ کوئی لمبا کھیل کھیلا جا رہا ہے، ویسے تم لوگوں نے اسے پوری طرح چیک کر لیا تھا۔“

”سارا دن چیک کرتے رہے ہیں باباجانی، لیکن اس کی یہ کیفیت حقیقی ہے۔“

”اوائے یہ مر تو نہیں جائے گا؟“

”پتا نہیں باباجانی، اب اس کا تو اندازہ ہی لگانا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں، ذمہ داری کس نے لی ہے اس کی۔“

”رات کی ڈیوٹی تو میری ہے باباجانی۔“

”صحیح طریقے سے ڈیوٹی انجام دینا، تم لوگوں نے مجھے بالکل مروادیا ہے، نجانے تقدیر

میں کیا لکھا ہے۔“ امیر علی شاہ نے کہا۔

”آپ فکر نہ کریں باباجانی، ہم لوگ مستعد رہیں گے۔“ شاد علی نے کہا اور امیر علی شاہ

وہاں سے واپس چلا گیا۔ رحمان علی شاہ کا دل اندر سے رورہا تھا، یہ کیسے سکے بھائی ہیں اس کے،

کیا فطرت پائی ہے انہوں نے، محبت کا کوئی عنصر نہیں ہے ان کے دل میں، خون کی کوئی کشش

باقی نہیں رہی ہے، وہ اس سے ایسا سلوک کر رہے ہیں جیسا اجنبی دشمنوں سے کیا جاتا ہے،

”نہیں..... یہاں نہیں، تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔“ وہ بڑبڑانے کے ساتھ
میں کچھ بولا اور اس کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ایک بند گاڑی میں سفر شروع کر دیا گیا۔ رحمان علی شاہ نہیں جانتا تھا کہ اب نئی منزل کون سی ہے۔

وہ صبر و سکون سے یہ سفر کرتا رہا، پھر کچھ دیر کے بعد گاڑی رکی اور اسے نیچے اتارا۔ وہ لوگ اس کی حرکات و سکنات کا مسلسل جائزہ لے رہے تھے، لیکن اس نے بھی طے کر لیا تھا کہ کسی کو اپنی صحیح کیفیت کا اندازہ نہیں ہونے دے گا۔ یہ طریقہ کار اس کے لئے

شاندار ثابت ہوا تھا۔ کم از کم اسے ان کے سامنے زبان کھولنے کی ضرورت نہیں پیش

تھی۔ اگر وہ کوئی سوال کرتے بھی تو وہ اس انداز میں جواب دیتا کہ آدھا جواب ان کی سمجھ

آئے اور آدھا نہ آئے، لیکن اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ بے چارے ڈاکٹر کبیر کی شامت

سلسلے میں بھی آسکتی ہے، وہ لوگ اس سے ضرور یہ سوال کریں گے کہ کیا اس نے کوئی ایک

اسے دی ہے جس نے اس سے اس کے حواس چھین لئے ہیں، بہر حال یہ عارضی معاملہ

اس کے بعد تو اسے باعمل ہونا ہی تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرتے ہوئے اسے اندازہ ہو گیا کہ

اپنی حویلی میں ہے، وہ اسے حویلی کے دوسرے حصے میں لئے جا رہے تھے اور پھر ایک کمر

میں پہنچنے کے بعد اسے سیڑھیوں سے نیچے اتارا جانے لگا اور اس کے دل میں ایک موہو

خواہش بیدار ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ حویلی میں ایسے تہہ خانے موجود ہیں جن میں سے

علم صرف امیر علی شاہ کو ہی ہے، ہو سکتا ہے اس وقت وہ اسے کسی ایسے ہی تہہ خانے میں

جا رہے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہی تہہ خانوں میں ایاز بیگ بھی موجود ہو، اگر

ہو جائے تو واقعی لطف آجائے۔ یہ جگہ بھی اس کے لئے اجنبی تھی، یہیں پیدا ہوا، یہیں

بڑھا، لیکن اس تہہ خانے کی سیڑھیاں اس نے کبھی طے نہیں کی تھیں۔ دوسرے چار

خانوں کے بارے میں اسے البتہ معلوم تھا پھر وہ اسے ایک ہال نما جگہ لے گئے جس کے

پورشن بنے ہوئے تھے، ایک کمرے جیسا تھا جس میں بستر وغیرہ پڑا ہوا تھا، اسے یہاں

کر دیا گیا۔ یہاں غسل خانہ بھی تھا، پانی وغیرہ کا بھی معقول انتظام تھا اور ایک ایسا چھوٹا

دان بھی جس سے مدہم مدہم روشنی اندر آرہی تھی اور یہاں سے ستارے دیکھے جاسکتے

لیکن ابھی اس نے یہ غور نہیں کیا تھا کہ یہ تہہ خانہ کون سے علاقے میں ہے اور پرک

کون سی ہے، اسے بستر پر بٹھایا گیا تو وہ بیٹھ گیا پھر امیر علی شاہ دروازے سے اندر داخل

کردل میں یہ امید جاگی تھی کہ شاید میری ربائی کا کوئی بندوبست ہو جائے، مجھے اور کوئی پروا نہیں ہے، یہ لوگ ہزار بار مجھے مار دیں، لیکن بس میرے ماں باپ محفوظ رہیں، مجھے ان کا پتا ٹھکانہ معلوم ہو جائے آہ کاش.....“ ایاز بیگ وہاں سے چلا گیا۔ رحمان علی شاہ قدموں کی چاپ سے یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور پھر اسے یہ یقین ہو گیا کہ ایاز بیگ کو انہی تہ خانوں میں رکھا گیا ہے، یہ اندازہ بھی ہوا تھا اسے کہ ایاز بیگ کو یقیناً اس کے پاس اسی لئے پہنچایا گیا ہے کہ اس کی اصلیت معلوم ہو جائے، لیکن اس نے صبر و سکون سے اپنے ڈرامے کو جاری رکھا تھا۔ تھوڑا سا وقت، بس تھوڑا سا وقت گزار لیا جائے ہمت کے ساتھ، اس کے بعد حالات اس کے قابو میں ہوں گے اور وہ اپنے آپ کو اس وقت کے لئے پوری طرح مستعد رکھے ہوئے تھا۔

رات آدمی سے زیادہ گزر گئی، لیکن نیند کا اس کی آنکھوں میں شائبہ بھی نہیں تھا، شہاب کے بارے میں بھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ شہاب کو یقیناً پوری تفصیل کا علم ہو گیا ہو گا اور وہ ٹرانسمیٹر پر اس سے رابطے کا منتظر ہو گا، لیکن اسے شہاب کے الفاظ بھی یاد تھے جن میں اس نے کہا تھا کہ ٹرانسمیٹر کا استعمال انہی لمحات میں موزوں ہو گا جب مکمل تنہائی ہے، ورنہ شہاب اس سے خود بھی رابطہ قائم کر سکتا تھا وہ بھی محتاط آدمی ہے اور اس پر پورا پورا اعتبار بھی کرتا ہے۔

پھر وہ اپنی جگہ سے آہستہ سے اٹھا، انداز مجہولوں کا سا تھا، سب سے زیادہ اسے اس روشن دان کی فکر تھی جس میں سے روشنی اندر چھن رہی تھی، اگر کوئی اس کا نگران ہو سکتا ہے تو روشن دان ہی سے اس کا جائزہ لے سکتا ہے اور کوئی ایسی جگہ یہاں بظاہر نظر نہیں آرہی تھی، سوائے ان دروازوں کے، چنانچہ وہ اٹھنے کے بعد آہستہ آہستہ چلتا ہوا غسل خانے کی طرف بڑھ گیا اور پھر غسل خانے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا، اندر لائٹ لگی ہوئی تھی اس نے روشنی تک نہیں جلائی تھی اور غسل خانے میں کھڑے ہو کر جائزہ لیتا رہا پھر اس نے فوراً ہی ٹرانسمیٹر نکال لیا اور شہاب کے بتائے ہوئے طریقہ کار کے مطابق اس کا بٹن دبا دیا۔

پنہی لمحات کے بعد اسے شہاب کی آواز سنائی دی۔

”ہاں رحمان علی شاہ کہو کس پوزیشن میں ہو؟“

”سر، آپ کو میری آواز صاف سنائی دے رہی ہے؟“

”ہاں بالکل۔“

کیوں آخر کیوں، لیکن اس کیوں کا جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ بہر حال الفاظ اس نے سن لئے تھے، شاد علی کو اس کی نگرانی پر مامور کر دیا گیا تھا۔ بڑا محتاط رہنا پڑے گا، پھر شاد علی بھی چلا گیا اور وہ بستر پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا، ابھی اسے خاصا محتاط رہ کر کام کرنا تھا، کافی دیر اسی طرح گزر گئی اس نے بستر پر جنبش نہیں کی تھی، اپنے بھائیوں کی فطرت کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتا تھا، یہ لوگ بھی مستعد لوگ نہیں تھے، رات کے کسی ایسے پہر کا انتظار کرنا پڑے گا جب وہ لوگ غافل ہو جائیں لیکن بہت زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی، وہ خاموشی سے سیدھا سیدھا لیٹا رہا، کوئی اس کے قریب پہنچا تھا اور پھر بے اختیار اس کے پاس بیٹھ گیا تھا، پھر اس کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

”ارے رحمان بھائی، رحمان علی شاہ صاحب۔“ اور یہ آواز سن کر اس کے پورے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے، یہ ایاز بیگ ہی کی آواز تھی، لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا، ہوشیاری ہی زندگی کی ضمانت ہے، ہو سکتا ہے اس وقت بھی بہت سی آنکھیں اس کی نگرانی کر رہی ہوں اور یہ جائزہ لینا چاہتی ہوں کہ ایاز بیگ سے ملاقات اس پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے، اپنے آپ کو سنبھالنا تھا، اپنے آپ کو کنٹرول کرنا تھا، اگر ایسا نہ ہوا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا اور وہ کھیل کسی قیمت بگاڑنا نہیں چاہتا تھا، چنانچہ وہ اسی طرح ساکت و جامد پڑا رہا۔

”رحمان بھائی آپ، آپ یہاں کیسے آگئے، آپ کہاں تھے، آپ کو پتا نہیں مجھ پر کیا قیامت ٹوٹی ہے، امیر علی شاہ صاحب نے مجھے کھیتوں سے اٹھوایا تھا اور اس کے بعد نجانبہ کہاں کہاں رکھا گیا مجھے اور اب میں ایک طویل عرصے سے یہاں قید ہوں، یہ لوگ مجھے مارتے بھی ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ اگر میں نے کوئی حرکت کی اور یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تو مجھے جان سے مار دیا جائے گا، رحمان بھائی میری مدد کیجئے، میرے ماں باپ کس حال میں ہیں میری بہن کس حال میں ہے۔“ ایاز بیگ رونے لگا لیکن اس نے کوئی جنبش نہیں کی اور اسی طرح خاموش پڑا رہا۔ وہ بہترین اداکاری کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اپنے دشمنوں کو ہر قیمت پر شکست دینا چاہتا تھا، ایاز بیگ نے پھر کہا۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے، آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ پھر وہ کافی دیر تک رحمان علی شاہ کے پاس بیٹھا رہا تھا اور پھر آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میری تقدیر کے ستارے ابھی گردش میں ہیں، آہ آپ کو دیکھ

”بہتر ہے۔“

”او کے رحمان، اب سب کچھ تمہاری ہوشیاری پر منحصر ہے..... دیے رحمان اب ایک سوال کرنا چاہتا ہوں تم سے۔“

”ضرور سر۔“

”ظاہر ہے میں تمہارے دشمنوں کے خلاف کام کر رہا ہوں لیکن بد قسمتی سے تمہارے پیغمبر تمہارے اپنے باپ اور بھائی ہیں مجھے ان کے خلاف بہت کچھ کرنا ہو گا۔“

”سر..... آپ میرے ساتھ ان کے رویے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آپ یقین کیجئے میں اپنے خون سے اس بے اعتنائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب میرے دل میں ان کے لئے نفرت اور انتقام کے جذبے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔“

”بہر حال! اچھا خدا حافظ۔“

”خدا حافظ.....“ رحمان نے ٹرانسمیٹر بند کر دیا..... اس کے سر کا بوجھ بالکل ہلکا ہو گیا تھا اور اب وہ بالکل مطمئن تھا۔



شہاب کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا..... اس کی محنت کا پھل مل گیا تھا..... حالانکہ نہ تو کوئی پولیس کیس تھا..... نہ ہی اس پر اس کی کوئی ذمہ داری تھی لیکن اس کیس پر کام کرنا اس کی زندگی کے سب سے بڑے مشن کا حصہ تھا..... اسے ایاز بیگ کا پتا چل جانے پر بے حد خوش ہوئی تھی..... ویسے وہ رحمان علی شاہ کو واپس بھیج کر غافل نہیں ہو گیا تھا۔ اسے اس خطرناک عمل کے رد عمل کا انتظار تھا اور اس کے لئے اس نے ڈبل اوگینگ کے ارکان کی ڈیوٹیاں اب ٹھیک پر لگادی تھیں، چنانچہ دن میں سردار علی نے اسے اطلاع دی کہ رحمان علی کو امیر علی شاہ اور اس کے بیٹے لے گئے ہیں۔ شہاب نے اس اطلاع پر مطمئن انداز میں گردن ہلائی تھی پھر کوئی ایک گھنٹے کے بعد اس نے ڈاکٹر کبیر سے ڈبل کر اس کے حوالے سے بات کی تھی اور ڈاکٹر کبیر نے بدحواس لہجے میں اسے بتایا تھا کہ امیر علی، رحمان علی شاہ کو لے گیا۔

”تھنک یو ڈاکٹر..... ہم آپ کے اس بہترین تعاون کو ہمیشہ یاد رکھیں گے..... اب شاید اس سلسلے میں آپ کی کوئی خاص ضرورت پیش نہیں آئے گی..... زیادہ سے زیادہ جب امیر علی شاہ پر مقدمہ چلے گا تو آپ کو ایک بار گواہی کے لئے پیش ہونا پڑے گا۔“

”سر بڑے سنگین حالات ہو چکے ہیں، میں بڑی دلچسپ سچویشن سے گزر رہا ہوں۔“

”میں اس سچویشن کی تفصیل معلوم کرنا چاہتا تھا، لیکن میں نے مکمل احتیاط برتی ہے اور یہ فیصلہ کر لیا تھا میں نے کہ جب تک تمہاری طرف سے مجھے مخاطب نہیں کیا جائے گا میں تمہیں مخاطب نہیں کروں گا۔“

”میں خود مضطرب تھا، بہر حال اب میں آپ کو پوری تفصیل بتا کر ہدایت لینا چاہتا ہوں۔“

”ہاں.....“ تفصیل بتاؤ۔“ شہاب کی آواز سنائی دی اور رحمان علی شاہ نے اسے (الف) سے لے کر (ی) تک پوری کہانی سنادی۔ شہاب خاموشی سے سنتا رہا تھا..... وہ خاموش ہوا تو شہاب نے کہا۔

”تم بے حد ذہین نوجوان ہو رحمان علی شاہ..... تم نے تو یہ کام بے حد آسان کر لیا۔“

”سر آپ میرے عمل سے مطمئن ہیں۔“

”بے حد مطمئن۔“

”اب مجھے بتائیے میں کیا کروں؟“

”بڑی صبر آزمائہ داری تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔“

”فرمائیے۔“

”اپنی اس اداکاری کو جاری رکھو۔ انہیں اس بات کا اطمینان دلادو کہ تم بے ضرر ہو اور وہ تم نہیں تھے۔“

”بہتر ہے..... ایاز بیگ کے لئے کیا حکم ہے۔“

”ہماری سب سے بڑی کامیابی اس کے بارے میں معلومات ہے، میرے خیال میں اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”کوئی امکان نہیں نظر آتا۔“

”تب اسے نظر انداز کرو..... مطلب یہ کہ اس کا بھی وہی طریقہ جاری رکھو۔“

”بہتر ہے سر..... مجھے سب سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ آپ صورت حال سے آگاہ ہیں یا نہیں۔“

”میں پوری طرح آگاہ ہوں۔“

”کورٹ میں ہیں۔“
”تم نہیں گئیں؟“

”نہیں..... میں کچھ دفتری کام کر رہی تھی۔“
”اور اگر میں ان کاموں میں مداخلت کروں تو.....“
”مجھے خوشی ہوگی۔“ بینا نے جواب دیا۔

”ویری گڈ، تم جیسی ساتھی کا ملنا بھی مشکل ہے مینا اگر تمہیں پریشان کیا جائے تو تم خوش ہوتی ہو۔“

”جی سر۔“ بینا نے آہستہ سے کہا۔

”تو پھر پریشان ہو جاؤ۔“

”جی میں سمجھی نہیں۔“

”ٹیکسی کر کے کریم سوسائٹی آنا پڑے گا۔“

”سر میں حاضر ہو جاتی ہوں۔“

”میں انتظار کر رہا ہوں۔“ شہاب نے کہا اور ٹیلی فون بند کر دیا، بینا بہت مستعد تھی اس نے پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی، شہاب نے اس کا پر جوش خیر مقدم کیا اور بولا۔
”میں نے تمہارے لئے کافی اور سینڈوچ تیار کر کے رکھے ہیں۔“

”ارے سر میں تو آ رہی تھی آپ نے کیوں زحمت کی۔“

”بس کبھی کبھی زحمت کر لینی چاہئے۔“

”تھینک یو سر آپ بیٹھے میں نکال کر لاتی ہوں۔“

”ناشتا کیا تھا؟“

”جی سر کیا تھا لیکن اب کافی وقت گزر چکا ہے اور ہلکی ہلکی بھوک بھی لگ رہی ہے۔“
سینڈوچ اور کافی سے شغل کرنے کے بعد شہاب نے کہا۔

”تم نے مجھ سے رحمان علی شاہ کے کیس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔“

”سرسلسل انتظار میں رہی ہوں لیکن اس اطمینان کے ساتھ کہ جب بھی آپ میری ضرورت محسوس کریں گے مجھے ضرور کال کر لیں گے۔“

”بہت اعتماد ہو گیا ہے تمہیں مجھ پر مینا۔“

”آپ کے تعاون سے میں یہ کام کرنے کے لئے تیار ہوں سر..... میری تو خوشی ہے کہ میں آپ کے کسی کام آسکا۔“

”بے حد شکریہ ڈاکٹر، ایک اچھے شہری سے ہم اسی تعاون کی توقع رکھتے ہیں، اور آپ آرام کیجئے اس کے باوجود کہ ہمارا آپ کا رابطہ تقریباً ختم ہو چکا ہے لیکن پھر بھی آپ کو مسلسل فون کر کے آپ کی خیریت معلوم کرتا رہوں گا۔“

”بہت بہت شکریہ جناب۔“ شہاب نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا لیکن اب اسے شہر سے رحمان علی شاہ کی طرف سے ٹرانسمیٹر پر کال کا انتظار تھا وہ جانتا تھا کہ رحمان علی شاہ ابتدائی وقت تو بڑا مشکل گزرے گا دیکھیں کس طرح وہ حالات کو کنٹرول کرتا ہے، ہاتھ جرم کی دنیا کا انسان نہیں تھا، لیکن پھر بھی اس نے جو کچھ اب تک کیا تھا وہ اطمینان بخش تھا اب اس کٹھن مرحلے سے وہ کیسے نمٹتا ہے اسی پر آگے کے تمام پروگرام کا انحصار تھا اور اس کے لئے شہاب کو بڑی مشقت کرنا پڑی، دن میں بھی منتظر رہا اور تھانے میں بھی اس نے آپ کو اس کال کے لئے مستعد رکھا اور گل زمان وغیرہ کو زیادہ لفٹ نہیں دی تاکہ وہ قریب موجود نہ رہیں، پھر رات کو گھر واپس آگیا..... تھوڑی دیر کے لئے فتح محمد کی خدمت پر حاضری دی اور اس سے باتیں کرتا رہا، پھر تقریباً اسے رات بھر ہی جاگنا پڑا تھا، تب کہیں اسے رحمان علی شاہ کی طرف سے کال موصول ہوئی تھی اور یہ اس کی محنت کا صلہ تھا اس کے بعد وہ انتہائی مسرور ہو گیا تھا، پھر چند گھنٹوں کے لئے سونا نصیب ہوا اور صبح کو خاصا سے جاگا۔ گل زمان سے ٹیلی فون پر بات چیت کی اور بتا دیا کہ کچھ مصروفیات ہیں جن کی بنا پر تھانے کسی بھی وقت پہنچے گا وہاں اس کا انتظار نہ کیا جائے، حالات بھی معلوم کئے اور پھر اس سے کریم سوسائٹی چل پڑا، یہ جگہ اس کے لئے ایک بڑی نعمت تھی اور یہاں سے بہت کام بہ آسانی کئے جاسکتے تھے، اس جگہ کے بارے میں اس کے ذہن میں بہت سے منصوبے تھے جنہیں وہ رفتہ رفتہ پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا یہاں سے اس نے سب سے پہلے عدالت کی داسٹی کے دفتر فون کیا، فون بینا نے وصول کیا تھا..... شہاب کی آواز پہچان کر خوش ہو گئی۔
”سر خیریت ہے۔“

”بالکل خیریت ہے مینا، خوشی کی بات ہے کہ تم دفتر میں مل گئیں، کیا واسطی صاب موجود نہیں ہیں۔“

”اور تم میری معاونت کرنا چاہتی ہو۔“ شہاب نے غیر متوقع جملہ کہا جو بینا کی سمجھ میں

نہ آسکا۔ ”سچی نہیں سر؟“

”ایسی دولت میں اپنا حصہ لینا پسند کرو گی؟“

”سر کیوں نہیں، پہلے بھی تو آپ نے مجھے جو عطا کیا ہے وہ میں نے فوراً لے لیا تھا اور سر میں ڈراے کرنا بالکل پسند نہیں کرتی ہماری جو ضروریات ہیں ہم ان سے منحرف تو نہیں ہو سکتے۔“

شہاب نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔

”بڑی مشکل ہو رہی ہے بینا، تم جس رفتار سے میرے قریب آرہی ہو وہ بہت تیز ہے۔“
بینا کی نگاہیں جھک گئیں، اس کے ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ تھی، شہاب نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور پھر بولا۔

”تو پھر یہ پوائنٹ بک سنبھال لو، اب تمام صورت حال پر آخری نگاہ ڈالنا ضروری ہے، یوں سمجھو فصل پک گئی ہے اور بس ہمیں کھیت کاٹ کر پھینک دینا ہے۔“
بینا نے اشتیاق بھری نگاہوں سے شہاب کو دیکھا اور بولی۔

”سر یعنی کام ہو گیا؟“

”ہاں بینا ہو گیا تقریباً۔“

”ویری گڈ..... ویسے آپ یقین کیجئے، میں ذرا سی الجھن کا شکار تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ اگر میں امیر علی شاہ کی حویلی تک پہنچ جاؤں تو مجھے یقینی طور پر وہاں سے کامیا بیاں حاصل ہو سکتی ہیں؟“

”نہیں بینا۔“ میں نے پہلے بھی تم سے یہی بات کہی تھی کہ یکساں طریق کار عموماً کارگر نہیں ہوگا۔ طریقہ کار میں تبدیلیاں بڑی ضروری ہیں اور اس سے تجربہ بھی بڑھتا ہے۔ بہر حال میں ایک بار پھر اپنی مکمل رپورٹ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں حالانکہ اس کے بہت سے پہلو تمہیں معلوم ہیں لیکن اب فائنل ٹچ دینے کے لئے ہمیں ایک بار پھر حالات کا جائزہ لے لینا چاہئے۔ بات امیر علی شاہ کی تھی، جو ایک مغرور، خود سر اور فطری طور پر خطرناک دولت مند ہے وہ اپنا پرستی کا شکار ہے اور کسی اور کو اپنا ہم پلہ نہیں دیکھنا چاہتا اس کی انا

”سر بہت کا لفظ کم ہے۔“ بینا نے جواب دیا اور شہاب مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”بینا اس دوران میں رحمان علی شاہ کے کیس میں مصروف رہا ہوں اور میں نے کافی کام کر لیا ہے۔“

”سر میں آپ سے یہ بعد میں پوچھوں گی کہ آپ نے کیا کام کیا ہے، ایک سوال اس سے پہلے کرنا چاہتی ہوں۔“
”ہاں ضرور۔“

”سر آپ محکمہ پولیس کے ایک افسر اعلیٰ ہیں آپ نے مجھے اپنا مافی الضمیر بھی بتا دیا ہے لیکن بعض معاملات میں کھانا ہی کھانا ہوتا ہے کیا آپ کو اس معاملے میں بھی کسی مالی منافع کی توقع ہے؟“

”یہ سوال تم کیوں کر رہی ہو بینا؟“

”اس کے پس پردہ بس یہ تصور ہے کہ آپ مجھے صرف ہماری وجہ سے اس قدر کھڑا مل لئے ہیں اور اپنی ڈیوٹی سے ہٹ کر کام کر رہے ہیں۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ تم ”صرف“ نہیں ہو بلکہ میری نگاہ میں بہت بڑا مقام رکھتی ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں عدنان واسطی صاحب کے مسلک کا آدمی ہوں۔ ہاں ایک سوال میں تم سے ضرور کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور سر۔“

”دولت کے بارے میں تمہارا کیا نظریہ ہے۔“

”عمر بڑھاتی ہے سر، چہرے کو شگفتہ رکھتی ہے۔ صلاحیتوں کو جلا دیتی ہے۔ نہ ہو تو دل میں اضحلال کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔“ بینا نے فوراً جواب دیا اور شہاب ہنس پڑا پھر بولا۔
”اور ہر شخص اسے اپنے پروفیشن کے مطابق ہی حاصل کر سکتا ہے۔“

”بے شک۔“

”ہمارے حالات سدھارنے والے یہی دولت مند لوگ ہو سکتے ہیں جو جرائم کرتے ہیں۔ ان سے کچھ ہاتھ لگ جائے تو کیا حرج ہے۔“

”بالکل سر۔ یہ بھی ان کے لئے ایک چھوٹی سی سزا ہے۔“

پتا بے اختیار مسکرا دی، پھر بولی۔ ”لیکن سر اپنی روزی ہم کس طرح حاصل کر سکیں گے؟“ جواب میں شہاب مینا کو اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔..... مینا بار بار آنکھیں بند کر لیتی تھی، جب شہاب نے اسے اپنے مکمل منصوبے سے آگاہ کر دیا تو اس نے آنکھیں بند کر کے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”سربات واقعی بہت پاور فل ہے لیکن اس کا انداز معاف کیجئے گا خالص مجرمانہ ہے۔“ شہاب کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے آہستہ سے کہا۔

”مینا ایک بار تمہیں اپنے وجود کی لندرسے جھلکیاں دکھا چکا ہوں۔ میرے والد ایک جن موصافی تھے، ساری زندگی سچ بولا، سچ لکھا، سچ کھایا، سچ پہنا اور یہی سچ کفن بن کر ان کے جسم سے لپٹ گیا اور وہ قبر کی گہرائیوں میں جا بسوئے۔ مینا میرے دل میں اپنے باپ کی چائی کا اتنا بلند مینار تعمیر ہے کہ اس کے آخری سرے تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، لیکن اس کے نتیجے میں انہوں نے جو کچھ کھویا وہ واپس لینا چاہتا ہوں اور یہی میرا مشن ہے جس پر میں کام کر رہا ہوں۔“

مینا متاثر لگا ہوں سے اسے دیکھتی رہی، پھر اس نے مسکرا کر آہستہ سے کہا۔ ”میری خوش بختی ہے کہ آپ نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع دینے کے قابل سمجھا۔“ شہاب خلا میں گھورنے لگا تھا۔



جوہر خان فطرتاً تند خو آدمی تھا، ہوا سے لڑنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کبھی کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا، ویسے تندرست و توانا تھا اور اپنی طاقت کے زعم میں ڈوبا ہوا، ہر ایک بہت برے آدمی کی پشت پناہی بھی حاصل تھی اور اس برے آدمی نے اسے زندگی میں ایک ایسا مقام بخشا تھا جس کا اس نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ ہر چند کہ ناہید ایک مظلوم عورت تھی جس نے کبھی اپنے عورت ہونے کا ثبوت نہیں دیا تھا لیکن پھر بھی جوہر خان اسے پسند کرتا تھا اور اس کے ساتھ اس کا رویہ برا نہیں تھا۔ بہر حال اس وقت وہ کسی اہم کام سے گھر سے نکلا تھا۔ گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں گیا تھا کہ ایک شخص اس کے قریب پہنچ گیا اور جوہر خان نے اسے گھور کر دیکھا۔

”یہ ایک پتا ہے جناب، اگر آپ بتا دیں تو عنایت ہوگی۔“

کا جنون اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اس نے اپنے ایک بیٹے کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا کیونکہ وہ کم حیثیت شخص کی بیٹی کو چاہتا تھا، لہذا اس نے غیث بیگ کو تباہ و برباد کر دیا۔ بیٹے نے شہر پسندی اختیار کی تو اس نے اسے بھی زندگی سے محروم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ باپ کا قہور جذبہ اس کے دل میں باقی تھا جس کی بنا پر اس نے بیٹے کو قتل نہیں کیا لیکن دوسری صورت میں اسے زندہ درگور کر دیا۔ یہ ہے امیر علی شاہ اس کے تین بیٹے اور چوتھے بیٹے کا معاملہ بہر حال میں نے یوں کیا مینا کہ رحمان علی شاہ سے رجوع کر کے اسے مکمل طور پر اپنے نژاد میں لے لیا اور اسے موقع دیا کہ وہ حویلی جا کر صورت حال کا جائزہ لے، وہ حویلی پہنچا اور نے ایاز بیگ کی تلاش کی کو شش کی۔ ماں سے ملا۔..... ماں کے علاوہ اس نے اس حویلی میں ہمدرد کسی کو نہیں پایا۔..... شہاب نے (الف) سے لے کر (ے) تک پوری کہانی مینا کو سنائی اور مینا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی ہوئی یہ کہانی سنتی رہی اس پر شدید حیرت کا تا ہو گیا تھا۔ آخری الفاظ سنانے کے بعد شہاب خاموش ہو گیا اور مینا اس کے انکشافات کے میں گم رہی..... پھر مینا نے کہا۔

”سر! اس بارے میں آپ کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔“ حالات پر حکمرانی کرتے ہیں اور صحیح معنوں میں مشکل سے مشکل تر حالات آپ کے میں آ جاتے ہیں..... بہت بڑا کام سر انجام دیا ہے آپ نے لیکن اب کیا دیر کرنا مناسب ہو گیا آپ یہ ہمت کر سکتے ہیں کہ فوری طور پر امیر علی شاہ پر ہاتھ ڈال دیں، ہمارے پاس سر کے خلاف شواہد تو ہیں، اس کا مینا جسے اس نے جس بیجا میں رکھا ہوا ہے، مرزا ایاز بیگ، غلام بیگ، ناہید، یہ سارے معاملے ایسے ہیں کہ امیر علی شاہ پوری طرح گرفت میں آ سکتا ہے سر، وہ مسئلہ ایک بار پھر منہ کھولے کھڑا ہوا ہے کہ ڈاکٹر کبیر کو اس طرح مجبور کر دیا گیا تھا کہ شریف آدمی اپنے مزاج اور اپنی مرضی کے خلاف ایک صحیح الدماغ آدمی کو پاگل قرار دے اپنے کلینک میں رکھنے کے لئے مجبور ہو گیا تھا، اگر آپ اس پر ہاتھ ڈالیں گے تو سر کہا امیر شاہ آپ کی گرفت میں رہے گا۔“

”یہ سب بعد کی باتیں ہیں، ہم کم از کم اسے قانون کی نگاہ میں تولے آئیں گے ایک تو بے شک اس پر ہاتھ ڈال ہی دیا جائے گا اور کیس رجسٹرڈ ہو جائے گا، لیکن اس سے پہلے روزی کا معاملہ بھی تو ہے مینا۔“

”اماں جوہر خان صاحب، آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا..... تشریف لائیے تشریف لائیے۔“ جوہر خان ٹھنک کر رک گیا۔ وہ اس شخص کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں عقب کا جائزہ نہیں لے سکی تھیں..... پیچھے سے وہی دونوں آدمی آگئے تھے، جنہوں نے اس سے پتا پوچھا اور ماچس مانگی تھی پھر جوہر خان کچھ سمجھ بھی نہ پایا تھا کہ عقب سے اس کی گدی پر دو زوردار ضربیں پڑیں اور اسے خوش اخلاقی سے مخاطب کرنے والے شخص نے اس کے لمبے بال پکڑے پیچھے سے دونوں آدمیوں نے اٹھایا اور بند گاڑی کے کھلے دروازے سے اندر پھینک دیا۔

جوہر خان چکر اکر رہ گیا تھا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا لیکن وہ تینوں پیچھے پیچھے ہی بند گاڑی میں چڑھ آئے تھے اور انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ بند گاڑی خاصی کشادہ تھی تین آدمیوں نے مل کر جوہر خان کو دبوچ لیا..... اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور پھر دونوں پاؤں بھی کس کر باندھ دیئے..... جوہر خان ابھی تک سنبھلنے کی کوششوں میں مصروف تھا پھر اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُٹ پڑا اور بحالت مجبوری ان میں سے ایک نے اس بار اس کے سر کی پشت پر ہلکی سی ضرب لگائی اور جوہر خان کی آنکھوں میں تارے ناچ گئے، پھر اس کے اندر جدوجہد کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ ہاں جب کافی دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ ایک عجیب و غریب جگہ عجیب و غریب حالت میں موجود تھا، کوئی تختہ نما چیز تھی جو اس کے جسم کے نیچے تھی..... دونوں پاؤں سیدھے تھے اور انہیں کس کر باندھ دیا گیا تھا..... دونوں ہاتھ بھی پھیلا کر باندھ دیئے گئے تھے اور بازوؤں کے اوپر لکڑی کے ایسے فریم جڑ دیئے گئے تھے جن سے بازو جنبش نہیں کر سکتے تھے..... کلائیوں میں لوہے کے کڑے پڑے ہوئے تھے، سر چھت کی جانب سیدھا تھا اور اسے بھی ایسے شکنجے میں محفوظ کر دیا گیا تھا کہ اگر وہ گردن ہلانے کی کوشش کرتا تو اس میں کامیاب نہیں ہو پاتا..... ایک عجیب و غریب کیفیت میں تھا وہ..... ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں خوف کا بے راہوا پھر وہ شدت غضب سے چیخنے لگا..... گالیاں نکالنے کے سوا وہ اور کیا کر سکتا تھا، جس قدر گالیاں اسے یاد تھیں اس نے نکال ڈالیں، چیخ کر ان لوگوں کو پکارا، جو اسے اس حالت میں پہنچانے کا باعث بنے تھے لیکن چاروں طرف سنائے کا راج تھا، جب وہ چیخ چیخ کر تھک گیا تو خاموش ہو گیا اور اسی وقت چار آدمی اس کے نزدیک پہنچ

”کیوں تمہارے باپ کا ملازم ہوں۔“ جوہر خان نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”نہیں جناب..... میں تو خود نجانے کب سے ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔
میرے باپ کی بھلایہ مجال کہاں کہ وہ کسی کو ملازم رکھے..... ذرا دیکھئے اگر یہ پتہ آپ کو معلوم ہو تو.....؟“

”مارکھانی ہے۔“ جوہر خان نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
”نہیں جناب پتا پوچھنا ہے، یہ ذرا چٹ دیکھئے آپ؟“ جوہر خان نے ایک لمحے کے رک کر اسے دیکھا اور ہاتھ آگے بڑھادیا..... اس شخص نے جلدی سے چٹ جوہر خان ہاتھ میں دے دی تھی۔ جوہر خان نے کاغذ کا پرزہ لے کر اس کے پرزے پرزے کر دیئے اسے فضا میں اچھال دیا، پھر وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ وہ شخص اسی جگہ کھڑا اسے منہ پھار دیکھتا رہ گیا تھا، پھر وہ جوہر خان کے پیچھے پیچھے چل پڑا لیکن فاصلہ اتنا رکھا تھا کہ اگر جوہر خان کوئی کوشش کرے تو اس سے بچ سکے جوہر خان نے غور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ مستانہ چال چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ زیادہ دور نہیں پہنچا تھا کہ پھر ایک آدمی اس کے قریب آگیا۔

”وہ سنئے، ماچس..... ماچس ہوگی آپ کے پاس۔“ جوہر خان نے پھر اسے گھور کر دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا..... غالباً گالیاں دے رہا تھا۔
”اگر ماچس ہو تو عنایت فرما دیجئے گا..... بڑی دیر سے سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے۔“
”سگریٹ ہے تمہارے پاس۔ جوہر خان نے پوچھا؟“
”جی جی ہاں۔ یہ ہے۔“ اس شخص نے سرور انداز میں سگریٹ جوہر خان کے سامنے کر دی۔ جوہر خان نے سگریٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا پھر اسے توڑ کر پھینکتا ہوا بولا۔
”سگریٹ رکھتے ہو تو ماچس نہیں رکھ سکتے، یہ کوئی طریقہ ہے کہ کسی کا راستہ روک ماچس طلب کی جائے؟“

”جی جی جی..... یہ..... یہ..... کیا کیا آپ نے..... میرا سگریٹ؟“
”بکو اس مت کرو۔“ جوہر خان دو قدم آگے بڑھا، تھوڑے فاصلے پر ایک بند گاڑی کھڑی ہوئی تھی جس کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جوہر خان نزدیک سے گزرا تو عقبی دروازے سے ایک شخص نیچے کود آیا۔

اور اس کے خاندان کی تمام خواتین سے اپنے عزیز واقارب کے رشتے جوڑتا رہا اور جب ایک بار پھر اس پر تھکن طاری ہو گئی تو مشین سے آواز اُبھری۔

”ہاں جوہر خان، تم سے پہلا سوال یہ ہے کہ ایاز بیگ کہاں ہے؟“ جوہر خان ایک لمحے کے لئے چکر لایا اور پھر اس نے گندی گالیاں دینی شروع کر دیں جن میں اب ایاز بیگ منظر نامہ پر تھا۔

”میرے خیال میں ابھی تم اسے پوری طرح تیار نہیں کر پائے ہو ورنہ اس کی تیاریاں مکمل کر لو۔۔۔۔۔ اس کے بعد اس سے سوالات کا سلسلہ شروع کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔“

”لیں سر۔“ جواب ملا اور اس کے بعد وہ عجیب و غریب کارروائیاں کرنے لگے، جوہر خان کے سر کے عین اوپر ایک مشین فٹ کی گئی جس میں ایک لمبی نوکدار کیل لگی ہوئی تھی، یہ کیل اوپر نیچے حرکت کرتی تھی اور اس کے چلنے سے ایک تیز سیٹی کی سی آواز بلند ہوتی تھی، یہ مشین آن کر کے انہوں نے اسے تھوڑا سا جوہر خان کی پیشانی کے قریب کر دیا، جوہر خان کچھ نہیں سمجھ پایا تھا۔۔۔۔۔ مشین چل پڑی اور چمکدار کیل اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی کے اوپر تیز رفتاری سے گھومنے لگی جوہر خان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

وہ چاروں اس عمل کے بعد وہاں سے چلے گئے اور جوہر خان حیرت سے اس گھومتی ہوئی چمکدار کیل کو دیکھنے لگا، وہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے، سیٹی کی آواز اس کے کانوں میں چبھ رہی تھی اور چونکہ ذہنی طور پر وہ سخت منتشر تھا اس لئے یہ آواز کئی گنا زیادہ تیز ہو کر اس کی سماعت کو متاثر کر رہی تھی۔ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ اور پھر بیس منٹ گزر گئے اور اب جوہر خان کو اندازہ ہوا کہ انہوں نے یہ کیا عمل کیا تھا، گھومتی ہوئی کیل اسے بالکل پیشانی میں سوراخ کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور سیٹی کی تیز آواز اس کے دماغ کو زخمی کر رہی تھی، وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چیختے لگا۔

”بند کرو اسے سور کے بچو، اسے بند کرو، میں کہتا ہوں اسے بند کرو، اسے بند کرو ورنہ میں مری جاؤں گا، میرے سر میں سوراخ ہو جائے گا، مری جاؤں گا آہ میں مری جاؤں گا۔“ وہ بری طرح تڑپنے لگا، لیکن بدن اس طرح ٹکچنے میں کسا ہوا تھا کہ وہ اسے جنبش نہیں دے سکتا تھا، نیچے سامنے رکھے ہوئے بکس میں ہلکی سی کلک ہوئی اور پھر اس میں سے آواز اُبھری۔

”جوہر خان! میرا خیال ہے اب تم مرزایاز بیگ کے بارے میں بتانا پسند کرو گے؟“

گئے۔۔۔۔۔ ان میں سے تین کی صورتیں وہ پہچانتا تھا، یہ وہی تھے جن میں سے ایک نے اس سے پتا پوچھا تھا، دوسرے نے ماچس مانگی تھی اور تیسرے نے اسے جوہر خان کہہ کر مخاطب کیا تھا اور اس کے بعد اغوا کر لیا تھا۔۔۔۔۔ جوہر خان کی زبان پھر چل پڑی اور وہ چاروں صبر و سکون سے اس کے قریب کھڑے رہے اور سردنگا ہوں سے اس کی صورت دیکھتے رہے۔۔۔۔۔ آخر جوہر خان جھلا کر بولا۔

”کتے کے بچو۔۔۔۔۔ آخر تم چاہتے کیا ہو اور مجھے اس طرح کیوں باندھ رکھا ہے تم نے؟“

”جوہر خان صاحب آپ سے کچھ اہم گفتگو کرنی ہے۔۔۔۔۔ تھوڑی سی معلومات کرنا چاہتے ہیں ہم آپ سے؟“

جوہر خان نے حسبِ توفیق پھر کچھ گالیاں دیں اور اس کے بعد بولا۔

”کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟“

”کیا آپ سوالات کے جواب دینے کے لئے تیار ہیں؟“

اب گالیوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا اور جوہر خان کے پاس مزید گالیاں نہیں تھیں، اس نے کہا۔

”بکو کیا بکنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ تم اپنی موت کو آواز دے رہے ہو۔۔۔۔۔ میں تمہیں کتے کی موت ماردوں گا۔۔۔۔۔ زندہ نہیں چھوڑوں گا میں تمہیں؟“

”دیکھئے اگر ابھی آپ کو کچھ اور بھی کہنا ہے تو ہمیں اس پر اعتراض نہیں ہو گا لیکن اس کے بعد جب آپ سے سوالات کا سلسلہ شروع ہو تو آپ صرف جواب دیجئے گا، ورنہ اذیت برداشت کرنا پڑے گی آپ کو۔“

”بھو کو تو سہی کتے کے پلو۔۔۔۔۔ کیا بھونکنا چاہتے ہو۔“ جوہر خان بولا اور وہ چاروں اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔۔۔۔۔ چند لمحات بعد وہ ایک عجیب و غریب قسم کی مشین دھکیلتے ہوئے لائے اور اسے جوہر خان سے کچھ فاصلے پر اس کے سینے کے اوپر نصب کر دیا گیا، پھر اس مشین کے کچھ ٹن آن کئے گئے اور ان میں سے ایک نے کہا۔

”چیف! جوہر خان آپ کے سوالات کے جواب دینے کے لئے تیار ہے۔“

”گڈ جوہر خان، شہنشاہ تم سے مخاطب ہے اور تم سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہے۔“

جوہر خان کی زبان پھر چل پڑی، عادی تھا حالانکہ تھک گیا تھا لیکن پھر بھی شہنشاہ سے

”سب کچھ بتا دوں گا میں، جو پوچھو گے وہ بتا دوں گا اسے بند کر دو خدا کیلئے اسے بند کر دو۔“
”سوچ لو جو ہر خان اور غور کر لو، میرا خیال ہے تم کافی تیز مزاج آدمی معلوم ہوتے ہو۔
یہ تو ابھی پہلا سبق ہے تمہارے لئے، میں نے بہت سے ایسے کھلونے تیار کر رکھے ہیں جو
بڑے بڑے تیز دماغ لوگوں کو راہ راست پر لے آتے ہیں، بولو بند کر دیا جائے اسے یا ابھی
تھوڑی دیر اور تم اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو؟“

”بند کر دو، میں کہتا ہوں اسے بند کر دو۔“ جو ہر خان نے کہا، اس بار اس نے کوئی کمال
نہیں دی تھی، چنانچہ چند لمحات کے بعد وہ خوفناک اور اذیت ناک آوازیں بند ہو گئیں، کمال
اپنی جگہ رُک گئی، جو ہر خان عاجزی سے بولا۔

”اے..... اے میرے سامنے سے ہٹا دو، تمہیں خدا کا واسطہ اسے میرے سامنے
سے ہٹا دو۔“

”تم اگر تعاون کرو گے جو ہر خان تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، اس کیل کو اس کے
چہرے پر سے ہٹا دیا جائے اور اسے میرے سوالات کے جواب دینے کا موقع دیا جائے۔“
دو آدمی آگے بڑھے اور انہوں نے اس مشین کو اس کے سر سے ہٹا دیا، جو ہر خان
آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانس لینے لگا تھا..... تھوڑی دیر اسے سنبھلنے کا موقع دیا گیا اور
اس کے بعد بکس سے آواز ابھری۔

”جو ہر خان، میں تم سے امیر علی شاہ کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کرنا چاہتا
ہوں اور میرا خیال ہے کہ اب چونکہ امیر علی شاہ کسی بھی شکل میں تمہاری مدد نہیں کرے
گا، اس کا اندازہ تمہیں خود ہی ہو گیا ہو گا، اس لئے میری رائے ہے کہ جو کچھ تم سے پوچھا جائے
سچ بتا دو بالکل سچ، کیونکہ اس کے بعد یہ کیل تمہارے ماتھے میں سوراخ کرنا شروع
کر دے گی اگر اسے تھوڑا سا اور نیچے جھکا دیا جائے گا۔“

”نہیں نہیں پوچھو مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“ اس بار جو ہر خان نے امیر علی شاہ کو
موٹی موٹی گالیاں دی تھیں اور اس کے بعد وہ صحیح معنوں میں ان سوالات کے جواب دینے لگا
تھا جو سامنے رکھے ہوئے باکس سے نشر ہونے والی آواز میں اس سے پوچھے جارہے تھے۔



امیر علی شاہ ذہنی طور پر سخت پریشان تھا، فیاض علی نے ان معاملات سے نمٹنے کے
بعد شہر واپس جانے کی اجازت مانگی تو وہ اس پر اُلٹ پڑا۔
”اپنی رنگ رلیوں میں مست رہنا چاہتا ہے تو، میری دولت کے بل پر عیش کر رہا ہے
اور مجھ سے یہ بے پروائی برت رہا ہے، تجھے پتا نہیں ہے کہ میں کتنا پریشان ہوں؟“
”نہیں بابا جانی، میں نے تو بس آپ سے اجازت مانگی تھی، اگر آپ کو میری ضرورت
ہے تو میں حاضر ہوں بابا جانی۔“

”ضرورت کے بچے، تو یہ نہیں دیکھ رہا کہ میں کتنے خلفشار کا شکار ہوں، میری سمجھ میں
اب کچھ نہیں آرہا ہے، ہم اسے پکڑ کر لے آئے ہیں، ہم نے اسے تباہ و برباد کر دیا ہے، سچ کچھ
پاگل بنا دیا ہے ہم نے اسے، لیکن کچھ پتا چل سکا، کچھ معلوم ہوا کہ اس کی شکل میں آنے والا
کون تھا، کیا قصہ ہے، کوئی بات سمجھ میں آرہی ہے، او میں کہتا ہوں تم میں سے کوئی اس قابل
نہیں ہے، ہو بھی کیسے سکتا ہے، زندگی بھر تم عیش و عشرت میں بسر کرتے رہے ہو، کبھی کوئی
کام کیا ہو تو یہ کام بھی کرو، او میں کہتا ہوں سازش کرنے والا کون ہو سکتا ہے، تم بھی تو کچھ پتا
لگاؤ، بس میری انگلی پکڑ کر ہی چلتے رہو گے؟“

”بابا جانی ہم تو آپ کے ہر حکم کی تعمیل کے لئے تیار رہتے ہیں۔“
”اور میرے مرنے کے بعد کس کے حکم کی تعمیل کرو گے، میں کہتا ہوں غلامی کی
عادت اچھی عادت تو نہیں ہے، خود بھی تو فیصلہ کرو، کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا ہے اور دیکھو یہ
بات تو طے ہے کہ اس ڈاکٹر نے اپنی جان بچانے کے لئے اور اس کے بھاگنے کے خطرے سے
بچنے کے لئے اسے نشے والی دوائیں دینا شروع کر دی تھیں اور ان ادویات نے اس کا دماغ ہی

اس کے دشمن بنے ہوئے ہیں، حالانکہ رحمان نے ان کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں کی تھی، ایک بار بھی ان میں سے کسی بھائی نے رحمان علی شاہ کے لئے باپ سے رحم کی اپیل نہیں کی ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ رحمان علی شاہ کو موت کی آغوش میں دھکیل دینا چاہتے ہیں، حالانکہ معاملہ باپ بیٹے کا ہی ہے لیکن لیکن..... بہت سے خیالات اسے پریشان کر رہے تھے..... غیاث بیگ بھی اسے یاد آ رہا تھا، اس کے بیٹے کا بھی معاملہ تھا اور رحمان علی شاہ کی کیفیت بھی، اس کے دل میں تھوڑی تھوڑی سی شفقت جاگ رہی تھی، حالانکہ جو کچھ کر چکا تھا وہ اتنا شدید تھا کہ اب اگر رحمان علی شاہ ہوش و حواس میں واپس آ بھی جائے تو اپنے باپ کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ کچھ دیر کے بعد فیاض علی، شاد اور گلزار تیار ہو کر آئے اور انہوں نے کہا۔

”آپ بالکل بے فکر رہو بابا جان، اب ہم اس سلسلے میں تمام تر معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی آئیں گے۔“ امیر علی شاہ نے خاموش نگاہوں سے انہیں دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا..... کچھ دیر کے بعد اس نے حویلی کی عقبی کھڑکی سے ان تینوں کو ایک قیمتی پجارو میں شہر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔



الٹ دیا، اس ڈاکٹر کے بچے کو یہ نہیں کرنا چاہئے تھا، اس کا تو میں بیڑہ غرق کر دوں گا، لیکن اب سب سے پریشانی کی بات تو یہ ہے کہ آخر وہ کون تھا جو حویلی میں آیا، میرا ہنٹر نکالا، گل باز اور خیر خان کو مارا، کیا چاہتا تھا وہ، اس کا مقصد کیا تھا، ایاز بیگ کو کیوں تلاش کر رہا تھا وہ، او بھئی کچھ پتا تو چلے، معلوم ہو جائے تو ہم اپنا بچاؤ کر سکیں، اب ساری دنیا سے تو لڑائی میں ہر کامیاب نہیں ہو سکتے نا اور تم لوگ ہو کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے بابا جانی کے سینے سے لگے ہوئے ہو، آگے بڑھ کر کچھ کرو، پتا چلاؤ، کیسے پتا چلا سکتے ہو سوچو۔“

تینوں لڑکے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہے، پھر فیاض علی نے کہا۔
”اور تو کوئی ذہن میں نہیں آتا بابا جان، میرا خیال ہے غیاث بیگ ہی کی گردن پکڑی جائے، ہماری سمجھ اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرتی، ہو سکتا ہے غیاث بیگ نے کسی سے رجوع کیا ہو؟“

”میرا ذہن بھی اسی طرف جاتا ہے، او جاؤ اس سے معلومات حاصل کرو، جو ہر خان سے بات کرو اور اس سے پوچھو کہ اس نے اتنی غفلت کیوں برتی کہ غیاث بیگ کو کسی سے رجوع کرنے کا موقع مل گیا، غیاث بیگ اگر کچھ بتا دیتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ان سب کو اٹھا کر میرے پاس لے آؤ، یہ کام میں کسی دوسرے سے بھی کر سکتا تھا، لیکن تم لوگوں کا جانا ٹھیک ہے۔“
”ہم چلے جاتے ہیں بابا جانی، آپ بے فکر رہیں ہم غیاث بیگ سے معلومات حاصل کریں گے اور اگر کوئی صحیح صورت حال معلوم نہیں ہو سکی تو پھر اسے آپ ہی کے پاس اٹھلائیں گے۔“

”تو جاؤ بھئی، باتیں کر کے مجھ پر احسان کیوں لاد رہے ہو؟“

امیر علی شاہ نے کہا اور فیاض علی دونوں بھائیوں کو اشارہ کر کے اٹھ گیا..... امیر علی شاہ نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے گردن نکادی تھی اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے آثار تھے۔

نجانے کیوں اب اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ رحمان علی شاہ کے ساتھ سخت زیادتی ہوئی ہے، ساری جوانی خاک میں ملادی گئی ہے اس کی اور یہ امیر علی شاہ نے خود اپنے ہاتھ سے کیا ہے، اپنا خون اپنے جگر کا ٹکڑا، باقی تینوں بھی تو اس کی اولادیں ہیں اور تینوں کے انداز میں اپنے بھائی کے لئے رحم اور محبت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ وہ امیر علی شاہ سے زیادہ

جگہ۔ ہمیں اپنی مرضی سے جینے کا حق تو ملنا چاہئے..... بولو کیا تم لوگ یہ محسوس کرتے ہو کہ تم اپنی پسند سے جی رہے ہو؟“

”بالکل نہیں..... ہمارے لئے تو ایک راستہ ہر صبح بنایا جاتا ہے اور شام تک کے لئے فیصلے کر دیئے جاتے ہیں کہ ہمارا دن آج کس طرح گزرے گا۔“

”میں بابا جانی کی زندگی کا دشمن نہیں ہوں، میں یہ نہیں چاہتا کہ ان کا سایہ ہمارے سردں سے اٹھ جائے لیکن تم خود سوچو، کیا تم نے ایسے بوڑھے باپ، بیٹے نہیں دیکھے جنہیں لوگ بھائی، بھائی کہتے ہیں۔ بابا جانی زندہ رہیں گے، ان کی زندگی میں کوئی مشکل نہیں ہے وہ

طویل عمر جنیں گے اور ہم ہمیشہ اسی طرح ان کے جوتوں میں پرورش پاتے رہیں گے..... میں کہتا ہوں یہ مال دولت، یہ عزت اور یہ اقتدار اگر صرف بابا جانی کے رحم و کرم پر رہے تو کیا اس میں پوری زندگی گزاری جاسکتی ہے، کیا ہم تینوں میں سے کوئی ایسا ہے جو بابا جانی کی خواہش کے مطابق جی سکے..... ارے ہم تو وہ لوگ ہیں کہ اگر بابا جانی کسی دن ہمیں حکم دیں

کہ خودکشی کر لو تو خودکشی کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہ رہے..... کیا یہی ہماری زندگی کا اختتام ہے..... ہماری ماں تو مٹی کی مورتی ہے اس نے آہوں اور سسکیوں میں زندگی بسر کی

ہے..... ہم نے ہمیشہ بابا جانی کی وفاداری کی، ہمیشہ ان کے مفادات کو مدد نگاہ رکھا، جب رحمان علی شاہ نے سرکشی کی تو ہم سب نے اپنے دل میں اس کے لئے نفرت بٹھالی اور اپنے بھائی کے

خلاف ہی کام کرنے لگے اور اس کی زندگی کے دشمن ہو گئے..... میں مانتا ہوں کہ اس نے بہت برا کیا اپنی عزت، اپنے خاندان، اپنے وقار کو خاک میں ملا کر ایک ایسی لڑکی سے محبت کی

جو ہمارے خاندان میں آنے کے قابل نہیں تھی مگر ٹھیک ہے کیا ہم میں سے کوئی کسی ایسی لڑکی سے محبت کر سکتا ہے جسے ہمارے بابا جانی پسند نہ کرتے ہوں، چاہے وہ کتنے ہی بڑے

خاندان سے ہو..... دیکھو میں بابا جانی کے خلاف زہر نہیں اگل رہا..... میں اب بھی ان کا تائیدار ہوں لیکن ہمیں کچھ سوچنا پڑے گا، اب رحمان علی شاہ کا معاملہ ہے..... تم دیکھو بابا

جانی نے خود ہی ایسے اقدامات کئے جو قانون کی نگاہ میں جرم ہیں..... رحمان علی شاہ تو خیر ان کا بیٹا ہے لیکن غیاث بیگ کی طرف سے آخر کار خطرہ پیدا ہو گیا نا..... آج میں یہ سوچتا ہوں کہ

سب کے ہاتھ کٹے ہوئے نہیں ہوتے، جس طرح ہم اپنے چاروں ہاتھ پاؤں پر زندہ ہیں..... دوسرے لوگ بھی اپنے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال سکتے ہیں..... اس وقت ہمارا کیا ہو گا.....

تینوں کے چہرے سستے ہوئے تھے..... تینوں اپنے طور پر کچھ سوچ رہے تھے..... جاری رہا اور بہت دیر اسی طرح خاموشی سے گزر گئی تو فیاض علی شاہ نے غضبناک لہجے میں کہا۔ ”تم دونوں کو سانپ کیوں سونگھ گیا ہے۔ کوئی کچھ بولتا کیوں نہیں۔“ خاموش بیٹے دونوں بھائی چونک پڑے۔

”کیا بولیں فیاض علی شاہ کچھ سمجھ میں آئے تو بولیں۔“ شاد علی نے کہا۔ ”کب سمجھ میں آئے گا، جب ہم کتے کی موت مارے جائیں گے۔“ فیاض علی آنکھیں

نکال کر بولا اور دونوں اسے دیکھنے لگے۔ ”میں سمجھا نہیں فیاض علی شاہ۔“ شاد علی بولا۔

”میں اپنی زبان سے تمہیں سمجھاؤں، تاکہ تم بابا جان سے کہو کہ فیاض بھی باغی ہو اور ان کے خلاف سوچنے لگا ہے۔“

دونوں بھائیوں نے برا سامنہ بنا کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر گلزار علی کہنے لگا۔ ”نہیں فیاض علی شاہ اگر تمہارے دل میں یہ خیال ہے کہ ہم آپس کی باتوں کو بابا جان کے سامنے دہرا دیں گے تو اس خیال کو دل سے نکال دو، ہم خود بھی اتنی ہی پریشانید

شکار ہیں، جتنی پریشانیوں کا شکار تم ہو۔“

”تم لوگ خود سوچو ہم جوان ہو چکے ہیں ہماری اپنی زندگی کے راستے بھی کھل جاتے چاہئیں تھے۔ ہم اپنے طور پر بھی کچھ فیصلے کر سکتے ہیں لیکن بابا جانی کے سامنے جا کر ہمارا

حالت چوہوں جیسی ہو جاتی ہے۔ ہم ان کا احترام کرتے ہیں، ان کی عزت کرتے ہیں..... شک وہ ہمارے باپ ہیں انہوں نے ہمارے لئے بہت کچھ کیا ہے لیکن احترام، عزت

بانی تھی ابھی تک وہاں ایسے مکمل انتظامات نہیں کر سکا تھا جن کے ذریعے وہ جگہ بہتر طریقے سے کارآمد ہو سکتی اور یہ تصور بارہا اس کے ذہن میں آیا تھا کہ اس خفیہ رہائش گاہ کے لئے کچھ ایسے لوگوں کا بندوبست کیا جائے جو یہاں کی مکمل نگرانی کر سکیں اور یہاں شہاب کے بہتر معاون ثابت ہو سکیں..... بینا کی سپرویزن میں تو یہ کام کیا جاسکتا تھا..... ذمے داری اس پر نہیں ڈالی جاسکتی تھی جو ہر خان سے جو کچھ معلوم ہوا تھا ڈبل اوگینگ کے افراد نے اس کی ساری تفصیل شہاب تک پہنچانے میں اپنے ذرائع کا سہارا لیا تھا اور جو ہر خان نے جو انکشافات کئے تھے وہ واقعی اتنے سنسنی خیز تھے کہ شہاب کو یہ معلومات حاصل ہونے سے بے حد خوشی ہوئی تھی..... امیر علی شاہ نے کئی ایسے جرائم کئے تھے جن کی اگر مکمل طریقے سے تفتیش شروع ہو جاتی اور وہ منظر عام پر آجاتے تو امیر علی شاہ گردن، گردن تک دلدل میں پھنس سکتا تھا..... ناصر وہ بلکہ اس کی اولاد بھی، اس کے تین بیٹے جن میں رحمان علی شاہ شامل نہیں تھا اس کے جرائم کے شریک کار تھے..... بہر حال شہاب کا اپنا ایک نظریہ تھا کہ جرم کیا ہے سزا ملنا ضروری ہے لیکن دنیاداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اس دنیا کا بادشاہ سمجھتا تھا وہ تمام حقوق اس نے اپنے نام کر لئے تھے جو ایسے لوگوں سے حاصل کئے جاسکتے تھے..... چنانچہ اب جو ہر خان کو اپنے قبضے میں لینا ضروری تھا..... ڈبل اوگینگ کے نمائندوں پر اسے پورا پورا بھروسہ تھا لیکن بہر طور جو کام اسے آگے کرنا تھا وہ اسے خود ہی سرانجام دینا ضروری تھا، چنانچہ اس نے ڈبل اوگینگ سے رابطہ قائم کیا اور سردار علی کو حکم دیا کہ جو ہر خان کو بے ہوش کر کے اس کے حوالے کر دیا جائے اور اس کے لئے ایک باقاعدہ منصوبہ ترتیب پا گیا..... ڈبل اوگینگ کے تین افراد نے جو ہر خان کو بے ہوش کیا اور بے ہوش کرنے کے بعد ایک گاڑی میں لے کر چل پڑے، پھر اسے ایک سنسان علاقے میں اس دوسری گاڑی میں منتقل کر دیا جس پر نمبر پلیٹ نہیں لگی ہوئی تھی اس کے بعد وہ وہاں سے چلے گئے..... باقی کام شہاب کا تھا..... چنانچہ جو ہر خان اس خفیہ رہائش گاہ تک پہنچ گیا، اس وقت یہاں شہاب کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ شہاب نے چہرے پر ماسک چڑھایا اور اس کے بعد جو ہر خان کو تہ خانے میں لے کر آگیا..... یہ تہ خانہ محفوظ کر دیا گیا تھا اور باہر سے اسے بند کرنے کے بعد کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہوتا تھا کہ کوئی شخص یہاں سے نکل بھاگے۔ جو ہر خان کو کالادیر کے بعد بستر پر ہوش آیا تھا اور اس نے بدلے ہوئے ماحول کو دیکھا تھا، ساتھ ہی اسے

کیا ہم صرف اس لئے مصیبت میں نہیں پڑ جائیں گے کہ ہم بابا جانی کے وفادار تھے۔
”وہ تو ٹھیک ہے فیاض علی شاہ لیکن ہم کیا کریں..... کیا بابا جانی کی مرضی کے خلاف، اس ملک میں جی سکتے ہیں ان کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ وہ ہماری ایک نہیں چلنے دیں گے۔ تم نے رحمان علی شاہ کو دیکھ ہی لیا، بابا جانی کے دل میں جب کسی کے لئے کوئی نذر آجاتا ہے تو وہ صرف اس کے دشمن ہوتے ہیں..... چاہے اس سے ان کا کوئی بھی رشتہ ہو۔“
”یہ فرق ہم تینوں میں سے کسی کے لئے بھی کبھی بھی ان کے دل میں آسکتا ہے، ایک بات ان کی مرضی کے خلاف ہو جائے۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو لیکن کیا، کیا جائے۔“
”ابھی تو کچھ نہیں کیا جاسکتا لیکن سوچنا پڑے گا۔ مل کر سوچو، ہم تینوں اپنے مستقبل کے لئے کچھ نہ کچھ سوچ ہی کر اپنا مستقبل بنا سکتے ہیں ورنہ ساری زندگی بابا جانی کی جوتیوں پر گزر جائے گی۔ کمال ہے۔“ فیاض علی نے منہ میزھا کر کے باہر دیکھا..... شاد اور گلزار علی شاہ بھی پر خیال انداز میں ایک دوسرے پر نگاہیں جمائے سوچ میں ڈوب گئے تھے۔



شہاب بڑی عمدگی سے اپنے اس کیس میں آگے بڑھ رہا تھا..... اس کے اپنے نظریات زندگی تھی اور وہ ان کی تکمیل کے لئے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا تھا..... انتہائی کسمپرسی۔ عالم میں اس نے ڈبل اوگینگ تیار کیا تھا اور یہ بھی بڑی ٹھوس سچائی تھی کہ ڈبل اوگینگ کے تمام افراد نے انتہائی ذہین اور ناقابل تسخیر ہونے کے باوجود بڑے بڑے حالات میں شہاب کے ساتھ تعاون کیا تھا لیکن اب صلہ ملنے کا وقت قریب آگیا تھا اور وہ لوگ پہلے سے بہت بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ شہاب نے ان کا پورا پورا خیال رکھا تھا اس کے بعد بینا اس کی زندگی میں آئی تھی۔ ایک ایسی پر سحر شخصیت جس کے سامنے شہاب نے ابھی تک اپنے دل کی زبان نہیں کھولی تھی لیکن دل کے گوشوں میں بینا کچھ اس طرح اترتی جا رہی تھی کہ شہاب کو یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں زندگی کی ڈگر ہی نہ بدل جائے۔ بینا بہت تعاون اور عزت کرنے والی لڑکی تھی اور پھر عدنان واسطی جو ایک قابل وکیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شریف آدمی بھی تھے اور بینا کی رگوں میں انہی کی شرافت اتری ہوئی تھی۔ بہر طور یہ سارے معاملے شہاب کی پسند کے مطابق ہی چل رہے تھے، اس نے اپنے لئے جو ایک مخصوص

نہ پابندی کروں گا اور وعدہ کروں گا کہ کتے کی طرح تم سے وفاداری نبھاؤں گا سمجھے..... میں نے میں نے ہمیشہ وفاداریاں نبھائی ہیں کیا سمجھے؟“

”ٹھیک ہے جوہر خان، اگر یہ بات ہے تو آج زندگی میں پہلی بار ایک برے آدمی پر ہمدردی کر رہا ہوں۔“ جوہر خان نے حیرت سے اسے دیکھا وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن نقاب پوش اس کے قریب پہنچ گیا، پھر اس نے جیب سے چابی نکالی اور جوہر خان کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھولنے لگا..... جوہر خان کے انداز میں حیرت پیدا ہو گئی تھی لیکن اس نے خاموشی سے ہاتھ کھولے اور اس کے بعد نقاب پوش نے اس کے پیروں کی بیڑیاں بھی کھول دیں، جوہر خان اپنے ہاتھوں کی کلاںیاں مسنے لگا تھا اور اس کے چہرے پر خباثت اُبھرتی آرہی تھی۔ نقاب پوش تھوڑے فاصلے پر جا کر کھڑا ہوا پھر اس نے پر سکون لہجے میں کہا۔

”جوہر خان یہ جگہ تمہارے لئے مناسب ہے یا کوئی اور کشادہ جگہ چاہتے ہو؟“

جوہر خان نے کوئی جواب نہیں دیا وہ بستر سے نیچے اتر آیا، پھر اس نے ہاتھوں کی آستینیں اٹھائی اور انہیں اچھی طرح کسنے کے بعد دونوں ہاتھ پھیلا کر نقاب پوش کے سامنے کھڑا ہو گیا..... نقاب پوش سکون سے کھڑا ہوا تھا، جوہر خان نے سر جھکا کر نقاب پوش پر حملہ کیا وہ اسے رگید کر دیوار تک لے جانا چاہتا تھا اس نے اپنا کاندھا نقاب پوش کے سینے سے لگا دیا اور اس کی کمر کے گرد اپنے ہاتھوں کا حلقہ بنا لیا اور اس کے بعد وہ نقاب پوش کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن چند ہی لمحوں میں اسے یہ احساس ہوا جیسے وہ کسی ستون پر زور آزمائی کر رہا ہو..... نقاب پوش کے بدن میں تھوڑی سی جنبش ضرور ہوئی تھی لیکن وہ نقاب پوش کو پیچھے نہیں ہٹا سکا تھا جبکہ نقاب پوش کے دونوں ہاتھ خالی تھے، جوہر خان خاصی دیر تک کسی ٹھنسنے کی طرح زور آزمائی کرتا رہا اس کے بعد پیچھے ہٹ گیا اس کی آنکھوں میں حیرت تھی اور اس نے نقاب پوش کے عقب میں جھانکا تھا۔

”نہیں جوہر خان میرے پیچھے کچھ نہیں ہے۔ آؤ دوبارہ کوشش کرو۔“

اس بار جوہر خان نے آگے بڑھ کر نقاب پوش کے پیٹ پر لات رسید کی تھی..... نقاب پوش چاہتا تو پیچھے ہٹ سکتا تھا لیکن یہ لات بھی اس نے اپنے پیٹ پر برداشت کی اور جوہر خان نے اچھل کر دوسری لات اس کے سینے پر مارنے کی کوشش کی..... اس بار نقاب پوش نے اپنے ہاتھوں سے اس کا پاؤں پکڑا اور اسے ایک زوردار جھٹکا دے کر قلابازی

اپنے ہاتھوں میں پڑی جھٹکڑی اور پیروں میں لگی ہوئی بیڑی کا احساس بھی ہوا تھا وہ جن حالات میں یہ تھوڑا سا وقت گزار چکا تھا۔ انہوں نے اسے بری طرح نڈھال کر دیا تھا..... اب پھر خاموشی سے بستر پر پڑا چھت کو دیکھتا رہا پھر اس کی نگاہیں اس نقاب پوش کی جانب اٹھ گئیں..... آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے سامنے آ گیا تھا..... نقاب پوش نے نرم لہجے میں کہا۔

”جوہر خان کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں تم سے؟“

”اب تو میرے پاس گالیوں کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم نے کہ آخر تم مجھ سے چاہتے کیا ہو۔“

نقاب پوش صبر و سکون کے ساتھ جوہر خان کی گالیاں سنتا رہا پھر اس نے کہا۔

”جوہر خان تمہارے باپ کا نام کیا تھا؟“

”کیوں تمہیں اس سے کیا غرض۔“

”مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے جوہر خان..... بس میں یہ جانا چاہتا ہوں کہ کیا بھی تمہاری طرح اتنا ہی ذلیل انسان تھا جتنے تم ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ بعض اوقات دلی ہاں شیطان اور شیطان کے ہاں ولی پیدا ہو جاتا ہے، میں صرف یہ جانا چاہتا ہوں کہ کیا تم کسی شیطان کے ہاں پیدا ہوئے ہو یا کسی شریف آدمی کی اولاد ہو۔“

”میرے ہاتھ پاؤں کھول دو، اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں شریف آدمی کی اولاد ہوں یا شیطان کی اولاد..... اگر تم واقعی مرد کے بچے ہو تو آؤ فیصلہ کر لیتے ہیں۔“ شیطان کی اولاد ہوں یا ولی کی۔ اسے بھول جاؤ میری اپنی بات میری اپنی زبان پر بھروسہ میرے ساتھ جو سلوک تم لوگوں نے کیا ہے وہ ایسا ہے کہ تم بھی اس پر فخر نہیں کرنا ارے میں تو ہوں ہی برا آدمی لیکن اگر تم اچھے آدمی ہو تو ایک اچھے آدمی کی طرح مجھ سے معاہدہ کرو، تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ایک برے آدمی کی زبان اور ایک اچھے آدمی کی زبان کیا ہوتی ہے۔“

نقاب پوش سکون سے اسے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔

”کیا چاہتے ہو جوہر خان کیا معاہدہ کرنا چاہتے ہو؟“

”میرے ہاتھ پاؤں کھولو، اکیلے مجھ سے مقابلہ کرو اگر شکست کھا جاؤ تو شرائط مجھے جانے دینا اور اگر مجھے زیر کر لو تو پھر میں ولی یا شیطان جس کی بھی اولاد ہوں تم سے

جوہر خان نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر نگاہیں جھکا لیں..... نقاب پوش نے پھر کہا۔
 ”اور جو شخص اپنی زبان کی اس طرح پابندی کرے کہ زبان کے ذریعے وہ وفادار کتے کی
 بنیبت اختیار کر جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت اچھا انسان ہے، اس دور میں جوہر خان
 جیسے انسان جو بظاہر اچھے نظر آتے ہیں اندر سے اتنے برے ہوتے ہیں کہ ان کی برائی کا کوئی

نقاب پوش اسے چھوڑ کر پوری شرافت کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا تھا اور جو ہر خانہ
جگہ بیٹھا رہ گیا تھا، اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور زمین پر بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں
انہیں پکڑ لیا تھا۔

توہ انسان کے ذہن میں اتارا گیا ہے، کیا تمہارے ذہن میں کبھی نیکیوں کا تصور نہیں ابھرا؟“
”میں نہیں جانتا۔“
”خیر..... جوہر خان جو کچھ تمہارے ذریعے امیر علی شاہ نے انسانوں کے ساتھ کیا ہے،
کیا تمہارا ضمیر اس پر مطمئن ہے؟“
”میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے جوہر خان تم اس بارے میں سوچو تھوڑا سا سوچو، غور کرو، موقع مل جائے تو غور کرو، اگر تم واقعی اتنے وفادار ہو کہ اپنی زبان کی پابندی کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں پہلا حکم یہ دیتا ہوں کہ جو کچھ اب تک کرتے رہے ہو اس پر غور کرو، دیکھو وہ سانسے تمہارے لئے کھانے پینے کی اشیاء موجود ہیں..... یہاں غسل خانہ ہے، تمہاری ضروریات زندگی یہاں پوری ہو سکتی ہیں۔ باہر نکلنے کی کوشش کرنا چاہو تو کر سکتے ہو، مجھے اعتراض نہیں ہوگا لیکن یہاں سے باہر نکل نہیں پاؤ گے، میں تمہیں چوبیس گھنٹے کا وقت دیتا ہوں اس چوبیس گھنٹے میں تم صرف اپنے آپ پر غور کرو اور ذرا یہ حساب لگاؤ کہ جو کچھ تم کرتے رہے ہو کیا بہتر کرتے رہے ہو..... چوبیس گھنٹے کے بعد میں دوبارہ تمہارے پاس آؤں گا..... چلتا ہوں۔“ نقاب پوش خاموشی سے مڑا اور اس کے بعد اس تہہ خانے سے باہر نکل گیا..... جوہر خان نے باہر دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تھی۔



بینا نے مسکراتے ہوئے شہاب کا استقبال کیا تھا۔ سلام کے جواب کے بعد شہاب نے کہا۔ ”مجھے امید تھی کہ اس وقت واسطی صاحب آفس میں موجود نہیں ہوں گے۔“
”اگر موجود ہوتے تو کیا فرق پڑتا..... تشریف رکھئے۔“
”بھئی ہمارا معاملہ کچھ اور ہے وکیل صاحب کو بعد میں ہی اس کیس میں شامل ہونا ہے۔“
”رات کے کچھ لمحات آپ کے بارے میں گفتگو کے لئے مخصوص ہوتے ہیں ہم آپ کی بہت سی باتیں کرتے ہیں اور روزانہ کرتے ہیں۔“
”ہنا نہیں کیا باتیں ہوتی ہوں گی۔ خیر..... آپ سے کچھ مشورے کرنے ہیں مس بینا۔“
”جی۔“

”پرانی ترتیب میں اب یہ اضافہ ہو چکا ہے کہ جوہر خان کو میں نے کریم سوسائٹی کی

حساب تک نہیں کیا جاسکتا۔ تم میرے خیال میں بہت اچھے انسان ہو۔ میں نہیں جانتا تمہارا ماضی کیا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا کہ تم امیر علی شاہ کی غلامی میں کیسے آگے لیکن اب سارے ماضی پر نگاہ دوڑاؤ اور یہ بتاؤ کہ امیر علی شاہ نے تمہیں اپنا غلام بنانے کے بعد کیا تمہارے اچھے کام لئے؟“

جوہر خان نے حیرت سے نگاہیں اٹھا کر اس نقاب پوش کو دیکھا پھر بولا۔
”امیر علی شاہ کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟“

”وہ سب کچھ جو امیر علی شاہ ہے، تم امیر علی شاہ کے بارے میں خاصی تفصیل میرے ساتھیوں کو بتا چکے ہو جوہر خان اور مجھے وہ سب کچھ معلوم ہو چکا ہے، وہ بات اپنی لیکن اب میں تم سے یہی سوال پھر کرتا ہوں کہ کیا امیر علی شاہ نے تمہیں اپنا غلام بنانے کے بعد تم سے نیک کام کروائے ہیں۔“
”نہیں۔“

”کیا تمہیں یہ احساس نہیں ہوا جوہر خان کہ تم نے صرف ایک شخص کا وفادار بن کر پیٹ بھرنے کے لئے اپنا تن ڈھکنے کے لئے بہت سے لوگوں کو نقصانات نہیں پہنچائے۔“
”مجھے اب یہ احساس نہ دلاؤ..... میری برائیاں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں۔ میں نے کچھ کیا ہے بے شک وہ اچھا نہیں تھا لیکن میرے مالک کا حکم تھا وہ جو اس نے کہا وہ میں نے کیا۔“
”نہیں جوہر خان، انسان کا مالک صرف اللہ ہوتا ہے کیا تم ایک مسلمان گھرانے نہیں پیدا ہوئے؟“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں اسی کے پاس پلا بڑھا، اسی کے پاس پروان چڑھا، میں نے کائنات کھایا ہے۔“
”نمک، نمک ایک عام سی چیز ہوتی ہے جوہر خان نمک کے علاوہ بھی اس دنیا میں کچھ کھایا جاتا ہے، میں بڑا سادہ سا سوال کر رہا ہوں کیا اس کائنات میں ہر شے کا تخلیق مالک نہیں ہے۔ بولو جواب دو؟“
”ہے۔“

”اور تمہارے امیر علی شاہ کو بھی اس نے تخلیق کیا ہے اس دنیا میں تمہیں جو کچھ اللہ کی طرف سے ملا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کسی کی وفاداری نہ کرو لیکن نیکی اور بدی کا

”بہنا..... تم نے مجھے بہت بڑا مقام دے دیا ہے اپنے درمیان..... واسطی صاحب نے
تمہارے سلسلے میں مجھ پر جس قدر اعتماد کر لیا ہے ان چیزوں نے تمہارے لئے میرے دل
میں بڑی وقعت پیدا کر دی ہے۔“

”سر آپ نے خود ہم لوگوں کو محرزہ کر دیا ہے..... شاید آپ ہمارے دل میں اپنے
مقام کا تعین نہ کر سکیں۔“

”آپ نے کبھی میرے ان وسائل کے بارے میں نہیں سوچا بیٹا جن کے تحت میں یہ
سب کچھ کر لیتا ہوں۔“

”سر میں نے ابتداء میں آپ کے بارے میں سوچا تھا اور جب مقدور بھر آپ کو جان لیا
تو پھر آپ کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا..... میں جانتی ہوں کہ جو کچھ مجھے بتانا مناسب ہے وہ
آپ نے بتا دیا ہے۔“

”آج پھر میں اپنا ماضی تمہارے سامنے دہرا رہا ہوں..... یہ ضروری ہے بیٹا..... بہت
شریف آدمی کی اولاد ہیں ہم، تین بھائی اور دو بہنیں..... ثاقب صاحب نے صحافت کی
عبادت کی..... انہوں نے اس پر اپنی زندگی تک قربان کر دی..... ان کی موت پر چند مضمون
لکھے گئے اور بس..... کسی نے ان کی سچائیوں کو پھر یاد نہ کیا جبکہ ان کے کئی ہم عصر اب صحافت
کے پیشے کو ترک کر کے صنعت کار اور سیاستدان بن چکے ہیں، وہ حکومت میں اہم عہدے
حاصل کر چکے ہیں کیونکہ حاصل کرنا آتا تھا..... بس میرے بہن بھائی نہایت کمپرسی میں
پروان چڑھے..... ہم نے جس طرح تعلیم حاصل کی وہ بھی المیہ داستان کا ایک باب ہے.....
بہر حال زندہ رہے..... بہت سوں کی عنایتوں نے زندہ رہنے میں مدد کی..... بیٹا میرے دو
بھائی..... ایک بڑے اور ایک چھوٹے نے اس زندگی کا آغاز کیا جو ان کے لئے ممکن تھی.....
تم تعین کرو وہ حالات سے جنگ کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے، چنانچہ انہوں نے شرافت کا سہارا لیا
اور شریف کہلانے لگے، اگر ان شریفوں میں بھی حالات سے جنگ کا حوصلہ ہوتا تو وہ شاید
مختلف ہوتے..... میں نے دنیا کو بغور دیکھا..... کامیاب لوگوں کا مطالعہ کیا، انہیں سمجھا اور
وقت سے لڑنے کا حوصلہ پیدا کیا..... کچھ برے صرف برے ہوتے ہیں..... وہ موقع ملنے پر
بھی بہتر نہیں بنتے..... کچھ میں برائی کے ساتھ کچھ بہتری کے جراثیم بھی ہوتے ہیں.....
میں ایک درمیانی راستے کا متلاشی تھا..... گھروالے اقدار کی چادر پھیلائے بیٹھے تھے، میں اس

کو بھی میں پہنچا دیا ہے..... اس سے اور بھی کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں۔“

”گڈ۔“

”لیکن بیٹا میں اب غیاث احمد کے لئے فکر مند ہو گیا ہوں..... اسے کوئی نقصان نہ پہنچ
جائے..... رحمان شاہ، امیر علی شاہ کے قبضے میں آچکا ہے..... ان ہنگامہ آرائیوں کے
پشت کہیں وہ غیاث بیگ کو نہ سمجھے حالانکہ مجھے اپنے کام کی تکمیل کے لئے اب زیادہ دیر
درکار نہ ہوگا لیکن پھر بھی۔“

”آپ کا خیال ہے کہ غیاث بیگ خطرے میں پڑ سکتا ہے؟“

”ہاں بیٹا..... اس کے امکانات ہیں۔“

”تو پھر؟“

”وقت سے پہلے غیاث بیگ کو وہاں سے ہٹانا بھی مناسب نہیں ہے۔“

”سر اس کے تحفظ کے لئے کوئی بندوبست کیا ہے؟“

”ہاں اس کے گھر کی مسلسل نگرانی کی جا رہی ہے۔“

”یقیناً وہ قابل اطمینان لوگ ہوں گے جو اس کے گھر کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔“

”نہ کہا اور شہاب سوچ میں ڈوب گیا..... بیٹا کے پاس وہ اس وقت بے مقصد نہیں آیا تھا۔
بہت دن سے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا..... یہ کوئی جذباتی مرحلہ نہیں تھا..... بڑا
شخصیت تو خیر اسے پسند ہی تھی لیکن اس کے علاوہ اپنے تمام تجربے سے وہ یہ بات کہہ سکتا
کہ بیٹا ایک زیرک، ذہین، معاملہ فہم، پھرتیلی اور دلیر لڑکی تھی۔ اس پر ہر طرح اعتبار کیا جا
تھا..... شہنشاہ کی شخصیت کے بارے میں صرف وہ واقف تھا یا فتح محمد لیکن فتح محمد اس کیلئے
نہیں کر سکتا تھا..... اب جوں، جوں یہ کام بڑھ رہا تھا اسے کچھ ضرورتیں محسوس ہو رہی تھیں
اور بیٹا اس کی خوش بختی تھی۔ آج وہ بیٹا کو شہنشاہ کے راز میں شریک کرنے آیا تھا۔
بیٹا شہاب کے جواب کا انتظار کر رہی تھی..... کچھ لمحے توقف کے بعد شہاب نے
”ہاں بیٹا وہ قابل اطمینان ہیں..... ویسے بیٹا آج کچھ اور باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے تم سے۔“

”سر آپ چائے پیئیں گے؟“

”یقین کر دو دل نہیں چاہ رہا۔“

”ٹھیک ہے..... جی سر۔“ بیٹا نے کہا۔

غیاث بیگ کے سلسلے میں، میں اپنی ٹیم کو ممکنہ ہدایات دیئے دیتا ہوں۔“
”جی سر۔“ بیٹا نے مسرت سے کہا۔



فیاض علی اور گلزار علی نے پچار و روک دی، پھر تینوں اتر کر غیاث بیگ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ دستک پر غیاث بیگ نے خود ہی دروازہ کھولا تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ بے اختیار رہ گیا۔

”سرکار آپ؟“

”ہم اندر آ سکتے ہیں۔“ فیاض علی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”ارے سرکاریہ، یہ جگہ اس قابل کہاں ہے۔ آئیے سرکار، اگر آپ غریب کے اس جھونپڑے کو اس قابل سمجھتے ہیں تو تشریف لائیے اس جھونپڑے میں تو آپ کو بٹھانے کے لئے صبح جگہ بھی نہیں ہے۔ آئیے، آئیے۔“ غیاث بیگ پیچھے ہٹ گیا اور تینوں اندر داخل ہو گئے۔ ناہید سامنے موجود تھی۔ غیاث بیگ کی بیوی بھی سامنے ہی تھی وہ سب ان امیر زادوں کو پہچانتے تھے جو ان کی تباہی بن گئے تھے۔ غیاث بیگ انہیں پلنگ تک لے گیا اور کچھ بدحواس سا نظر آنے لگا۔

”بڑے میاں اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں تمہیں معلوم ہے تمہارے ہاں مہمان بن کر نہیں آئے۔ کچھ معلومات کرنی ہیں تم سے یہ جوہر خان کہاں ہے؟“
”سرکار، دو دن سے غائب ہے۔ آپ کی طرف نہیں گیا، شاہ پور میں نہیں ہے وہ۔“
”دو دن سے غائب ہے؟“

”جی سرکار، ہم تو یہی سمجھے کہ شاہ پور میں ہو گا۔ بڑے سرکار نے کسی کام سے مصروف کر دیا ہو گا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔ کہاں جاسکتا ہے وہ؟“

”سرکار ہمیں بتا کر جائے گا وہ۔ ہم تو رعایا ہیں، کمی کمینے ہیں ہم لوگ، ہماری کوئی اوقات ہے اب، بس زندگی کی جتنی سانسیں ہیں سہہ رہے ہیں انہیں۔“

”دیکھو چچا غیاث بیگ، ہم نے بچپن سے تمہیں دیکھا ہے اور تمہاری عزت کی ہے، اس لئے ہمیں کسی ایسی بات پر مجبور مت کرو جس پر ہمیں خود افسوس ہو۔“

چادر پر نہ بیٹھ اور میں نے اپنی جگہ تلاش کرنی شروع کر دی، اسی دوران بیٹا میں نے کچھ لوگوں کو تلاش کیا جو بہترین صلاحیتوں کے مالک تھے لیکن بے وسیلہ تھے اور میری طرح جھنجھلائے ہوئے، میں نے ان سے رابطے کئے اور ایک گروہ بتالیا جسے ڈبل اوگر وپ کاہر گیا۔ اس وقت اس گروپ میں چھ افراد ہیں۔ ہم چھوٹے، چھوٹے کام کرتے رہے ہیں کسی مضبوط پشت کی تلاش میں تھا اور پھر میں کامیاب ہو گیا۔ تبھی مجھے پولیس کی ملازمت مل گئی۔ اب میں زیادہ پر اعتماد ہوں، یہ وہی لوگ ہیں جن پر میں ہر طرح اعتماد کر سکتا ہوں۔ گلد۔۔۔۔۔ طریقہ کار کیا ہے سر۔“ بیٹا نے دلچسپی سے پوچھا۔

”وہ لوگ مجھے شہنشاہ کے نام سے جانتے ہیں۔“ شہاب نے ہر شخص کی تفصیل بتا دی ہوئے کہا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ یعنی وہ آپ کی اصل شخصیت سے ناواقف ہیں۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے کبھی اپنے بارے میں نہیں جانے دیا۔“

”آہ۔۔۔۔۔ کتنا عجیب، کتنا سنسنی خیز ہے یہ سب لیکن سر آپ نے مجھے۔“

”اس کی وجہ ہے۔“ شہاب نے کہا۔۔۔۔۔ ”تمہیں ڈبل اوگینگ کا سا تو ان رکن بنانا چاہیے ہوں میں۔ تم اب میری اسسٹنٹ کی حیثیت سے اس گروپ کو کنٹرول کرو گی لیکن ان پر ظاہر نہیں کروں گی کہ تم مجھے جانتی ہو۔“

”اوہ میرے خدا۔“ بیٹا شدید سنسنی کا شکار ہو گئی۔

”کیا تمہیں میری یہ پیشکش منظور ہے بیٹا۔“

”سر۔۔۔۔۔ یہ میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔ میں خوشی سے اس کے لئے تیار ہوں۔“

”گلد۔۔۔۔۔ اب اس سلسلے میں مزید تفصیلات سن لو۔ بہت جلد میں تمہیں ان روشناس کروا دوں گا۔“ شہاب دیر تک بیٹا کو اپنی پوری ٹیم کے بارے میں بتاتا رہا اور وہ سننے میں مبتلا رہی، اس کے بعد بات پھر غیاث بیگ پر آ گئی اور وہ دیر تک اس کے بارے میں بات کرتے رہے پھر کریم سوسائٹی کی اس کوٹھی کے بارے میں کئی منصوبے زیر غور رہے۔ میں شہاب نے کہا۔

”ٹھیک ہے بیٹا۔۔۔۔۔ اب یہ معاملہ تمہاری نگرانی میں دے رہا ہوں۔ ویسے میری بہت بڑی آنکھن دور ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اب ہم اپنا دائرہ کار بہترین کر لیں گے۔“

”کہاں سرکار؟“

”شاہ پور بڑے سرکار کے پاس، تم تینوں کو بلایا ہے۔“

فیاض علی نے خود ہی فیصلہ کر کے کہا..... اب اس سلسلے میں یہاں سے معلومات نہیں حاصل ہو سکتی تھیں تو وہ لوگ کیا کرتے..... جھلاہٹ کا شکار ہو گئے تھے اور کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھے..... غیاث بیگ نے کچھ سوچا، پھر آہستہ سے بولا۔

”ٹھیک ہے سرکار، جو حکم ہو۔“ اور پھر اس نے ناہید کی طرف رخ کر کے کہا۔

”چلو بیٹا دو چار جوڑی کپڑے ہیں باندھ لو، سرکار کا حکم نالا تو نہیں جاسکتا۔“ ناہید اور غیاث بیگ کی بیوی خاموشی سے اندر چل پڑی تھیں..... تینوں بھائی خاصے اُلجھے ہوئے تھے اور ان پر شدید جھلاہٹ سوار تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں عورتیں دو گٹھریاں لے کر نکل آئیں اور وہ دروازے کی جانب چل پڑے..... غیاث بیگ مردہ قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا..... بہت سے خیالات اس کے دل میں آ رہے تھے..... فیاض علی نے دروازہ کھولا لیکن دروازہ کھولتے ہی وہ بری طرح ٹھنک گیا وہ چھہ نقاب پوش تھے جو زبردست اسلحے سے لیس دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں دہلی ہوئی جدید ساخت کی رائفلوں کا رخ ان کی جانب تھا..... فیاض علی وغیرہ بری طرح سہم گئے..... نقاب پوشوں میں سے ایک نے انہیں پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور وہ بری طرح پیچھے ہٹے..... غیاث بیگ ان کی پلیٹ میں آکر گرتے، گرتے بچا تھا..... دونوں عورتیں اُچھل کر ادھر ادھر ہو گئی تھیں..... ان کے حلق میں ان کی چیخیں گھٹ گئی تھیں..... نقاب پوشوں میں سے ایک نے فیاض علی کی گردن پر رائفل کی نال رکھتے ہوئے کہا۔

”دونوں ہاتھ پشت پر کر لو تم سب، خبردار منہ سے اگر آواز نکلی تو وہ تمہاری آخری آواز ہوگی۔“ ان تینوں کے اوسان خطا ہو گئے تھے بھلا ان کے منہ سے کیا آواز نکلتی..... تینوں نے ہاتھ پیچھے کر لئے اور دو نقاب پوشوں نے پھرتی سے عقب میں پہنچ کر ان کے ہاتھ مضبوطی سے کس لئے۔ دونوں عورتیں تو دہشت سے سمٹ کر ایک دیوار سے جا لگی تھیں۔ غیاث بیگ بیٹھی، بیٹھی آنکھوں سے یہ کارروائی دیکھ رہا تھا..... آن کی آن میں ان تینوں کے ہاتھ کس دیئے گئے اور پھر ان کے منہ کھلوا کر ان کے منہ میں عجیب ساخت کے ربڑ کے گولے ٹھونس دیئے گئے جس سے ان کے منہ بند ہو گئے تھے۔

”تصور غم تو ہم بن گئے ہیں سرکار، آپ کو پتا ہے سب کچھ چھین لیا گیا ہے ہم نہیں جو اوقات دی گئی ہے اسی میں گزارا کر رہے ہیں۔“

”اور اب اس اوقات کو بدلنے کی کوشش بھی کر رہے ہو۔“

”کرتے سرکار اگر ہمارا ستون ہم سے نہ چھین لیا جاتا..... ہم تو بوڑھے ہو گئے ہیں اپنی ہڈیوں میں اتنی جان نہیں پاتے کہ صحیح کھڑے بھی ہو سکیں، ہمارا بیٹا ہوتا تو ہم آخر کوشش ضرور کرتے جینے کی، پر کیا کریں بڑے سرکار نے وہ بھی چھین لیا اور تقدیر نے ان ساتھ دیا..... ورنہ لوگ کہتے ہیں کہ ظلم کی لاناھی کبھی نہ کبھی ٹوٹ جاتی ہے..... انظار کر رہے ہیں سرکار کہ یہ لاناھی کب ٹوٹی ہے۔“

”غیاث بیگ، ہمیں کہانیاں سنانے کی کوشش مت کرو یہ بتاؤ تم بڑے سرکار کے خلاف کیا سازش کر رہے ہو؟“

”سازش، ہم کیا کہیں چھوٹے سرکار، اپنی درگت نہیں بنانا چاہتے ورنہ جواب تو اب دیتے ہم آپ کو کہ آپ کا دل خوش ہو جاتا، ارے سرکار اس وقت کا انتظار کیجئے جب آپ بھی ہمارے جیسے ہو جائیں کمزور، بے سہارا اور بے بس، جس کے لئے جینا بھی مشکل ہو..... اس کے بعد ہم بھی آپ سے پوچھیں کہ سرکار کس کے خلاف کوئی سازش کر رہے ہیں..... ارے یہاں تو جینا ہی زندگی کی سب سے بڑی مشکل بن گیا ہے۔ ہم کیا سازش کریں گے سرکار اگر کوئی خیال دل میں ہے تو نکالئے پستول اور یہ آخری سانسیں بھی چھین لیجئے..... اور کیا کہیں آپ سے؟“

فیاض علی نے جھنجھلائی ہوئی نگاہوں سے دونوں بھائیوں کی جانب دیکھا اب بھلا اس سلسلے میں اور کیا کہے۔ غیاث بیگ اس پائے کا آدمی ہوتا تو پہلے ہی بہت کچھ کر بیٹھا ہوتا، سب کچھ سہتا رہتا تھا اور باپ کا سوچنے کا انداز اس طرح کا تھا..... صاف ظاہر ہوتا تھا کہ غیاث بیگ اس سننے میں بالکل بے قصور ہے..... چنانچہ اب کیا، کیا جائے..... بہر حال اس نے کہا۔

”جو ہر خان کے بارے میں کوئی صحیح معلومات نہیں حاصل ہے تمہیں؟“

”نہیں سرکار، ہمارا بس اس سے اتنا ہی واسطہ ہے کہ جوتے، لات، تھپڑ کھالیتے ہوں اس سے اور جو بھی خدمت لینا چاہتا ہے وہ خدمت کر لیتے ہیں اس کی۔“

”تو پھر ایسا کرو تھوڑے بہت کپڑے رکھ لو، تیار ہو جاؤ، تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔“

”چلو اور تم بڑے میاں تم یہیں رکو، خبردار، کسی سے اس کارروائی کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو اپنے نقصان کے ذمے دار خود ہو گے سمجھ لینا اچھی طرح، چلو۔“ نقاب پوشوں نے فیاض علی وغیرہ کو رانگل کی نال سے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔ تینوں کے پاؤں لرز رہے تھے وہ بری طرح دہشت زدہ ہو گئے تھے، پھر وہ لوگ انہیں ایک پرانی سی بند گاڑی کی جانب لے گئے۔ گاڑی کا دروازہ کھولا گیا اور انہیں اس میں ٹھونس دیا گیا۔ تین نقاب پوش رانگلین تھام کر ان کے سامنے بیٹھ گئے تھے اور باقی آگے بڑھ گئے تھے، لیکن ان میں سے ایک نقاب پوش وہیں رہ گیا تھا۔۔۔۔۔۔ جب بندوین آگے بڑھ گئی تو نقاب پوش نے پجوار میں داخل ہو کر اس کا انجن سٹارٹ کیا اور اسے لے کر ایک جانب چل پڑا۔۔۔۔۔۔ پجوار کی چابی اس نے شاہ علی شاہ کے لباس سے نکال لی تھی۔ اس علاقے سے کچھ دور نکل کر اس نے چہرے سے نقاب اتار لیا پھر ایک شادی ہال کے پارکنگ میں اس نے پجوار پارک کی اور نیچے اتر کر ٹہلنے والے انداز میں آگے بڑھ گیا۔

ایک نامعلوم سی بے کلی، ایک بے نام سا احساس، امیر علی شاہ ان دنوں شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔ بڑی مطمئن زندگی گزاری تھی اس نے، زمینیں لا محدود، کاروبار لا محدود، آمدنی لا محدود، زندگی میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔۔۔۔۔۔ شادی ماں باپ نے کی تھی۔ اپنی پسند اور اپنے اصولوں کے مطابق کی تھی۔ مزاج کا یہ شعبہ نہیں تھا اس لئے عورت مشکل نہیں بنی۔ بیوی سیدھی سادی خاندانی عورت تھی۔ سر جھکا کر گزارہ کر گئی، بیٹے بھی مشکل نہ بنے۔۔۔۔۔۔ ابتداء ہی سے ان پر سختی رکھی تھی۔ رحمان علی شاہ بھی سرکش نہیں تھا۔ سرکش تو اس نے کی ہی نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ نوجوانی کی عمر تھی، صنف مخالف اس عمر میں ذہنوں کے لئے ایک انوکھی کشش رکھتی ہے اور کبھی، کبھی انسان بری طرح بھٹک جاتا ہے، رحمان علی شاہ بھی بھٹک ہی گیا تھا۔ ورنہ پوری زندگی کے ریکارڈ میں کسی بیٹے نے کبھی باپ کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے کی کوشش نہیں کی تھی اور ہر بات پر سر جھکانے کے عادی تھے۔۔۔۔۔۔ اصل غصہ تو غیارت بیگ پر تھا۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے عزت دار آدمی تھا۔ شاہ پو پکا پرانا خاندانی لیکن امیر علی شاہ کے جوڑ کا بھی نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ اسے خود سوچنا چاہئے تھا یا پھر اس کے سوچنے کی باری ہی نہیں آئی تھی۔۔۔۔۔۔ نوجوانوں نے سارا کھیل خود ہی حیل ڈالا تھا، یہ سوچ کر کہ بھلا جوانی کے راتے



”کون آسکتا ہے سمجھانے پر مان جانا چاہئے تھا لیکن نہ مانے، ذمے داری غیاث بیگ کی جی کو نہ امیر علی شاہ کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ فیصلہ اسے کرنا چاہئے تھا کہ کیا امیر علی شاہ نے اسے سمجھایا لیکن وہ کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکا۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد تو برے ہی تھی جو کچھ کیا وہ ضرورت تھی اور اس کے نتیجے میں رحمان علی شاہ نے بوقدم اٹھایا اس کے تحت اگر کوئی اور ہوتا تو اس کے جسم کے اتنے ٹکڑے کرائے جاتے کہ کوئی شخص انہیں دوبارہ سنبھال نہ سکتا لیکن اپنی اولاد تھی اس لئے زیادہ سے زیادہ انتقام کی شدت سے یہ رخ اختیار کیا اور رحمان علی شاہ کو راندہ درگاہ کر دیا گیا لیکن اب نہ جانے کیوں ایک انوکھا احساس دل میں جا گزریں ہو رہا تھا، وہ رات بڑی بھیانک رات تھی۔۔۔۔۔۔ جب کوئی اس حویلی میں داخل ہوا۔۔۔۔۔۔ اس حویلی میں جہاں امیر علی شاہ کی اجازت کے بغیر اس طرح داخل ہونے کا تصور بھی موت کا خوف دلادیتا تھا۔۔۔۔۔۔ امیر علی شاہ کا ہنر غائب ہوا اس کے خاص الخاص آدمیوں، خیر خان اور گل باز خان کو رحمان علی شاہ کے نام سے پینا گیا۔۔۔۔۔۔ بڑا انوکھا تصور تھا، بڑا عجیب خیال تھا یہ اور پھر اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ وہ رحمان علی شاہ نہیں تھا۔۔۔۔۔۔ ایسا کون سرکش ہے، ایسا کون جیلا ہے، کہاں سے پیدا ہو گیا اور کیوں، یہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ اگر کچھ الجھوانہ ہوتا، بات کچھ خطرناک لوگوں کی ہوتی جو منظر عام پر آ جاتے تو پھر ان کے خاندانوں کی تباہی لازمی تھی۔۔۔۔۔۔ بچنا مشکل ہو جاتا ان کا لیکن ایسا نادریدہ وجود جس کے بارے میں ابھی تک کچھ پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔۔۔۔۔۔ غیاث بیگ کے بارے میں سوچتا تو ذہن خود ہی اس کی تردید کرنے لگتا تھا۔۔۔۔۔۔ غیاث بیگ کا ماضی اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اس کی پشتوں میں بھی کبھی کوئی ایسا سرکش نہیں پیدا ہوا تھا جو امیر علی شاہ کے خاندان سے ٹکر لے لے، کون ہے مجھ وہ کون ہے، آخر وہ کون ہے۔۔۔۔۔۔ بس شاید یہی بے کلی تھی، یہی بے چینی تھی، یہی بے قراری تھی اس کے بعد رحمان علی شاہ کو کلینک سے لے آیا گیا تہہ خانے میں رکھا گیا اور یہ تہہ خانے امیر علی شاہ کے بزرگوں نے بنوائے تھے۔۔۔۔۔۔ ظاہر ہی خاندان ایک ہی تھا، انداز ایک ہی تھا اور یہی طریقہ کار برسوں سے اختیار کیا گیا تھا۔۔۔۔۔۔ انسانوں کو انسان نہ سمجھا جائے، بشمول کو ایسا مزہ چکھایا جائے کہ اپنی نسلوں کو وصیت کر جائیں کہ کبھی اس خاندان کے راستے میں نہ آئیں۔۔۔۔۔۔ تہہ خانوں میں عقوبت خانے بھی بنے ہوئے تھے اور ایسی پر اسرار جگہیں بھی جہاں سے مجرموں کا جائزہ لیا جاسکے اور یہ جائزہ لیا گیا تھا اس وقت، جب رحمان

”ہیلو کون ہے؟“

”جوہر خان بول رہا ہے شاہ صاحب۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”او جوہر خان کیسا ہے تو..... میں آ رہا تھا تیرے پاس بڑا خراب حال ہو گیا ہے، شہر ہر کارروائی کرنی پڑے گی تینوں لڑکے غائب ہیں ایک عجیب کھیل شروع ہو گیا ہے بھئی، تم سب یکے ہو، جھک مار رہے ہو۔“

”شاہ صاحب میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو بول کیا بات ہے لمبی بات مت کر، میں آ رہا ہوں باقی باتیں وہیں ہو جائیں گی۔“

غیاث بیگ کیسا ہے گھر میں ہے؟“

”شاہ صاحب میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

جوہر خان کا لہجہ تلخ ہو گیا اور امیر علی شاہ کی آنکھیں ہیرت سے پھیل گئیں۔ جوہر خان اور اس لہجے میں بات کرے اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”او تیرا دماغ تو ٹھیک ہے، کیسے بول رہا ہے تو مجھ سے کیا تیری آواز میں نرمی ہے؟“

”میں نے اپنی آواز کی نرمی ختم کر دی ہے امیر علی شاہ۔“

”او تو پاگل ہو گیا ہے کیا..... موت آئی ہے تیری..... میرے دروازے کے کتے، تیرا لہجہ کیسا ہے، تیری جرات کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح بولنے کی..... پہلے مجھے اس بات کا جواب دے؟“

”اس بات کا جواب یہ ہے امیر علی شاہ کہ اب میں نے تمہاری غلامی چھوڑ دی ہے۔“

”دنیا چھوڑنے کا ارادہ ہے کیا؟“

”نہیں۔“

”تو پھر کیا پاگل ہو گیا ہے؟“ امیر علی شاہ نے غرا کر کہا۔

”نہیں پاگل بھی نہیں ہوا..... بس غلامی چھوڑ دی ہے اور میری غلامی چھوڑنے کے بعد دنیا تو تمہیں چھوڑنی پڑے گی امیر علی شاہ۔“ امیر علی شاہ کا پورا بدن سنسن کر رہ گیا..... غصے کی شدت نے اس کی زبان بند کر دی تھی وہ کچھ دیر سکوت کے عالم میں رہا اور پھر اس کی غراہٹ ابھری۔

”جوہر خان یہ پاگل پن تجھ پر کیسے سوار ہوا..... میرے مٹانے آ..... سامنے آ کر بات

علی شاہ کو تہہ خانے میں لایا گیا تھا جو کچھ ہوا تھا اس کی کوئی صحیح شکل ہی سامنے نہیں آ رہی تھی، پھر رحمان علی شاہ نے جس کیفیت کا مظاہرہ کیا تھا وہ ایک طرف تو قابل افسوس تھی دوسری طرف ذرا پریشان کن کہ کہیں رحمان علی شاہ اداکاری تو نہیں کر رہا۔ ایاز بیگ رحمان علی شاہ کے پاس جانے کا موقع دیا گیا..... ایاز بیگ کو دیکھنے کے بعد رحمان علی شاہ انداز میں کوئی تبدیلی رونما ہونی چاہئے تھی لیکن اس نے ایاز بیگ پر بھی توجہ نہیں دی اور اس کی کیفیت دیکھنے کے بعد امیر علی شاہ کو یہ یقین ہو گیا کہ اس کا ذہنی توازن متاثر ہو گیا ہے۔ بات بھی دکھ کا باعث تھی، اگر امیر علی شاہ ڈاکٹر نصرت کبیر کو حکم دیتا کہ اسے سچ کچھ بتا دے بنادو اور نصرت کبیر یہ سب کچھ کرتا تو بات الگ تھی..... اس نے اپنے طور پر اتنے پر خاندان کے ایک نوجوان کو ذہنی طور پر معطل کیوں کر دیا، اس کی یہ جرات کیوں ہوئی شامت تو آجاتی نصرت کبیر کی، لیکن امیر علی شاہ بہت سے محاذ ایک ساتھ نہیں کھولنا چاہتا تھا، پہلے اس شخص کا پتا چل جائے جس نے گل باز خان اور خیر خان کو مارا تھا اس کے بعد ہی معاملات سے نمٹا جائے گا۔ غرض یہ کہ انہی حالات میں وقت گزر رہا تھا..... تینوں نکلوں تحقیقات کے لئے بھیجا تھا لیکن امیر علی شاہ کو خود بھی اس بات کی امید نہیں تھی کہ وہ کسی صورت حال معلوم کر کے آئیں گے..... اپنی اولاد کا اسے خود اندازہ تھا..... عیش و عشرت کی زندگی میں پل کر سارے کے سارے ٹکے ہو چکے تھے اور ان میں کوئی بڑا کام کرنے کی صلاحیت نہیں تھی، پھر بھی وہ انتظار کرتا رہا اور وقت گزرتا رہا، پھر اس کے بعد اس کے غم میں شدت آنے لگی۔ دن گزر گیا تھا..... دوسرا دن بھی گزر گیا تھا اور اب تیسرے دن کا آغاز ہو گیا تھا لیکن تینوں لڑکے واپس نہیں آئے تھے۔ ایسی کون سی لمبی تحقیقات کرنے لگ گئے۔ شہر میں فیاض علی خان کی کوٹھی پر ٹیلی فون کیا..... وہاں سے جواب ملا کہ فیاض علی خان تین چار دن سے ادھر آیا ہی نہیں ہے۔ یہ لڑکے کہاں غائب ہو گئے، جانا پڑے گا، خود شہر پر پڑے گا اور اس سلسلے میں کارروائی کرنا ہوگی وہ تیاریاں کرنے لگا..... خیر خان، گل باز خان، بلایا گیا..... ان کی حالت اب خاصی بہتر تھی لیکن وہ سخت خوف زدہ تھے نہ جانے کیوں ان کی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ بہر حال ان سے کوئی خاص بات کرنا مناسب نہیں تھا..... ڈاکٹر گاڑی تیار کر رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور امیر علی شاہ نے نفرت بھرے انداز میں ٹیلی فون کا ریسیور اٹھالیا اور غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

کر..... تو میرا وفادار کتا رہا ہے اور میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس لئے نے گردن کیوں اٹھائی ہے، اس کے بعد تجھے تیری ساری باتوں کا جواب دوں گا..... آج میرے سامنے ایک بار جوہر خان تو، مرد کا کاجچ ہے، مرد کے بچے مردوں ہی سے بات کرتے ہیں..... آج سامنے، سامنے آکر بات کر۔“

”امیر علی شاہ نے زنگی میں بہت کچھ کیا تھا اور جوہر خان اس کا پورا، پورا رازدار تھا نہ صرف رازدار بلکہ یقیناً جوہر خان کے پاس اس کے بارے میں بے شمار ثبوت تھے لیکن چونکہ اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔“

”جانتا ہے، قانون میرے گھر کے ایک کمرے میں رہتا ہے، میں کسی بھی وقت قانون کا سامنا کر سکتا ہوں اور میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ذلیل کتے، قانون میں بناتا ہوں، جو میں کہتا ہوں وہ ہوتا ہے۔ کیا تو یہ بات نہیں جانتا؟“

”جانتا ہوں امیر علی شاہ اس لئے میں نے دوسرا انتظام بھی کیا ہے۔ کیا سمجھا؟“

”ہاں..... فیاض علی، گلزار علی اور شاد علی اس وقت میرے پاس ہیں میرے قبضے میں رازداری مرضی کے مطابق کل شام تک مجھے میری مطلوبہ رقم نہ ادا کر دی گئی تو سب سے پہلے فیاض علی، اس کے بعد گلزار علی اور پھر شاد علی کی لاش، ایک ایک کر کے تمہارے سامنے پیش کی جائیں گی..... تم جانتے ہو قتل کرنا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے اور ایک میں تمہارے لئے لوگوں کو قتل کرتا رہا ہوں۔“

”کیا بکواس کرتا ہے کتے، کیا بکواس کرتا ہے، ان تینوں کا تجھ سے کیا تعلق؟“

”تمہیں معلوم ہے امیر علی شاہ اب ان کا مجھ سے تعلق پیدا ہو گیا ہے۔ غیث بیگ کے لڑکے بچا تھا تاہم نے انہیں۔ وہاں سے میں نے انہیں اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور اب یہ وہاں ایک تہہ خانے میں محفوظ ہیں ابھی تک میں نے انہیں کوئی تکلیف نہیں دی ہے۔“

”بتاؤ، تو، بکتا ہے تو؟“

”تھیک ہے امیر علی شاہ پھر انتظار کرو، پہلی لاش کا؟“

”کتے، کتے، میں تیری نسلوں کو تباہ کر دوں گا، تو نے اگر میرے کسی بھی بیٹے کو نقصان پہنچا تو میں تیری نسلوں کو تباہ کر دوں گا۔“ جواب میں جوہر خان ہنس پڑا۔

”تو میرا وفادار کتا رہا ہے اور میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس لئے نے گردن کیوں اٹھائی ہے، اس کے بعد تجھے تیری ساری باتوں کا جواب دوں گا..... آج میرے سامنے ایک بار جوہر خان تو، مرد کا کاجچ ہے، مرد کے بچے مردوں ہی سے بات کرتے ہیں..... آج سامنے، سامنے آکر بات کر۔“

”امیر علی شاہ میں پاگل نہیں ہوا ہوں اس لئے تمہارے سامنے نہیں آؤں گا جو کچھ میرا کہنا چاہتا ہوں اگر سکون سے سن سکتے ہو تو سن لو..... وقت بدل گیا ہے بعد میں یہ نہ کہنا کہ جوہر خان تو نے مجھ سے بات نہیں کی۔“

”بول کیا بات کرنا چاہتا ہے بول..... آج تیری یہ مجال ہو گئی کہ میرے سامنے تو مجھ سے بات کر رہا ہے، بول کیا بات کرنا چاہتا ہے؟“ امیر علی شاہ کے بدن پر تھر تھری طاری تھی۔ غصے، نا شدت سے اس کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگا تھا۔ جوہر خان نے کہا۔

”تو نے یہ بات تسلیم کی ہے امیر علی شاہ کہ میں نے تیرے دروازے کی غلامی کی ہے۔ کتوں کی طرح پروان چڑھا ہوں تیرے سامنے اب میرا دل نہیں چاہتا کہ میں کتوں جیسا زندگی گزاروں، میں نے اپنی عاقبت خراب کر لی ہے تیرے لئے، لئے سیدھے کام کر، کر کے عاقبت تو خراب ہو ہی چکی ہے میری لیکن دنیا ہی کیوں نہ بناؤں، میں بھی کیوں نہ عیش کروں جیسے دنیا کے لوگ عیش کرتے ہیں۔ امیر علی شاہ میرے دماغ میں تبدیلی آئی ہے میں نے سوچا ہے کہ تیرے لئے اب تک جو کچھ کرتا رہا ہوں اب تجھ سے اس کا صلہ وصول کروں۔“

”اوکتے، اوکتے، کیا صلہ نہیں دیا میں نے تجھے، گھر بنا دیا تیرا، اتنی خوب صورت لڑکی سے تیری شادی کرادی تیری، ہر ضرورت پوری ہوتی ہے میری ڈیوڑھی سے۔“

”نہیں میری ہر ضرورت تیری خوشی کے مطابق پوری ہوتی ہے امیر علی شاہ، اب میں یہی نہیں چاہتا، سن زیادہ باتیں کرنے سے کوئی فائدہ نہیں..... مجھے پچاس لاکھ روپے چاہیے۔“

پورے پچاس لاکھ نقد اور نوٹوں کی شکل میں اگر یہ بات تجھے مذاق لگتی ہے تو پھر میری طرف سے ہونے والے مذاق کا انتظار کر، میں تجھے زیادہ انتظار نہیں کروں گا امیر علی شاہ۔“

”اوکینے، اوذلیل تو مجھ سے تو تڑاک سے بات کر رہا ہے؟“

”ہاں..... میں اب ہر بند سن سے آزاد ہو چکا ہوں کیا نہیں کیا میں نے تیرے لئے؟ علی شاہ، طالب حسین، فضل الدین، مولوی اصغر خان اور بہت سے دوسرے جن کے

شہاب فون بند کر کے کھانسنے لگا۔ اس نے بڑی عمدگی سے جوہر خان کی آواز کی نقل کی تھی۔ یہ کام وہ اپنے کسی اور آدمی سے نہیں لے سکتا تھا۔ اس لئے اس نے جوہر خان کو اپنی جوتی میں لے لیا تھا اور اس پر کام کیا تھا۔ ویسے جوہر خان اب ایک مستحکم حیثیت سے مانے آیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب وہ جوہر خان کے پاس پہنچا تو وہ زمین پر دوڑانوں بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا۔ شہاب خاموشی سے بیٹھ گیا۔ تب جوہر خان جھپٹے ہوئے انداز میں کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”سوری جوہر خان تمہیں کچھ دیر کے بعد جائے نماز مل جائے گی اور وضو وغیرہ کے لئے لوٹا بھی۔“

”صاحب مجھے نماز نہیں آتی مگر اب دل چاہتا ہے۔۔۔۔۔ یہ تو بس ایسے ہی اللہ کے مانے بیٹھ گیا تھا۔“

”تھوڑے بہت پڑھے لکھے ہو؟“

”نہیں صاحب۔“

”نماز کی کتاب لادی جائے تو پڑھ سکو گے؟“

”نہیں پڑھ سکوں گا۔“

”خیر اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ ویسے بھی میں تمہیں زیادہ دن یہاں نہیں رکھوں گا۔“

”نہیں صاحب۔ اب میرے دل میں کہیں جانے کی آرزو نہیں ہے۔۔۔۔۔ تھوڑے عرصہ میں آپ کو میرے اوپر اعتبار ہو جائے گا۔ مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے۔۔۔۔۔ مجھے بڑے دروازے کا چوکیدار بنادینا۔“

شہاب عجیب سی نظروں سے اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”تمہارے اہل خاندان کہاں ہیں؟“

”میں کسی خاندان کا اہل ہی نہیں تھا صاحب۔ اسی لئے اللہ نے مجھے اس سے محروم کر دیا۔“

”کیا مطلب؟“

”آزاد علاقے میں کہیں پیدا ہوا تھا، ہوش سنبھالنے کے بعد پتا چلا کہ ماں باپ کی کسی

”یہی تو ایک پخت ہے امیر علی شاہ، میری نسلوں کا کوئی وجود نہیں ہے، نہ کوئی آئندہ۔“

”فون بند مت کرنا، میری بات سن، میں نے تیری ہر ضرورت پوری کی ہے۔ وفادار رہ بچاس لاکھ میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، دے دوں گا تجھے بچاس لاکھ مجھے بہت سی باتیں پوچھنی ہیں تجھ سے۔“

”بات ختم ہو چکی ہے شاہ صاحب۔ بچاس لاکھ پورے میرے نہیں ہوں گے۔ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو میرے اس منصوبے میں شریک ہیں۔ باقی بچیس لاکھ میں ملک سے ہی نکل جاؤں گا اب ذرا دیکھنی ہے۔“

”تو نے میرے راز دوسروں کو بھی دیدیئے؟“

”ابھی تک ایسا نہیں کیا ہے لیکن۔۔۔۔۔“

”جنم میں جاکتے، کہاں لینے ہیں تجھے یہ بچاس لاکھ؟“

”شہر میں، لانگ پارک نامی ایک جگہ ہے جہاں بارہ دری بنی ہوئی ہے۔ بس اس درری پر آ جاؤ۔۔۔۔۔ اکیلے آنا شاہ صاحب اور یہ خیال رکھنا کہ تم بے شمار راکٹوں کی زد ہو گے۔ پولیس جو کچھ کرے گی بعد میں کرے گی۔ زیادہ سے زیادہ ہمارا ایک آدمی جائے گا لیکن اس کے بعد شاہ صاحب۔ پورے شاہ پور میں تمہارے کڑیل جوانوں کا کھڑا مٹایا جائے گا۔“

”دیکھ اپنی گندی زبان سے یہ بکواس مت کر۔۔۔۔۔ پیسے تجھے مل جائیں گے، وقت بتا۔“

”شام پانچ بجے۔“

”پہنچ جاؤں گا۔۔۔۔۔ بچے کب ملیں گے؟“

”پارک سے لے کر جانا۔“

”کوئی بد عہدی تو نہیں ہوگی؟“

”بد عہدی صرف بد عہدی کے جواب میں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے جوہر خان، ٹھیک ہے۔“ امیر علی شاہ نے کہا اور دوسری طرف سے

بے جان ہو گئی۔ امیر علی شاہ بہت دیر تک ریسورہا تھ میں لئے بیٹھا رہا۔



”تو پھر؟“

”رحمان علی شاہ اسے اب بھی قبول کر لے گا۔“

”مرد کے لئے مشکل ہے صاحب یا پھر ہمیں سچی محبت کا کوئی تجربہ نہیں ہے ویسے صاحب۔ آپ کو اگر اس کی ذرا بھی امید ہو تو آج ہی ہم سے طلاق کے کاغذات پر انگوٹھا لگوا لو۔“

”ہاں اس بے چاری کے عدت کے دن شروع ہو جائیں اور انہیں ایک ہونے میں زیادہ وقت نہ صرف کرنا پڑے لیکن آپ خود جانتے ہو یہ مشکل ہے۔“

”کیوں؟“

”امیر علی شاہ ایسا ہونے نہیں دے گا۔“

”امیر علی شاہ۔“ شہاب نے گہری سانس لے کر کہا پھر بولا۔ ”تمہارا دل اللہ کی طرف رجوع ہوا ہے جو ہر خان تو تمہیں اور بھی بہت کچھ کرنا ہو گا۔“

”کیا صاحب؟“

”ممکن ہے تمہیں امیر علی شاہ کے کر تو توں کی عدالت میں گواہی دینا پڑے۔“

”دیں گے صاحب۔۔۔۔۔ خدا کی قسم دیں گے وہ سارے ثبوت دیں گے اس کے خلاف جو ہمارے پاس ہیں۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ صاحب آپ کچھ نام یاد کر لو۔۔۔۔۔ یہ شاہ پور کے لوگ، وہ لوگ جو سچے اور دین دار لوگ ہیں وہ امیر شاہ کے خلاف گواہی دیں گے۔۔۔۔۔ اس نے غیاث بگ کا سارا مال و اسباب، زمینیں ضبط کر لی ہیں سب کچھ اس سے نکلواؤ صاحب، ہم اس کی تفصیل بتائیں گے۔“

”اللہ ضرور تمہارے گناہ معاف کر دے گا جو ہر خان۔۔۔۔۔ ایک برے شخص کو کیفر کر دار تک پہنچانے کا بھی ثواب ملے گا تمہیں اور بہت سے لوگ جو آئندہ اس کے ظلم کا شکار ہونے والے تھے وہ بھی بچ جائیں گے۔“

”کاش ایسا ہو سکے صاحب۔“ جو ہر خان رونے لگا۔

شہاب بعد میں بھی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔۔۔۔۔ اس نے جو ہر خان سے اور بھی بہت کچھ معلوم کیا تھا پھر وہ اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔



پچاس لاکھ روپے حقیقتاً امیر علی شاہ کے لئے بڑی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔۔۔۔۔ اصل

سے دشمنی تھی۔ اس دشمنی میں مارے گئے۔ مجھے بچپن ہی میں شاہ پور لے آیا گیا تھا۔“

”کون لایا تھا؟“

”امیر شاہ کے والد تو قیر شاہ پھر شاہ پور میں ہی میری پرورش ہوئی اور امیر علی شاہ مجھے اپنا کتا بنالیا۔۔۔۔۔ بس صاحب اتنی عقل ہی نہ تھی اس کے اشاروں پر دم ہلاتے رہے۔ کبتار ہا کرتے رہے اور اپنی دنیا اور عاقبت خراب کر لی۔ کیا ملا صاحب ہمیں۔“

”جو ہر خان، غیاث بگ کی بیٹی سے تمہارا نکاح ہوا تھا۔“

”ہاں صاحب۔“

”وہ تمہارے ساتھ مکمل بیوی کی حیثیت سے رہی ہے؟“

”ہاں صاحب آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی انسانیت ہی نہیں تھی ہمارے دل پر۔“

”کیا مطلب؟“

”سارا کیس یہی تھا صاحب۔ رحمان شاہ اور وہ محبت کرتے تھے۔۔۔۔۔ یہ زبردستی نکاح تھا۔“

”اس کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟“

”وہی جو بکری کا قصائی کے ساتھ ہوتا ہے وہ تو مظلوم اور پسے ہوئے لوگ بیچارے۔“

”جو ہر خان، کیا تم اسے طلاق دے سکتے ہو؟“

”جی؟“ جو ہر خان چونک پڑا۔

”تم نیکیاں کرنے پر اترے ہو، اس لئے میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔۔۔۔۔ تمہیں معلوم کہ وہ رحمان شاہ سے محبت کرتی ہے۔“ جو ہر خان سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔

”اب تو صاحب زندگی کا رخ ہی بدل گیا ہے وہ اگر چاہے تو ابھی، اسی وقت طلاق دے دیں مگر صاحب اس سے اس بے چاری کو اب کیا فائدہ ہو گا۔“

”کیوں؟“

”امیر علی شاہ نے اپنے بیٹے کو بھی تو پاگل خانے میں داخل کر دیا ہے۔۔۔۔۔ بے پاگل نہیں ہے اور یہ بھی افسوس کی بات ہے اگر وہ سچ پاگل ہوتا تو اسے قبول کر لیتا۔“

”نہیں جو ہر خان وہ دونوں ایک دوسرے سے سچی محبت کرتے ہیں۔“

”تو ہے ہمارا نام۔“ اس نے ناک میں کہا۔

”کیا بات ہے؟“

”پیے لینے آئے ہیں؟“

”کیسے پیے؟“

”جو تمہارے پاس ہیں۔“

”کس نے بھیجا ہے تمہیں؟“

”اس نے جس نے تم سے فون پر بات کی تھی۔“

”وہ خود کہاں مر گیا؟“

”پتا نہیں..... اس نے کہا تھا کہ یہاں جی بھی ہوگا، ٹٹی بھی ہوگا، بھولا اور شبو بھی ہوں گے..... ہم نے انہیں دیکھ لیا ہے۔ چھپے ہوئے ہیں بھوتی کے ہا، ہا، ہا۔“ کبڑے نے ہنس کر کہا۔

”ہیابو اس کر رہا ہے؟“ امیر علی شاہ دھاڑا۔

”ڈراؤ مت۔ ہمیں تو بس سو روپے ملیں گے وہ دیکھو سب موجود ہیں..... دیکھو ایک وہ رہا، دوسرا وہ رہا، تیسرا وہ رہا، سارے تم پر بند و قوتوں سے نشانہ لگائے بیٹھے ہیں ہی، ہی، ہی۔“ اس نے پھر گندے پیلے دانت نکال دیئے..... امیر علی شاہ نے اس کی انگلیوں کے اشاروں پر چاروں طرف دیکھا..... کہیں، کہیں جھاڑ اُگے ہوئے تھے یہ جھاڑ مٹی کے تودوں پر اُگے ہوئے تھے جو زیادہ اونچے نہیں تھے لیکن ان جھاڑیوں سے باہر نکلی بند و قوتوں کی نالیاں صاف نظر آ رہی تھیں جن کا نشانہ امیر علی شاہ ہی تھے۔

امیر علی شاہ کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی..... اس نے گھٹی، گھٹی آواز میں کہا۔ ”میرے لڑکے کہاں ہیں؟“

”پہلے پیسے دکھاؤ۔“

”یہ ہیں پیسے۔“ امیر علی شاہ نے جھلانے ہوئے انداز میں ساتھ لایا ہوا بریف کیس اس کی طرف بڑھا دیا۔

”اس میں، ہم بھی ہو سکتا ہے..... پہلے کھولو اسے۔“ کبڑا پھر دانت نکال کر بولا۔

”اوہ..... یہ دیکھو، یہ دیکھو۔“ امیر علی شاہ نے بریف کیس کھول دیا..... ہزار، ہزار کے

افیت اسے اس بات کی تھی کہ یہ رقم ایسے شخص کو دینی پڑ رہی تھی جو اس کا کتا تھا، جسے اس نے اس سے زیادہ حیثیت کبھی نہیں دی تھی۔

لیکن مقدر بگڑ گیا تھا وہ ہو رہا تھا جو کبھی نہیں ہوا تھا اگر کوئی بڑا آدمی اس کے مقابل آئے اور قوت کا مظاہرہ کرتا تو وہ اپنی قوتوں کو بھی آزماتا لیکن یہاں تو گھر کی بلی نے مونچھ پکڑ لی تھی..... بہر حال بچوں کے لئے زندگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا..... اس لئے تنہا آیا اور پوری رقم لایا تھا۔

متعین کردہ جگہ سنان پڑی ہوئی تھی۔ دور، دور تک کسی کا پتا نہیں تھا..... امیر علی شاہ پکارو بھی خود ڈرائیو کر کے لایا تھا..... یہ وہی پکارو تھی جسے فیاض علی شاہ ہمراہ لائے تھے۔ آج ہی اسے محکمہ پولیس کے ٹریفک ڈیپارٹمنٹ نے امیر علی شاہ کے پاس پہنچایا تھا..... اسے شادی ہال کے سامنے لاوارث کھڑی دیکھ کر کسی نے پولیس کو خبر کی تھی اور پولیس والوں نے رجسٹریشن آفس سے اس کے بارے میں معلوم کیا تھا پھر جس کے نام پر یہ گاڑی رجسٹرڈ تھی وہ نام جان کر تو پورا ٹریفک ڈیپارٹمنٹ حرکت میں آ گیا تھا اور ہر کوئی اسے شاہ صاحب کے پاس پہنچانے کے لئے مستعد ہو گیا تھا..... امیر علی شاہ نے اسے وصول کرتے ہوئے ہا پر وائی سے کہا تھا کہ بند ہو گئی تھی اس لئے اسے چھوڑ دیا گیا تھا کہ بعد میں کسی مکینک کو جانے منگوایا جائے پھر وہ لوگ بھول گئے تھے۔

”شاہ صاحب۔ آج کل گاڑیوں کے پارٹس وغیرہ نکال لئے جاتے ہیں۔“ ٹریفک پولیس نے کہا تھا۔

”اویار اگر کوئی نکال لے جاتا تو اس کا مقدر۔ اتنی گاڑیاں ہیں گھر میں کہ یہ گاڑی باہر نہ رہی۔“

امیر علی شاہ نے دور، دور تک نظریں دوڑائیں..... اچانک اسے ایک ٹوٹی پھوٹی اچھلتی کودتی اسی طرف آتی نظر آئی اور وہ کینہ توڑ نظروں سے ادرہ دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد ایک مجبور سا آدمی نیچے اترا..... اس نے ضرورت سے زیادہ ڈھیلی پتلون پہنی ہوئی تھی بوسیدہ سی قمیض جس کے کف اس کے ہاتھوں سے بہت بڑے تھے، بڑی گندی سی شخصیت مالک تھا، پشت پر اُبھرے ہوئے بڑے سے کو بڑے اسے اور بد نما بنا دیا تھا..... پھر وہ چلتا ہوا امیر علی شاہ کے پاس آ گیا۔

کبردار یر تک پجارو کو جاتا دیکھتا رہا پھر اس نے بریف کیس سنبھالا اور مٹی کے ان جہازوں بھرے تو دود کی طرف بڑھ گیا..... اس نے جہازوں میں اڑے ہوئے لوہے کے پائپ گھسیٹے جو دور سے بند قوس کی نال معلوم ہو رہے تھے۔ تمام پائپ جمع کر کے وہ واپس وین کے پاس پہنچا..... پائپ اندر پھینکے پھر چہرے سے ماسک اتار دی۔ قمیض اتار کر کمر سے ربڑ کا کوبڑا کر اسے بھی اندر پھینکا اور دروازہ بند کر دیا..... اس کے بعد وہ بریف کیس سنبھال کر دین کے اسٹیرنگ پر آ بیٹھا اور سیلف لگا کر اسے اشارت کر دیا۔



فون بینا نے ریسیو کیا تھا اور دوسری طرف سے شہاب کی آواز سن کر اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ ”لیس سر۔“
”بینا، واسطی صاحب موجود ہیں؟“
”نہیں سر کورٹ گئے ہوئے ہیں۔“
”واپسی دو بجے کے بعد ہوگی؟“
”پتا نہیں سر، ان کی ضرورت ہے؟“
”ہاں۔“
”فکر ہی نہ کریں..... بس دو ضمانتیں کرانی ہیں..... میں ابھی چلی جاتی ہوں..... ایک گھنٹے کے بعد ہم آفس پہنچ جائیں گے یا جہاں بھی آپ کہیں۔“
”نہیں..... میں کورٹ پہنچ جاتا ہوں..... انہیں تلاش کر لوں گا..... ہم دونوں آفس جا رہے ہیں۔“
”آپ جیسے پسند کریں سر۔“

”اوکے..... ذرا چائے وغیرہ کی تیاری کرو۔“ دوسری طرف سے فون بند ہو گیا..... بینا نے بھی ریسیور رکھ دیا..... اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی..... لگا ہوں میں شہاب کا چہرہ آگیا تھا..... دلکش خطوط، توانا جسم، انداز گفتگو دل موہ لینے والا..... کتنا بڑا انسان ہے وہ، سمندر سے زیادہ گہرا..... اپنے دل میں نہ جانے کیا، کیا چھپائے ہوئے اس کی باتوں کا ایک، ایک لفظ یاد آنے لگا..... وہ، وہ اسے اتنا بڑا مقام دیتا ہے..... اس نے اسے اپنا رازدار بنالیا ہے، اتنا گہرا رازدار..... ایک انوکھی لہر دل میں اٹھی اور وہ گہرا کر چاروں طرف

نونوں کی گڈیاں بھری ہوئی تھیں۔
”گٹو! انہیں۔“ کبردا مسکراتا ہوا بولا۔
”کیا..... دماغ خراب ہے..... پچاس لاکھ کے نوٹ گنو گے بیٹھ کر..... دیکھ لو پورے پچاس گڈیاں ہیں۔“
”کاغذ بھرے ہوئے تھے؟“ کبرڈے نے کہا اور امیر علی شاہ کے منہ سے گالی نکل گئی جس پر کبردا بڑ گیا۔
”گالی مت دو، میں بھی دوں گا، لو مجھے کیا ملے گا صرف سو روپے اور گالی الگ سنو۔“
”کوئی بھی گڈی کھول کر دیکھ لے مردود، رقم پوری ہے۔“
”مردود مت کہو۔ اشارہ کروں گا، گولیاں چل جائیں گی۔“ کبردا بولا اور امیر علی شاہ بوکھلا گیا، پھر کئی گڈیاں درمیان سے کھول کر دیکھی گئیں جنہیں کبرڈے نے بریف کیس سے نکالا تھا..... تب کبرڈے کو اطمینان ہوا اور اس نے بریف کیس بند کر کے قبضے میں لے لیا۔
”بچے کہاں ہیں میرے۔“ وہ خونخوار لہجے میں بولا۔
”گاڑی میں پڑے ہیں..... نکال لو خود۔“ کبردا بولا اور امیر علی شاہ کا منہ حیرت سے کھل گیا پھر وہ بے اختیار ہو کر وین کی طرف دوڑا..... اس نے خود ہی وین کا پچھلا دروازہ کھولا تھا..... اندر فیاض علی شاہ، شاد اور گلزار موجود تھے..... وہ ہوش میں تھے لیکن ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے..... پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے منہ میں حلق تک کپڑے ٹھونے ہوئے تھے۔ ”انہیں کھولو۔“ امیر علی شاہ بے قرار ہو کر چیخا۔
”میں کیوں کھولوں..... میرا جتنا کام ہے وہی کروں گا..... ارے ہاں میں کوئی تہا نوکر ہوں اور ہاں سنو۔“ کبرڈے نے اچانک رازداری سے کہا۔
”کیا ہے؟“

”گالی مت دینا..... یوں کرو، تم ایک کو کھول دو وہ دوسروں کو کھول دے گا۔“
امیر علی شاہ پر اتنا برا وقت کبھی نہیں آیا تھا..... بڑی مشکل سے شاد علی کی رسیاں کھینچیں اور پھر اس نے دوسرے بھائیوں کو کھولا تھا..... تینوں برے حال میں تھے اور ہڈیاں نظر آرہے تھے..... امیر علی شاہ انہیں لے کر پجارو کی طرف بڑھ گیا، پھر اس نے خود پجارو کا اسٹیرنگ سنبھالا تھا اور گاڑی آگے بڑھادی تھی۔

”نہیں۔۔۔ میں اسے الگ رکھنا چاہتا ہوں یا پھر یہ کیس کے رخ پر دیکھیں گے جو صورت حال ہوئی اسے کس کیس سے نکالنا ہے۔“

”اے بچانا چاہتے ہو؟“ واسطی صاحب بولے۔

”سو فیصد۔“

”آسان سی بات ہے۔۔۔۔۔ اسے سلطانی گواہ بنالیا جائے گا۔ ہم بتادیں گے کہ غیاث بیگ تو بھی امیر علی شاہ کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ کرتا لیکن جوہر خان کا ضمیر بھی جاگا اور اس نے برائی کے خاتمے کے لئے بیڑا اٹھالیا ایسی کے ہمت دلانے پر غیاث بیگ کی ہمت بندھی۔“

”ویری گڈ۔۔۔۔۔ یہ ہیں استادی کے گرو اور اسے تجربہ کہتے ہیں۔۔۔۔۔ بخدا یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔“

”شکریہ بیٹے۔۔۔۔۔ ویسے غیاث بیگ کو تحفظ درکار ہوگا۔“

”اس کی طرف سے زندگی کے خطرے کی درخواست بھی لے لیں گے۔“

”یہ کافی نہ ہوگا۔۔۔۔۔ بات ایک اڑدھ کی ہے۔“ واسطی صاحب متفکر لہجے میں بولے۔

”ہم خود اس کے لئے ایسی رہائش گاہ کا بندوبست کریں گے کہ امیر علی شاہ کے آدمی اسے تلاش نہ کر سکیں۔“

”تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔۔۔۔۔ آپ اپنے مدعی کی طرف سے پولیس کے لئے درخواست تیار کر لیں۔۔۔۔۔ میں اور بیٹا جا کر ان لوگوں کو لے آتے ہیں۔۔۔۔۔ یہاں انہیں بریف کر دیں گے اس کے بعد آپ انہیں لے کر منبرے تھانے آجائیے۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ انہیں تھانے سے واپس اس گھر میں نہیں لے جانا چاہئے اور اس کے لئے ایک ذریعہ ہے میرے پاس۔“ واسطی صاحب نے کہا۔

”کیا؟“

”میرے ایک عزیز کا گھر ہے، بالکل غیر متعلق اور شریف لوگ ہیں۔۔۔۔۔ غریب ہیں ہم انہیں خرچ دے دیں گے خوشی سے رکھ لیں گے۔۔۔۔۔ ایک بزرگ خاتون ہیں، دونوں جوان لڑکیاں جو ملازمت کرتی ہیں۔۔۔۔۔ چھوٹا سا گھر ہے ایک کمرہ انہیں دلوائیں گے بے فکر ہو وہ نہایت موزوں جگہ ہے کسی کا خیال بھی ادھر نہیں جائے گا۔“

”بہتر ہے۔۔۔۔۔ ہم چلتے ہیں، چلیں مس بیٹا۔“

دیکھنے لگی۔

شہاب اور عدنان واسطی ساتھ، ساتھ داخل ہوئے تھے۔

”ہیلو مس بیٹا۔“ شہاب نے کہا۔

”ہیلو سر۔“

”ہم نے راستے میں کوئی گفتگو نہیں کی صرف اس لئے کہ سب کچھ آپ کے علم میں ہو۔۔۔۔۔ ہاں چائے کی کیا پوزیشن ہے؟“

”چائے بس آرہی ہے سر۔“ بیٹا نے کہا۔۔۔۔۔ چائے کے چند گھونٹ لینے کے بعد شہاب نے کہا۔

”جی واسطی صاحب۔۔۔۔۔ اب میں تفصیلی رپورٹ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ کیفیت یہ ہے کہ اس وقت ایاز بیگ اور رحمان علی شاہ، امیر علی شاہ کی حویلی کے ایک تہہ خانے میں محبوس ہیں۔۔۔۔۔ جوہر خان ہمارے قبضے میں ہے۔ ان لوگوں کی فہرست میرے پاس ہے جو امیر علی شاہ کے خلاف گواہی دے سکتے ہیں۔ فی الحال ہم غیاث بیگ کی درخواست پر ایف آئی آر کاٹ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ ایف آئی آر آپ غیاث بیگ، اس کی بیوی اور بیٹی کی طرف سے لکھوا سکتے ہیں۔۔۔۔۔ میں اس کی بنا پر شاہ پور میں چھاپہ ماروں گا اور امیر علی شاہ کے ساتھ اس کے جرم میں شریک اس کے تینوں بیٹوں کو گرفتار کر لوں گا جبکہ چوتھا بیٹا امیر علی شاہ کے دوسرے جرم کا مدعی ہو گا اور اپنی ایف آئی آر الگ لکھوائے گا۔“

”اے گرفتار کرو گے؟“ واسطی صاحب بولے۔

”ایسے مجرم کو گرفتار تو ہونا چاہئے جبکہ ایاز بیگ اس کی قید سے برآمد ہوگا۔“

”بہت بڑا کام ہو گا شہاب میاں۔“

”تو یہ بڑا کام کریں گے۔“ شہاب مسکرا کر بولا۔

”بعد کے حالات ذہن میں ہیں؟“

”آپ پریشان ہیں۔“

”بخدا نہیں۔۔۔۔۔ بس یونہی سوچنے لگا تھا۔ لوگ گواہی دیں گے اس کے خلاف۔“

”نہ دیں۔۔۔۔۔ غیاث بیگ تو گواہی دے گا وہ مدعی ہے۔“

”جوہر خان گواہی دے گا؟“

”جی سر۔“ مینا نے اجازت طلب نگاہوں سے باپ کو دیکھا تو وہ اس صاحب کی غیثات سے کہنے لگا۔
”ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ۔۔۔۔۔ میں درخواست تیار کرتا ہوں۔“

راستے میں شہاب نے مینا کو جوہر خان سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا اور یہی بہت متاثر ہو گئی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

”سر خدا کرے یہ سب کچھ اسی طرح انجام پا جائے جس طرح ہم نے سوچا ہے، حالانکہ آپ یقین کریں سوچ، سوچ کر میرا بھی دل کانپ جاتا ہے۔۔۔۔۔ مقابل واقعی اڑدھا ہے۔“
”فکر مت کرو مینا۔۔۔۔۔ ویسے تمہیں ایک خوشخبری بھی دینا چاہتا ہوں۔“
”کیا سر؟“

”تمہارے اکاؤنٹ میں اب سات لاکھ روپے ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ پانچ لاکھ روپے کا اضافہ مبارک ہو۔“ مینا خاموش ہو گئی۔ کافی دیر کے بعد اس نے کہا۔

”سردہ کام ہو گیا؟“

”ہاں۔“

”خدا کی پناہ اور آپ نے اس سے گھٹنے ٹکوائے لیکن سر ایک بات کہوں۔۔۔۔۔ میں ان دولت کا کیا کروں گی۔۔۔۔۔ ایک جرم کا اعتراف کرنا چاہتی ہوں سر آپ ماسٹڈ تو نہیں کریں گے۔“
”نہیں۔“

”میں آپ کے پہلے دیئے ہوئے روپیوں کے بارے میں آج تک ابو کو بتانے کی ہمت نہیں کر سکی۔۔۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا انہیں کیسے بتاؤں۔“

”نہیں، نہیں یہ سب کچھ چھپانا مناسب نہیں ہو گا۔۔۔۔۔ ابھی کچھ وقت خاموشی اختیار کرو۔۔۔۔۔ اس کے بعد تم واسطی صاحب کو میرا موقف بتا دینا میں اجازت دے رہا ہوں۔“

”اور سر اگر؟“

”دیکھ لیں گے مینا۔۔۔۔۔ کچھ کریں گے۔“

”اوکے سر؟“ مینا نے ٹھنڈی متفکر سانس لے کر کہا۔

غیث بیگ نے خود ہی دروازہ کھولا تھا وہ بیمار تھا اور کراہ رہا تھا۔۔۔۔۔ اس نے دونوں جوڑتے ہوئے کہا۔ ”ارے معاف کر دو ہمیں بھائی، معاف کر دو مرنے دو بھیا، اللہ جس طرح ہمارا موت لکھی ہے اسی طرح مر جانے دو ہمیں۔“

”کالت کر کے؟“

”کالت کر کے؟“

”کیا درخواست ہے؟“ غیاث بیگ نے پوچھا اور واسطی صاحب اسے درخشاہ نے لگے..... غیاث بیگ نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اس درخواست میں نہایت چابک دستی سے شروع سے آخر تک کی تفصیل لکھی گئی تھی۔

”کتے کی موت مارے جائیں گے بھائی..... ہم سب..... لکھ لو۔“

”کتے کی موت مارا جائے گا امیر علی شاہ..... سمجھے آپ اور پھر کیا آپ کو لیا بیگ زندگی نہیں چاہئے۔“ غیاث بیگ رونے لگا تھا..... اس نے روتے ہوئے کہا۔

”ایک بار یہ یقین دلادو کہ وہ زندہ ہے..... سولی پر لٹکنے کے لئے تیار ہوں میں۔“

”اس پر دستخط کیجئے۔“ واسطی صاحب نے کہا اور غیاث بیگ نے دستخط کر دیئے دوسری درخواست ناہید کی طرف سے تھی، جس میں اس نے اپنے ساتھ ہونے والی زانیہ اور جبری نکاح کی تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ اس کا زبردستی کا شوہر بھی اب غائب ہو چکا ہے..... ناہید کے دستخط کے بعد یہ کام مکمل ہو گیا..... عدنان واسطی نے کہا۔

”غیاث بیگ صاحب..... آپ دیندار انسان ہیں..... اللہ پر مکمل بھروسہ رکھئے انشاء اللہ آپ کا میٹا زندہ سلامت آپ تک پہنچے گا اور آپ کو تمام حقوق ملیں گے..... آپ کا وکیل ہوں..... آپ کو بہت جلد امیر علی شاہ کے خلاف میری وکالت میں عدالت میں پیش ہونا ہو گا اس کے لئے خود کو تیار رکھیں..... آپ کے لئے ایک اور رہائش گاہ کا انتظام کیا گیا ہے جہاں آپ کو تمام سہولتیں حاصل ہوں گی۔ آپ مکمل حوصلے سے کام لیں غیاث بیگ نے گردن جھکا دی تھی۔



”کہاں رکھا انہوں نے تمہیں؟“

”عجیب سی جگہ تھی بابا جانی۔“

”کوئی اتنا پتا اس کا؟“

”نہیں بابا جانی وہ کم بخت بہت چالاک تھے۔“

”او تم نے انہیں کوس، کوس کر کیوں نہ مار ڈالا بہادر..... یا انہوں نے تمہارا منہ بھی مڑا دیا تھا۔“ امیر علی شاہ نے تسخرانہ کہا۔

”بابا جانی ہم پر طنز بکا رہے۔ ہم تو سب کچھ آپ کی ہدایت کے مطابق کر رہے تھے۔“

”لوئے تم اغوا بھی میری ہدایت پر ہی ہوئے تھے۔ کمال کرتے ہو بھی۔ بڑے سعادت مند بنے ہو۔ او جاؤ آرام کرو، تم لوگوں کو کیا تکلیف دینا..... میں خود ہی کچھ کروں گا۔“

”آپ اس جھگڑے کو ختم کیوں نہیں کر دیتے بابا جانی۔“
”کیسے میرے لعل، بولو کیسے ختم کروں۔ کوئی مشورہ دو مجھے۔“ او تمہاری زیر
دینی پڑی ہے مجھے۔ پچاس لاکھ روپے میں خریدا ہے میں نے تمہیں۔“
”کس سے بابا جانی؟“ فیاض علی حیرت سے بولا۔

”جوہر خان سے سمجھے جوہر خان سے۔“ تینوں بیٹوں کے چہروں پر حیرت کے نشانات
دیکھ کر امیر شاہ نے انہیں پوری صورت حال بتائی پھر بولا۔ ”اوئے دیکھ لینا میں جوہر خان
اس کے ہمدردوں کو، سارا قانون نکال دیتا میں اس کا مگر کیا کروں تم جوہوں کی طرح اس
چوہے دان میں جا پھنسے تھے۔“

لڑکے کچھ دیر خاموش رہے پھر فیاض شاہ نے کہا۔ ”آپ کا ہی پالتو تھا وہ۔“ آپ
کہتے تھے کہ وہ آپ کا وفادار کتا ہے۔“

”کتا پاگل ہو گیا ہے۔ ٹھیک ہے گولی مار دی جائے گی اسے، اب اس کی زندگی خطر
ہے۔ تم لوگ جاؤ۔ مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔ پچاس لاکھ روپے میرے جوتے کا بل
مگر جوہر خان۔“ امیر علی خان خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔
”جاؤ تم لوگ آرام کرو اور خیر خان اور گل باز کو بھیج دو۔“ تینوں بھائی اٹھ گئے تھے
ان کے جانے کے بعد امیر علی دیر تک سوچ میں بیٹھا رہا پھر گل باز خان اور خیر خان
تھے۔ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کر کے امیر شاہ نے کہا۔

”کیسا حال ہے تم لوگوں کا؟“

”ٹھیک ہے شاہ جی۔“ دونوں بولے۔

”تمہارے یار نے تو دولت کمائی ہم سے بھی۔“ امیر شاہ نے ہنستے ہوئے کہا
دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے پھر امیر شاہ نے انہیں بھی پوری کہانی سنا دی
وہ حیران رہ گئے۔ تب امیر شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”او تم بھی اپنا پروگرام بتا دو، تمہیں
کچھ چاہئے۔“

”ہم سے پوچھتے ہو شاہ جی؟“ گل باز خان بولا۔

”ہاں بھی۔ تمہیں بھی اپنے مستقبل کا خیال ہو گا۔“

”جوہر خان کا بدلہ ہم سے مت لو شاہ جی۔ یہ ساری گالیاں اسے دو ہمارا کیا قصور۔“

”موت دوں گا اسے، موت دوں گا اسے۔“ موت دوں گا گل باز خان۔ موت دوں گا اسے، موت، جو دولت اس
نے پیش کی تھی مجھ سے نمک حرامی کر کے حاصل کی ہے وہ اسے قتل کر کے اس کی لاش
کے ساتھ قبر میں دفن کروں گا۔ یہ میرا عزم ہے۔ پچاس لاکھ میرے جوتے کی گرد
ہے۔ تم لوگوں کو جب بھی ضرورت ہو مجھ سے مانگ لینا۔ او میں نے تمہاری وفاداری پر
فرمایا ہے ہمیشہ۔“

”آپ جوہر خان کے معاملے کو ہم پر چھوڑ دو شاہ جی۔ ہمیں اس کے کچھ ٹھکانے
معلوم ہیں۔ ہم اسے تلاش کر کے آپ کے سامنے پیش کریں گے۔“
”ایسے نہیں خیر خان۔ میرے دماغ میں ایک منصوبہ ہے۔ برامت مانا۔ دشمن
کو بچانے کے لئے جال لگایا جاتا ہے۔ میں نے ایک جال تیار کر لیا ہے اس کے لئے۔“
”بتاؤ شاہ جی۔“

”تم لوگ کچھ دولت لے کر فرار ہو جاؤ۔ دو چار لاکھ روپے میں تمہیں دے دوں
گا۔ یہ رقم لے کر نکل جاؤ۔ میں اخبار میں خبر دے دوں گا کہ میرے دو ملازم چوری
کر کے بھاگ گئے۔ بے فکر رہنا پولیس تم سے کچھ نہیں کہے گی، پھر تم جوہر خان کو تلاش
کرنا دھم مل جائے تو اس سے کہنا کہ تم نے بھی اپنا حصہ وصول کر لیا۔ کیا سمجھے۔ اس کے
بعد تم جوہر خان کے بارے میں مجھے خبر دینا۔“

خیر خان اور گل باز خان نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر گل باز خان نے کہا۔ ”ٹھیک شاہ
جی۔ آپ کے لئے ہم چور بننے کو بھی تیار ہیں۔“ اس منصوبے کے ہر پہلو پر غور کرنے
کے بعد گل باز خان اور خیر خان کو جانے کی اجازت مل گئی۔ کافی دور نکلنے کے بعد گل باز نے
خیر خان سے کہا۔

”خیر خان۔ کیا واقعی ہماری تندر کے ستارے چمکنے والے ہیں؟“

”لگتا تو ایسا ہی ہے گل باز۔ زیادہ چالاک آدمی جب مصیبت میں پڑ جاتا ہے تو ایسے
نکلتا ہے۔ اس کے بیٹے اس سے نالاں ہیں جوہر خان کام دکھا گیا اور ہم، ہم سے بھی اس
نے کون سے نیک کام لئے ہیں، آج تک ساری زندگی اس کے لئے برے کام کرتے
رہے۔ پہلی بار اپنے لئے ایک بر کام کریں گے۔“

”اور خدا کرے وہ جلدی اپنا منصوبہ پورا کرے۔ مجھے تو نیند نہیں آئے گی آج۔“

دونوں ہنسنے لگے تھے۔



”کھیل ختم ہونے والا ہے رحمان شاہ۔۔۔ اب تم مجھے اس قید خانے کے بارے میں پوری تفصیل بتاؤ بالکل صحیح راستوں سے آگاہ کرو۔“

”سر میں نے ان تہہ خانوں کی پوری تفصیل معلوم کر لی ہے۔۔۔ حویلی میں چورجی سے پچھنے کے راستہ۔۔۔ بڑے خفیہ تہہ خانے ہیں۔ رحمان شاہ راستوں کی تفصیل بتانے لگا اور شاہ نے اسے محتاط رہنے کا مشورہ دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔۔۔ اس نے اپنے کام تقریباً مکمل کر لئے تھے۔۔۔ ہیڈ کوارٹر سے پولیس کی نفری طلب کر لی تھی جو خاص استحقاق کے تحت

اسی کام کرنے کے لئے طلب کی جاسکتی تھی۔۔۔ دو خدہ صی اسٹنٹ لئے تھے۔۔۔ گل زمان جانے لگا۔۔۔ ابھی کوئی بات نہیں بتائی گئی تھی۔۔۔ پولیس کے دو ٹرک اور دو جیپیں ہر طرح سے

پھر علی الصباح وہ اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔۔۔ راستے میں گل زمان نے پوچھا۔ ”وہ ہرنی۔۔۔ کوئی خاص مجرم پکڑنے جا رہے ہیں کیا؟“

”ہاں گل زمان۔“

”کون سا کیس ہے سر جی؟“

”وہ ایف آئی آر درج ہوئی تھی نا۔۔۔ ایک وکیل صاحب اپنے موکل کو لائے تھے۔“

”اوہ، وہ صاحب جی وہ تو بے کار سا کیس تھا صاحب جی بڑے بے کار سے لوگ۔۔۔ اس سے کچھ حاصل واصل نہیں ہو گا۔ صاحب جی۔“

”گل زمان، ہر چیز سے تو کچھ حاصل نہیں ہو جاتا وہ بے کار سے لوگ تھے لیکن جن لوگوں کے خلاف انہوں نے ایف آئی آر درج کروائی ہے وہ بے کار لوگ نہیں ہیں بس تیار ہوا، کیا سمجھے؟“

”گل زمان، شاہ کی صورت دیکھنے لگا اور پھر اس نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔۔۔“

”اے صاحب جی کیا بتاؤں، یہ کھوپڑی بے کار ہو کر رہ گئی ہے۔ بس جی کچھ اور ہانگ

شاہاب نے ذیل اوگینگ سے رابطہ قائم کیا اور دوسری طرف سے سردار علی نے اپنا پیغام ریسیو کیا۔ ”سی۔ پی کنٹرول ریسیونگ۔“

”سردار علی۔۔۔ تمام لوگوں کو اکٹھا کر لو۔۔۔ مسلح ہو کر شاہ پور روانہ ہو جاؤ۔۔۔ رات وہیں قیام کرنا ہے۔ ٹارگٹ امیر شاہ کی حویلی ہوگی۔“

”یس سر۔“

”رات کے تیسرے پہر میں جب وہاں ٹیلی فون کے استعمال کا امکان نہ رہے تو فون کے فون کیبل کاٹ دو۔۔۔ مین لائن تلاش کر لو تو بہتر ہے تاکہ ایک جگہ سے سارے فون

ہو سکیں۔۔۔ کل دن میں وہاں پولیس ریڈ ہو گا اور گرفتاریاں ہوں گی۔۔۔ پولیس پارٹی امیر کے پاس آئے گی۔ اس علاقے میں اس کے اثرات ہیں۔ ممکن ہے راستے میں پولیس ڈسٹر ب کیا جائے اگر ایسی کوئی کوشش ہو تو تم ڈسٹر ب کرنے والوں کے خلاف ضرورت

ہر کاروائی کر سکتے ہو۔۔۔ ہوشیار رہنا ہے۔“

”بہتر ہے سر؟“

”اس بارے میں کوئی سوال؟“

”نہیں سر۔ پیغام مکمل ہے۔“

”اوکے۔۔۔ شاہاب نے فون بند کر دیا۔۔۔ کچھ دیر کے بعد اس نے ٹرانسمیٹر پر

شاہ کو مخاطب کیا وہ بھی بہتر پوزیشن میں تھا۔۔۔ فوراً ہی کال ریسیو کی تھی۔

”ہیلو رحمان شاہ؟“

”بول رہا ہوں سر؟“

”کس حال میں ہو؟“

”حسب معمول سر؟“

”ایاز بیگ کی کیا کیفیت ہے؟“

”وہ یہاں بدستور ہے سر۔۔۔ دو چار بار میرے پاس آچکا ہے لیکن میں

بات نہیں کی۔۔۔ میں اپنے باپ اور بھائیوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

گرفتار رہا ہوں..... گرفتاری کے بعد میں آپ کو ساری بات بتا دوں گا چلو۔“ انسپٹر شہاب نے کہا اور امیر علی شاہ غصے سے بھر گیا۔

”کیا نام ہے تمہارا انسپٹر؟“

”شہاب ثاقب۔“

”سنو مجھے پوری تفصیل بتائے بغیر کسی قسم کی کوئی بد تمیزی کرنا تمہارے حق میں نہایت مضرت ثابت ہوگا۔“

”سرجی ٹریننگ کے دوران ہم سے حلف لیا جاتا ہے کہ پولیس کے جو قواعد ہیں انہی کے مطابق عمل کریں گے سر پہلے آپ ہتھکڑی پہن لیں اس کے بعد میں آپ کو ساری تفصیلات بتا دوں گا..... گل زمان میں نے تمہیں راستے میں جو تفصیل بتائی ہے، تم اس کے تحت آٹھ آدمیوں کو لے کر چلے جاؤ اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر عمل کرو۔“

”لیں سر۔“ گل زمان نے سیلوٹ جھاڑا اور اس کے بعد پولیس کی نفری کو لے کر چورجی کی جانب چل پڑا..... جب اس نے ادھر قدم بڑھائے تو امیر علی شاہ کے چہرے پر ہلکی سی بیلاہٹ دوڑ گئی۔ تاہم اس نے خود کو سنبھال کر کہا۔

”ٹھیک ہے انسپٹر، میرے ساتھ عام طور سے پولیس کے افراد تعاون کرتے ہیں لیکن تم کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ذہانت اور ہوشیاری کا مظاہرہ کر رہے ہو..... میرے خیال میں تم اپنی تقدیر پر سیاہی لگا رہے ہو..... تمہاری مرضی ہے ورنہ لوگ یہاں سے تقدیریں بنا کر جاتے ہیں۔“

”سرجی میں آپ کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگ لوں گا لیکن مجھے پولیس کی کارروائی کر لینے دیجئے۔“ شہاب نے کہا اور امیر علی شاہ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ امیر علی شاہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اس وقت غصے سے کام نہیں چل سکتا تھا، وہ ٹھوکر چکا تھا کہ پچھلے کچھ دنوں سے اس کے ستارے گردش میں ہیں اور اس کی ناکامیوں کا ”دشدرن“ ہو چکا ہے، چنانچہ اب کسی قسم کی کوئی سخت حماقت بے مقصد تھی۔ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے آفیسر..... اب مجھے بتاؤ، مجھے کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟“

”سر مرزا غیاث بیگ نامی شخص نے آپ کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی ہے..... نامہ مقدمہ، جائیداد اور زمینوں پر اور دولت پر، بیٹے کو اغوا کر کے جس بیچا میں رکھنا، ایک

داروں نے پولیس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ حویلی کے نگران نے انہی شہاب سے سوال کیا تھا۔

”آفیسر صاحب کیا امیر علی شاہ صاحب سے بات کرنی ہے آجائو۔“

شہاب نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا..... امیر علی شاہ صاحب تک اطلاع پہنچ گئی لیکن اطلاع دینے والوں نے بس اتنا ہی بتایا تھا اسے کہ پولیس آئی ہے امیر علی شاہ چونکہ دنوں شدید الجھنوں کا شکار تھا اس نے ہر بات سے متاثر ہو جاتا تھا۔ عام حالات میں شاید پولیس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن اس وقت وہ اپنی رہائش گاہ سے باہر نکل آیا تھا۔ تیوں بھی ساتھ تھے انسپٹر شہاب کو اس نے تکیھی نگاہوں سے دیکھا اور اس کے چہرے پر رعب ابھر آئی..... انسپٹر شہاب مودبانہ انداز میں اس کے سامنے پہنچ گیا تھا۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“ امیر علی شاہ نے رعب دار لہجے میں پوچھا۔

”پولیس اسٹیشن سے جناب۔“

”شہر کے ہو؟“

”جی سر۔“

”تمہیں اتنی تمیز نہیں ہے کہ بڑے آدمیوں کی حویلی کے دروازے سے اندر ہونے سے پہلے ان سے اجازت لی جاتی ہے؟“

”وہ سر معافی چاہتا ہوں اگر وہ بڑے آدمی ملزم ہوں تو پھر اس حد تک اجازت ضرورت نہیں پیش آتی میں اندرونی علاقے میں نہیں جاؤں گا۔“

”اندرونی علاقے میں جانے والوں کو یہاں گولی مار دی جاتی ہے۔“ امیر علی شاہ نے ”جی سر..... اسی لئے میں اندرونی علاقے میں نہیں جاؤں گا۔ آپ امیر

صاحب ہیں؟“

”ہاں۔“

”اور یہ آپ کے تینوں صاحبزادے؟ میرا مطلب ہے فیاض علی شاہ صاحب اور گلزار علی۔“

”تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میں تم سے یہ سوال کر رہا ہوں۔“

”سرجی پولیس کی کارروائی کے طور پر بحالت مجبوری میں آپ کو اور آپ

نہیں ہو سکا تھا، پھر یہ گاڑیاں سفر کرتی ہوئی شہر میں داخل ہو گئیں اور قلعہ کے بعد
شاہ نے انہیں لاکھاپ میں منتقل کر دیا لیکن جب خیر خان اور گل باز خان کو بھی لاکھاپ
میں پہنچایا گیا تو امیر علی شاہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا اور بولا۔
”اے تم لوگ بھی؟“ خیر خان اور گل باز خان نے گردن جھکادی تھی۔



مدن واسطی اور بینا واسطی آج بڑی سنسنی خیز کیفیت کا شکار تھے۔ انہیں علم تھا کہ
شاہ آج امیر علی شاہ کے خلاف آپریشن کر رہا ہے اور پولیس پارٹی امیر علی شاہ کو گرفتار
کرنے چل پڑی ہے۔ بہر حال وہ آفس ہی میں تھے۔ جب انہیں شاہ کا فون موصول ہوا۔
فون کا انتظار ہی کیا جا رہا تھا۔ بینا نے جھپٹ کر ریسور اٹھایا اور بے صبری سے بولی۔
”ہیلو۔“

”مس بینا انسپکٹر شاہاب بول رہا ہوں۔“

”السلام علیکم سر، سر آپ خیریت سے تو ہیں نا سر کیا آپ شاہ پور سے واپس آ گئے ہیں؟“
”جی مس بینا اور ہمارے معزز مہمان اس وقت تھانے میں فروکش ہیں۔“ شاہاب نے کہا۔
”سر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی۔ میرا مطلب ہے کوئی ایسی مداخلت تو نہیں ہوئی؟“
”نہیں مس بینا، حیرت انگیز طور پر سب کچھ ٹھیک ہے، واسطی صاحب موجود ہیں؟“
”جی میں ریسورڈیڈی کو دے رہی ہوں بات کر لیجئے۔“ واسطی صاحب نے سلام دعا
کے بعد پوچھا۔

”ہاں کیا صورت حال رہی؟“

”سر ایاز بیگ اور رحمان علی شاہ کو تہہ خانوں سے برآمد کر لیا گیا ہے اور امیر علی شاہ اور
اس کے تین بیٹوں کے ساتھ اس کے دو خاص ملازمین کو بھی گرفتار کر کے لاکھاپ میں
ڈال دیا گیا ہے۔“

”اس نے ابھی تک کوئی مداخلت تو نہیں کی؟“

”نہیں سر میں نے ٹیلی فون ابھی تک اس کے ہاتھ نہیں لگنے دیا۔“

”فون کرنے کی کوشش تو کر رہا ہوگا؟“

”ابھی تک نہیں کی ہے، مجھے خود اس بات پر حیرت ہے۔“

آدمی کا زبردستی غیاث کی بیٹی سے نکاح کر دینا، سب کچھ چھین کر اس پر سختیاں کرنا،
سارے الزامات ہیں آپ پر سر اور ان کے تحت آپ کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔“
”اور ان لڑکوں کو؟“ امیر علی شاہ نے پوچھا۔

”یہ بھی آپ کے دست راست ہیں سر، ان کے نام بھی ایف آئی آر میں درج کر
گئے ہیں اس کے علاوہ سر ایک اور ایف آئی آر بھی ہے وہ آپ کے بیٹے رحمان علی شاہ
طرف سے ہے جس میں اس نے آپ پر بڑے سنگین الزامات لگائے ہیں۔“
”بکواس کرتے ہو..... رحمان علی شاہ بھلا مجھ پر الزامات کیسے لگا سکتا ہے۔“

”سر آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟“

”وہ میرے پاس ہے۔“

”نہیں سر وہ قیدی ہے اور اس نے ہم سے اسی قید خانے سے رابطہ قائم کر کے کہا ہے
کہ پولیس اسے اپنے ظالم باپ کے چنگل سے نکالے۔“

امیر علی شاہ نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لی تھیں، اب اس کے پاس کہنے اور کرنے
کچھ نہیں رہ گیا تھا..... شاہاب کا رویہ اس کے ساتھ برا نہیں تھا اور اس نے عاجزی سے یہ
تھا کہ مجبوری ہے سر کار، ورنہ یہ سب کچھ نہ کیا جاتا پھر گل زمان نے نہایت ذہانت کے ساتھ
رحمان علی شاہ اور ایاز بیگ کو تہہ خانوں میں تلاش کر لیا تھا اور تمام تر ہدایت پر عمل کر
ہوئے تہہ خانوں میں ان کی تصاویر بھی بنائی تھیں..... ان دونوں کو نکال کر باہر لے آیا
اور پولیس نے انہیں اپنی تحویل میں لے لیا..... امیر علی شاہ ان تمام کارروائیوں کو سنگین
سے دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے انسپکٹر، بہر حال متعلقہ افراد کو شدید نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔“

شاہاب نے گردن جھکادی تھی وہ بہت مودب اور منکسر نظر آ رہا تھا..... امیر علی
اس کے تین بیٹوں کے ساتھ پولیس کی ایک جیب میں بٹھایا گیا..... انسپکٹر شاہاب خود
اس کے ساتھ بیٹھا تھا جبکہ رحمان علی شاہ اور ایاز بیگ کو دوسری جیب میں بٹھایا گیا تھا
شاہاب کو جو خطرات درپیش تھے ان میں سے ایک بھی خطرہ سامنے نہیں آیا تھا..... امیر
شاہ کو نہایت اطمینان سے گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن چونکہ معلومات مکمل تھیں اس لئے خیر
اور گل باز خان کو بھی تلاش کر لیا گیا تھا جبکہ امیر علی شاہ کو ان کی گرفتاری کے بارے میں

”ایاز میاں میں بالکل خیریت سے ہوں جو رویہ میں نے تمہارے ساتھ اختیار کیا اس نے تم سے معافی اس لئے نہیں مانگوں گا کہ وہ سب کچھ ضروری تھا، اگر میں یہ سب کچھ نہ کرتا تو ہم اتنی آسانیاں نہیں حاصل کر سکتے تھے جتنی آسانیاں اب ہمیں حاصل ہو گئی ہیں۔“

ایاز بیگ کا منہ شدت حیرت سے کھلا رہ گیا تھا، پھر اس نے محبت بھرے انداز میں جان علی شاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”آپ ٹھیک ہیں رحمان بھائی..... بالکل ٹھیک ہیں؟“

”ہاں اللہ کا شکر ہے۔“

پھر عدنان واسطی نے ضروری کاغذات پر ان لوگوں سے بھی دستخط کرائے..... تاکہ بس مکمل ہو جائے اور اس کے بعد خاصی دیر تک ان لوگوں کے درمیان گفتگو ہوتی رہی پھر ایاز بیگ نے کہا۔

”کیا یہ ممکن ہے کہ میں اپنے والدین کے پاس چلا جاؤں؟“

”میں ابھی تمہیں وہاں چھوڑ دوں گا اور رحمان شاہ صاحب آپ کو میں اسی جگہ بھیج رہا ہوں جہاں آپ پہلے بھی تھوڑا سا وقت گزار چکے ہیں..... مزید کچھ اور وقت آپ کو وہاں گزار پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے جناب، آپ کے ہر حکم کی میں تعمیل کروں گا۔“ رحمان شاہ نے ممنون لہجہ میں کہا۔

یہاں چائے وغیرہ پی گئی اور اس کے بعد شہاب، رحمان شاہ اور ایاز بیگ کو لے کر نیچے آئے..... اس نے بیٹا کو بھی ساتھ آنے کے لئے کہا تھا اور واسطی صاحب نے بخوشی اجازت دے دی تھی..... نیچے آکر وہ سب کار میں بیٹھ گئے اور شہاب نے کار سٹارٹ کر کے آگے بڑھادی تھی..... تھوڑی دیر کے بعد شہاب نے کہا۔

”ڈیز رحمان علی شاہ وہاں تمہیں ایک ایسا شخص ملے گا جس سے مل کر تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوگی بلکہ تم شاید اس سے شدید نفرت محسوس کرو، لیکن ابھی چونکہ میرے اور تمہارے درمیان مزید تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکی ہے اس لئے اس وقت میں تم سے صرف اتنی درخواست کر سکتا ہوں کہ وہ جو کوئی بھی ہو بے شک تم اس سے کوئی تعاون نہ کرنا لیکن تم کا اختلاف بھی نہ کرنا۔“

”میرا خیال ہے اسے کچھ دیر فون کرنے سے روکا جائے، ظاہر ہے بعد میں تو ہمیں اسے یہ اجازت دینا پڑے گی لیکن بہتر یہ ہے کہ تم اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ اور کسی بھی ایڈز سے دار آدمی کو وہاں نہ چھوڑو جس سے وہ فون کرنے کی اجازت مانگ سکے۔“

”بہتر ہے سر۔“

”ارے ابھی تم اس طرح کہہ رہے ہو، جیسے میں تمہیں ہدایت دے رہا ہوں۔“

”سر آپ مجھے ہدایت نہیں دے سکتے۔“ شہاب نے کہا اور عدنان واسطی ہنسنے لگا پھر بولا۔

”ان لوگوں کو کہاں رکھا ہے؟“

”فی الحال ہمارے پاس ہیں لیکن میں نے انہیں امیر علی شاہ کے قریب نہیں جانے دیا۔“

”گڈ تو پروگرام کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے سر میں انہیں لے کر آپ کے پاس آ جاؤں؟“

”ہاں بالکل، تھوڑی سی کارروائی مکمل کر لینا ضروری ہے۔“

”تو میں حاضر ہو رہا ہوں۔“

”آ جاؤ..... میں انتظار کر رہا ہوں۔“

بیٹا کو صورت حال بتا کر عدنان واسطی صاحب نے انتظامات کئے اور تھوڑی دیر کے بعد شہاب وردی میں ملبوس ایاز بیگ اور رحمان شاہ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا، ان کا پر جوش و خروش مقدم کیا گیا تھا..... عدنان واسطی نے غیاث بیگ کے بیٹے سے نہایت محبت سے مصافحہ کیا اور بولا۔

”میں تمہیں رہائی کی مبارک باد پیش کرتا ہوں ایاز بیگ۔“

”سر میرے ماں باپ کہاں ہیں کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں؟“

”تمہارے والدین اور بہن بالکل خیریت سے ہیں اور ایک ایسی جگہ ہیں جہاں انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ کچھ دیر کے بعد تمہیں ان کے پاس پہنچا دیا جائے گا اور تمہاری ان سے ملاقات ہو جائے گی۔“

”سر اللہ آپ لوگوں کا بھلا کرے، رحمان علی شاہ صاحب کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔“

ان کی حالت بہت خراب ہے۔“ جواب میں رحمان علی شاہ نے پہلی بار موڈ بدل کر تہقہ لگا دیا اور ایاز بیگ حیرت سے منہ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

پینا چند لمحات تاثر میں ڈوبی رہی پھر اس نے کہا۔ ”سر ان لوگوں کا کیا حال ہے؟“
”یوں سمجھ لو اژدھے کے سر پر پاؤں رکھا ہوا ہے اور شدید سنسنی ہے کہ جب یہ پاؤں
نے کانٹا کیا ہوگا۔۔۔۔۔ ویسے بیٹا مزے تو لیں گے ہم، آسانی سے سارا کھیل ختم کر دیتے تو وہ
لفظ آتا جواب آ رہا ہے۔“ بیٹا اس سے امیر علی شاہ کی گرفتاری کے بارے میں تفصیلات
معلوم کرتی رہی اور شہاب نے اسے ساری تفصیلات بتائیں پھر اسے اس کے آفس پر اتارتے
ہوئے کہا۔

”اچھا بیٹا اب ذرا کچھ اور معاملات دیکھ لئے جائیں بعد میں تفصیلی ملاقات ہوگی ابھی
قانون سے دور رہنا مناسب نہیں ہے۔“

”جی سر میں جانتی ہوں اور آپ بالکل مطمئن رہیں میں بڑے صبر و سکون کے ساتھ
انتظار کروں گی۔“

”میرا؟“ شہاب نے بیٹا کو دیکھ کر کہا اور بیٹا بے تکے سوال پر بوکھلا سی گئی، اس کی سمجھ
میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔۔۔۔۔ شہاب نے اسے لا جواب پا کر خود ہی کہا۔
”ٹھیک ہے بیٹا میں بہت جلد تم سے رابطہ قائم کروں گا وہ خدا حافظ۔“ بیٹا نیچے اتر
گیا اور شہاب نے مسکراتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔



گل زمان رات کو تھانے آیا تھا اور پھر اس نے لاک اپ کے سامنے چکر لگایا تھا۔۔۔۔۔ امیر
علی شاہ نے غرائی ہوئی آواز میں اسے پکارا اور گل زمان اس کے قریب آ گیا۔
”تم بھی مجھے اپنا نام بتا دو دلیر آفیسر۔۔۔۔۔ تاکہ میں دیکھ لوں کہ میرے ملک کی پولیس
کیسے، کیسے دلیر افراد موجود ہیں۔“

”کس۔۔۔۔۔ سمجھا نہیں سر۔“ گل زمان بولا۔
”اتنا ضرور جانتے ہو گے کہ میں کون ہوں؟ اور میرے ساتھ ہونے والے سلوک پر
تمہارا کیا بے گا؟“

”سر جی۔۔۔۔۔ ہم تو قانون کے غلام ہیں۔۔۔۔۔ ہماری آپ سے تو کوئی دشمنی نہیں ہے۔۔۔۔۔
پہلے حکم دو ہم آپ کی ہر خدمت کریں گے۔“
”مجھے فون چاہئے۔“ امیر علی شاہ بولا۔

رحمان علی شاہ نے حیرت سے شہاب کو دیکھ کر کہا۔ ”ایسی کون سی شخصیت ہو سکتی ہے؟“
”تفصیل نہیں بتاؤں گا ابھی۔۔۔۔۔ بس تمہیں وہاں عمارت میں چھوڑ دوں گا اور تمہاری
نمارت کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو۔“

”میری جانب سے آپ بالکل مطمئن رہیں۔۔۔۔۔ میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔
شہاب نے اسے کریم سوسائٹی کی کوٹھی پر چھوڑ دیا اور اس کے بعد وہاں سے واپس پڑا۔
پڑا۔۔۔۔۔ بیٹا کچھ متفکر نظر آرہی تھی۔۔۔۔۔ شہاب نے اس کے تفکر کو محسوس کر کے کہا۔
”کیوں بیٹا کیا بات ہے؟“

”سر کیا جوہر خان اور رحمان علی شاہ آگ اور پانی نہیں ہیں؟“
”نہیں بیٹا دونوں پانی پانی ہو چکے ہیں۔۔۔۔۔ اس لئے کوئی مشکل نہیں پیش آئے گی۔“
بیٹا گہری سانس لے کر خاموش ہو گئی تھی پھر لایا بیگ کو وہاں لے جایا گیا جہاں غیاث
بیگ اس کی بیوی اور ناہید کو رکھا گیا تھا۔۔۔۔۔ غیاث بیگ ہی کو باہر بلایا گیا اور شہاب کے بارے
میں سن کر وہ فوراً باہر آ گیا۔۔۔۔۔ یہاں شہاب نے لایا بیگ کو گاڑی سے اتار کر اس کے ساتھ
لے جا کر پیش کیا تو غیاث بیگ کا سانس بند ہو گیا۔۔۔۔۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لئے ہاتھ
پھیلائے اور شہاب نے اسے سہارا دیا پھر کہا۔

”غیاث بیگ صاحب، میں نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا ہے اپنے بیٹے
اندر لے جائے لیکن یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ دشمن ابھی کتوں کی طرح آپ لوگوں کی
سوتگھتا پھر رہا ہے، آپ کو محدود رہنا ہے اس وقت تک، جب تک میں آپ کو کلیئر نہ
دوں۔۔۔۔۔ جاؤ ایاز تمہارے والدین اب تمہارے پاس ہیں۔۔۔۔۔ اچھا میں چلتا ہوں، احتیاط
رکھنا۔“ ایاز کی خود حالت خراب تھی اس نے آگے بڑھ کر غیاث بیگ کو سنبھالا اور غیاث
بیگ پاگلوں کی طرح اس سے لپٹ گیا۔۔۔۔۔ بیٹا کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔۔۔۔۔ شہاب
اسے اشارہ کیا اور گاڑی میں آ بیٹھا پھر اس نے گاڑی وہاں سے بھی بڑھا دی تھی۔

”متاثر ہو گئی ہو بیٹا؟“
”سر بڑے تاثر انگیز لمحات ہیں۔“

”اسی لئے میں نے ان لمحات میں، اپنی اور تمہاری شرکت مناسب نہیں سمجھی۔ بہرہ
بینا یہ زندگی کے معاملے ہیں، ہمیں خوشی ہے کہ ہم ہچکچڑے ہوؤں کو ملانے کا باعث بنے۔“

”سر..... میں اپنے اختیار سے آگے کیسے بڑھ سکتا ہوں..... آپ کے خلاف تو ہید وارڈز سے کارروائی ہو رہی ہے۔“

”اپنے اختیار سے آگے بڑھو آفسر۔“

”تو کری چلی جائے گی سر۔“

”عہدہ بڑھوادوں گا تمہارا..... میرے ساتھ تعاون کرو۔“

”سر بڑی مشکل سے زندگی گزر رہی ہے..... آپ ہماری تنخواہ دیکھیں پھر فیصلہ کریں۔“

”یہ لو، یہ لو پچاس ہزار ہیں..... رکھو انہیں..... مجھے فون کرنے دو۔“

”گل زمان۔“ شہاب دھاڑا۔

”لیں سر۔“ گل زمان نے پوری قوت سے پاؤں زمین پر مار کر سیلوٹ کیا پھر لنگڑانے لگا۔

”ہالا کھولو۔“

”لیں سر۔“ گل زمان چابی لے کر دوڑا..... اس دوران شہاب نے نہایت ادب سے نوٹ دونوں ہاتھوں میں تھام لئے تھے..... گل زمان نے تالا کھولا اور شہاب نے پورا دروازہ کھول دیا۔

”سر پہلے ناشتا کر لیجئے..... اس کے بعد فون کیجئے..... دل کٹ رہا ہے یہ سوچ سوچ کر کہ آپ کل سے بھوکے ہیں..... آئیے، آئیے..... شہاب امیر شاہ کے سامنے بچھا جا رہا تھا..... بہت عمدہ ہوٹل سے ناشتہ نما کھانا آیا تھا اور امیر علی شاہ کہ اپنی زندگی کے انوکھے تجربات سے گزرتا پڑا تھا..... شہاب اسے فون کے پاس لے گیا تھا۔

”تمہارا یہاں ہونا ضروری نہیں ہے۔“ امیر شاہ بولا۔

”حضور اطمینان سے تشریف رکھئے، آرام سے فون کیجئے..... آؤ گل زمان۔“ شہاب نے کہا اور گل زمان کو لے کر باہر نکل آیا..... گل زمان نے سرور لہجے میں کہا۔

”صاحب..... اللہ کا شکر ہے..... بڑے دن کے بعد روزہ ٹوٹا۔“

شہاب چونک کر اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔

”گل زمان..... بولتے ہوئے الفاظ کا خیال رکھا کرو..... اس غلیظ کمائی کو تم کیسے متبرک ناموں سے تعظیم دے رہے ہو..... یہ وہ لعنت ہے جو ہمیں دنیا تو دے رہی ہے..... ہماری آخرت چھین رہی ہے۔“

”سر جی وہ تو آفس میں ہے..... یہاں نہیں آسکتا۔“

”مجھے آفس لے چلو۔“

”سر جی..... لاک اپ نہیں کھول سکتے۔“

”کیوں؟“

”انچارج صاحب نہیں ہیں جی..... ان کے حکم کے بغیر لاک اپ نہیں کھل سکتا۔“

”اے بلاؤ، اے بلاؤ..... اس سے کہو کہ جتنی دیر مجھے لاک اپ میں گزارنی پڑے اس کی زندگی اتنی ہی کم ہوتی جائے گی۔ لکھ لینا اسے۔“

”سر جی..... ہمیں کوئی خدمت بتاؤ۔“

”دفع ہو جاؤ۔“ امیر علی شاہ دھاڑا۔

”اچھا جی۔“ گل زمان نے کہا اور سعادت مندی سے وہاں سے ہٹ آیا..... پھر دوسرے دن بارہ بجے سے پہلے شہاب امیر علی شاہ کے سامنے نہیں آیا تھا..... البتہ صبح بچے وہ تھانے آگیا تھا اور اس نے کچھ اہم کام کئے تھے جن میں سب سے اہم کام یہ تھا کہ آئی آر جسٹریا بنوایا تھا اور پرانار جسٹر محفوظ کر لیا تھا، پھر بارہ بجے وہ گل زمان کے پاس لاک اپ پہنچا تھا..... امیر علی شاہ اور دوسرے لوگوں کا برا حال تھا..... ان کے چہرے لرز ہوئے تھے۔

”سر مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے کہ آپ لوگوں نے نہ تو رات کو کھانا کھایا اور نہ ناشتا کیا۔“

”کیا نام ہے تمہارا؟“ امیر علی شاہ سرد لہجے میں بولا۔

”شہاب ثاقب سر، پہلے بھی آپ کو بتایا تھا۔“

”میری حویلی میں کتے بھی گندے برتنوں میں کھانا نہیں کھاتے۔“

”گل زمان برتن دھلوائے نہیں تھے؟“ شہاب دھاڑا۔

”اور وہ کھانا..... جانوروں کے کھانے سے بدتر تھا اور صبح کا ناشتا، صبح کا ناشتا۔“

”سر آپ صاحب اقتدار لوگ ہو، آپ خود دیکھ لیں بجٹ ہی نہیں ہوتا ملزموں کھانے کے لئے پھر بھی ہم جتنا خیال رکھ سکتے ہیں رکھتے ہیں۔“

”بکواس مت کرو مجھے فون کرنا ہے۔“

”توبہ، توبہ، بڑے ان سے خشکی چل رہی تھی..... آپ نے چھوٹے چھوٹے
کیس پکڑنے سے تو منع ہی کر دیا ہے۔“

”کسی غریب آدمی سے ایک پیہ بھی او تو بچتے برا کوئی نہ ہو گا۔“ شہاب نے کہا
گل زمان مسکرانے لگا..... بہر حال وہ خوش تھا کہ ایک مقتول رقم کا آسرا ہوا..... ویسے شہاب
دلچسپ آدمی تھا رشوت لے رہا تھا مگر نفرت اور کراہت کے ساتھ۔

آخر کار امیر شاہ باہر آگیا پھر بولا۔ ”مجھے لاک اپ میں بند کرو گے؟“

”سر مہربانی ہو جائے تو..... بڑے افسروں کا خطرہ رہتا ہے۔“

”ہوں چلو۔“ امیر شاہ اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ لاک اپ میں چلا گیا۔

اس نے شہاب سے کہا تھا۔ ”کچھ دیر کہیں جانے کی کوشش نہ کرنا۔ تم سے کام ہے؟“

”ایس سر..... آپ کی اجازت کے بغیر تھانے سے قدم نکالنے والے پر لعنت!

شہاب بولا پھر اسے آدھے گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا تھا..... اس دوران رشوت کی رقم خورد

کر لی گئی تھی تاکہ الٹی آنتیں گلے نہ پڑ جائیں..... شہاب سب کچھ جانتا تھا کہ اب کیا ہو

والا ہے لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ آنے والے افسر کے سامنے امیر شاہ اپنی دی ہوئی رقم

حوالہ دے دے اور رقم شہاب کی جیب سے برآمد ہو جائے۔

آنے والا ایس پی تنویر جاہ تھا..... محکمہ پولیس کا سخت ترین انسان..... وہ ایک ڈی ای

پی کے ساتھ آیا تھا..... چاروں طرف ایڑیاں بچاٹھیں..... شہاب اپنی کرسی سے ہٹ کر

ہو گیا تھا۔

”امیر علی شاہ کو گرفتار کیا ہے تم نے؟“

”جی سر۔“ شہاب نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”ایف آئی آر ہے اس کے خلاف۔“

”اس کی حیثیت معلوم ہے؟“

”جی سر۔“

”ہیڈ کوارٹر سے اجازت لی تھی؟“

”نہیں سر۔“

”کیوں؟“
”ایف آئی آر سنگین تھی سر..... مؤنصد قابل دست اندازی پولیس۔“

”لاؤ انہیں۔“ ایس پی نے کہا اور شہاب خود امیر علی کو لاک اپ سے نکال لایا..... ایس

پی صاحب نے کھڑے ہو کر امیر علی شاہ کا استقبال کیا تھا۔ ”سر میرا نام تنویر جاہ ہے..... سر کیا

جائیں محکمہ پولیس نئی نئی بھرتیاں کرتا رہتا ہے..... یہ افسر نیا لگا ہے آپ سے واقف نہیں

تھا..... کہتا ہے ایف آئی آر درج کرائی گئی ہے۔“

”ہائیں کم کرو ایس پی صاحب..... یہ بتاؤ کیا کرنے آئے ہو؟“

”سر ایف آئی آر دیکھ لوں..... لاؤ آفیسر..... ایف آئی آر دکھاؤ۔“ ایس پی نے کہا اور

شہاب نے جلدی سے رجسٹر لاکر سامنے رکھ دیا..... ایس پی، ایف آئی آر دیکھتا رہا پھر بولا۔

”اس کا بھی قصور نہیں تھا..... آپ کے دشمنوں نے ہی کام پکا کیا تھا..... انسپکٹر رجسٹر میں لے

جا رہوں بعد میں تمہیں واپس مل جائے گا۔“

”ایس سر۔“ شہاب نے گردن جھکا کر کہا۔

”ان لوگوں کو بھی میں لے جا رہا ہوں۔“ ایس پی نے کہا..... شہاب خاموش ہی رہا

تھا..... ایس پی تنویر جاہ، امیر شاہ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل گیا..... گل زمان

نے کہا۔

”سر، یہ سب قانونی تھا؟“

”وہ سب قانونی ہے جو ہم نے چھپا دیا ہے۔“ شہاب نے کہا اور گل زمان زبان دانوں

میں دبا کر خاموش ہو گیا۔



تھانے سے باہر آکر ایس پی نے امیر شاہ سے پوچھا۔ ”سر آپ کہاں جانا پسند کریں

گے..... شاہ پور، یا کہیں اور؟“

”نہیں ایس پی، یہاں میرا مکان موجود ہے۔“ امیر شاہ نے فیاض علی شاہ کی رہائش گاہ کا

بنا ہوا دیا..... کچھ دیر کے بعد گاڑیاں اس خوبصورت کوٹھی پر جا کر کیں۔ ”کوئی پیغام ہے

میرے لئے۔“

”جی سر..... عالی مرتبت رات کو آپ سے ملاقات کریں گے..... میں انہیں اطلاع

دوں گاکہ آپ کہاں ہیں۔“

”یہی پوچھنا چاہتا تھا..... انہیں میری یہاں موجودگی کی اطلاع دے دینا۔“
آفیسر..... ذرا ایف آئی آر کی تفصیل مجھے بتاؤ۔“

”سر یہ آپ کے لئے ہی لایا ہوں..... یہ درخواستیں پولیس کو مختلف لوگوں کی طرف سے موصول ہوئی ہیں..... غیاث بیگ کی درخواست ہے جو عدنان واسطی ایڈووکیٹ کے حوالے سے موصول ہوئی ہے.....“ ایس پی نے درخواست پڑھ کر سنائی پھر ناہید غیاث بیگ کی درخواست سنائی گئی، پھر ایاز بیگ اور آخر میں رحمان علی شاہ..... امیر علی کے چہرے کا متغیر ہوتا رہا تھا..... دیر تک وہ خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

”اب کیا کیا جاسکتا ہے..... یہ رجسٹر تھانے واپس جائے گا؟“

”سر مجھے نہیں معلوم۔“

”تم یہ مجھے دے دو..... رات کو میں عالی مرتبت سے بات کر کے جو صورت حال ہو

تمہیں بتا دوں گا۔“

”سر مجھے ہدایت ملی ہے کہ آپ کی ہر خواہش کی تعمیل کروں۔“

”شکریہ آفیسر..... یہ تھوڑی سی گزربز ہو گئی ہے..... ایک کام اگر تم سے ممکن ہوئے

اور کرو۔“

”جی سر۔“

”غیاث بیگ کا پتا تمہیں بتائے دیتا ہوں..... اسے اس کی بیوی اور بیٹی کو وہاں

ہٹا دو..... جب ان سب لوگوں کے دماغ ٹھیک ہو جائیں تو انہیں چھوڑ دینا۔“

”بہتر جناب..... میں پتا نوٹ کئے لیتا ہوں۔“ ایس پی تنویر جاہ نے کہا اور ڈی ایس بی

نوٹ کرنے لگا پھر بولا۔ ”اور کوئی حکم؟“

”بس شکریہ..... اب تم لوگ جاسکتے ہو۔“

باہر نکل کر ڈی ایس بی فیخر الدین نے آہستہ سے کہا۔ ”سر، یہ سب ٹھیک ہو رہا ہے

قانون کی یہ تحقیر مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔“

”ریزائن کرو۔“ ایس پی نے سرد لہجے میں کہا۔

”میرے ریزائن کر دینے سے اگر قانون کی عظمت بحال ہو سکے تو پہلا کام یہی

”کچھ نہیں ہوگا..... سوائے اس کے کہ تمہیں اپنی حماقت کا افسوس ہوگا۔“

”اور آپ کی اپنی کیا رائے ہے؟“

”میں اظہار نہیں کرنا چاہتا۔“

”میں ایس ایچ او کی عظمت کو سلام کرتا ہوں جس نے بڑی جرات کے ساتھ اس شخص

باجھ ڈال دیا تھا۔“

”بعد میں کیا ہوا؟“

”سر ہمیں اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہئے..... ہمیں ہمارے فرائض منصبی سے روکا

جاتا ہے۔“

”جس ہستی کی طرف سے حکم ملا ہے ہم اس کی مخالفت نہیں کر سکتے..... بات بہت اوپر

سے شروع ہوئی ہے۔“

”لیکن سر ہم سے ہمارے فرائض کے بالکل الٹ کام لیا جا رہا ہے..... ایک شخص مجرم

ہے اس کے خلاف مناسب کارروائی ہوئی ہے لیکن اس کارروائی کو رد کر کے اس کی مدد کی

جاری ہے اور دوسرے معمولی مجرم اس لئے سزا پاتے ہیں کہ کوئی بڑی ہستی ان کی پشت پر

نہیں ہوتی۔“

”ہاں ایسا ہے۔“

”تب تو پھر ہمارے لئے بھی ایک رعایتی کوٹہ ہونا چاہئے۔“

”کیسا رعایتی کوٹہ۔“

”ہم بھی کسی مجرم کو معاف کر دینے کے حقدار ہونے چاہئیں۔“ ڈی ایس پی نے کہا

اور تنویر جاہ طنزیہ ہنسنے لگا۔

”کوٹہ ضروری ہے کیا؟“ ڈی ایس پی اس انداز پر بغلیں جھانکنے لگا تھا..... کچھ دیر

خاموش رہنے کے بعد تنویر جاہ نے کہا۔

”اب یہ آخری کام بھی کر لیا جائے تو بہتر ہے۔“

”کون سا کام؟“

”غیاث بیگ کو اس کی بیوی اور بیٹی کے ساتھ کچھ عرصہ کے لئے تحویل میں لینا

ہاں ہیں اس کا بھی پتا چلانا پڑے گا۔ بس ذرا اپنے دماغ سے کام لو۔۔۔۔۔ ہم پولیس کی طرح
بہن تو ہو نہیں سکتے، ساری صورت حال تمہارے علم میں آگئی ہے آفیسر صاحب۔ بس ذرا
ہمارے ارد گرد کا خیال رکھنا، کیا کرنا ہے ہمیں۔۔۔۔۔ یہ ہم سے زیادہ تم بہتر جانتے ہو، ویسے
رات کو ہماری میٹنگ ہو رہی ہے۔ دیکھو جو مشورہ ملے گا تمہیں بھی اس سے آگاہ کریں
گے، بس اس مشکل سے نکال دو۔۔۔۔۔ بعد میں ہمارے اور تمہارے جو تعلقات رہیں گے، تم
سوچ بھی نہیں سکو گے وہ ہم دونوں کے لئے کتنے فائدے مند رہتے ہیں۔“

”سر میں تو آپ کی بے لوث خدمت کر رہا ہوں آپ بالکل مطمئن رہیں جو کچھ بھی
منپڑے گا ضرور کیا جائے گا۔“

”کل دن کو گیارہ بجے میں تم سے رابطہ قائم کروں گا۔ ہم لوگ ذرا دیر سے اٹھنے کے
باقی ہیں، ویسے اگر ممکن ہو سکے تو کچھ تھوڑی سی معلومات حاصل کرو، ہو سکتا ہے ایس ایچ او
لو اس بارے میں معلوم ہو ویسے وہ اچھا بندہ ہے، ہمارے ساتھ تعاون کرے گا۔“

”جی سر۔“ ایس پی تو یہ جاہ نے جواب دیا اور اس کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔



شہاب بڑا مسرور نظر آ رہا تھا۔۔۔۔۔ رقم تقسیم ہو گئی تھی اس لئے گل زمان بھی شہاب پر
داری نڈر ہو رہا تھا، اچھی خاصی رقم اس کے ہاتھ بھی آئی تھی اور بہت دن کے پت جھڑ کے
بعد کچھ سبز پتے دیکھنے کو ملے تھے۔۔۔۔۔ بہر حال شہاب کی اب تک کی کوششیں بار آور رہی
تھیں اس نے عدنان واسطی اور مینا سے رابطہ قائم کیا۔۔۔۔۔ فون مینا نے اٹھایا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے مینا؟“

”سر بڑی سنسنی محسوس کر رہی ہوں واقعات درحقیقت بہت ہی تیز رفتار ہو گئے
ہیں۔۔۔۔۔ سر آپ اب کیا کر رہے ہیں؟“

”ایس پی تو یہ جاہ صاحب ظاہر ہے اپنے طور پر نہیں آئے ہوں گے انہیں عقب سے
دانت ملی ہوگی بہر حال یہ ایک الگ بات ہے مینا تمہیں ایک اہم کام کرنا ہے اور یہ بتاؤ
تمہارے لئے ممکن ہو سکے گا یا نہیں؟“

”فرمائیے سر۔“

”کل اپنے آفس میں مستعد رہو اور ہو سکے تو واسطی صاحب کو بھی کورٹ نہ جانے

جے۔۔۔۔۔ یہ کوئی باقاعدہ گرفتاری نہیں ہے، ہم ان لوگوں سے کہیں گے کہ انہیں حفاظت
غرض سے تحویل میں لیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ یہ کام ہی کئے لیتے ہیں۔۔۔۔۔ اس وقت ہماری ڈیوٹی
علی شاہ کی خدمت پر لگائی گئی ہے۔“

”سر ہم انہیں کہاں رکھیں گے؟“

”ہیڈ کوارٹر کے لاک اپ میں اور کون سا مہمان خانہ ہے ان کے لئے۔“ تو یہ جاہ نے
کہا اور ڈی ایس پی تاسف سے خاموش ہو گیا لیکن غیاث بیگ کا مکان انہیں خالی ملا تھا۔
وہاں ٹوٹے پھوٹے سامان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔۔۔۔۔ پڑوسیوں سے ہونے والی تحقیقات
بتایا تھا کہ وہ دو تین دن پہلے یہاں سے کہیں جا چکے ہیں۔۔۔۔۔ ایس پی نے پرسکون انداز میں
وہاں سے نکل کر امیر شاہ کو فون کیا۔۔۔۔۔ نمبر وہ لے آیا تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ امیر شاہ بول رہا ہوں۔“

”سر آپ کا نیاز مند ایس پی تو یہ جاہ بول رہا ہے۔“

”ہاں ایس پی صاحب، کہنے خیریت، یقیناً کسی خاص بات پر ہی آپ نے مجھے فون

ہو گا؟“

”جی سر آپ کے پاس سے چلنے کے بعد میں نے فوراً ہی آپ کے دوسرے عکس
تعمیل کے لئے آپ کے بتائے ہوئے پتے پر غیاث بیگ کے گھر چھاپہ مارا ہے، وہاں تو
پھوٹے سامان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔ پڑوسیوں کا کہنا ہے کہ غیاث بیگ دو تین
پہلے یہ گھر چھوڑ کر جا چکا ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ ہوں، تو یہ بات ہے وہ لوگ بھی پکا پکا ہی کام کر رہے ہیں اب بتاؤ ایس پی

کرنا چاہئے؟“

”سر میں تو صرف آپ کے احکامات کا منتظر ہوں۔“

”غیاث بیگ نے ایف آئی آر کھائی ہے اتنا تو خیر وہ بھی جانتا تھا کہ ہم اسے آسانی
نہیں چھوڑیں گے اس لئے وہ گھر چھوڑ کر نکل گیا لیکن خیر ہمارا کیا بگاڑ لے گا اب تو اس
پاؤں ہی کٹ چکے ہیں۔۔۔۔۔ چھوٹے موٹے کچھ کام اور ہیں ایس پی صاحب، آپ تو اچھی طرح
جانتے ہو آپ کو کیا کرنا ہے اور ہاں یہ رحمان علی شاہ اور ایاز بیگ پر بھی ذرا کڑی نگاہ
ہے۔۔۔۔۔ لازمی بات ہے کہ ہر آمدگی کے بعد پولیس انہیں اپنی تحویل میں تو نہیں رکھ سکتی

غریب۔ خیر اب ہم اس موضوع پر گفتگو نہیں کریں گے۔۔۔۔۔ اصل میں میں یہ نہیں چاہتا کہ واسطی صاحب کو ہماری اس کارروائی کے بارے میں پہلے سے معلوم ہو، ممکن ہے وہ اس قدر ذہنی برتری کا مظاہرہ نہ کر پائیں لیکن ہمارا واسطہ بڑے غلط قسم کے لوگوں سے ہے اور ان سے ہمیں ہر طرح کی احتیاط برتنی ہے۔“

”جی سر۔“ مینا نے جواب دیا۔



تو یہ جاہ کی ڈیوٹی واقعی امیر علی شاہ کے ساتھ لگادی گئی تھی، ہدایت کے مطابق اسے بارہ بجے امیر علی شاہ کے پاس پہنچنا پڑا۔۔۔۔۔ امیر علی شاہ کے ہونٹوں پر فتح مندانہ مسکراہٹ تھی، تینوں بیٹے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ امیر علی شاہ نے خوشگوار موڈ میں ایس پی تویر جاہ کا استقبال کیا جو سادہ لباس میں وہاں پہنچا تھا۔

”آؤ جی ایس پی صاحب، کیسا لگ رہا ہو گا تمہیں ہمارے لئے یہ کام کرنا مگر بھائی ہم تو ایک بات جانتے ہیں وقت کی ڈیمانڈ پوری کرنی ہی ہوتی ہے۔ اب دیکھو نا انسان، انسان میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے تو پھر زندگی بے مقصد اور بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے۔۔۔۔۔ ہم نے یہ نام، یہ حیثیت آخر کچھ کر کے ہی کمایا ہو گا۔۔۔۔۔ اب اگر چھوٹے چھوٹے لوگ ہماری بغل میں گھونسا مار کر نکل جائیں تو پھر بات ہی کیا، حالانکہ یہ جو سب کچھ ہو رہا ہے ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہم حالات اور ماحول کو اپنی مٹھی میں جکڑنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن انسان وہی ہوشیار ہوتا ہے جو چھوٹی سے چھوٹی چیز کو نظر انداز نہ کرے۔۔۔۔۔ چیونٹی بھی بدن پر چڑھ جائے تو کہیں نہ کہیں کاٹ کر نشان ڈال ہی دیتی ہے۔۔۔۔۔ اس لئے اس چیونٹی کو مسل کر پھینک دینا ہمارے خیال میں تو ایک بہتر عمل ہے۔“

”جی سر کیوں نہیں؟“

”تو بھی اب ساری صورت حال تمہارے سامنے ہے، ویسے تو اس سلسلے میں اصل کارروائی جس شخص کی ہے ہم اس کا بھی نام سامنے لا سکتے تھے لیکن ایس پی صاحب جب وہ غلط کر ہمارے سامنے نہیں آیا تو ہم کسی کا نام کیوں لیں۔۔۔۔۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ایف آئی آر میں جو تفصیلات درج کی گئی ہیں ان میں ایک تو مرزا غیاث بیگ کی رپورٹ ہے کہ ہم سائل کے بیٹے کو اغوا کر کے جس بیچا میں رکھا، بے شک پولیس نے اسے برآمد کر لیا وہ ایک

دو۔۔۔۔۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے کچھ مہمان تمہارے پاس ضرور پہنچیں گے۔۔۔۔۔ مہمانوں کی گفتگو ریکارڈ کرنی ہے۔۔۔۔۔ کوئی ایسا سسٹم کرو جس سے یہ باتیں ٹیپ ہو سکیں۔“

مینا خاموش رہی تو شہاب نے کہا۔ ”میں تم سے یہ سوال کر رہا ہوں کہ تمہارے پاس اس کا انتظام ہے؟“

”نہیں سر۔“

”تو پھر یوں کرو کہ کچھ دیر کے لئے اپنا دفتر خالی کر دو آدمی پہنچ جائیں گے اور یہ سہ تیار کر دیں گے بلکہ چھوڑو اس وقت تنہا ہو؟“

”جی سر۔۔۔۔۔ ڈیڈی گئے ہوئے ہیں۔“

”تو پھر میں ایک گھنٹے کے اندر اندر آرہا ہوں۔۔۔۔۔ اگر اتفاق سے واسطی صاحب آج جائیں تو انہیں کسی نہ کسی طرح وہاں سے ہٹالینا بعد میں تمہیں ساری تفصیلات بتا دوں گا۔“

”جی بہت بہتر۔“

شہاب نے انتظامات کئے اور تھوڑی دیر کے بعد وہ مینا کے آفس میں پہنچ گیا۔۔۔۔۔ واسطی صاحب کی میز کے گرد کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ پرانی طرز کی میز کے نیچے بڑا احتیاط کے ساتھ وہ سارا سسٹم نصب کر دیا گیا جسے شہاب اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔۔۔۔۔ ریموٹ کنٹرول ٹیپ ریکارڈر تھا جو بہت ہی جدید اور بے آواز تھا۔۔۔۔۔ مینا شہاب کی کارروائی کو بغور دیکھتی رہی اس نے اس مسئلے میں مداخلت نہیں کی تھی، پھر جب شہاب کام سے فارغ ہو گیا تو اس نے اس سارے سسٹم سے مینا کو روشناس کرایا اور مینا نے کچھ لگی۔ شہاب نے کہا۔

”ریموٹ تمہارے پرس میں ہونا چاہئے۔۔۔۔۔ اصل میں مینا مجھے شبہ ہے کہ کل، لوگ یہاں آئیں گے اور عدنان صاحب کو مجبور کرنے کی کوشش کریں گے۔۔۔۔۔ یہ اندازہ ہے ممکن ہے ایسا نہ ہو لیکن بہر حال ہمیں ہر مسئلے پر نگاہ رکھنی چاہئے۔“

”ٹھیک ہے سر میں سمجھ گئی۔ ویسے سر کیا یہ سب کچھ مناسب ہوا ہے۔۔۔۔۔ قانون ہی قانون شکن لوگوں کی مدد کر رہے ہیں؟“

”اس وقت ایک دلچسپ میزان آگیا ہے مینا میں بڑی سنسنی محسوس کر رہا ہوں۔“

دیکھنا ہے کہ قانون کس قدر بے بس ہے۔۔۔۔۔ بس یوں سمجھ لو کہ یہ ایک کسوٹی ہے بڑی عجیب

جتنے دور ہوئے کہ اب تو کبھی موقع کا کوئی شعر بھی یاد نہیں آتا۔“

”جی واسطی صاحب، میں آپ سے امیر علی شاہ کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے لئے امیر علی شاہ کا نام ہی کافی ہو گا۔“

عدنان واسطی نے چونک کر امیر علی شاہ کو دیکھا اور پھر بڑے نیاز مندانہ انداز میں آگے بڑھ کر بولا۔

”سر مجھے حکم دیا ہوتا جہاں آپ فرماتے ہیں حاضر ہو جاتا، آپ نے تو میری بڑی عزت افزائی کر دی ہے، بہت بڑے آدمی ہیں آپ۔“ عدنان واسطی کے بڑھے ہوئے ہاتھ امیر علی شاہ نے نظر انداز کر کے کہا۔

”نہیں وکیل صاحب جی ابھی آپ سے ہاتھ نہیں ملانا..... آپ سے ہاتھ ملے گا مگر تھوڑی سی باتوں کے بعد۔“

”اوہ کوئی حرج نہیں ہے تشریف رکھئے..... زندگی کے معمولات تو چلتے ہی رہتے ہیں آپ براہ کرم تشریف رکھئے..... ایس پی صاحب غریب آدمی ہوں لیکن پھر بھی آپ کی خدمت کر کے مجھے خوشی ہوگی۔ کیا منگو اؤں آپ کے لئے؟“

”او نہیں بھائی نہیں..... کھانے پینے نہیں آئے ہیں اللہ کے فضل سے ہمارے پاس نے پینے کو بہت کچھ ہے، کچھ باتیں کر لو یہ بچی کون ہے؟“

”جی میری بیٹی ہے، مجھے اسسٹ کرنی ہے۔“ عدنان واسطی نے کہا۔

”اس کی یہاں موجودگی میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟“

”نہیں سر بالکل نہیں آپ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کی وفادار ہے یہ بھی۔“

”او کہاں بھئی..... ہم سے وفاداری کب کی تم نے وکیل صاحب..... تم تو تھوڑے ہی دنوں کے لئے دوسروں کے وفادار بن گئے ہمارے خلاف۔“

”نہیں سر اگر آپ کی طرف سے مجھے کوئی حکم ملتا تو میں اس کی تعمیل کرتا۔ فرمائیے سلائی کیا خدمت ہے؟“

”وکیل صاحب امیر علی شاہ صاحب کی آمد کی وجہ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے اور پھر

نہایت یہ ہے کہ سارے معاملات کے روح رواں آپ ہی ہیں۔“

”میں سمجھ گیا سر، مرزا غیاث بیگ کے سلسلے میں اشارہ کیا جا رہا ہے۔“

الگ بات ہے لیکن وہ سارا مسئلہ بھی دوسری شکل رکھتا ہے پھر اس کی بیٹی ناہید کی درخواست ہے جس کی شادی ہم نے زبردستی اپنے ایک آدمی سے کرادی..... بھئی نکاح تو کر لیا ہم نے بغیر نکاح کے تو اس کے گھر نہیں بھیج دیا، تیسری درخواست خود ہمارے بیٹے کی ہے، چوتھی درخواست ایاز بیگ کی۔ عدالت میں ہم ان چاروں درخواستوں کا سامنا کر سکتے ہیں لیکن یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ہم اپنے دشمنوں کو بھرپور شکست دینا چاہتے ہیں اور ان کی شکست یہ ہے کہ ان کی بات کی سنوائی ہی نہ ہو اور بس جی اللہ کا فضل ہے، دعا میں ہیں رات عالی مرتبت سے ملاقات ہوئی تھی۔ تمہیں پتا چل گیا ہو گا ایس پی صاحب؟“

”جی سر، صبح مجھے اطلاع دے دی گئی تھی۔“

”تو پھر ٹھیک ہے..... اب باقی رہ جاتا ہے وہ سر اوکیل..... تو میرا خیال ہے اس نے سامنے بھی تھوڑی سی ہڈی ڈال دی جائے..... بلاوجہ ہی اپنی دنیا خراب کر رہا ہے، آپ جائے ہو اس وکیل کو؟ اس کا نام عدنان واسطی ہے۔“

”جی سر جانتا ہوں..... ظاہر ہے ہم لوگوں کے واسطے تو پڑتے ہی رہتے ہیں۔“

”بس تو اس کے دفتر چلنا ہے تمہارے ساتھ، تم نے یہ اچھا کیا کہ سادہ لباس میں آئے“

”ٹھیک ہے سر..... میں حاضر ہوں۔“

”او بھئی ایس پی صاحب، یہ میرے تین نکلے بیٹے ہیں، یہ ذمے دار ہیں اب ان کو سنبھالنا چاہیے ان کو بڑے آدمیوں کی طرح چھینا آنا چاہئے، سکھا رہا ہوں لیکن سیکھ کر نہیں دیتے، پکی پکائی دے دو ان لوگوں کو کھا کر پیٹ پر ہاتھ پھیر لیں گے تو پھر چلیں ایس پی صاحب۔“

”جی سر۔“ تھوڑی دیر کے بعد ایس پی صاحب اور امیر علی شاہ عدنان واسطی کے دفتر میں پہنچ گئے تھے..... بیٹا پہلے ہی عدنان واسطی کو شہاب کی خواہش سے آگاہ کر چکی تھی۔

عدنان واسطی خود بھی سنسنی کا شکار تھا..... بہر حال یہ لوگ شہاب سے بھرپور تعاون کرتے تھے چونکہ یہ پودا انہیں کا لگایا ہوا تھا جسے شہاب اب اپنی محنت سے سنبھال رہا تھا..... امیر علی

کو پہچان بھی لیا تھا عدنان واسطی نے لیکن اس نے اس سے زیادہ پذیرائی ایس پی صاحب کی، کی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ارے ایس پی صاحب، یعنی اس موقع پر کوئی شعر پڑھنے کو دل چاہ رہا ہے جس سے عزت افزائی کا تذکرہ ہو لیکن افسوس وکالت کے پیشے سے منسلک ہو کر شعر و شاعری کی

”وہ، جی، ہاں اصل میں واسطی صاحب، امیر علی شاہ صاحب بہت اثرورسوخ رکھتے ہیں ایک بہت بڑی شخصیت نے ان کے بارے میں ہدایات دی ہیں اور ہر طرح کی ذمہ داری قبول کی ہے۔“

”جی میں سمجھ رہا ہوں۔“

”وہ غیث بیگ کہاں ہے؟ آپ کو تو اس کے بارے میں معلوم ہوگا؟ ہم اسے تلاش کرنے اس کے گھر گئے تھے وہ چالاک آدمی وہاں سے غائب ہو گیا ہے..... اس کے علاوہ رحمان علی شاہ اور ایاز بیگ الگ غائب ہیں۔“

”سر، غیث بیگ نے مجھ سے میرے دفتر میں ملاقات کی تھی اور اپنا پتا وغیرہ لکھوایا تھا..... بس میں نے اپنے طریق کار کے مطابق ہی کارروائی کی ہے۔“

”کیا پتا ہے؟“ امیر شاہ نے پوچھا اور واسطی صاحب نے اپنا فائل نکال کر اس میں درج پتا ہرا دیا۔

”اوبھائی..... اس پتے سے غائب ہے وہ..... نہیں ہے اب وہ یہاں۔“

”سر مجھے اس بارے میں کچھ معلومات ہیں۔“ بینا نے درمیان مداخلت کی اور وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”تو بتاؤ بی بی۔“

”مرزا غیث بیگ کو اس کے داماد جوہر خان کی حمایت حاصل ہے کیونکہ جوہر خان دوسری بار یہاں آیا تھا اور اس نے ہماری فیس ادا کی تھی۔“

امیر شاہ کا چہرہ اتر گیا وہ غرا کر بولا۔ ”ہاں وہ غدار میرا کتا ہے..... آج کل مجھ پر بھونک رہا ہے لیکن اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا..... میری نرم طبیعت نے بہت سے سر اٹھادیئے ہیں میرے سامنے لیکن اب کچھ کر لوں گا۔“

”ہمارے لئے خدمت بتائیے۔“

”چلو تم یہ معاوضہ رکھو..... تمہیں اور بھی خدمت بتائیں گے۔“

”سر..... آپ بہت فراخ دل انسان ہیں..... ہم سے کوئی کام لیں گے تو معاوضہ بھی مانگ لیں گے آپ سے..... یہ بہت بڑی رقم ہے..... اس پر ہمارا حق نہیں ہے۔“

”لو عجیب سر پھرا آدمی ہے یہ وکیل..... پچیس ہزار ٹھکرا رہا ہے..... تمہاری مرضی

”اوبھائی اشارہ نہیں کیا جا رہا..... یا اگر تم اسے اشارہ ہی سمجھتے ہو تو یوں سمجھو..... یہ اشارہ تمہیں محبت سے کیا جا رہا ہے ورنہ یہ اشارہ تلوار کی نوک چبھ کر بھی کیا جاسکتا ہے..... ہم اس کے قائل نہیں ہیں۔“

”سر میں سمجھا نہیں۔“

”بھئی دیکھو بات کو ایک دفعہ میں سمجھ لینا ہی زندگی کی علامت ہوتی ہے..... ہمارے خلاف ایف آئی آر درج کرائی ہے اور ہماری گرفتاری کرادی ہے لیکن گرفتار ہو گئے تھے، اب یہ دوسری بات ہے کہ تمہارے ہاں کوئی ایسا لاک اپ نہیں ہے جو بر رکھ سکے..... بات نہ تمہاری خوشامد کرنے کی ہے اور نہ ہمیں اس کی ضرورت ہے..... بلاوجہ برائی کے عادی نہیں ہیں..... ہاں برائی کی طرف لے جاؤ گے تو ضرور جائیں گے کتنی فیس ملی ہے تمہیں ان لوگوں سے سب کو ملا کر اور کیا ملا ہوگا ہماری تو سمجھ میں آتا..... تھوڑے بہت پیسے مل گئے ہوں گے..... یہ کیس ختم کرالیا ہے ہم نے کوئی ایڈ آر نہیں ہے اب ہمارے خلاف لیکن جو لوگ اس سے متعلق ہیں انہیں سمجھا دینا ہماری داری ہے اور تم بھی انہی میں سے ایک ہو..... لو یہ پچیس ہزار روپے رکھ لو اور بھول کیس کو۔“

”سر آپ کی محبت اور دوستی ہی میرے لئے دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے، اگر یہ پیسے رکھ لئے تو پھر میں آپ کے نیاز مندوں میں کیسے شامل ہوا..... پیسوں کے کوئی بھی کسی کی محبت حاصل کر لیتا ہے، آپ مجھے حکم دیجئے کہ کرنا کیا ہے؟“

”اوبھائی تمہیں کیا کرنا ہے اور تم کر بھی کیا سکتے ہو..... بس یوں کر دینا..... دماغ سے نکال دو اور اس کیس کو بالکل بھول جاؤ۔“ امیر علی شاہ نے کہا۔

”لیکن سر تھانے میں ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔“

”کون سا تھانہ، کیسا تھانہ..... یہ تمہیں ایس پی تنویر جاہ نظر نہیں آرہا؟ پولیس ڈیپارٹمنٹ ہیں..... سب کام ٹھیک ہو چکا ہے..... ایف آئی آر رجسٹر ہم اٹھا تھانے سے اور اب وہ ہمارے پاس ہے۔“

”جی سر۔“ عدنان واسطی نے کہا..... ان کا چہرہ اتر گیا تھا..... امیر علی شاہ نے کہا..... ”اومیاں ایس پی صاحب، تم بھی تو کچھ بولو۔“

بیوں اور دو ملازموں کو گرفتار کر لیا..... انہیں لاک اپ کر دیا گیا پھر امیر علی شاہ نے فون کرنے کی اجازت مانگی اور پانسہ پلٹ گیا..... ایس پی صاحب امیر علی شاہ کو نکال لائے اور اپنے اختیار بنیاد پر ایف آئی آر رجسٹر ساتھ لے آئے جواب امیر شاہ کے قبضے میں ہے اور امیر شاہ اس کیس کے سارے نشان مٹاتا پھر رہا ہے تاکہ اس کیس کا وجود ہی نہ رہے۔“

”اور شہاب؟“

”شہاب حاضر ہے واسطی صاحب۔“ اچانک دروازے سے شہاب کی آواز سنائی دی پھر اندر آنے کی اجازت لے کر وہ اندر داخل ہو گیا..... وہ سادہ لباس میں تھا اور بہت سمارٹ نظر آ رہا تھا..... عدنان واسطی نے بے اختیار کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا وہ بے حد منتشر نظر آ رہا تھا۔ ”ہیلو واسطی صاحب، ہیلو مینا۔“ مینا نے مسکراتے ہوئے گردن خم کی۔

”ہینو شہاب۔ میں میں سخت پریشان ہو گیا ہوں۔“

”خیریت سر؟“

”بھئی سب کچھ معلوم ہے تمہیں..... امیر علی شاہ نکل گیا..... اس نے آخر کار وی کیا جس کا خدشہ تھا۔“

”خدشہ تو تھا سر۔“

”اور اب وہ تمہارا دشمن بن گیا ہو گا..... اس کمبخت نے سارے توڑ کر لئے۔“

”نہیں سر، وہ ابھی میرا دشمن نہیں بنا..... اسے گرفتار کرنا میری ڈیوٹی تھی..... اس کے بعد میں نے اسے وہ سہولتیں فراہم کیں جن کا وہ طلب گار تھا..... یہاں تک کہ سرکاری رجسٹر بھی اس کی تحویل میں دے دیا۔“

”تو پھر سب کچھ ختم؟“ عدنان واسطی نے مضطرب لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب سر؟“ شہاب حیرت سے بولا۔

”اب کیا کرو گے؟“

”وہ جو کیا جاسکتا ہے..... سر ہم نے تو لڑائی شروع کی ہے..... اب تو ہم کسی مد مقابل کے مقابل آئے ہیں..... اب تو جنگ شروع ہو گی..... یہ تو پینترے بازی ہے جو ہو رہی ہے..... ہم داؤ لگانے کے لئے پینترے بدل رہے ہیں اور سر، ابتدائی واروں سے وہ زخمی ہو چکا ہے..... ہم نے اس کے زخم لگا دیئے ہیں سر اور ان کی تفصیل یہ ہے..... نمبر ایک..... ہم

ہے بھی لیکن یہ کان کھول کر سن لینا وکیل صاحب..... دوبارہ کوئی ایف آئی آر ان کے حوالے سے درج نہیں ہو گی۔“

”جی سر۔ میں یہ نہیں کروں گا لیکن میرے خیال میں یہ احکامات بار کو نسل کو بھی دیئے جائیں..... کہیں دوسرے وکیل یہ کام نہ شروع کر دیں۔“

تنویر جاہ نے چونک کر عدنان واسطی کو دیکھا..... عدنان واسطی کے الفاظ کی تلخی اس نے محسوس کی تھی اور خوفزدہ ہو گیا تھا کہ اب کہیں اس شریف النفس وکیل کی شامت نہ آجائے مگر شکر ہے..... امیر شاہ نے نہ سمجھا اور بولا۔

”او تم کسی کی فکر مت کرو بھائی..... سب سے نمٹ لیں گے..... تم بس اپنا کام کرو..... ایک ڈیوٹی اور ہے تمہاری۔“

”حکم سر۔“ عدنان واسطی نے کہا۔

”دیکھو..... ہم خفیہ طور پر یہاں آئے ہیں، کسی کو نہیں معلوم وہ لوگ لازمی تمہارے پاس ضرور آئیں گے..... انہیں اعتماد میں لے کر ان سے ان کی موجودہ رہائش کا ضرور معلوم کر لینا اور پھر اس فون پر ہمیں بتا دینا۔“

”جی بہتر ہے۔“

”اور کوئی کام ایس پی صاحب؟“ امیر شاہ نے ایس پی سے کہا۔

”نہیں سر اور کوئی کام نہیں ہے۔“

”تو پھر چلو..... یہ کام بھی ہو گیا..... اور یہ پیسے رکھ لو وکیل صاحب بچی کے کام ہی آجائیں گے۔“

”سر ضرور ان لوگوں کا آپ سے لیکن کوئی خدمت انجام دینے کے بعد بے حد شکریہ۔“

”تمہاری مرضی ہے..... ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں ایس پی صاحب؟“

”جی سر، ہوتے ہیں..... چلیں۔“

”ہاں چلو۔“ پھر رسمی سلام دعا کے بعد وہ وہاں سے نکل آئے۔

ان دونوں کے چلے جانے کے بعد عدنان واسطی نے مضطرب نظروں سے مینا کو دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ”یہ کیا ہوا؟“

”یہی ہوا ہے ڈیڈی، تمام تر شیوتوں کے بعد انسپکٹر شہاب نے امیر علی شاہ، اس کے

نے اس کے شکست خوردہ بیٹے کو جس نے اس کا ظلم قبول کر لیا تھا اور خود کو بے بس قرار دے دیا تھا..... اس کے مد مقابل لاکھڑا کیا، نمبر دو..... اس کے وفادار غلام جو ہر خان کو جگا کر اس سے دشمنی پر آمادہ کر دیا وہ ہمارے پاس اس کے جرائم کا سب سے موثر گواہ ہے، نمبر تین..... غیاث بیگ کو اس کا بیٹا واپس دلادیا اور مستقبل میں اس کے اٹھانے بھی اسے مل جائیں گے، نمبر چار۔ امیر شاہ کو ہتھکڑیاں لگا کر اس کی حویلی سے لایا گیا اور لاک اپ میں اسے اٹھائیں گھسنے بھوکا پیاسا زمین پر بٹھائے رکھا..... اس کے باوجود وہ ہمارا دشمن نہیں ہے۔“ اور شہاب نے بیٹا کی طرف دیکھا اور مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

”لیکن اب؟“ واسطی صاحب بولے۔

”اب اس پر دوسرا پہلے سے زیادہ مہلک اور کاری وار کرنے کی کوشش کی جائے گی اور سر وہ اس دوسرے وار سے بھی بچ گیا یا یہ وار کرنے کی صورت حال نہ بن سکی تو پھر اس پر تیسرا وار ہو گا..... واسطی صاحب، سڑکیں وسیع ہیں، حادثات ہوتے رہتے ہیں..... بڑے افسوس ناک حادثے ہوتے ہیں بعض اوقات، اخبارات میں خبر ہو گی..... امیر علی شاہ اپنے تین بیٹوں کے ساتھ ٹریفک کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے یا ان کے کسی دشمن نے انہیں ان کی زمینوں پر ہلاک کر دیا..... اب ہر حادثے کا کوئی نہ کوئی پس منظر تو ہوتا ہے..... زیادہ سے زیادہ کسی سرکاری اجتماع میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کی جائے گی، ایک بڑے آدمی کی موت پر موت برحق ہے اور گناہ کی سزا ضروری۔“

واسطی صاحب کے علاوہ بیٹا بھی کانپ گئی..... یہ آواز بے حد ہولناک تھی۔ شہاب مسکرا رہا تھا لیکن یہ بے حد سفاک مسکراہٹ تھی..... کچھ دیر اسی تاثر میں گزر گئی پھر شہاب نے کہا۔

”مجھے عوام کے تحفظ کے لئے وردی دی گئی ہے واسطی صاحب..... اس کے تحت مجھے تنخواہ بھی ملتی ہے..... ہمیں حکم ہے کہ فتنہ و فساد پھیلانے والوں پر معصوم اور بے گناہ عوام کو نقصان پہنچانے والوں پر گولی چلائیں، انہیں گرفتار کریں، انہیں ہلاک کر دیں، بشرطیکہ گناہ گار ہوں اور امیر شاہ ظالم ہے، گناہ گار ہے اگر وہ حفاظتی خول پہنے ہوئے ہے تو ہماری ڈیوٹی ختم نہیں ہو جاتی..... ہاں بیٹا کیا رپورٹ ہے؟“

”جی سر؟“ بیٹا چونک پڑی۔

”کام ہو گیا؟“

”جی سر۔“

”شہاب نے کہا اور بیٹا نے ریموٹ نکال لیا اس نے ریموٹ پر لگے ہوئے ٹین ”ٹاؤ۔“ ریوینڈ کیا..... واسطی صاحب پہلے تو کچھ نہ سمجھ پائے لیکن جب کچھ دیر کے بعد ٹین کے نیچے سے آوازیں ابھریں تو ان کی آنکھیں شدید حیرت کے پھیل گئیں وہ اس عجیب عجیب آواز کو سن رہے تھے۔



ڈی آئی جی نادر حیات ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے اور شہاب اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نادر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”نہیں انسپکٹر سیلوٹ نہیں۔ تم نے کہا تھا تم مجھ سے ذاتی ملاقات کی خواہش مند ہو؟“

”جی سر..... خالص ذاتی ملاقات ہے..... مجھے آپ سے کچھ رہنمائی درکار ہے۔“

”کس قسم کی؟ بیٹھو۔“ ڈی آئی جی خود بھی بیٹھ گئے۔

”محکمہ پولیس میں نیا ہوں..... ایسے اختیارات کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں جو کاری طور پر تو دیئے جاتے ہیں لیکن کسی وجوہات کی بنیاد پر ختم کر دیئے جاتے ہیں۔“

”کوئی مشکل درپیش ہے؟“ نادر حیات مسکرائے۔

”جی سر۔“

”ٹاؤ۔“

”سریہ تحریری رپورٹ ہے..... میں نے سوچا ممکن ہے زبانی طور پر میں آپ سے فیصل نہ بیان کر سکوں..... اس لئے تحریر کر لی ہے۔“

”ہاں..... گڈ..... یہ اچھا کیا تم نے..... لاؤ دکھاؤ۔“ نادر حیات صاحب نے کہا اور ٹیبل کے وہ فائل درمیان سے کھول کر ان کے سامنے کر دیا جس میں ایک کاغذ رکھا ہوا تھا اور لکھا تھا اس نے اس واقعے کی پوری تفصیل من و عن لکھ دی تھی۔ نادر حیات کاغذ پڑھنے لگے پھر وہ اس طرح اس میں کھوئے کہ شہاب کی موجودگی ہی بھول گئے، وہ گم صم یہ کاغذ پڑھ رہے تھے اور ان کے چہرے پر تغیرات نمودار ہوتے جا رہے تھے، پھر انہوں نے تین بار اس فیصل کو پڑھا اور پھر فائل بند کر دیا..... اس کے بعد وہ شہاب کو گھورنے لگے۔ دیر تک وہ

اسے دیکھتے رہے پھر بولے۔

”ایف آئی آر جسٹراب کہاں ہے؟“

”میرے علم کے مطابق امیر علی شاہ کے پاس لیکن سر وہ اصلی نہیں ہے۔ رجسٹر میرے پاس ہے۔ میں نے اصل کی ڈپلی کیٹ تیار کر لی تھی، البتہ ایس پی صاحب اس پر غور نہیں کیا۔ یہ اصلی ایف آئی آر رجسٹر ہے۔“

”ونڈر فل۔ دکھاؤ۔“ ڈی ایس پی صاحب خوش ہو کر بولے اور شہاب نے ان کے سامنے کر دیا۔ نادر حیات صاحب دیر تک مختلف چیزیں دیکھتے رہے تھے پھر نے کہا۔ ”ڈاکٹر نصرت کبیر اس سلسلے میں گواہی دیں گے؟“

”مکمل سر؟“

”غیاث بیگ کے لئے کون گواہی دے گا؟“

”شاہ پور کے معززین۔“

”رحمان علی شاہ خود گواہی دے گا؟“

”جی سر۔“

”ایاز بیگ محفوظ ہے؟“

”جی سر۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ ایک اور گواہ میرے پاس ہے۔“

”کون؟“ نادر حیات صاحب نے پوچھا اور شہاب نے جیب سے ایک کیسٹ نکال دوسری جیب سے واک مین نکالا پھر اس نے کیسٹ آن کر کے ڈی آئی جی صاحب کو۔ اور انہوں نے پر شوق انداز میں کلیپ کانوں پر چڑھائے۔ کیسٹ آن تھا، وہ سنتے رہے پھر ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”ان لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے محکمہ پولیس کو، کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ قانون کو سمجھتے ہیں ہمیں۔“ شہاب گردن جھکائے بیٹھا رہا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ڈی آئی جی صاحب بولے۔ ”مجھ پر بھروسہ کرو گے شہاب؟“

”جی سر۔ آپ کی ایک کانفرنس نے میری ہمت افزائی کی تھی اور میں اسی ڈور کو پکڑے ہوئے آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔“

”میں زندگی کی بازی لگا دوں گا وہ مجرم ہے اسے ایسی عبرت ناک سزا ملے گی کہ۔“

سنبل جائیں گے۔۔۔۔۔ تم یہ سب کچھ میرے پاس چھوڑ جاؤ۔۔۔۔۔ صورت حال مد نظر رکھو۔۔۔۔۔ مجھے روزانہ شام کو رپورٹ چاہئے جس میں تم مجھے ایاز بیگ اور غیاث کی خیریت بتاؤ گے اور یہ بتاؤ گے کہ رحمان علی شاہ کہاں ہے، یہ بھی بتاؤ گے کہ امیر شاہ اب کیا کر رہا ہے۔“

”جی سر۔“

”جاسکتے ہو۔“

پانچویں دن تک پوزیشن یہ تھی کہ امیر علی شاہ، شاہ پور واپس چلا گیا تھا۔۔۔۔۔ باقی سب حسب سابق تھا۔۔۔۔۔ سوائے ایک ذاتی سی بات کے وہ یہ کہ رحمان علی شاہ اور جوہر خان گہرے دوست بن گئے تھے اور دونوں میں خوب گھٹ رہی تھی، پھر نادر حیات صاحب نے عدنان واسطی سے ملاقات کر کے ان سے کچھ قانونی امور پر گفتگو کی اور انہیں ہدایات جاری کرنے کے بعد کہا۔

”انسپکٹر شہاب کل صبح ہم پولیس فورس کے ساتھ مفرد امیر شاہ کی حویلی پر ریڈ کریں گے جو گرفتار ہونے کے بعد پولیس کو جل دے کر لاک اپ سے نکل بھاگا ہے، اس ریڈ کی قیادت تم کرو گے اور نگرانی میں خود کروں گا۔“

پولیس کے چھ ٹرک شاہ پور پہنچے تھے اور پوری حویلی پولیس والوں سے بھر گئی تھی۔ امیر علی اور اس کے بیٹوں کو گل باز خان اور خیر خان کے ساتھ گرفتار کر کے سختی سے گھسیٹے ہوئے حویلی سے نکال کر پولیس اسٹیشن لایا گیا تھا اور امیر علی شاہ ششدر رہ گیا تھا۔ یوں اسے معمول کے مطابق لاک اپ کر دیا گیا۔ ساری رات وہ بند رہا۔۔۔۔۔ دوسری صبح گل زمان نیاز مندی سے اس کے سامنے پہنچا تھا۔

”حضور۔۔۔۔۔ کوئی تکلیف، کوئی ضرورت؟“

”بکواس مت کرو۔۔۔۔۔ انچارج کہاں ہے تمہارا؟“

”موجود ہیں حضور۔۔۔۔۔ کوئی حکم؟“

”فون کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور سرکار۔۔۔۔۔ وہ چابی۔۔۔۔۔ گل زمان ہنس کر بولا۔

”یہ گھڑی رکھو، یہ انگوٹھی رکھو۔ تین لاکھ روپے مالیت کی ہیں، کیش نہیں ہے میرے ہاتھ۔“ امیر شاہ دانت پیس کر بولا۔

”ارے حضور... اس کی کیا ضرورت ہے..... اسے آپ کا تحفہ سمجھ کر رکھ لیں۔“
ہیں..... آئیے سرفون کیجئے..... آئیے۔“ گل زمان نے چابی لباس سے نکال کر لاک اپ کا
دروازہ کھول لیا اور باقی لوگوں کو وہیں بند کر کے صرف امیر شاہ کو آفس لے گیا..... شہاب
نے دست بستہ سلام کیا اور فون اسے پیش کر دیا..... امیر شاہ نے نمبر ڈائل کئے اور ریسپور
کان سے لگا لیا..... پھر سخت لہجے میں بولا۔

”عالی مرتبت سے بات کراؤ..... میں امیر علی شاہ بول رہا ہوں۔“

”عالی مرتبت موجود نہیں ہیں۔“

”کہاں ہیں وہ؟“

”غیر ملکی دورے پر گئے ہیں..... دورے سے واپسی پر وہ امریکی ہسپتال میں بغرض
علاج داخل ہوں گے..... ان کا پروگرام بہت طویل ہے سوری سر۔“ دوسری طرف سے
سلسلہ منقطع ہو گیا اور امیر علی شاہ ریسپور کو گھورتا رہ گیا..... اچانک اس کے چہرے پر خوف
کے آثار ابھر آئے تھے..... اس نے آہستہ سے ریسپور واپس رکھ دیا اور شہاب کو دیکھنے لگا۔
”اور کوئی خدمت حضور، کوئی ضرورت ہو بے تکلفی سے فرما دیجئے۔ گل زمان، بڑی
سرکار کا خیال رکھنا۔ لاک اپ میں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔“
”جی سر۔ آئیے۔“ گل زمان نے کہا اور امیر شاہ کو واپس لا کر لاک اپ میں بند کر دیا۔



ڈی آئی جی نادر حیات نے بنفس نفیس لاک اپ میں امیر شاہ سے ملاقات کی تھی
رہائی نری سے پیش آئے تھے..... انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو امیر شاہ نے کہا۔
”آپ لوگوں کو معزز لوگوں کے بارے میں علم ہونا چاہئے..... سب کو ایک لکڑی سے
کتے ہیں آپ لوگ۔“
”معزز لوگ اگر جرائم کریں تو ان کے ساتھ کیا سلوک کریں ہم لوگ۔ امیر علی شاہ
ناج؟“ نادر حیات نے پوچھا۔
”میرے خلاف جرم ثابت ہو گیا؟“
”ہاں۔ وہ سارے لوگ پولیس کی تحویل میں آگئے ہیں جو آپ کے کشنگان ہیں۔ ان
لاپ کا بیٹا بھی شامل ہے۔“

”اوسب میرے دشمنوں کی سازش ہے۔ بہت بڑا پلان بنایا گیا ہے میرے خلاف۔“

”ٹھیک شاہ صاحب۔ عدالت میں آپ کو پورا موقع ملے گا۔“

”ٹھاک موقع ملے گا۔ مجھے اپنے بچاؤ کے لئے کوئی کوشش بھی نہیں کرنے دی جاتی۔
ملاپنے ہمدردوں کو ٹیلی فون کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو ڈی آئی جی صاحب، میں عالی مرتبت کا
ملا دست ہوں اور آپ کو علم ہو چکا ہو گا کہ عالی مرتبت پہلے بھی مجھے اس کیس سے نکال
چکے ہیں۔ اصل میں یہ سب میرے خلاف بنایا ہوا کیس ہے اور اس میں کوئی سچائی نہیں ہے،
پہلوں لگا کر لو کہ عالی مرتبت کی واپسی کا انتظار کر لو ان سے بات کر کے پھر جو مرضی
ہے کر لیں۔“

”عالی مرتبت ملک سے باہر سرکاری دورے پر ہیں اور اس کے بعد وہ امریکہ میں اپنا

علاج کرائیں گے، بہر حال کیس تو چل ہی رہا ہے، اندر وہ اس دوران، ایسے آج سے زیادہ کے لئے کچھ کر لیں گے۔“

”مجھے کچھ اور لوگوں کو بھی فون کرنا ہے، جو میرے بچاؤ کا بندوبست کر سکتے ہیں۔“ آپ ابھی ہمارے سامنے انہیں فون کر لیجئے گا۔ ہم آپ کو اس کا پورا پورا نمونہ دیں گے۔ ایک معزز شہری کو بس اتنی ہی سہولتیں دی جاسکتی ہیں۔ اب یہ تو ممکن نہیں، امیر علی شاہ صاحب کہ آپ کو گرفتار کرنے کے بعد عالی مرتبت کی واپسی تک کے کر دیا جائے۔“

”او دیکھو ڈی آئی جی صاحب میں کوئی ٹیو پیو نہیں ہوں..... بہت بڑا آدمی میں..... آدھے سے زیادہ شاہ پور میری ملکیت ہے، او بھی دیکھو کچھ دو اور کچھ لو پر فیہ ورنہ کھانے میں رہو گے۔“

”وہ جی کر لیں گے آپ ایسا کریں کہ جن لوگوں کو فون کرنا چاہتے ہیں کر لیں۔ لوگوں سے ملاقات کر لوں گا اگر وہ آپ کے لئے کوئی نکتہ نکال سکتے ہیں تو میں ان سے نہ کروں گا۔“

ڈی آئی جی نادر حیات نے اپنے سامنے ٹیلی فون رکھا اور سوالیہ نگاہوں سے امیر علی کو دیکھنے لگے..... امیر علی شاہ پر اس دوران بدحواسی طاری ہو گئی تھی، چنانچہ اس نے ڈی آئی جی صاحب کو ایک ٹیلی فون نمبر بتایا اور ڈی آئی جی صاحب نے ٹیلی فون نمبر ڈائل کر ریسور امیر علی شاہ کو دے دیا لیکن یہ ٹیلی فون نمبر انہوں نے اس وقت اطمینان سے اپنے ہاتھ میں لکھ لیا۔ جب امیر علی شاہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔ یہ بھی ایک بڑی ہستی تھی لیکن امیر علی شاہ کی ملاقات اس سے نہ ہو سکی۔ پھر یکے بعد دیگرے چار نمبر ڈائل کئے گئے، ان میں دو پر باقاعدہ گفتگو ہوئی اور امیر علی شاہ نے ان لوگوں کو اپنی پتہ سنائی۔ شاید ان میں سے نے وعدہ بھی کیا تھا کہ کچھ کرے گا۔ نادر حیات صاحب تمام نمبر زور نام نوٹ کرتے تھے..... پھر امیر علی شاہ نے کہا۔

”ڈی آئی جی صاحب آپ بھی سوچو، ایس ایچ او صاحب کو بھی میں نے نقد پر بنائی ہے تو میرے معاملے میں ذرا نرمی اختیار کرو۔ دنیا میں کچھ لینے اور کچھ دینے کا کام چلتا ہے۔“

”جی جی۔“ امیر علی شاہ کو واپس لاک اپ میں پہنچانے کے بعد ڈی آئی جی نادر حیات نے چاروں نمبر میں نے نوٹ کر لئے ہیں مسٹر شہاب ثاقب۔ کم از کم یہ اندازہ ہو گیا کہ ان نمبروں سے اس کیس میں مداخلت ہو سکتی ہے۔ تم بالکل بے فکر رہنا۔ میں اپنے فرض کو نبھاتا ہوں۔ ان لوگوں میں سے اگر کسی نے بھی امیر علی شاہ کے معاملے میں مداخلت کی تو میں انہیں بھی گرفتار کر کے لاک اپ میں ڈلوادوں گا۔ یہ شخص سمجھتا کیا فوڈ کو۔“

شہاب ثاقب نے دل سے ڈی آئی جی نادر حیات کو سراہا تھا اور سوچا تھا کہ اگر ایسے پولیس آفیسر پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آجائیں تو معاشرے سے جرائم کا اسی فیصد خاتمہ لے لے۔ بہر حال اس وقت شہاب ثاقب کو دلچسپ صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا جب جگ قانون اسے موصول ہوا۔ جبار بیگ صاحب نے کہا۔

”وہ شہاب صاحب، بھیجی سنا ہے تم نے شاہ پور کے امیر علی شاہ کو گرفتار کیا ہے کسی کے سلسلے میں؟“

”جی سر..... صحیح سنا ہے آپ نے۔“

”بھئی وہ تو ہمارا دوست ہے ہمارے اور ان کے درمیان بڑے روابط رہ چکے ہیں، کم از کم وہ تو کر لینا چاہئے تھا یا ر..... وہ تو بڑے کام کا آدمی ہے۔ ہمارے بہت سے کام آسکتا یا کر رہے ہو اس کے سلسلے میں؟“

”افسوس ہے جبار بیگ صاحب۔ اس کی گرفتاری میرے ہاتھوں عمل میں نہیں آئی ہے۔“

ڈی آئی جی نادر حیات صاحب نے اسے بذات خود گرفتار کیا ہے کیونکہ علاقہ میری تحویل میں ہے، جس سلسلے میں یہ کارروائی ہوئی ہے اس لئے گرفتاری میں، میں بھی شریک تھا۔ میں ایک بار اسے رہا کر چکا ہوں لیکن نادر حیات صاحب نے اس بار خود ریڈ کر کے گرفتار کیا ہے۔ آپ اگر نادر حیات صاحب کے سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں تو ضرور کیجئے گا۔

”میرے ہاتھ کی ہوتی تو ظاہر ہے آپ کی ہدایت کے مطابق ہی کام کرتا۔“

”اس سلسلے میں نادر حیات صاحب تو بہت ہی سخت مزاج ہے۔“

”نہایت کہ اس نے قسم کھائی ہے کہ اگر امیر علی شاہ کے سلسلے میں کسی نے سفارش

بہت سے لوگوں کو لپیٹ میں لے لیا تھا یہاں تک کہ ایس پی تنویر جاہ کو فخر الدین کی سفارش کے ساتھ عدنان واسطی سے درخواست کرنی پڑی تھی کہ عدنان واسطی اس کا نام سامنے نہ لائے، کیونکہ ڈور تو بے شک اوپر سے ملی تھی لیکن ڈور ہلانے والا یہاں موجود نہیں تھا اور اس سلسلے سے بالکل بے خبر ملک سے باہر تھا یا پھر یہ بھی ڈی آئی جی نادر حیات کی کوئی کوشش تھی کہ وہ شخص یعنی عالی مرتبت خود ہی اس معاملے سے نکلنے کے لئے ایک طویل عرصے کے لئے روپوش ہو گیا تھا۔ مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔ ہر کیس میں امیر علی شاہ کو پانچ پانچ اور چھ چھ سال کی سزائیں سنائی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بیٹوں کو بھی سزائیں سنائی گئی تھیں اور ان دو ملازموں کو بھی جو اس کے دست راست تھے..... نجانے کیوں امیر علی شاہ نے جو ہر خان کا نام نہیں لیا تھا۔ غالباً اس تصور کے ساتھ کہ اگر جو ہر خان ان لوگوں کے ہاتھ نہیں لگا ہے اور وہ خود اس کا نام پیش کرتا ہے تو جو ہر خان کے پاس اور بھی بہت سے ایسے راز تھے جو امیر علی شاہ کی ان سزائوں میں اضافہ ہی کر سکتے تھے۔ حالانکہ مجموعی طور پر یہ سزائیں اتنی ہو گئی تھیں کہ امیر علی شاہ کی زندگی ان کے لئے ناکافی تھی لیکن شکر تھا کہ ایسا کوئی قتل مع ثبوتوں کے پیش نہیں کیا جاسکا تھا جس کے نتیجے میں اسے سزائے موت ہی ہو جاتی، حالانکہ ایسے کئی کیس اس پر تھے لیکن ان کے کوئی ایسے ثبوت موجود نہیں تھے جو ٹھوس حیثیت کے حامل ہوں۔ بہر حال یہ مسئلہ اس شکل میں حل ہو گیا تھا۔ رحمان علی شاہ بھی کئی پیشیوں میں شریک ہوا تھا۔ متاثر ہی تھا کیونکہ بہر حال باپ اور بھائی تھے لیکن جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ ایسا تھا کہ اگر اس کے بعد وہ چاہتا بھی تو امیر علی شاہ اور اپنے بھائیوں کو ان مشکلات سے نہیں نکال سکتا تھا۔ جب سزائیں سنائی گئیں تو رحمان علی شاہ بہت مضطرب ہو گیا تھا۔ شہاب کے ساتھ ہی عدالت سے واپس آیا تھا اور غمگین نظر آ رہا تھا۔ شہاب اسے اس عمارت میں لے گیا جو کریم سوسائٹی میں تھی اور جہاں جو ہر خان بھی موجود تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد شہاب نے رحمان علی شاہ کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”تم اپنے باپ کو معاف بھی کر سکتے تھے لیکن معاملہ صرف تمہارا ہی نہیں تھا رحمان علی شاہ۔ بہت سے لوگ امیر علی شاہ کے ہاتھوں ستائے ہوئے تھے..... جیسے غیاث بیگ اس کا بیٹا لایا بیگ۔ اور پھر بہت سے دوسرے بھی..... بہر حال مجھے افسوس ہے لیکن اب تم یہ سوچو کہ تم پر کتنی ذمے داریاں آپڑی ہیں۔“

وغیرہ کی کوشش کی تو اسے بھی اسی کیس میں پھانس لوں گا۔“
”ہوں۔ اور سب خیریت ہے..... کیسا چل رہا ہے تمہارا تھانہ۔“ جبار بیگ کا دم بدل گیا۔

”سر آپ کی دعاؤں کے سہارے چل ہی رہا ہے۔“
”اچھا ٹھیک ہے پھر کسی وقت بات کروں گا باقی سب خیریت ہے؟“

”جی سر..... بالکل۔“ شہاب نے جواب دیا اور دوسری طرف سے ٹیلی فون کا منقطع ہو گیا۔ نادر حیات کے بارے میں یہ جملے سننے کے بعد جبار بیگ صاحب کو ہوش آ گیا تھا اور انہوں نے ٹیلی فون بند کر دیا تھا..... بہر حال امیر علی شاہ صاحب نہیں چل سکی، اونٹ پہاڑ تلے آ گیا تھا اور اب اسے اپنی کوتاہ قدمی کا احساس ہو رہا تھا۔ انسانی فطرت ہے۔ آسمان کو چھونے کے لئے کوشاں اپنی پستیوں کو بھول جانے والی طرح منہ کے بل گرتے ہیں۔ مقدمہ پیش ہوا۔ عدنان واسطی نے اس کی پیروی کی، کے بعد تمام تر سلسلے جاری ہو گئے حالانکہ کیس بہت مشکل تھا لیکن جو کچھ اس کے ساتھ تھا وہ کیس کو آسان بناتا چلا گیا۔ امیر علی شاہ کے حواریوں نے اس کے بعد صورت سنبھال لیا تھا..... گو امیر علی شاہ کی رہائی کسی طرح ممکن نہیں ہوئی اور ضمانت کے جانے والی ہر کوشش ناکام بنادی گئی۔ اتنی گواہیاں تھیں کہ امیر علی شاہ کو گردن افہ مہلت نہیں مل رہی تھی۔ وکیلوں کا ایک پورا پیٹیل تھا جو اس کے تحفظ کے لئے کوشاں تھے لیکن بعد میں ان وکیلوں کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ بے شک کیس لڑنے کا معاوضہ ہے لیکن اس کیس میں وہ امیر علی شاہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ گواہیاں تھیں کہ امیر علی شاہ نے شاہ پور کے لوگوں کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ سامنے آ رہا تھا۔ ہر کے خلاف گواہی دینے پر تل گیا تھا، جس کے ساتھ امیر علی شاہ نے اپنی طاقت کے برا سلوک کیا تھا..... خود عدالت آ کر لوگ اپنے نام لکھوا رہے تھے اور اس ضرورت ہی نہیں پیش آئی کہ افضل خان وغیرہ کے کیس کو ادھر سے پیش کیا جائے کے لوگوں نے خود ہی یہ کیس بھی عدالت کے سامنے پیش کئے تھے۔ ڈاکٹر کبیر کی اہمیت کی حامل تھی اور انہوں نے رحمان علی شاہ کے سلسلے میں ہر چیز مع ثبوت کا دست سامنے رکھ دی تھی۔ پھر عدنان واسطی کو دی جانے والی دھمکیاں جنہوں۔

”کے بعد ناہید۔“
”شادی کرو گے ناہید سے؟“

”ضرور کروں گا شہاب صاحب..... ضرور کروں گا اس سے شادی۔“

”یہ بھول کر کہ وہ جوہر خان سے متعلق رہ چکی ہے۔“

”پہلے بھی آپ سے عرض کر چکا ہوں کسی کے بدن پر اگر غلاظت بھر کر پھینک دو تو وہ بے شک گند اہو جاتا ہے لیکن اس کا کوئی قصور ہوتا ہے اس میں۔ آپ مجھے خود بتائیے..... وہ زہرے باپ کے ستم کا شکار ہوئی ہے بھلا اس کا کیا قصور..... وہ تو میرے لئے اتنی ہی پاکیزہ اور پہلے سے زیادہ محبت کے قابل ہے۔“

”خدا تمہیں خوش رکھے..... درحقیقت تمہارے ان الفاظ نے یوں سمجھ لو مجھے میری بہن کا صلہ دے دیا..... میں جوہر خان سے بات کرتا ہوں۔ وہ آج ہی اسے طلاق دے دے..... پھر عدت کا وقت گزارنے کے بعد تم ناہید کو اپنی زوجیت میں لے لینا۔“

رحمان علی شاہ مسکرانے لگا پھر بولا۔ ”شہاب صاحب جوہر خان نے بہت دن پہلے طلاق نامہ لکھ کر میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے بہت شرمندہ تھا اور اصل میں وہ بھی بس نمک حلائی کا شکار تھا..... میرے اور اس کے درمیان بات ہو چکی ہے۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب وہ اور میں وہاں رہ رہے تھے۔“

”اور وہ ویری گڈ ویری گڈ۔ ویسے ایک بات کہوں جوہر خان جتنا برا تھا اتنا ہی اچھا انسان بن چکا ہے۔“

”ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے۔“ شہاب نے جوہر خان کو بلایا اور وہ سامنے آگیا۔
”تمہیں معلوم ہے جوہر خان کہ امیر علی شاہ اور اس کے بیٹوں اور اس کے ان دونوں ساتھیوں کو کافی لمبی سزائیں ہوئی ہیں۔ ان سزاؤں میں اگر کتنی ہی اپیل کی جائے لیکن میرا خیال ہے ڈی آئی جی نادر حیات صاحب ہر قیمت پر ان سب کو سزائیں دلوائے بغیر نہیں رہ سکیں گے..... وہ بھی اپنی دھن کے پکے آدمی ہیں..... میری ایک آرزو تھی کہ تمہیں ان معاملات میں ملوث نہ کیا جائے..... خطرہ یہ تھا کہ اگر میں نے یہ کام نہ کیا تو کہیں خود امیر علی شاہ صاحب اس مسئلے میں تمہارا نام نہ لے دیں لیکن بہر حال ایک چھوٹی سی کاوش کی تھی جو ناکام ہو گئی۔ مجھے رحمان علی شاہ نے بتایا ہے کہ تم نے ناہید کو طلاق دے دی ہے۔ بہر حال

”کیا ذمے داریاں شہاب صاحب، دولت، جائیداد، کاروبار، یہی ساری چیزیں سنبھالوں گانا میں، تنہا انسان کے لئے کیا یہ سب کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ میری ماں شاہ پور کی حویلی میں میری صورت دیکھے گی، کیا جواب دوں گا اسے۔“

”یہ سب کرنی کا پھل ہے جسے نہ میں روک سکتا تھا۔ نہ تم نہ کوئی اور..... خدا کی لائے بے آواز ہوتی ہے۔ خود امیر علی شاہ نے کتنے لوگوں کو زندگی سے دور کر دیا تھا..... یہ دکھ کی بات ہے خیر اب یہ بناؤ مستقبل کے لئے تمہارا کیا ارادہ ہے۔“
”ابھی میں کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر ہوں جناب مجھے کوئی ایسی جگہ دیجئے جہاں میں تھوڑا وقت اپنا غم غلط کرنے میں گزار لوں۔“

”میری بات مانو گے؟“

”سر آپ کے سوا کسی کی بات نہیں مانوں گا۔“

”تو پھر غیاث بیگ کے ساتھ رہو۔ وہ گھرانا تمہارا ضرورت مند ہے۔“

رحمان علی شاہ نے نگاہیں اٹھا کر شہاب کو دیکھا اور بولا۔

”کیا کروں کیا نہ کروں، آخر ہوں تو اسی باپ کا بیٹا جس کے ہاتھوں ان لوگوں کو اتنے زخم ملے ہیں کہ اب ان زخموں کا مرہم ممکن نہیں ہے۔“

”ایک ذاتی سوال کروں رحمان علی شاہ؟“

”شہاب صاحب آپ مجھ سے کچھ پوچھنا نہ کریں..... اللہ نے سب کو زندگی عطا فرمائی ہے اور ہماری ہر سانس اسی کے حکم کی تابع ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس کے احکامات کی پیروی کرتے ہوئے کسی مردے کو زندگی دے دیتے ہیں۔ آپ میرے لئے مسیحا ہیں اور میں اس زندگی کو آپ کا رہن منت سمجھتا ہوں۔“

”مجھے خوشی ہے کہ میں انسانیت کے کسی کام آسکا لیکن مجھے کھلے دل سے ایک بات بتاؤ رحمان علی شاہ؟“

”جی شہاب صاحب۔“

”ناہید سے شادی کرو گے؟“

رحمان علی شاہ نے شہاب کو دیکھا اور بولا۔ ”اس کے سوا زندگی میں اور ہے کیا آپ یقین کیجئے نہ مجھے اس دولت سے دلچسپی ہے نہ جائیداد سے، مجھے اپنی ماں بے حد عزیز ہے۔“

تم نے بہت سے اچھے کام کئے ہیں جو ہر خان اور میں تم سے بہت خوش ہوں، اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مستقبل میں تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

جوہر خان پھیکے سے انداز میں ہنسا اور بولا۔ ”مستقبل..... صاحب آپ خود کہہ دیجئے ہو کہ ماضی میں ہم نے بہت برے برے کام کئے ہیں، انسان پر ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب اس کے گناہ اسے بے چین کرتے رہتے ہیں..... صاحب گناہ گار کو جب اپنے گناہوں پر احساس ہوتا ہے تو اس سے اس کا سکون چھین جاتا ہے..... ہم بھی اتنے ہی بے سکون ہیں صاحب، ہمارے لئے اگر کوئی دعا کر سکتے ہو تو بس یہ دعا کر دو کہ خدا ہمیں سکون دے جنم کی آگ تو ہمارا مقدر ہے لیکن زندگی کے جتنے سانس ہیں گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے گزارنا چاہتے ہیں اور کوئی آرزو نہیں ہے ہمارے دل میں۔ دنیا سے کنارہ کشی چاہتے ہیں ہم۔“

”جوہر خان دیکھو اللہ اپنے گناہ معاف کرنے پر قادر ہے وہ اگر چاہے تو انسان کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور جو گناہ اس نے اللہ کے حضور کئے ہیں ان کی معافی مل جاتی ہے لیکن نقصان انسان کو انسان کے ہاتھ سے پہنچتا ہے اس کی معافی ممکن نہیں ہوتی اور انسان ہی اپنے مجرم کو معاف کر سکتا ہے۔ میری رائے ہے کہ تم اپنا ذاتی وقت انسانوں کی بہتری کے لئے صرف کر دو..... ہو سکتا ہے تمہیں سکون مل جائے۔“

”صاحب ہمیں رہنمائی چاہئے..... ہم دنیا سے بہت دور کے آدمی ہیں کبھی کبھی اپنے کام کے بارے میں سوچا نہیں۔“

”کہاں جانا پسند کرو گے؟“ شہاب نے سوال کیا اور جوہر خان تھکی تھکی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

”کوئی جگہ ہوتی تو ضرور چلے جاتے..... ہمارا تو کچھ بھی نہیں ہے اس دنیا میں لیکن بہر حال تلاش کریں گے صاحب کہ ہمیں بھی کوئی ٹھکانہ مل جائے۔“

”تم نے ایک بار کہا تھا جوہر خان کہ اگر یہاں اس جگہ تمہیں ٹھکانہ مل جائے تو تم یہاں سے کہیں جانا نہ پسند کرو گے۔“

جوہر خان نے نگاہیں اٹھا کر شہاب کو دیکھا اور بولا۔

”آپ ہمیں یہاں رہنے دو گے صاحب؟“

”نہیں..... میں تمہیں یہاں رکھنا چاہتا ہوں..... تمہارے کہنے سے نہیں یہ میری بات

”پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ ہمارا مختصر سا کنبہ ایک دوسرے سے بے حد مخلص ہے..... ہمارے درمیان اعتماد کے ناقابل یقین رشتے قائم ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے

جھوٹ نہیں بولتے۔ کیا اس رقم کے بارے میں واسطی صاحب کو نہ بتایا جائے؟“

”بیٹا..... میری زندگی کی کہانی بھی تمہیں معلوم ہے اور میں اپنے افکار میں ہوں..... اس دنیائے مجھے یہ تجربہ دیا ہے..... اپنا حق ملے تو ضرور وصول کرو..... اگر تمہیں واسطی صاحب کو میرے اصولوں سے اختلاف ہو تو بیٹا یہ ایک مجبوری ہے کہ ہمارا ہمارا مشکل ہو جائے گا..... اس کے لئے تمہیں اپنے وسائل استعمال کرنے پڑیں گے ورنہ بنیادی اختلاف ہو تو بات آگے بڑھنا مشکل ہو جائے گی۔ سوری بیٹا۔“ شہاب پتھر پلٹے میں بولا۔

”آپ برامان گئے سر۔“ بیٹا مسکرا کر بولی۔

”میری پوری حیات پر محیط ہے، یہ تصور بیٹا۔ میں نے خود کو کسوٹی پر رکھا ہے اور اپنے عمل کو بہتر سمجھتا ہوں..... چند روز کے بعد میری بہن کی شادی ہے اور میں نے اپنے ایک بھاری رقم رکھی ہے۔“

”جی سر..... ہم اس شادی میں شریک ہوں گے۔“

”ضرور بیٹا۔“

”سر میں موضوع بدل رہی ہوں۔“

”بدل دو بیٹا..... یہ لمحات مجھے بوجھل محسوس ہو رہے ہیں۔“

شہاب نے آہستہ سے کہا۔

”ٹھیک ہے سر۔“

اس کے بعد دوسرے امور پر باتیں ہوتی رہی تھیں..... بیٹا نے پھر اس موضوع بات نہیں کی تھی۔



ڈی آئی جی نادر حیات خان نے شہاب ثاقب کی فائل منگوائی تھی اور اس وقت ان مصروف تھے..... کافی دیر تک وہ فائل دیکھتے رہے..... بارہوری تھانے کے بارے میں تفصیلات تھیں۔ ایک بڑے اور خطرناک گروہ کا خاتمہ اور اس کے بعد علاقے میں ہونے والے وارداتوں کی تفصیل سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ شہاب ثاقب نے وہاں زبردست کٹر کر لیا تھا..... بہر حال ڈی آئی جی نادر حیات صاحب یہ تفصیلات دیکھتے رہے، پھر انہوں

تبھی سی نوٹ لکھا جو آئی جی صاحب کے نام تھا اس میں کچھ ایسے حوالے دیئے جو آئی جی کے لئے بھی قابل توجہ تھے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایس پی تویر جاہ نے ڈی آئی جی ایس پی فخر الدین بھی ساتھ تھے..... نادر حیات نے سر دنگا ہوں سے ان کو دیکھا تو ایس پی تویر جاہ نے کہا۔

”سر مجھے علم ہے کہ مجھے کیوں طلب کیا گیا ہے؟“

”تشریف رکھئے آپ لوگ۔“ ڈی آئی جی صاحب نے نرم لہجے میں کہا اور دونوں

پوچ گئے۔

”جی کیا علم تھا آپ کو؟“

”سر آپ نے امیر علی شاہ صاحب کے سلسلے میں ہمیں طلب کیا ہو گا۔“

”تویر جاہ صاحب۔ میں آپ کی زبانی تفصیل سننا چاہتا ہوں۔“

”سر تفصیل بس اتنی سی ہے کہ جو رکاوٹیں محکمہ پولیس کو لاحق ہیں ان کے سلسلے میں اگر آپ جیسا کوئی مجاہد جہاد کرتا ہے تو آپ یقین کیجئے۔ ہم لوگ بھی اس قدر بے ضمیر نہیں ہیں کہ ہم آپ سے تعاون نہ کریں۔ انسپکٹر شہاب نے پوری سچائی اور دیانتداری کے ساتھ کی تم کا دباؤ قبول کئے بغیر امیر علی شاہ کو اس کی حویلی سے گرفتار کیا تھا اور ایک مجرم کو جس طرح لاک اپ کیا جاتا ہے اس طرح اس نے امیر علی شاہ کو لاک اپ میں بند کیا تھا۔ ہمیں اس سلسلے میں کوئی خبر نہیں تھی لیکن پھر عالی مرتبت نے براہ راست مجھے طلب کیا..... فخر الدین اس کی گواہی دیں گے کیونکہ یہ بھی میرے ساتھ تھے۔ مجھ سے امیر علی شاہ کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے کہا کہ مجھے اس سلسلے میں کوئی علم نہیں ہے۔ تب مجھے ہدایات ملی گئیں کہ امیر علی شاہ کا کیس اس طرح ختم کر دیا جائے کہ سرے سے اس کا وجود بھی باقی نہ رہے۔ سر مجھے حکم دیا گیا کہ اگر ایف آئی آر کٹ گئی ہے تو ایف آئی آر رجسٹر ہی بدل دیا جائے۔ ہر قیمت پر یہ کام کرنا ہے۔ سر اس کی رپورٹ میں نے آئی جی صاحب کو پیش کی۔ آئی جی صاحب نے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ معاملہ جن ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے، اب اس سے ٹھکانا مشکل ہے۔ کیونکہ ہدایات مجھے دی گئی ہیں اس لئے آئی جی صاحب کو اس بارے میں کوئی تفصیل نہ بتائی جائے اور اگر میں ان ہدایات پر عمل کر سکتا ہوں تو کروں نہ کرنا چاہوں تو یہ بھی مجھ پر منحصر ہے..... سر میں سمجھتا ہوں کہ آئی جی صاحب کی بات اپنی جگہ

جیسا آپ استعفیٰ پیش کرنا چاہتے ہیں؟“
”جی سر۔“

”تو پھر سنئے..... آپ استعفیٰ نہ پیش کریں بلکہ اس وقت کا انتظار کریں جب آپ کی سروس ختم کر دی جائے..... سمجھ رہے ہیں نا آپ بات ایک ہی ہو جاتی ہے۔ معمولی سے فرق کے ساتھ اور یہ سروس میں نہیں ختم کروں گا۔ ممکن ہے آئی جی صاحب کو یہ قدم اٹھانا پڑے۔ ممکن ہے کہیں اور سے اس کی کوشش کی جائے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا تو کم از کم اتنا سمجھئے کہ ضمیر کے خلاف نہ جائے۔ اپنے کسی قدم کو اٹھاتے ہوئے اپنے ضمیر سے سوال کریں کہ یہ جائز ہے کہ نہیں ظاہر ہے آپ کسی بڑے آدمی کے حکم کی خلاف ورزی کریں گے تو آپ کی یہ ملازمت ختم کر دی جائے گی۔ کم از کم اس وقت تک ایسے چند نیک کام کر لیجئے جن کی تکمیل کے بعد آپ کو یہ دکھ نہ رہے کہ محکمہ پولیس میں آکر آپ نے کچھ نہیں کیا۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ۔“

”جی سر۔“

”اور فخر الدین صاحب آپ بھی۔“

”جی سر۔“ فخر الدین نے جواب دیا۔

”کیا اس سے تھوڑا بہت اتفاق کرتے ہیں آپ۔“

”مکمل سر۔“ فخر الدین نے جواب دیا۔

”تو سنئے اس نیک دل انسان نے ان واقعات کا پورے کیس میں کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو امیر علی شاہ کیس کے اس پورشن میں آپ کو بھی عدالت میں آنا پڑتا۔ وہ اعلیٰ ظرف انسان ہے اور اس اعلیٰ ظرف انسان نے اپنی رپورٹ میں ایسی کوئی بات نہیں لکھی، آپ پورا فائل پڑھ سکتے ہیں۔“ ایس پی تنویر جاہ اور ڈی ایس پی فخر الدین نے حیرت سے ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور دونوں ہی کے دل میں انسپکٹر شہاب ثاقب کے لئے عزت و احترام کا ایک مقام پیدا ہو گیا۔ تنویر جاہ نے کہا۔

”اگر آپ میرے اس اعتراف کو قابل معافی سمجھتے ہیں تو میں آپ سے صرف ایک وعدہ کرتا ہوں کہ اس وقت تک ملازمت ضرور کروں گا جب تک میری یہ ملازمت سرکاری طور پر ختم نہیں کی جاتی۔“

بالکل درست تھی آپ خود تصور فرمائیے کہ کیا ہو سکتا تھا، اس وقت چنانچہ میں نے ان اقدامات کئے۔“

”تفصیل ان اقدامات کی تفصیل۔“ نادر حیات صاحب نے کہا۔

”سر، میں نے امیر علی شاہ صاحب کو لاک اپ سے آزاد کرایا..... ایف آئی فائل اپنی تحویل میں لے لی اور انسپکٹر شہاب کو حکم دیا کہ اس کیس کے لئے وہ کچھ بھی نہ کرے اور خاموشی اختیار کرے۔ وہ بے چارہ خاموش ہو گیا۔“

”ہوں لکھ کر دیجئے مجھے یہ سب کچھ۔“ ڈی آئی جی صاحب نے کہا اور اپنی ہی پریذ اور قلم نکال کر ایس پی تنویر جاہ صاحب کو دے دیا۔ تنویر جاہ بھی اکھڑ دماغ آدی تو ساری تفصیل لکھ کر اس نے ڈی آئی جی صاحب کو دے دی اور ڈی آئی جی صاحب اس تقریر کو پڑھنے لگے، پھر انہوں نے تنویر جاہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”آپ کو علم ہے..... تنویر جاہ صاحب کہ اس اعتراف کے نتیجے میں آپ کے ماتو سلوک ہو گا۔“

”سر مجھے معطل کیا جائے گا، ہو سکتا ہے میری سروس بھی ختم کر دی جائے..... ہے مجھے استعفیٰ دینے کا حکم دیا جائے۔ میں ان تمام چیزوں کے لئے تیار ہوں..... پر آپ ایک عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب تک محکمہ پولیس کو دیانتداری سے اٹھانے کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، کرپشن ختم نہیں ہو سکتا۔ ہم اگر کسی معمولی سے اس کی غلطی پر چالان بھی کرتے ہیں تو وہ اپنے تعلقات بتاتا ہے اور یہ تعلقات ظاہر ہوتے ہیں کہ اگر ہمیں ادھر سے احکامات ملیں تو ہماری کیا مجال کہ ہم انہیں مسترد کر دے ہر ایک کو جینا ہوتا ہے سر۔ ہم بھی جیننا چاہتے ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اصولی طور پر پولیس کو اور ان افسران کو رضا کارانہ طور پر اپنے استعفیٰ پیش کر دینے چاہئیں جو صاحب اور صاحب ضمیر ہیں دوسروں کی برائی اپنے آپ پر مسلط کر کے انہیں محکمہ پولیس طرح بدنام کرنا پڑتا ہے سر یہ زندگی اور ذہن پر ایک ضرب کاری ہے کچھ لوگ ان برداشت کر کے ماحول کے مطابق ڈھل جاتے ہیں اور کچھ اپنے آپ میں کٹھن رہتے ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ یہ ملازمت کی ہی نہ جائے۔“

”تنویر جاہ صاحب انسان فطری طور پر برا نہیں ہوتا۔ اچھائیاں اس کے دل

”دیری گڈ۔ ٹھیک ہے میں نے آپ کو جس کام کے لئے بلایا تھا وہ مختلف کام ہے۔“
آئی جی صاحب ان دونوں کو طلبی کا مقصد بتانے لگے جو ایک بالکل ہی الگ معاملہ تھا۔ بہر حال
یہ لوگ دل میں شہاب ثاقب کے لئے عزت اور محبت کا ایک مقام لے کر اٹھے تھے۔ ڈی جی
جی صاحب کی کاوشیں رنگ لائیں اور انہوں نے خصوصی رپورٹ کے تحت اپنے اختیار
سے کام لے کر شہاب کے لئے ترقی کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔ شہاب ثاقب کو نہایت
احترام کا درجہ دیتے ہوئے ڈی ایس پی کا عہدہ دے دیا گیا تھا اور اس کی اطلاع شہاب کو اس
ملی جب اس کی بہن کی شادی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی اور دوسرے دن اسے اس شادی کا قہر
انتظام کرنا تھا۔ دوسرا دن بارات کا تھا۔ شہاب کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ حکم نامہ ملے
بعد وہ ڈی آئی جی نادر حیات کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ڈی آئی جی نادر حیات نے اسے
مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

”شہاب۔ اصل میں ہم لوگ یوں سمجھ لو کہ آندھی کے آم سمیٹنے نکلے ہیں جو دن
بھی ہمیں مل جاتا ہے ہم اس سے فائدہ اٹھا کر کیوں نہ ایسے کام کر لیں جن سے محکمہ پولیس کی
نیک نامی ہو اور جس حد تک بھی ممکن ہو سکے اس کی پیشانی کے داغ مٹائیں ہمارا اپنا ضمیر
زندہ رہے گا۔ بعد میں اگر ہمارے خلاف کوئی کارروائی ہو جاتی ہے تو ہمیں یہ تو خوشی ہوگی۔“

”سراپ میرے لئے عظمت کا مینار ہیں۔ آپ کے سہارے میں بہت کام کرنا پڑا
ہوں۔“

”اس لئے میں نے کچھ اور بھی تجویز کیا ہے۔ بہت عرصے سے ایک کیس معطل
تھا اس میں۔ میں نے ایک اسپیشل سکوڈ کی درخواست کی تھی۔ محکمہ داخلہ نے اس درخواست
کی منظوری دے دی تھی کیونکہ اسپیشل سکوڈ کے سلسلے میں، میں نے جو تجاویز پیش کی تھیں
دیانتدار ہاتھوں میں گئیں اور ان تجاویز کو سراہتے ہوئے انہیں منظور کر لیا گیا۔ یہ اسپیشل
سکوڈ ہر طرح کے جرائم میں مداخلت کرے گا اور اس کی کارروائیاں نہایت خفیہ ہوں گی
اس کی براہ راست رپورٹ مجھے حاصل ہوگی اور اس کے لئے کچھ افراد میں نے منتخب کر
لیے ہیں۔ کچھ کا انتخاب باقی رہ گیا ہے۔ اس کے افراد ہر طرح کے چھوٹے اور بڑے جرائم
تفتیش کریں گے اور ان کی صحیح صورت حال کا تجزیہ کر کے ان جرائم کو کنٹرول کریں گے۔“

”کچھ ایسے لوگوں کا تعاون حاصل ہے جن کا تعلق جر نلزم سے بھی ہے۔ پولیس رپورٹنگ
نے بھی اور بھی وہ بہت کچھ کرتے ہیں۔ میں نے انہیں ہدایت کی تھی کہ ان خبروں کو جمع
کرنا جن میں معاشرتی، اخلاقی اور قانونی جرائم ہوئے ہیں اور مسخرے پن سے ان کا خاتمہ
کر دیا گیا ہے۔ کہیں کسی انداز میں اور کہیں کسی انداز میں وہ لوگ یہ رپورٹیں جمع کر رہے ہیں
اور ایسے واقعات جو انتہائی گھناؤنے جرائم پر مبنی ہیں۔ ہوئے تو ہیں لیکن ان کی صحیح تفصیل
ماننے نہیں آسکی اور وہ نامکمل ہی ختم کر دیئے گئے ہیں۔ ہم ان میں سے کسی ایک کیس کا
انتخاب کریں گے اور اس کے اصل محرکات معلوم کر کے یہ دیکھیں گے کہ صحیح مجرم گرفتار
ہوئے یا اس سلسلے میں کس انداز میں کام ہوا۔ انسپکٹر شہاب ثاقب میں نے اس سلسلے میں آپ کو
اس اسپیشل سکوڈ کا چیف مقرر کیا ہے اور ڈی ایس پی کا عہدہ دیتے ہوئے یہ ذمہ داری میں آپ
کے سپرد کر رہا ہوں۔ اس کی آفیشل کارروائی آہستہ آہستہ ہو جائے گی، آپ کو اس سلسلے میں
مکمل ذمہ داری سونپ دی جائے گی۔ میں ذاتی طور پر آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں۔“

”سر، میں اس کے لئے شکر گزاری کے جذبات کا صحیح انداز میں اظہار نہیں کر سکتا۔
ہاں میں یہ اظہار عملی طور پر ضرور کروں گا اور آپ کو اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر کے
دکھاؤں گا۔“

”مجھے یقین ہے میرے دوست۔ بالکل یقین ہے۔“ شہاب کو یہ خوشخبری سب سے
پہلے فتح محمد کو دینی تھی۔ فتح محمد نے یہ تفصیلات سن کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور چند لمحات
خاموش رہنے کے بعد آہستہ سے بولا تھا۔

”قدرت ہر اس شخص کو اس کا مقام دیتی ہے جو اس مقام کا اہل ہوتا ہے۔ میری طرف
سے دل مبارک باد قبول کرو۔“ اس کے بعد شہاب نے اپنے گھر میں آکر اپنے عہدے کے
”بھ جانے کی اطلاع دی تھی اور اسے بے شمار دعائیں ملی تھیں۔ عصمہ اور عطی بھی خوش
نصیب۔ فائق اور واثق بھی خوش تھے۔ بہر حال شادی کا جو انتظام ہوا تھا وہ پڑوسیوں کے لئے
”اجیران کن تھا۔ یہ گھر ہمیشہ ہی کسمپرسی کا شکار رہا تھا اور گھروالوں کے کانوں میں پڑوسیوں
کے فقرے گونجتے رہتے تھے، جن میں کہا جاتا تھا کہ اب تو سیاں کو تو ال ہو گئے ہیں۔ گھر کے
لوگ ان فقروں پر چراغ پا ہو جاتے تھے لیکن شہاب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی پھیلی رہتی
تھی۔ بہر حال بہن کی شادی اس دھوم دھام سے ہوئی کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے اور بہن

وہ اس سے پوری طرح اتفاق کرتے تھے۔ شہنشاہ کا عمل یہ تھا کہ ان اژدہوں کو بلوں سے نکال کر باراجائے جو قانون کو اپنی مٹھی میں اٹھلونا جھٹتے ہیں اور اس کے لئے اگر انہیں قانون سے ہٹنا بھی پڑے تو بحالت مجبوری ایسا کیا جائے۔ بہر حال انتہائی مشکل حالات میں انہوں نے اپنے آپ کو قائم رکھا تھا اور اب یوں لگتا تھا جیسے تقدیر کے ستارے گردش سے نکل آئے ہوں اور اب اچھا وقت آگیا ہو۔ مالی طور پر اب وہ اس قدر آسودہ ہو چکے تھے کہ کبھی کبھی انہیں خود بھی یقین نہیں آتا تھا۔ شہنشاہ نے انہیں بہت کچھ دیا تھا اور ان کے مشکل حالات دور ہو گئے تھے۔ پھر شہنشاہ نے ان سے یہ بھی سوال کیا تھا کہ اب ان حالات میں اگر وہ چاہیں تو اپنا طرز زندگی بدل سکتے ہیں لیکن ان سب کا مشترکہ جواب تھا کہ جو سیٹ اپ انہوں نے بنایا ہے اس میں انہیں بڑی آسانیاں حاصل ہیں اور وہ ایسے ہی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ شہنشاہ خود بھی اس بات سے متفق تھا چنانچہ اب سب کا طرز زندگی بدل چکا تھا لیکن اپنے طور پر انہیں وہی جگہ سب سے زیادہ موزوں نظر آتی تھی جہاں سے انہوں نے اپنے اس عمل کا آغاز کیا تھا۔ یہ وہ ذہین ترین نوجوان تھے جو اپنی صلاحیتوں کا بدل نہیں پاسکتے تھے اور اب انہیں اس دنیا سے انتقام لینے کا بہترین موقع حاصل ہوا تھا جس نے انہیں پستیتوں میں دھکیلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شہنشاہ ان کے لئے ایک اعلیٰ مثال تھی اور وہ اپنے اس پراسرار لباس کے ایک ایک نعل پر اپنی جان بچھا کر رکھنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ آج انہیں ہدایت ملی تھی کہ ایک نیا ممبر ان کے درمیان شامل ہو رہا ہے اور مقررہ وقت پر وہ ان لوگوں سے ملاقات کرے گا۔ تمام ممبر بند کو ان پر موجود رہیں اور اس نئے ممبر کا انتظار کریں، چنانچہ وہ لوگ اس ممبر کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ سردار علی نے کہا۔

”یقینی طور پر ہمارا ساتواں ساتھی بھی ایسی ہی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہو گا کہ شہنشاہ نے اسے ڈبل اوگینگ میں شامل کرنے کے بارے میں سوچا۔“

”چلو ٹھیک ہے اب یہ گینگ ڈبل او سیون ہو جائے گا جبکہ اب تک یہ ڈبل او سکس تھا۔“ وہ لوگ نئے ممبر کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور اس کا انتظام کرتے رہے پھر دروازے پر دستک ہوئی تو انجم نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک خوبصورت سی لڑکی کو کھڑے دیکھ کر وہ حیران ہو گیا۔ اس نے حیرانی سے کہا۔

”جی کہئے آپ کو کس سے ملنا ہے؟“

گھر سے رخصت ہو گئی۔ زندگی کے دونوں رخ مکمل تھے لیکن ایک سوال باقی تھا وہ یہ کہ جب کے حالات بہتر ہو گئے ہیں تو شہاب کوئی اعلیٰ رہائش کیوں نہیں اختیار کرتا؟ جواب شہاب نے نعیمہ بیگم پر چھوڑ دیا تھا۔ نعیمہ بیگم نے کہا۔

”میں نہیں جانتی کہ میرے بچوں کا انداز فکر کیا ہے اور میں یہ بھی نہیں کر سکتی کہ میرے بچے اعلیٰ سوسائٹی کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو میں انہیں روکوں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے تو صرف اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ اگر مجھے موقع ملے تو میں زندگی کی آخری سانس اسی زمین پر گزار دوں جس کی ایک ایک اینٹ کو ہم نے اپنے خون کے گارے سے سجایا ہے، اس طرح انسان اپنا مقام نہیں بھولتا جہاں تک اس گھر کا تعلق ہے تو یہ اس قابل ہے اپنے رہنے والوں کو وہ سکون مہیا کر سکے جو ان کی خواہش ہے، ہاں یہ بچے اگر اس میں غلیف محسوس کرتے ہیں تو میں اپنے بچوں سے کبھی منحرف نہیں ہو سکتی۔“ فائق نے کہا۔

”اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں میرا بھائی ثاقب اور میرا چھوٹا بھائی واثق کسی بھی طرح اپنی ماں سے منحرف نہیں ہو سکتے۔ ہماری ماں کی خواہش ہمارے لئے آسمان کا درجہ رکھتی ہے، چنانچہ میں سب کی نمائندگی بخدا ان دونوں سے پوچھتے بغیر کر رہا ہوں کہ ہم یہیں اس گھر میں قیام کریں گے۔ ہمیں واقعی یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔“ ثاقب اور واثق نے گردن خم کر کے کہا۔

”ہماری ماں ہمارے سروں کی تاج ہے اور تاج کی عظمت کو ہم کبھی داغ دار نہیں ہونے دیں گے۔“ لوگوں کی زبانیں بند ہو گئیں اور کسی نے صدق دل سے کچھ کہا ہو یا نہ کہا لیکن صدق دل سے سوچا ضرور تھا کہ بہر طور یہ لوگ کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتے جہاں بزرگوں کا یہ مقام ہو، وہاں زوال کی گنجائش نہیں ہوتی۔



ڈبل اوگینگ ہر طرح سے مطمئن اور مسرور تھا۔ یہ ایک بہت بڑی سچائی ہے کہ ان ذہین نوجوانوں نے بے کسی اور کسمپرسی کی زندگی گزار کر یہ مقام حاصل کیا تھا۔ ابتدائے جن بدترین حالات کا شکار رہے تھے، ان میں اپنے آپ کو کسی ایک نظریے پر قائم رکھنا نہیں تھا، لیکن انہوں نے ثابت قدمی سے شہنشاہ کا ساتھ دیا تھا اور اتنے مشکل حالات میں وقت گزارا تھا کہ کوئی اور ہوتا تو بدل ہو جاتا لیکن انہیں شہنشاہ کے نظریات سے عشق تھا۔

ن کر دیا۔ وہ سب اس جانب متوجہ ہو گئے۔ شہنشاہ کی آواز ابھری۔
”جہاں تک میرا اندازہ ہے ہماری نئی ساتھی مس بینا واسطی آپ لوگوں کے درمیان
پہنچ گئی ہوں گی۔“

”جی سر، محترمہ بینا ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہم ایک دوسرے سے اپنا تعارف
رہ چکے ہیں۔“

”وہ کہانی میں بار بار دہرانا نہیں چاہتا جو آپ میں سے ہر ایک کو معلوم ہے۔ مختصر الفاظ
میں اپنی نئی ساتھی مس بینا کو میں اپنے موقف سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ بات ان چھوٹے
مٹے جراثیم پیشہ لوگوں کی نہیں ہے جو جرم کرتے ہیں اور اپنے محدود وسائل کی بنا پر قانون
کے شکنجے میں آجاتے ہیں۔ اگر صحیح معنوں میں کوئی مجرم ہے، چاہے اس نے کسی پائے کا جرم
کیا ہو۔ وہ قابل سزا ہوتا ہے۔ قانون بعض اوقات صحیح لوگوں کو اور کبھی کبھی غلط فہمی کی بنیاد پر
غلط لوگوں کو سزا دے دیتا ہے۔ ہم بہر حال غلط اور صحیح کا تجربہ کرتے ہیں لیکن ہمارا اصل
ہرگت وہ بڑی پھیلیاں ہیں جو قانون کو نکل جاتی ہیں اور ہماری مہم انہی کے خلاف ہے۔ وہ
لوگ جو ناجائز ذرائع سے دولت کے انبار لگا رہے ہیں ان کی دولت کا تھوڑا سا حصہ ہمارے
مصرف میں آجائے تو میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کیونکہ یہی ہمارے مقصد کو آگے
بڑھانے میں معاون ہو سکتا ہے۔ بہر حال میں اس گروہ کے سات افراد کے مکمل ہو جانے پر
آپ لوگوں کو مبارک باد دیتا ہوں۔ مس بینا واسطی نے یقیناً اپنا تعارف کرادیا ہو گا۔ یہ پیشے
کے لحاظ سے وکیل ہیں اور آپ لوگوں کا بھی مطالبہ تھا کہ تمام تر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق
رکھنے والے لوگ یکجا ہو گئے ہیں۔ ایک وکیل کی اشد ضرورت ہے چنانچہ مس بینا ایک ماہر
وکیل کی بیٹی ہیں۔ وہ قانونی نکات کے سلسلے میں بھی آپ کی پوری پوری مدد کریں گی۔ بس اتنا
ن کہنا چاہتا تھا میں۔“ اور اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ بہر حال ڈبل اوگینگ نے اپنی نئی
ساتھی کو خوشی سے خوش آمدید کہا تھا اور اس سے متعلق تمام کوائف حاصل کر لئے گئے تھے۔



”مجھے چھ آدمیوں سے ملنا ہے۔ آپ براہ کرم کیا مجھے بقیہ پانچ افراد سے ملا سکتے ہیں۔
یہ کوڈورڈ تھا جس کی اطلاع ان لوگوں کو دے دی گئی تھی۔ انجم نے حیرت سے مسکراتے
ہوئے نوجوان لڑکی کو اندر آنے کی دعوت دی اور دروازہ بند ہو گیا۔ لڑکی نے دو قدم اُڑے
بڑھ کر حیران نگاہوں سے اس پورے ماحول کو دیکھا اور پھر ہونٹ سکڑ کر بولی۔
”ویری گڈ، ویری گڈ، ایسا ہونا چاہئے تھا۔“ یہ الفاظ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکے تھے
لیکن لڑکی نے اس کے بعد ان الفاظ کی کوئی وضاحت نہیں کی تھی اور انجم سے کہا تھا۔
”تو پھر فرمائیے مجھے کس طرف چلنا ہے؟“
”آئیے۔“ باقی پانچ افراد بھی اس حسین ساتھی کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ وہ اندر پہنچ
کر بولی۔

”واقعی شہنشاہ کے عجیب ہونے میں مجھے پہلے بھی شبہ نہیں تھا لیکن اب یہ کارخانہ
حیات دیکھ کر مجھے اور حیرت ہوئی ہے آپ میں سے یقیناً ایک کا نام سردار علی ہو گا۔ دوسرے
شوکت صاحب، تیسرے فراز، و تھے سالک، پانچویں انجم شیخ اور چھٹے فراست علی۔ میں یہ
نہیں جانتی کہ مجھے ریسیو کرنے والے صاحب کا نام کیا ہے، ویسے اس سے پہلے میں آپ کو اپنا
نام بتا دوں۔ میرا نام بینا واسطی ہے اور میں وکالت بھی کرتی ہوں۔ میرے والد واسطی
صاحب، عدنان واسطی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور مجھے کچھ اہم وجوہ کی بنا پر ڈبل اوگینگ
میں شامل کیا گیا ہے۔ کیا آپ اپنا تعارف کرنا پسند کریں گے؟“

سردار علی نے تعارف سے آغاز کیا تھا اور اس کے بعد بت فراست علی تک پہنچی تھی۔
ان سب کے بعد بت فراست علی تک پہنچی تھی۔ ان سب نے پر مسرت انداز میں اپنے سے
ساتھی کو خوش آمدید کہا تھا۔ فراز کہنے لگا۔

”اور ہمیں نہیں بتایا گیا کہ ہماری ساتویں ساتھی ایک خاتون ہیں، لیکن بہر حال
آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ براہ کرم تشریف رکھئے آپ کے اعزاز میں چائے کا بندوبست
کیا گیا ہے۔“

بینا مسکراتی ہوئی بیٹھ سی۔ چائے کے دوران ان لوگوں نے اپنے اپنے بارے میں مختصر
تفصیلات بتائیں۔ وہ ٹرانسمیٹر کچھ فاصلے پر رکھا ہوا تھا، جس پر شہنشاہ ان سے رابطہ قائم کر
تھا۔ چنانچہ چائے کا دور چل ہی رہا تھا کہ ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا اور فراز نے ٹرانسمیٹر

تو یہ زندگی تو مختصر ہے روز قیامت نجانے کس کس کا ہاتھ اور تمہارا گریبان ہوگا۔ اپنے بن کون سے قصور کی معافی طلب کرو گے روز محشر، اس لئے بہتر یہ ہے کہ کسی غریب کو نیکی نہ ستانا۔ اگر تم کسی کے بچوں کا پیٹ کاٹ کر تھوڑی بہت رقم حاصل کر لیتے ہو تو یقیناً وہ اس سے تمہارے بچوں کا پیٹ کبھی نہیں بھرے گا۔ وہ رقم کب اور کس طرح نکل جائے گی؟ تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہوگا۔ ہاں پریشانیاں تمہارا مقدر بن جائیں گی۔ اس لئے میری رائے ہے کل زمان کہ کبھی کسی غریب آدمی کو نہ ستانا اور پھر یہ بھی خیال رکھنا کہ جرم کو قبول کرانے کے لئے جو کچھ کیا جاتا ہے اس میں انسانیت کا پہلو ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ بعض وقت ایسے لوگ آجاتے ہیں جو ذہنی طور پر تشدد پر مجبور کر دیتے ہیں، لیکن پھر بھی یہ خیال رکھنا کہ سزا دینے والی ذات، ذات باری کی ہے۔ تم صرف اپنا فرض پورا کرو۔“ گل زمان دن جھکا کر خاموش ہو گیا تھا پھر نیا انچارج آگیا اور شہاب اسے چارج دینے لگا۔

یہ ساری کارروائی مکمل ہو گئی۔ اس کے بعد آٹھ دن تک شہاب کو آرام کرنا تھا۔ نادر بات صاحب کی طرف سے یہی ہدایت ملی تھی۔ ان آٹھ دنوں میں سے سات دن شہاب نے اپنے اہل خاندان کے ہمراہ گزارے۔ بہن اور بہنوئی کی دعوتیں کیں۔ گھر کے ماحول کو بے حد خوشگوار کیفیت حاصل ہو گئی تھی۔ فائق اور واثق وغیرہ شہاب کے سلسلے میں دہریہ بننے کے شکار تھے۔ انہیں یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ شہاب بے پناہ دولت کا مالک بن چکا ہے اور رائج بھی وہ جانتے تھے لیکن بہر حال غیر متفق نہیں تھے جو ہر ہاتھ وہ وقت کی مانگ تھی اور شہاب نے شروع ہی سے اس مانگ کو قائم رکھا تھا۔ آٹھویں دن شہاب بیٹا واسطی کے پاس گیا۔ عدنان واسطی کو صورت حال سے لاعلم نہیں رکھا گیا تھا۔ شہاب کو جو عہدہ دیا گیا تھا اس کی اطلاع بھی بیٹا کے ذریعے عدنان واسطی صاحب کو مل چکی تھی۔ انہوں نے شہاب سے ملنا چاہا تھا لیکن بیٹا نے انہیں سمجھا دیا کہ ابھی شہاب اپنی ذہنی تعمیر میں مصروف ہے، نالے بہتر ہے کہ اسے اس کا کام کرنے دیا جائے۔ وہ خود ہی یہاں آکر آپ سے ملاقات کرے گا اور اس وقت جب شہاب اچانک عدنان واسطی کے دفتر پہنچا تو بیٹا واسطی کے ساتھ عدنان واسطی بھی موجود تھے۔ کھڑے ہوتے ہوئے محبت بھرے انداز میں شہاب کو سینے سے لگایا اور کہنے لگے۔

”یہ جرات تم ہی نے مجھے دلائی ہے شہاب یہاں کہ اتنے بڑے آدمی سے اتنی بے

گل زمان اور تھانہ بارہ پوری کے تمام ارکان حیران رہ گئے۔ جب شہاب ثاقب نے انہیں بتایا کہ اس کا تبادلہ ہو گیا ہے اور نیا انچارج بہت جلد اپنا چارج لینے والا ہے۔ گل زمان کی تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔

”ارے صاحب مگر ایسا کیسے ہو گیا؟“

”بس ہو گیا گل زمان مجھے اسپیشل برانچ دے دی گئی ہے اور شاید تھوڑا سا عہدہ بھی

بڑھا دیا گیا ہے۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے سر، لیکن آپ یقین کرو آپ کا جانا ہمارے لئے اچھا نہیں ہے۔ ہم تو یہ سوچ رہے تھے کہ آپ کے ساتھ ایک طویل سا تھ رہے گا صاحب۔“ گل زمان کی آواز بھرا گئی۔ شہاب مسکرا کر بولا۔

”تھانوں میں تو یہ ہوتا ہی رہا ہے گل زمان اور پھر ایک بات میں جانتا ہوں کہ میرے آنے کے بعد تم سب کے لئے کچھ مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔ تم جس انداز میں کام کرنے کے عادی تھے۔ میں نے وہ سب کچھ بند کر دیا تھا۔“

”صاحب قسم لے لیجئے شروع شروع میں ایسا بے شک ہوا تھا اور ہم پریشان ہو گئے تھے لیکن آپ نے جو کچھ کیا وہ تو ایک الگ بات تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ اب تو ہمارا مزاج ہی بدل گیا ہے۔ کسی چھوٹے موٹے آدمی سے سوچ پاس لینے کو کبھی دل ہی نہیں چاہتا جبکہ کبھی کبھی ایسے موقع حاصل ہو جاتے ہیں۔ آپ نے ہمارے پیٹ بھر دیئے تھے صاحب۔“

”بہر حال گل زمان جانا تو ہے مجھے لیکن ایک نصیحت کر رہا ہوں مان لو تو تمہاری مرضی ہے۔ اول تو یہ کہ تم بھی انسان ہو۔ انسان کی اولاد ہو۔ انسانیت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا

وہاں سے اٹھ گیا..... مینا سے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ بہر طور اس کے بعد اس نے اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ہی اس کے لئے ایک شاندار آفس بنایا گیا تھا۔ نادر حیات صاحب نے اس سلسلے میں تمام کارروائیاں مکمل کر لی تھیں۔ فی الحال شہاب کے سپرد چار افراد کئے گئے تھے جن کے بارے میں نادر حیات صاحب نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ یہ لوگ براہ راست محکمہ پولیس کے آدمی نہیں تھے بلکہ پرائیویٹ سیکٹر میں کام کیا کرتے تھے لیکن ان کے عہدے باقاعدہ محکمہ پولیس میں موجود تھے اور خفیہ ڈیپارٹمنٹ میں اس طرح کی کارروائیاں ہوتی ہیں۔ شہاب نے ان چاروں سے ملاقات کی اور ان کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ چاروں ہی مخلص اور کام کے لوگ تھے اور سچی بات یہ ہے کہ نادر حیات صاحب کی اصل شخصیت اب شہاب پر واضح ہوئی تھی۔ نادر حیات صاحب نے شہاب کو ایک رات اپنے گھر طلب کر لیا اور شہاب ولولے کے مطابق وہاں پہنچ گیا۔ نادر حیات صاحب نے بڑے پرتاک انداز میں اس کا خیر مقدم کیا تھا۔

کھانے وغیرہ کا پروگرام تھا۔ نادر حیات صاحب نے اپنے اہل خانہ سے بھی شہاب کی ملاقات کرائی۔ اچھے صاف ستھرے لوگ تھے پھر اس کے بعد وہ اسے لے کر اپنے کمرہ خاص میں پہنچ گئے۔ شہاب کو اپنے سامنے بٹھا کر نادر حیات صاحب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہت عرصے سے مجھے ایسے افراد کی تلاش تھی جو میرے ہمنوا ہوں۔ میرا اپنا بھی ایک ماضی ہے۔ یوں سمجھ لو شہاب کبھی کسی وقت میں تمہیں اپنے ماضی کے بارے میں بتا دوں گا، لیکن محکمہ پولیس میں میری آمد بلکہ اگر اس سے تھوڑا سا پیچھے چلا جاؤں تو یوں سمجھ لو کہ اس بارے میں میرا سوچنا ایک خاص نکتہ نگاہ سے تھا۔ میں نے قانون کی بے حرمتی ہوتے دیکھی ہے۔ یہ وطن ہمارے سروں کا سائبان ہے اور اس کے نیچے ہم محفوظ ہیں۔ اگر اس کی پیشانی پر ایسے بد نما داغ لگا دیے جائیں جو دور دور تک نظر آئیں تو ہماری آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں اور ایسا ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ دولت، اقتدار بے شک اللہ کی دین ہے لیکن اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے کسی بھی طور قابل معافی نہیں ہیں۔ بس یہی ایک نظریہ مجھے جدوجہد پر آمادہ کرتا رہا اور طویل ترین جدوجہد کر کے میں ایک معمولی انسان کی حیثیت ترک کر کے یہاں تک پہنچا ہوں اور اس کے لئے مجھے جو سفر کرنا پڑا ہے شہاب وہ اپنی جگہ ایک طویل کہانی لکھتا ہے لیکن اب خدا کا فضل ہے کہ میں اس مقام پر ہوں کہ اپنی مرضی کے مطابق بہت کچھ

تکلفی سے گلے مل رہا ہوں۔“

شہاب مسکرا کر بولا۔ ”اور میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ ایک اتنی بڑی شخصیت سے گلے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے جس کے سینے میں قانون بند ہے اور انسانیت کی راہوں پر سفر کر کے اپنی ساری زندگی گزار گیا ہے۔“ عدنان واسطی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بس یوں سمجھ لو میاں کہ سوکھے ہوئے پھول کی اصل قیمت سے واقف شخص ہی اس کی قدر کر سکتا ہے۔ میں تمہیں تمہارے نئے عہدے کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ بیٹھو۔“ شہاب بیٹھ گیا۔ عدنان واسطی نے کہا۔

”مینا نے مجھے تقریباً تمام ہی تفصیل بتادی ہے اسے تم نے جو عزت اور جو اعزاز بخشا ہے وہ میرے لئے بھی باعث اعزاز ہے۔ شہاب میاں تم نے سوچ لیا ہے کہ مینا کو اپنے عہدے کے ساتھ ساتھ یہ اعزاز جو تم نے دیا ہے وہ اس کی اہل ثابت ہوگی۔“

شہاب نے مینا سے کہہ دیا تھا کہ وہ بس عدنان واسطی صاحب کو اتنا بتا دے کہ شہاب کیا عہدہ ہو گیا ہے اور ڈی آئی جی نادر حیات صاحب نے اسے کیا ذمے داریاں سونپی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی شہاب نے کہا تھا کہ وہ عدنان واسطی صاحب کو یہ بھی بتا دے کہ شہاب نے اسے اپنے ان ماتحتوں میں شامل کر لیا ہے جو اس کے ساتھ خفیہ طور پر کارروائیاں کر رہے گے اور اس کے لئے شہاب نے مینا کو ایک معقول مشاہرے کی پیش کش کی ہے۔ مینا نے باتیں مینا نے اپنے والد سے کہہ دی تھیں۔ باقی ڈبل اوگینگ وغیرہ کا کوئی حوالہ انہیں نہیں گیا تھا کہ یہ شہاب کا ذاتی راز تھا جسے نبھانے کیوں اس نے مینا کے سینے میں اتار دیا تھا۔ شہاب نے کہا۔

”جی واسطی صاحب۔ مس مینا موجودہ زمانے کو سمجھ کر اس کے مطابق عمل کرنے، مہارت رکھتی ہیں اور میں نے بلاوجہ ہی ان کا انتخاب نہیں کیا۔ باقی آپ کو مطمئن کرنے کے لئے میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ ان کی عزت و ناموس اور آپ کے وقار و عظمت کا خیال میری ذمے داری ہے۔ آپ اس کے لئے کبھی متردد نہ ہوں۔“

”بالکل متردد نہیں ہوں کیونکہ مجھے تم پر بھی اعتماد ہے اور مینا پر بھی۔“ شہاب کافی دیر تک عدنان واسطی سے گفتگو کرتا رہا اور انہیں مطمئن پانے کے

مسلہ۔ امیر علی شاہ اپنی حیثیت کی بنیاد پر جو کچھ کرتا رہتا ہے وہی سب کچھ یہاں بھی ہے۔ رائے علی ساندہ اس بستی کا سربراہ ہے اس کے تین بیٹے تھے۔ نور علی ساندہ، پیار علی ساندہ ازندہ جن۔ شہزاد مرچکا ہے، بہر حال اب ان کے بارے میں ساری تفصیلات میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ پیڑا اور پین لے لو اور ان پر تفصیلات کو نوٹ کرو۔“

نادر حیات صاحب نے ایک پیڑا اور قلم شہاب ثاقب کو دے دیا۔ شہاب نے یہ دونوں چیزیں لے لیں اور پوائنٹس نوٹ کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

”جیسا کہ میں نے تم سے کہا آٹھ مہینے پہلے کی بات ہے ہو سکتا ہے اس وقت کے اخبارات تمہارے علم میں ہوں یا یہ نام تمہاری نگاہوں سے گزرا ہو۔ خیر یہ ایک الگ بات ہے تو صورت حال یہ ہوئی کہ بستی نور الہی سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک اور بستی مہر جان ہے۔ بستی مہر جان میں یوں تو ایسے کئی رئیس موجود ہیں جو زمیندار بھی ہیں اور بستی کے آس پاس کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے باغات بھی لگائے ہوئے ہیں۔ میں جس شخص کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں اس کا نام خادم شاہ تھا۔ خادم شاہ اور بدر شاہ۔ بدر شاہ، خادم شاہ کا بیٹا تھا، اگلو تا بیٹا باقی اس کی اور فیملی تھی۔ وہاں چھوٹی سی حویلی بنائی ہوئی تھی۔ انہوں نے کچھ کارخانے وغیرہ بھی لگائے ہوئے تھے۔ میں نہیں کہتا کہ خادم شاہ کی اپنی کیفیت کیا تھی کیونکہ اس قسم کے جتنے بھی شاہ ہوتے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر شاہ ہی بن جاتے ہیں۔ خادم شاہ کی ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام شہناز تھا۔ وہ بیٹی کسی حادثے میں مر گئی۔ تفصیلات زیادہ معلوم نہیں ہو سکیں، لیکن مسئلہ کچھ ایسا ہی تھا پھر یوں ہوا کہ خادم شاہ کی حویلی میں آگ لگ گئی اور بعد میں ان کی جلی ہوئی لاشیں حویلی سے برآمد ہوئیں۔ بستی مہر جان کے لوگوں کا کہنا ہے کہ حویلی سے چھین بلند ہوتی رہیں لیکن کسی نے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ ایسے افراد حویلی کے ارد گرد بھاری اسلحہ سے لیس گردش کرتے رہے جن کے چہرے نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور انہوں نے چیخ چیخ کر کہا تھا کہ بستی مہر جان کا کوئی بھی آدمی اگر حویلی کی جانب آنے کی کوشش کرے گا تو اسے گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ ان لوگوں نے فائرنگ بھی کی تھی لیکن چونکہ بستی کے لوگ خادم شاہ کی حویلی کی جانب نہیں گئے تھے اس لئے ان میں سے کوئی ہلاک نہیں ہوا۔ البتہ حویلی میں سے سولہ خاکستر لاشیں برآمد ہوئی تھیں جن میں خادم شاہ، بدر شاہ اس کی بیوی وغیرہ کی لاشیں بھی تھیں۔ یہ سارا مسئلہ ہوا۔

کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے لئے وسائل اکٹھے کئے ہیں۔ میں نہیں کہتا شہاب جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہ وسائل ہمیشہ قائم رہیں گے، لیکن جب تک یہ ہماری بستی میں ہیں ہم اپنے طور پر جو کچھ بھی کر سکتے ہیں ہمیں ضرور کرنا چاہئے۔ بہت بڑے لوگ بڑے اوقات ایسے جرائم کر ڈالتے ہیں جو پورے معاشرے کو داغدار کر دیتے ہیں۔ میں ان کے خلاف کمر بستہ ہوں۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ چھوٹے جرم کرنے والوں کو معاف کر دیا جائے یا ان پر توجہ ہی نہیں دی جائے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ جہاں جرم ہو وہاں اس کی سرکوبی بھی ہو اور یہی میرا نکتہ نظر ہے۔ شاید میں نے اپنے مقصد کے اظہار کے لئے خاصے الفاظ ضائع کر دیئے۔ اب میں مطلب کی بات پر آتا ہوں جیسا کہ میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ پھر کبھی جب بھی موقع ملے گا میں تمہیں اپنے ماضی کے بارے میں بتاؤں گا لیکن کچھ ایسی کہانیاں میرے علم میں ہیں جو بہر طور دردناک ہیں اور ان کا کوئی سدباب نہیں ہو سکا۔“

”جی سر۔“

”یہ ڈیپارٹمنٹ جو میں نے تمہاری سربراہی میں بنایا ہے میری بہت سی آرزوؤں کا مرکز ہے اور تمہیں اس کے لئے میں نے کافی غور کر کے منتخب کیا ہے کیونکہ تمہارے بچے میں مجھے وہ دل نظر آیا ہے جو درد مند ہے اور وطن کی محبت سے سرشار بھی۔ خیر پھر بات وہیں آگئی اصل میں ہم ایسے کمیز کوری اوپن کرنا چاہتے ہیں جو بظاہر ختم ہو گئے ہیں لیکن اصل حیثیت سے نہیں۔ ان میں اقتدار والوں کی اپنی حیثیت خارج ہوئی ہے اور انہوں نے ان کمیز کو اپنی مرضی کے مطابق ختم کر لیا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا میری بات؟“

”جی سر۔“

”تو پھر میں سب سے پہلے جس واقعہ کی نشاندہی کرتا ہوں ہو سکتا ہے تم بھی اس سے آگاہ ہو۔ کوئی آٹھ مہینے پہلے کی بات ہے ایک بستی نور الہی کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ نور الہی اچھا خاصا علاقہ ہے بلکہ تم اسے قصبہ بھی کہہ سکتے ہو آبادی بھی کافی ہے اور اسی تناسب سے وہاں کی صورت حال ہے بستی نور الہی کے سب سے بڑے جاگیردار ساندے کہلاتے ہیں۔ ساندے فیملی زیادہ بڑی نہیں ہے لیکن بستی نور الہی پر اس کا مکمل قبضہ ہے۔ اس کے علاوہ دوسری ساری صورت حال جو ابھی پچھلے کیس میں تمہیں پیش آئی، میرا مطلب ہے امیر شاہ“

”تم ممکن ہے اسے میرا جنون قرار دو لیکن ہر شخص کے اندر کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ میری کمزوری یہی ہے اور میں تمہیں اس کی مختصر وجہ بتا سکتا ہوں۔ یوں سمجھ لو مسٹر شہاب، تمہارا پہلا میسٹ کیس ہے، ہم اپنا کام اسی انداز میں جاری رکھیں گے اور میرے خیال میں تمہاری گنجائش نہیں رہی ہے کہ میں تمہیں اپنا مزید موقف بتا سکوں۔“

”جی سر واقعی اس کی گنجائش نہیں رہی ہے۔“ شہاب نے آہستہ سے کہا۔ پھر بولا۔

”سر یہ چند نام میرے علم میں آئے ہیں لیکن میں کسی ایسی ٹھوس شخصیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں جو اس سلسلے میں میری رہنمائی کرے۔ مزید کچھ سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوئے ہیں ان کی بھی تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہوں۔“

”یقیناً ایسی کسی شخصیت کی نشاندہی کے بغیر میں تمہیں اس کام پر مجبور نہیں کر سکتا اور کیا سوال ہے تمہارے ذہن میں۔“

”سر اگر ہم اس کیس کو آگے لے جاتے ہیں تو کیا اس کیس کا کوئی مدعی ہمیں مل سکتا ہے؟“

”یقیناً اور اس مدعی کی نشاندہی بھی یہی شخص کرے گا جس کا نام میں تمہیں بتا رہا ہوں بس سمجھ لو کہ یہ اس کیس کی مکمل تفصیل تمہارے سامنے پیش کر دے گا۔ نام غلام قادر ہے۔ آٹھ ماہ پہلے انکسپٹر کے عہدے پر فائز تھا، استعفیٰ دیا ہے۔ ملازمت کی مدت پوری ہونے سے پہلے اور اس استعفیٰ کی بنیادی وجہ بھی یہی کیس ہے جس میں اس کے راستے روک دیئے گئے تھے، ویسے بھی مدت ملازمت بہت تھوڑی سی باقی رہ گئی تھی نیک دل اور فرض شناس آدمی ہے۔ ان دنوں پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا کارخانہ لگا رکھا ہے اور اسی میں کام کر کے اپنا گزارا کرتا ہے اس سلسلے میں تمہاری مدد کرنے پر فوراً تیار ہو جائے گا۔ یوں سمجھ لو کہ وہ اس کیس کی مکمل فائل ہے اور یہ کیس اس کی زندگی کا اتنا اہم کیس ہے کہ اس کے لئے اس نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا کیونکہ اس کا ضمیر برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ جس فرض کو وہ سرانجام دے رہا ہے اس میں بددیانتی کا مظاہرہ کرے۔ کیا سمجھے؟“

”سر اس کا مقصد ہے کہ وہ تو کوئی عظیم آدمی ہے۔“

”یقیناً اور ایسے ہی عظیم لوگ بے چارے پسماندگی کی زندگی گزارتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اگر تم صرف اس کے پاس چلے جاؤ تو وہ تمہیں بہت سے رموز سے آگاہ کر دے گا۔ میں

پولیس نے معمول کے مطابق تفتیش کی لیکن یہ نہیں پتا چل سکا کہ خادم شاہ کی حویلی آگ لگانے والے کون تھے، البتہ یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ خادم شاہ اور بدر شاہ کو ہاتھ پائوں باندھ کر ان کے کمروں میں ڈال دیا گیا تھا اور وہ آگ لگنے کے بعد نکل بھاگنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ بستی کے لوگوں نے اس سلسلے میں کوئی بھی نام نہیں لیا لیکن سب سے پہلے لوگوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پولیس بہر حال کچھ نہ کچھ کرنا تھا، چنانچہ کارروائی ہوتی رہی۔ کسی طرح راگ علی ساند کا نام بھی سامنے آیا۔ کچھ دشمنیوں کے واقعات بھی پولیس کے علم میں لائے گئے لیکن ساند پر کچھ ثابت نہیں ہو سکا کیونکہ کچھ ہی دن کے بعد چار آدمی گرفتار ہوئے جن کی نشاندہی باقاعدہ ہو گئی تھی اور یہ ثابت کر دیا گیا تھا کہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے خادم شاہ کی حویلی میں آگ لگائی۔ یہ چاروں مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے اعتراف کر لیا تھا کہ خادم شاہ کی حویلی میں ڈاکہ ڈالنے گئے تھے اور آگ اتفاقیہ طور پر لگ گئی۔ بس یوں سمجھ لو کہ اس سارے مسئلے کو پالش کیا گیا تھا اور کوئی صحیح صورت حال سامنے نہیں آئی تھی اس سلسلے میں ایک شخص نے میری رہنمائی کی۔ تمہیں بھی اس سے ملاؤں گا اس شخص نے مجھے کچھ تفصیلات بتائی تھیں جو میرے ذہن میں موجود تھیں۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ کام بھی کیا لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور اس کے بعد خاموشی ہی اختیار کر لی گئی۔ ان چاروں افراد کو سزائیں ہو گئی ہیں جنہیں ڈاکہ کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا اور کیس ختم ہو گیا ہے لیکن واقعات جہاں تک اشارہ کرتے ہیں اس سلسلے میں راگ علی ساند اور اس کے دونوں بیٹوں کی ملوث نظر آتے ہیں۔ میری ان لوگوں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے لیکن یہ سوچو شہاب، قانون کی کس قدر بے عزتی ہے یہ کہ جس نے جس طرح چاہا قانون کو اپنے حق میں کر کے اپنی مرضی کے مطابق کام کر ڈالا۔ کیا ایک قانون پسند، کیا ایک قانون کی عبادت کرنے والا اس بات کو برداشت کر سکتا ہے؟ اصل میں شہاب زیادہ تفصیلات میں نہیں جاؤں گا بس یوں سمجھ لو کہ اس خفیہ ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ کی حیثیت سے تمہارا پہلا کیس یہی ہو گا۔“

شہاب دلچسپی سے یہ ساری داستان سن رہا تھا۔ وہ نام اس نے نوٹ کر لئے تھے جن کی نشاندہی ڈی آئی جی نادر حیات صاحب نے کی تھی اور اب اس سلسلے میں وہ آگے کے سوالات کرنا چاہتا تھا۔ ڈی آئی جی نادر حیات نے کچھ لمحات توقف کیا پھر مسکرا کر بولے۔

”جی ہاں مجھے اس کا علم تھا بلکہ شاید آپ کو یہ پتا نہ ہو کہ نادر حیات صاحب نے میرا سختی پیش کرنے کے بعد مجھے پیش کش کی تھی کہ میں اگر چاہوں تو ان کے لئے خفیہ طور پر کام کروں لیکن بس دل کچھ اس طرح اچاٹ ہوا تھا کہ اس کے بعد محکمہ پولیس میں نہ رہ سکا۔ اپنے طور پر کچھ کرنے کی ٹھانی اور خدا کا شکر ہے۔ یہ میری چھوٹی سی کاوش میرا اور میرے ہندن کا پیٹ بھرنے میں معاون ہے، دل خوش تو نہیں ہوتا جب اخبارات میں ایسی خبریں پڑھتا ہوں جن میں جرم ہوتے ہیں اور تفتیش ناکام ہو جاتی ہے لیکن پھر سوچتا ہوں کہ زمانہ اسی کا نام ہے اگر سب اچھے ہو جائیں تو بروں کی شناخت کیسے ہو۔ خیر آپ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کروں..... ہاں کچھ چائے وغیرہ۔“

”نہیں غلام قادر صاحب۔ میں جس اہم مقصد کے لئے حاضر ہوا ہوں بس اس کے بارے میں تھوڑی سی معلومات درکار ہیں۔“

”جی فرمائیے۔“

”بات بستی نور الہی، بستی مہر جان، راگ علی ساند اور خادم شاہ کی ہے۔“

”ارے یہ کیس تو ختم ہو چکا ہے۔“

”جی ہاں قانون کے رجسٹروں میں اور عدالت کے فیصلوں میں یہ کیس ختم ہو چکا ہے لیکن ذی آئی جی نادر حیات صاحب کا کہنا ہے کہ آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کیس ختم نہیں ہوا ہے۔“

”اوہ۔“ غلام قادر کے ہونٹ سکڑ گئے پھر وہ بولا۔

”گویا نادر حیات صاحب نے اس وقت کا تعین کر لیا ہے جس کا انہوں نے فیصلہ کیا تھا۔“

”جی ہاں انہوں نے مجھ سے کہ غلام قادر بد دل نہ ہو جو کچھ ہوا ہے قانون کی کتابوں میں بے شک بند ہو گیا ہے، لیکن میری کتاب میں یہ نامکمل چیز درج ہے اور کبھی نہ کبھی اسے منظر عام پر لائیں گے۔ بہر حال خدا انہیں ان کے نیک مقصد میں کامیابی عطا کرے، اس میں میری ذمہ داریاں مجھے بتا دی جائیں۔“

”تمہیں اس کے نام ایک خط لکھ دیتا ہوں جس میں صرف اتنا لکھوں گا میں کہ مسٹر شہاب ثاقب کے ساتھ اس کیس کے سلسلے میں وہ تمام تعاون کرے جو اس کے لئے ممکن ہو سکے۔“

”میرا خیال ہے کافی ہے جناب۔“

”بہت شکریہ شہاب۔ بس یہ سمجھ لو کہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ تمہارا میسر کیس ہے۔ تمہیں اس میں اپنی تمام تر کاوشوں کو بروئے کار لانا ہو گا۔“

”بہت بہتر۔“

”انسپکٹر غلام قادر کا پتا نوٹ کر لو۔“ نادر حیات صاحب نے کہا اور شہاب ثاقب نے پتا نوٹ کر لیا۔ پھر انہوں نے پیدمانگا اور اس پیڈ پر ایک چھوٹا سا رقعہ انسپکٹر غلام قادر کے نام لکھ دیا۔ شہاب نے اس کے بعد اجازت طلب کر لی تھی۔ انسپکٹر غلام قادر کے پلاسٹک کے کارخانے پر پہنچ کر شہاب نے غلام قادر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ چہرے بدن کا ایک تقریباً پینتالیس سالہ شخص جو چہرے ہی سے دیندار اور نیک نظر آتا تھا اس سے لا اور اس نے شہاب کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی میرا نام غلام قادر ہے۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

”غلام قادر صاحب اگر زیادہ مصروفیت نہ ہو تو میں آپ کا تھوڑا سا وقت لینا چاہتا ہوں؟“

”جی جی آئیے تشریف لائیے۔“ غلام قادر اسے اپنے چھوٹے سے آفس میں لے گیا

جہاں ایک میز اور چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ سب کچھ سادہ سادہ تھا۔ شہاب نے اپنا کارڈ نکال کر غلام قادر کو دیا۔ غلام قادر نے کارڈ پڑھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو انتظامیہ سے تعلق ہے آپ کا؟“

”جی ہاں۔“

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر شہاب ثاقب مگر ہم تو گزر رہا ہوا وقت ہیں ہماری کیا

ضرورت پیش آسکتی ہے؟“

”یہ ایک رقعہ ہے آپ کے نام۔“ شہاب ثاقب نے نادر حیات صاحب کا پرچا نکال کر

غلام قادر کو دیا۔ غلام قادر نے پرچا پڑھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نادر حیات صاحب مرد مومن ہیں۔ رفتار اور گفتار

کے یکساں، وہ وقت کو کبھی نہیں بھولتے اور ان کی کوئی خدمت سرانجام دینا سعادت ہے۔“

ذہنی نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں خاموشی اختیار کر لوں۔۔۔۔۔ جب مرنے والی کا باپ اور بیٹی اس کیس کو آگے بڑھانا نہیں چاہتے تو میں زبردستی کی کارکردگی دکھانے کی کوشش نہ کروں۔۔۔۔۔ ڈانٹنے والا سا انداز تھا۔ اس لئے میں بھی خاموش ہو گیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔۔۔۔۔ خوارہ اگت کو مجھے اطلاع ملی کہ ایک شخص کو دردنا کے علاقے میں گولی سے اڑا دیا گیا ہے۔ یہ شخص گھوڑے پر آ رہا تھا کہ اسے گولی مار دی گئی۔۔۔۔۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ بستی نور الہی کے بہت بڑے زمیندار راگ علی ساند اکا بیٹا شہزاد علی ساند تھا۔ یہ شخص اوباش طبع اور کافی بدنام تھا، بہر حال میں راگ علی ساند کی حویلی پہنچا۔ حویلی میں شہزاد علی ساند کی لاش موجود تھی۔ میرا نہایت سرد مہری سے استقبال کیا گیا۔ راگ علی ساند اکا بیٹا نور علی ساند مجھ سے ملا اور مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ تو میں نے شہزاد علی ساند کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ نور علی ساند نے کہا۔

”میں اس کیس کی ابتدائی تفصیل سننا چاہتا ہوں، بشرطیکہ آپ کے پاس وقت ہو۔“
”اصل میں یہ کارخانہ ہے اور پھر میں نے کچھ واقعات اپنی ڈائری میں نوٹ کئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو آپ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے۔۔۔۔۔ میں آپ کو کمرہ تفصیل بتاؤں گا۔“

”بے حد مناسب لیکن کھانے کا تکلف نہ کیجئے گا۔ میں حاضری دوں گا اور اس کے بعد۔“
”نہیں بھی ہم غریبوں کے ہاں بھی کچھ کھاپی لیا جائے تو عنایت ہوگی آپ کی۔ بالکل جائز کمائی ہے اس کا آپ سے وعدہ کیا جاتا ہے۔“

شہاب ہنس کر کھڑا ہو گیا تھا۔ بہر حال یہ نئی ذمے داریاں اسے کافی دلچسپ محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے اس سلسلے میں بہت کچھ سوچا تھا۔ عہدہ بڑھ گیا تھا، لوگ خوش ہوئے تھے، ایک موقع ملا تھا لیکن شہاب کو اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سے مزید فائدہ ہوں گے۔ بہر حال وہ وقت مقررہ پر غلام قادر کے ہاں پہنچ گیا۔ سادہ مزاج آدمی نے سادہ انتظام کیا تھا۔ کھانے وغیرہ سے فراغت کے بعد وہ اسے اپنے کمرے میں لے گیا اور پھر ان نے ایک سال پرانی ڈائری نکال لی۔

کچھ دیر ڈائری کے اوراق التار پھر ایک جگہ پر رک کر بولا۔

”تیس جولائی، بستی کے ایک شخص نے پولیس کو اطلاع دی۔ میں بستی مہر جان کی بات کر رہا ہوں کہ نہرو والی پلیا کے پاس ایک نوجوان لڑکی کی لاش پڑی ہوئی ہے جسے گردن دبا کر مار دیا گیا ہے۔ میں اسی علاقے میں تھا۔ فوراً ہی جائے واردات پر پہنچا تو وہاں بستی مہر جان کا زمیندار خادم شاہ اپنے بیٹے بدر شاہ کے ساتھ موجود تھا اور اس نے لاش اپنی تحویل میں لے لی تھی۔ میں نے بدر شاہ سے لاش کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اس نے کہا۔ گھریلو معاملہ تھا۔۔۔۔۔ لڑکی نے خودکشی کی ہے، خادم شاہ نے مجھ سے درخواست کی کہ اس کی عزت قائم رکھنے کے لئے پولیس اس کیس میں مداخلت نہ کرے۔ لڑکی ضدی اور خود سر تھی۔ شہر جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس بات پر اسے انکار کیا گیا تو اس نے دھمکی دے دی اور کہا۔ خودکشی کرے گی اور یہ سو فیصد ہی خودکشی کا کیس ہے۔ نہ وہ کسی کے خلاف کوئی کارروائی چاہے ہے اور نہ ہی اس کا رروائی کا کوئی جواز ہے۔ بہر حال میں نے بہت کوشش کی لیکن خادم شاہ نے اس سلسلے میں مجھ سے تعاون نہیں کیا اور خاصی سختی پر اتر آیا، بعد میں ڈی ایس پی خانہ

”ہم اپنی غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔ شہزاد ساند ایک بڑی رقم لے کر گھوڑے پر گزر
تھا اور غالباً ڈاکوؤں نے یہ کارروائی کی ہے۔ وہ کسی کا نام نہیں لینا چاہتے کیونکہ ڈاکو ان کے
نامعلوم ہیں۔ رقم انہوں نے کوئی ڈھائی لاکھ بتائی تھی جو شہزاد علی ساند کے پاس موجود
تھی۔ شہزاد علی ساند کی تدفین کر دی گئی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھی نہیں دی گئی تھی
اور اسے ایک منٹ کے لئے بھی پولیس کی تحویل میں نہیں لایا گیا۔ شہاب ثاقب صاحب
ایسی آبادیوں میں رہنے والوں کے، میرا مطلب ہے بڑے زمینداروں کے ایسے
اختیارات ہوتے ہیں۔ پولیس ایک طرح سے ان کے سامنے بے اثر ہو جاتی ہے اور سراسر
واقعات توڑ موڑ دیے جاتے ہیں۔ ہاں غریب غربا کی بات اور ہے ان کے ہاں اگر کوئی دانی
جزم ہوتا ہے تو اس کے سلسلے میں پولیس کھل کھیل لیتی ہے، وہ بھی اس وقت تک جب تک
کہ کوئی بڑی شخصیت اس سلسلے میں اپنی کسی رائے کا اظہار نہ کرے یا کچھ نہ چاہے۔ ایسے
واقعات میں بھی اگر کہیں سے کوئی بڑی شخصیت ملوث ہو جائے تو پھر یوں سمجھ لیجئے کہ وہ بھی
ختم ہو گیا، بہر حال میں نے اس سلسلے میں اپنی کارروائیاں کیں اور کوشش کی کہ کچھ واقعات
اوپر تک پہنچا دوں پھر اس دوران مجھے ایک شخص ملا جو بستی نور الہی کا ایک معزز آدمی تھا اور
اس کا کچھ رشتہ بستی مہر جان میں بھی تھا۔ خود بھی ایک معزز آدمی تھا۔ عادل فقیر کے نام سے
پہچانا جاتا تھا، اس نے مجھے کچھ تفصیلات بتائیں۔ اب آپ یہ بتائیے کہ میں آپ کو واردات
بتاؤں یا پہلے وہ تفصیل۔“

”نہیں غلام قادر صاحب بہتر یہ ہو گا کہ آپ پہلے تفصیل بتائیں۔“

”ہاں یہی بہتر ہو گا۔“ غلام قادر نے کہا اور پھر بولا۔

”عادل فقیر نے جو انکشافات مجھ پر کئے وہ کچھ یوں تھے کہ راگ علی ساند کا ایک
شہزاد ساند ایک بار بستی مہر جان شاید فٹ بال کھیلنے گیا تو بستی مہر جان میں اس نے خادمہ
کی بیٹی شہناز کو دیکھا جو کسی نہ کسی طرح اس کی نگاہوں میں آ گئی تھی۔ شہناز شہر میں
حاصل کرتی تھی اور ان دنوں اپنے گھر آئی ہوئی تھی۔ بہر حال شہزاد ساند اس لڑکی پر رنج
گیا اور اس سے ساید اپ سرس راگ علی ساند اسے اس لڑکی سے رشتے کی فرمائش کی
راگ علی ساند نے یہ کہہ کر اس کی درخواست مسترد کر دی کہ مہر جان کے خادمہ شاہ سے
کے اچھے تعلقات نہیں ہیں۔ اس لئے یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔ شہزاد نے باپ کی بات سنی۔“

”ہم نے اچھا بھائی کھویا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم بے غیرت ہیں، اگر ہم یہ
دیکھنا کہ وہ دے دیتے ہیں تو پولیس زیادہ سے زیادہ کیا کر سکے گی۔ گرفتاریاں ہوں گی،

بیانات ہیں اس کے لئے قانون بے حقیقت ہے تو یہ آٹے دال کی دکان ہو گئی۔ کم از کم بیانات کو حلف تو نہیں اٹھایا جاتا۔“

”جی غلام قادر صاحب ویسے بات بہت دور تک چلی جاتی ہے۔ آپ کے تجربے کی بنیاد میں آپ سے یہ سوالات کر سکتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا ہونا چاہئے لیکن جانتا ہوں کہ موثر جواب آپ کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ اب اس سلسلے میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں غلام قادر صاحب۔“

”جی غلام قادر صاحب ویسے بات بہت دور تک چلی جاتی ہے۔ آپ کے تجربے کی بنیاد میں آپ سے یہ سوالات کر سکتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا ہونا چاہئے لیکن جانتا ہوں کہ موثر جواب آپ کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ اب اس سلسلے میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں غلام قادر صاحب۔“

”اگر ہم کیس ری اوپن کرتے ہیں تو اس کے لئے ہمیں مدعی کی تلاش ہوگی۔ آپ کے بل میں خادم شاہ کے خاندان کا کوئی ایسا فرد زندہ بچا ہے جو ساندوں کے خلاف درخواست دے اور کیس کرے۔“ غلام قادر نے ایک لمحے سوچا پھر بولا۔

”بات چونکہ ڈی آئی جی نادر حیات کی ہے اور یہ بات مجھے معلوم ہے کہ نادر حیات کیا ہیں اس لئے شہاب صاحب میں آپ کے سامنے ایک سنسنی خیز انکشاف کر رہا ہوں۔ ایک انکشاف جس کے بارے میں ابھی چند ہی لوگوں کو معلوم ہے۔ اصل حقیقت کوئی نہیں انکشاف دے بھی نہیں۔“

”آپ مجھے اپنے تمام رازوں کا امین پائیں گے۔“ شہاب نے سنجیدگی سے کہا۔

”خادم شاہ کی بیوی بدر شاہ کے دو بچوں کے ساتھ زندہ ہے۔ اس رات وہ گھر پر نہیں تھا یہ واقعہ ہوا اور اپنے دونوں پوتوں کے ساتھ کسی تقریب میں گئی ہوئی تھی، جب ساری صورت حال معلوم ہوئی تو وہ وہیں سے روپوش ہو گئی۔ اپنے ایک خاص ملازم کے ساتھ اور اس کے بعد اس نے پولیس سے رجوع کیا یعنی مجھ سے خدا کے فضل سے میں اسے احکامات کا غدار نہیں تھا، ورنہ بعد میں اگر ساندوں کو پتا چلتا کہ خادم شاہ کے قتل کے تین افراد بچ گئے ہیں تو وہ یقیناً انہیں بھی ختم کر دیتا، خادم شاہ کی بیوی اور بدر شاہ

مقدمہ چلے گا اور اس کے بعد خادم شاہ وغیرہ کو زیادہ سے زیادہ سزا ہو جائے گی اور وہ کسی طرح بچ ہی جائیں گے۔ ہم لوگ ایسے چھوٹے موٹے کام نہیں کرتے۔ ہمارے معاملات یہی جانتے ہیں، بہر حال جناب شہاب صاحب اس کے بعد میں یہی کوشش کرتا ہوں کہ کوئی واقعہ نہ ہونے پائے لیکن واقعہ ہو گیا۔ اچانک بنی خادم شاہ کی حویلی میں آگ لگی اور خادم شاہ اس کا بیٹا بدر شاہ اس کی بیوی صفیہ جہاں اور باقی رشتے ناطے دار اور دوسرے چند افراد ہلاک ہو گئے۔ اس طرح راگ علی ساندانے اپنا انتقام لے لیا لیکن مجھے صورت حال معلوم ہونے میں نے تفتیش جاری رکھی اور اس سلسلے میں کئی قدم آگے بڑھ گیا۔ تب ایک شام نور علی اندام مجھے ملا اور اس نے مجھ سے بڑی کھل کر بات کی اس نے کہا کہ میں اپنی نوکری کے بیٹے پر زہا بلکہ اپنے خاندان کے ساتھ بھی اسی سلوک کا انتظام کر رہا ہوں جو خادم شاہ کے ساتھ ہوا۔ میں نے اس وقت بھی عاجزی ہی اختیار کی اور کہا کہ بہر طور اتنی بڑی وارنٹ ہوئی ہے۔ میری ذمہ داریاں ہیں کہ میں اس واردات کی تفصیل معلوم کروں اور مجرم کیسے کر دار تک پہنچاؤں۔ اگر میں اس سلسلے میں کامیاب نہیں ہوتا تب بھی میرے مصیبت ہے اس پر نور علی ساندانے کہا کہ اگر میں اس کے ساتھ تعاون کروں تو وہ میرا مشکل بھی حل کر دے گا۔ حالات کے تحت میں نے اس سے تعاون کا وعدہ کر لیا تو چاروں میرے پاس گرفتاری دینے پہنچ گئے۔ یہ چوبیس سے چھپیس سال تک کی عمر کے لڑکے تھے انہوں نے اعتراف کیا کہ بستی مہر جان میں انہوں نے خادم شاہ کے گھر ڈاک ڈالا تھا اور پانچ مار کے دوران اتفاقاً طور پر آگ لگ گئی جو ایک ایسی موم بتی سے لگی تھی جو کپڑوں کے قریب پڑی ہوئی تھی اور پھر یہ آگ بجھائی نہیں جاسکی۔ باقی تمام باتیں بعد کی تھیں مجرم موجود تھے۔ پولیس بھلا اس سلسلے میں اور کیا کر سکتی تھی۔ چنانچہ ان چاروں پر مقدمہ اور انہیں سزائیں ہو گئیں۔ یہ ہے بستی نور الہی اور بستی مہر جان کی کہانی۔“ خادم قادر بتایا۔ شہاب دم سادھے یہ کہانی سن رہا تھا۔ ریٹائرڈ انسپکٹر غلام قادر نے چند لمحات توقف پھر بولا۔

”کچھ ایسی بددلی طاری ہو گئی تھی مجھ پر کہ میں ایک طویل عرصے تک چھٹی ہوں اس کے بعد میں نے استعفیٰ دے دیا۔ کم از کم جو حلف برداری کی جاتی ہے اس کی کچھ لائنیں جائے لیکن بس یہی کھیل ہے جو اپنا دفاع نہیں کر سکتا، وہ سزا پاتا جاتا ہے اور جس کے

کے دو بچے موجود ہیں۔ ان کی عمریں دس اور گیارہ سال کی ہیں اور خادم شاہ کی بیوی جہاں یہیں شہر میں خاموشی سے اپنے اس ملازم کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ اصل میں اپنے والدین کی طرف سے بھی بڑی صاحب اثر تھی لیکن والدین مر چکے ہیں۔ اسے نہ ترکہ ملا تھا جو اس نے وہیں محفوظ کیا ہوا تھا اور وہی ترکہ اب اس کے کام آ رہا ہے۔ انہیں چاہیں تو اسے مدعی بنا سکتے ہیں۔ وہ تمام ذمے داریاں پوری کر سکتی ہے۔ بہر حال اس نے مدعی کا معاملہ تو حل ہو جاتا ہے لیکن ایک اور بات بھی میں بتاؤں آپ کو۔ آپ کے آجائے گی۔

”جی جی ضرور۔“

”ایک شخص اور ہے۔ مولوی ارشاد علی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مولوی ارشاد علی بستی نور الہی کا باشندہ ہے اور وہ ساندوں کے ہاں خزانچی تھا۔ مولوی ارشاد علی کی ایک بیوی تھی جس کا بیٹا بری صحبتوں میں پڑ گیا تھا اور اسے ساندوں کا سہارا حاصل تھا۔ ان بری صحبتوں کی تمام خبر نور علی وغیرہ کو تھی اور وہ اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔ ایک طرف یوں سمجھ لو وہ ان کا وفادار بن چکا تھا جب گرفتاری کی ضرورت پیش آئی تو پیار علی ساندوں اس لڑکے کو بھی سامنے کیا اور اس نے خوشی سے اپنے مالکوں کے لئے اپنی گرفتاری دے دی۔ مولوی ارشاد علی کچھ عرصے وہاں رہے اور اس کے بعد وہاں سے واپس چلے آئے۔ اب وہ شہر میں ایک جگہ رہتے ہیں۔ یہ شخص بھی اس کیس کے سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

”کیا ان کا پتا آپ کو معلوم ہے؟“ شہاب نے سوال کیا اور غلام قادر مسکرایا پھر بولا۔

”وہ جو کہتے ہیں ناکہ چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ بہت دکان میں ان لوگوں کے پیچھے لگا رہا اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا ہوں۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ کوئی مسئلہ ہی نہیں بن رہا اور ساندے عیش سے دندنا رہے ہیں تو بھی خاموش ہو کر بیٹھ گیا، بہر حال یہ دو خاندان ایسے ہیں کہ اگر یہ کیس ری اوپن ہو تو سلسلے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ انہیں آمادہ کر سکیں۔“

”ڈی آئی جی نادر حیات صاحب سے آپ نے کبھی ان کا تذکرہ کیا؟“

”نہیں اتفاق سے نہیں بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں اس زندگی سے ہٹ ہی گیا تھا۔ بددلی ہو گئی تھی اس لئے میں نے کبھی اس سلسلے میں نادر حیات صاحب سے کوئی تعلق

نہیں کیا۔ بس وہ یہ جانتے تھے کہ اس وقت ساری صورت حال میرے علم میں اس لئے تھی کہ میں اس علاقے میں تعینات تھا اور پھر ایک آدھ دفعہ ان سے بات بھی ہوئی اور میں نے اس سلسلے میں ذاتی رپورٹ پیش کی تھی لیکن اس کے بعد کوئی ایسی تفصیلی ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ ویسے یہ بات میں جانتا تھا کہ انہوں نے ان واقعات کو دل میں رکھ لیا ہے۔ کچھ ان قسم کے آدمی ہیں وہ۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا اور آپ کو مجھ تک پہنچا۔ یہ شہاب صاحب بات چونکہ دل کو لگی ہے اور میں خود بھی اس سلسلے میں خاصی ذہنی ہمت کا شکار رہا ہوں اس لئے اگر کسی بھی وقت میری مدد کی ضرورت پیش آئے تو میں حاضر ہوں۔ اب ایک الگ اور مختلف زندگی گزار رہا ہوں اس لئے فعال تو نہیں رہ سکا لیکن پھر بھی بچہ نہ کچھ۔“

یقیناً کسی نیک کام کے لئے اگر جدوجہد کی جائے تو انسان کبھی بھی اس سے الگ نہیں ہو سکتا۔ مجھے اگر آپ کی مدد کی ضرورت پیش آئی تو میں آپ کو ضرور زحمت دوں گا۔ دونوں بچے براہ کرم ذرا تفصیل سے مجھے نوٹ کرا دیجئے گا۔“

”ضرور..... ضرور لیکن شہاب صاحب بڑا مشکل ہو جائے گا آپ کے لئے کیونکہ مجھے لی اس یہ پتہ معلوم ہی ہو گئے تھے۔ خیر اب آپ دیکھئے۔ ظاہر ہے میں آپ کی صلاحیتوں کو چیلنج نہیں کر سکتا۔“

”کس مشکل کا تذکرہ کر رہے ہیں آپ؟“

”یہ دونوں گھرانے آپ سے مشکل ہی سے تعاون کریں گے۔“

”وہ میں خود دیکھ لوں گا۔“ بہر حال پتہ نوٹ کئے گئے اور اس کے بعد شکریہ کے ساتھ باب نے غلام قادر صاحب سے اجازت لے لی اور وہاں سے چل پڑا لیکن یہ انوکھی داستان کے ذہن میں گردش کر رہی تھی۔ گھر ہی واپس آیا تھا۔ بہن اور بہنوئی آئے ہوئے تھے ان کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ زندگی کے کتنے روپ ہیں، کہیں کوئی انسان کچھ اور کچھ ہوتا ہے۔ بہر حال گھر ایک حسین پناہ گاہ ہے جہاں پہنچنے کے بعد زندگی کے سارے غم سے اتر جاتے ہیں اور ماحول اگر بہتر ہو تو وقت نہایت خوشگوار رہتا ہے۔ بہن بہنوئی آئے ہوئے تھے اور اس کا انتظام کیا گیا تھا، چونکہ وقت کافی ہو گیا تھا اس لئے نیچر سب کو کھانا کھلایا تھا، پھر بھی وہ لوگ موجود تھے۔

”آئیے ڈی ایس پی صاحب۔ بھی بڑی غلط بات ہے آپ کو گھر کے معاملات سے لڑنے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔“

”بولنے لگے ہیں بہنوئی صاحب۔ چند ہی دن میں بولنے لگے ہیں..... چلنے اچھا ہے۔“

”وہ ہیں بیٹا یقیناً ہیں۔ امیر علی شاہ کیس میں ان کے واجبات باقی ہیں..... دوسرے معاملات میں بھی قانونی امور انہیں ہی دیکھنے ہوں گے۔“

”ہم دونوں باپ بیٹی خوب برسر روزگار ہوئے۔“ بیٹا بولی۔

”اسکتی ہو؟“

”کریم سوسائٹی۔“

”ہاں۔“

”وہیں سے بول رہے ہیں۔“

”ہاں۔“

”ابھی پہنچ جاتی ہوں۔“

”اوکے..... انتظار کر رہا ہوں۔“ شہاب نے فون بند کر دیا اور بیٹا کے بارے میں

سوچنے لگا۔ خوب سیرت، خوب صورت، باعمل اور مودب اس کی تصویر میں بھی نہیں ہوگا

کہ کسی کے دل میں اس کی محبت کا پودا پھوٹ چکا ہے اور آنکھوں میں رنگین خواب جاگ اٹھے

ہیں۔ وہ بہت خوش ہے کہ اسے ایک پراسرار اور خفیہ کردہ میں عہدیدار مقرر کر دیا گیا ہے،

لیکن جو مقام کسی کے دل میں پیدا ہوا ہے اسی کے لئے وہ تمام عہدوں سے برتر ہے، پھر

شہاب نے خود کو سنبھال لیا۔ حیات کا یہ منصب نہیں ہے جو ذہن و دل میں آرہا ہے۔ ابھی تو

بہت کچھ باقی ہے، ایک نظریہ اور اس کی تربیت یہ تو آغاز ہے ابھی اسے عروج تک لے جانا

ہے۔ جب تک بیٹا کریم سوسائٹی نہیں پہنچ گئی، شہاب انہی خیالات میں گم رہا تھا۔ جو ہر خان

نے بڑی خوش اسلوبی سے کوٹھی کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ وہ سب کچھ بن گیا تھا اور شہاب نے

اسے مکمل اختیارات دے دیئے تھے..... ایک عمدہ رہائش گاہ تھی یہ جس میں اعلیٰ درجے کا کچن

تمام ضروریات سے مرصع، بیرونی حصے میں جو جھاڑ جھنکاڑ بھرے ہوئے تھے ان کے لئے جو ہر

خان ایک بہترین مالی ثابت ہوا تھا۔ اندرونی معاملات بھی بالکل سدھر گئے تھے۔ ایک آفس

ترتیب دے لیا گیا تھا جس میں ہر طرح کی اسٹیشری موجود تھی اور پھر گیٹ پر ایک مستعد

نیکیدار۔ شہاب نے جو ہر خان سے مشورہ کیا تھا کہ یہاں ضروری امور کے لئے کتنے افراد کی

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا آپ کی کسر کہاں پوری ہو سکتی ہے۔“ دلچسپ گفتگو پر مذاق جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ وہ تھوڑا سا ذہنی دباؤ جو اس داستان کو سننے کے بعد شہاب پر طاری ہو گیا تھا، عارضی طور پر دور ہو گیا تھا۔

دوسرے دن سب سے پہلے مرشد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فتح محمد کی شان ہی نہ تھی۔ سارے محلے میں سراونچا ہو گیا تھا ان کا کیونکہ یہ انہی کی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ شہاب نے

پارہا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سب کچھ ہو گیا تھا لیکن شہاب نے اپنا گھر نہیں چھوڑا تھا، جہاں کا نا پھوسیاں کرنے والے تھے کہ شہاب دونوں ہاتھوں سے دولت کما رہا ہے، ہاں

لوگوں کے دلوں میں یہ بات بھی بہر طور تھی کہ اس نے اپنی جائے پناہ نہیں چھوڑی تھی، فضاؤں میں اڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ محلے والے دل میں کچھ بھی خیالات رکھتے ہوئے

لیکن کم از کم اس بات سے خوش تھے کہ پولیس کا ایک اعلیٰ عہدیدار ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اگر کوئی اڑی بھڑی کا وقت آگیا تو کم از کم اس کی مدد ضرور حاصل ہو سکتی ہے

بس ایسی ہی کچھ ملی جلی کیفیات تھیں، فتح محمد صاحب کی۔ خدمت میں حاضری کا سلسلہ نہیں تھا اور وہ شہاب کو ہمیشہ دعاؤں سے نوازتے رہتے تھے، بہر حال اس وقت ذہن میں

کچھ تھا لیکن اتنا وقت نہیں تھا کہ شہاب ان کے ساتھ بیٹھ کر اس سلسلے میں کوئی گفتگو کرے البتہ وہ ہیڈ آفس جانے کے بجائے کریم سوسائٹی کی کوٹھی پہنچا تھا اور وہاں سے اسے

واسطی کو فون کیا تھا۔

”کیا مصروفیت ہے؟“

”کوئی خاص نہیں سر۔ بس یوں سمجھئے سپیشل ڈیپارٹمنٹ کے ذیلی آفس میں

ہوئی ہوں۔“

”نہیں سمجھا۔“

”والد صاحب قبلہ نے کہا ہے کہ جب میں نے مکمل ذمے داریاں قبول کر لی تہا

”کیسی بات کرتے ہیں جو ہر خان صاحب۔ آپ ہمارے بڑے ہیں، آپ سے یہ کام
جتنے ہوئے ہمیں شرم نہیں آئے گی اور پھر شہاب صاحب کے دل میں ہماری جو عزت ہے وہ
بھی ختم ہو جائے گی کیونکہ وہ جس طرح آپ کو عزت دیتے ہیں اسی طرح یہاں آنے والے
کو بھی آپ کا احترام کرنا پڑے گا۔“

جوہر خان ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”اصل میں کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اتنا دیا ہوتا ہے کہ وہ بانٹتے بانٹتے تھکتے نہیں
ہیں۔ اللہ نے شہاب صاحب کو عزت دی ہے اور جو کچھ ان کے پاس ہے، وہی وہ دوسروں
کو دیتے ہیں۔ اللہ انہیں اور عزت دے۔“

بیتا چائے کے ساتھ شہاب کے سامنے آ بیٹھی، شہاب نے پر خیال انداز میں اسے
دیکھا۔ سامنے رکھے ہوئے پیڑ پر وہ قلم سے کچھ یادداشتیں ترتیب دے رہا تھا۔ پھر چائے کے
گھونٹ لیتے ہوئے اس نے کہا۔

”مس بیتا، عہدے کے تحت ہمیں ایک کیس ملا ہے۔ اس میں محکمہ پولیس کے سپیشل
ڈیپارٹمنٹ کی پہلی کارکردگی سامنے آئے گی، جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ چند افراد
ماخوٹوں کے طور پر مجھے دے دیئے گئے ہیں لیکن میں ذہنی طور پر ان سے مطمئن نہیں ہوں۔ وہ
بے شک ہمارے آؤٹ ڈور ورکر ہو سکتے ہیں لیکن ہم انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال
نہیں کر سکتے۔ میں ایک ایسا ملا جلا طریقہ کار ترتیب دے رہا ہوں جس سے وہ بھی مطمئن
ہو جائیں اور ہمارا کام بھی جاری رہے۔ بہر حال نئے کیس کا نیا فائل ڈبل اوگینگ کی ذمہ داریوں
کے ساتھ کھل رہا ہے اور آپ کو اب اس نئے کیس کی تفصیلات ترتیب دینا ہیں۔“

”سر میرا خیال ہے ہمیں اس کا فائل بنالینا چاہئے۔“

”یہی میں آپ سے عرض کرنے والا تھا۔“

”تو پھر میں ڈکٹیشن بک لے آتی ہوں۔“

”تھینک یو مس بیتا۔“ شہاب سنجیدگی سے بولا اور بیتا تیار یوں کے بعد پھر اس کے
سامنے آ بیٹھی۔

”واقعہ کی مختصر سی تفصیل یہ ہے کہ آٹھ نومبر پہلے ایک کیس ہوا تھا جو بہر طور میری
یادداشت میں نہیں ہے۔ بستی مہرجان میں خادم شاہ نامی ایک زمیندار کی حویلی جلادی گئی تھی

ضرورت پیش آئے گی، جوہر خان نے نہایت ذہانت کے ساتھ کہا تھا۔

”صاحب ابھی تو صرف میں یہاں موجود ہوں جن لوگوں کو یہاں لایا جائے، وہ
مالی ہوں، نہ لک ہوں نہ فراش ہوں۔۔۔۔۔ وہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو ضرورت پڑنے
سب کچھ کر سکیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کا پیٹ وزن دار ہو کیونکہ یہاں جو معاملات
ہوں گے ان میں رازداری بڑی ضروری ہوگی، چنانچہ ان کا انتخاب ذرا سوچ سمجھ کر کیجئے۔
شہاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جوہر خان تم نے یہاں کے معاملات کو بہترین طریقے سے سمجھ لیا ہے۔“

”جی صاحب جی۔ اللہ نے عقل دے دی ہے۔۔۔۔۔ بے عقلی کا دور تو گزر چکا ہے۔“

شہاب محسوس کرتا تھا کہ جوہر خان اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔۔۔۔۔ اب زندگی
میں کوئی اور مقصد اس کے سامنے نہیں رہ گیا ہے، بس اپنی ذمہ داریاں اور یاد اللہ اپنی زندگی کا
مقصد بنالیا ہے۔

بیتا آگئی۔ اس نے اپنا پرس اپنی میز پر رکھا۔۔۔۔۔ یہاں باقاعدہ اس کے لئے میز لگائی
تھی۔ شہاب کے اپنے بیٹھنے کی جگہ الگ تھی۔ پرس میز پر رکھنے کے بعد وہ شہاب کے سامنے
آگئی اور بولی۔

”بیٹھ سکتی ہوں سر۔“

”تشریف رکھئے۔“ شہاب مسکرا کر بولا۔

”سر یہاں ایک طریقہ کار رائج ہونا چاہئے۔“

”جی ارشاد۔“

”جو مہمان آئے، اپنی ضیافت کا بندوبست کرے۔“

”واہ۔ بیتا آپ یقین کریں آپ جیسی ذہین لڑکی میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں

دیکھی۔ مطلب یہ ہے کہ آپ چائے پی رہی ہیں؟“

”بس دو منٹ سر، ابھی آئی۔“ بیتا نے کہا اور کچن میں چلی گئی۔ چائے بنائی۔ ایک

جوہر خان کو دی جو باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جلد ہی سے اٹھتا ہوا بولا۔

”ارے بی بی صاحبہ ایسے کام آپ نہ کیا کریں شرمندگی ہوتی ہے ہمیں۔ کھٹی ٹوٹا

ہے ہم نے بجا دیا کریں اور ہمیں بتا دیا کریں۔“

اور اس میں اس کے اہل خانہ جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ ڈاکوؤں نے یہ کارروائی کی تھی اور ڈاکو گرفتار ہو گئے تھے۔ انہیں سزائے موت اس لئے نہ ملی کہ انہوں نے بیان دیا تھا کہ بے شک ڈاکہ زنی انہوں نے کی تھی، لیکن حویلی میں آگ شمع سے لگی تھی اور اس میں ان کی کارروائی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اقبالی مجرم گرفتار ہو گئے، کیس ختم ہو گیا لیکن اصل کیس کچھ اور ہے۔“

”جی سر۔“ بینا نے دلچسپی سے کہا۔

”اس سلسلے میں اب ایک اور نام آتا ہے جو بستی نور الہی کا ہے۔ بستی نور الہی میں ویسے تو بہت سے لوگ رہتے ہیں لیکن راگ علی ساند اس بستی کا سب سے بڑا زمیندار ہے۔ تین بیٹوں کا باپ تھا۔ ایک بیٹا قتل کر دیا گیا۔ دو بیٹوں کے ساتھ آج بھی بستی نور الہی میں آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اب یہاں سے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ مہر جان بستی کے خادم شاہ کی بیٹی شہناز، راگ علی ساند کے بیٹے شہزاد ساند کی ہوس کا شکار ہوئی اور اسے ہلاک کر دیا گیا۔ شہزاد علی ساند، خادم شاہ کے بیٹے بدر شاہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ نہ شہناز کا کیس پولیس کو دیا گیا اور نہ ہی شہزاد ساند کا معاملہ پولیس کے سامنے آیا، دونوں بڑے خاندانوں نے قانون کو نظر انداز کر کے اپنے معاملات خود ہی نمٹا دیئے۔ راگ علی ساند نے اپنے بیٹے کے قاتلوں کے خاندان کو ہی فدا کر دیا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قانون ان لوگوں کے سامنے انتہائی بے بس ہے۔ اصل میں وہی چیز سامنے آ رہی ہے مینا جو امیر علی کے کیس میں سامنے آئی تھی۔۔۔۔۔ ان بڑے بڑے اژدہوں نے قانون کو اپنی جیب میں رکھ لیا ہے لیکن قانون کے رکھوالوں میں ڈی آئی جی نادر حیات جیسے لوگ بھی موجود ہیں۔ یہ کیس بہت دن سے ان کے ذہن میں تھا کیونکہ سرکاری طور پر اس کا فائل بند ہو گیا تھا۔ اس لئے نادر حیات صاحب کسی مناسب وقت کی تلاش میں تھے اور اب ان کے خیال میں وہ وقت آ گیا ہے جب ایسے کیسوں کو نکالا جائے اور ان کی صحیح تفتیش کر کے مجرموں کو یہ بتایا جائے کہ اگر ان کی سانسیں باقی ہیں تو وہ قانون کی گرفت سے دور نہیں ہیں۔ آخر کار قانون کا ٹکچہ ان کی گردنوں کو جکڑ لے گا۔۔۔۔۔ عارضی کامیابی سے خوش نہ ہو جائیں۔ قانون کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔ خیر۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے میں کچھ جذباتی باتیں کر گیا اس سلسلے میں۔۔۔۔۔ میں نے تھوڑے سے قدم آگے بڑھائے اور نادر حیات صاحب کی رہنمائی میں ایک شخص انسپکٹر غلام قادر کے

پاس پہنچا۔ جواب ریٹائرڈ ہے۔ اس نے اپنی ذمہ داریوں سے استعفیٰ دے دیا تھا اور استعفیٰ اسی جے بی کے اظہار کے طور پر دیا گیا تھا جس میں قانون کو مفلوج کر دیا جاتا ہے۔ غلام قادر سے ملاقات کر کے مجھے اس سلسلے میں مزید تفصیلات معلوم ہوئیں۔ یہ بات غلام قادر جانتا ہے اور اس کے بعد اب میں جانتا ہوں اور تیسری رازدار تم ہو بیٹا کہ خادم شاہ گھرانے کے تین افراد زندہ بچ گئے تھے۔ خادم شاہ کی بیوی گوہر جہاں اور اس کے دو پوتے جو چھوٹے ہیں۔ گوہر جہاں خفیہ طور پر غائب ہو گئی تھی اور اب وہ یہاں خاموشی سے اپنے پوتوں کی پرورش کر رہی ہے، یہ بات صرف غلام قادر جانتا ہے اور کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ نمبر دو ایک اور گھرانہ ہے۔۔۔۔۔ یہ گھرانہ مولوی ارشاد علی کا ہے۔۔۔۔۔ مولوی ارشاد علی کی ایک بیوہ بہن کا بیٹا ان ڈاکوؤں میں شامل ہے جنہوں نے خادم شاہ کے گھرانے کو جلانے کی ذمہ داری قبول کی ہے اور سزا کاٹ رہا ہے۔۔۔۔۔ مولوی ارشاد علی ظاہر ہے نام ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ برے لوگوں میں سے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ ان کے بھانجے نے جو کچھ بھی کیا اس کا پس منظر پتا نہیں ان کو معلوم بھی ہے یا نہیں لیکن بہر حال انہوں نے بستی سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے اور وہ بھی یہیں رہتے ہیں۔۔۔۔۔ گویا مینا ہمارے سامنے ایک مدعی بھی ہے اور ایک عالی نشان گواہ بھی جو بہر حال ساندوں کے خلاف صحیح طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ باقی گرفتار زندگان کے بارے میں، میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون ہیں اور انہوں نے ساندوں کی گرفتاری کس لئے اختیار کی ہے خیر تو یہ ہے وہ مختصر کہانی جس پر اب ہمیں کام کرنا ہے۔“

”سر کیا گوہر جہاں نے اس سلسلے میں کیس دائر کرنے کی درخواست کی ہے۔“

”بالکل نہیں۔۔۔۔۔ یہ کیس تو ڈی آئی جی نادر حیات قانون کے نام پر ری اوپن کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ ہمیں گوہر جہاں کو تیار کرنا ہو گا اور مولوی ارشاد علی سے تفصیلات معلوم کرنا ہوں گی۔“

”جی سر، بالکل۔“

”یہ تمام پوائنٹس نوٹ کر لئے تم نے مس بینا۔“

”جی سر۔“

”اب ہمیں اس کے پورشن بنانے ہیں ظاہر ہے ابھی میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کے ذمہ داروں سے تو کوئی اہم کام نہیں لے سکتا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ذمہ داروں میں

کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اخبارات سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمیں بہر طور ان کی ضرورت پیش آئے گی، کم از کم وہ اس شکل میں ہمارے بہترین معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب ڈبل اوگینگ کی ڈیوٹیاں مخصوص کردی جائیں۔ میرا خیال ہے اس سلسلے میں تم انہیں ہدایات دو۔“

”میں سر۔“

”ہاں بیٹا، اس دن بھی میں نے ان لوگوں کو بتادیا تھا کہ تم گروپ کنٹرولر ہوگی اور ایک بار پھر میں انہیں ہدایات دے دوں گا کہ جو ہدایت میں انہیں براہ راست نہ دوں وہ بیٹا کے ذریعے ان تک پہنچیں گی۔“

”شکریہ سر۔“

”تو پھر بیٹا یوں کرتے ہیں کہ سب سے پہلے ہمیں ان لوگوں کے بارے میں رپورٹس درکار ہوں گی۔۔۔۔۔ ایک آدمی کو گوہر جہاں کے پتے پر تعینات کر دو۔۔۔۔۔ دوسرے کو مولوی ارشاد علی کے پتے پر۔۔۔۔۔ دو افراد بستی نور الہی چلے جائیں اور ساند اگھرانے پر نظر رکھیں۔۔۔۔۔ دو افراد بستی مہر جان جا کر خادم شاہ کے گھرانے کی تفصیلات مہیا کر کے لائیں۔۔۔۔۔ یہ ذمے داریاں ان لوگوں میں تقسیم کردی جائیں۔“

”سر جیسا آپ پسند کریں۔“

”ٹرانسمیٹر اٹھا کر لائیے۔“ شہاب نے کہا اور اس کے بعد ٹرانسمیٹر سامنے آگیا۔ شہاب نے ڈبل اوگینگ کو کال کیا۔۔۔۔۔ فراست علی اور انجم شیخ موجود تھے۔ شہاب نے کہا۔

”فراست علی اور انجم شیخ یہ بات میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ ہماری نئی ممبر مس بیناب اس گروپ کو کنٹرول کریں گی اور میرے احکامات ان کے ذریعے آپ تک پہنچیں گے، چنانچہ اب اس سلسلے میں مس بینا آپ سے ملاقات کریں گی اور کچھ نئی ذمے داریاں آپ لوگوں کے سپرد کریں گی۔ شام کو پانچ بجے ہیڈ کوارٹر میں آپ لوگ مس بینا کا انتظار کریں گے۔“

”بہت بہتر جناب۔“ فراست علی نے کہا اور شہاب ٹرانسمیٹر بند کرنے کے بعد مسکراتی نگاہوں سے بینا کو دیکھنے لگا۔



خوف و ہشت کی ایک لہر زرینہ کے جسم میں دوڑ گئی۔ اسے ایک دم احساس ہوا تھا کہ یہی خواب گاہ بدل گئی ہے اور یہ اس کا بستر نہیں ہے۔۔۔۔۔ رات کو اپنے بستر پر ہی سوئی تھی۔۔۔۔۔ اب اس وقت وہ اپنی خواب گاہ میں نہیں تھی۔ سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی تین بج رہی تھی۔۔۔۔۔ نجانے کیوں اسے شدید خوف کا احساس ہوا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ تبھی دروازہ کھلا اور ایک کسی قدر بھاری بدن کا شخص اندر داخل ہوا۔ زرینہ کانپ کر رہ گئی تھی کیونکہ اس شخص نے چہرے پر نقاب چڑھی ہوئی تھی اور اس کے انداز میں کسی قدر لڑکھڑاہٹ تھی۔ زرینہ کو بس کچھ ایک خواب کی مانند محسوس ہو رہا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور جلدی سے بستر سے باہر کود گئی، پھر اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”کون ہو تم؟“

”میں جو کوئی بھی ہوں لیکن تمہارا پرستار ہوں اور بڑی مشکل سے میں نے تمہیں مل لیا ہے۔“ زرینہ کو یہ آواز کچھ مانوس سی محسوس ہوئی لیکن شدید ذہنی ہیمجان کے عالم میں یہ اندازہ نہیں لگا سکی کہ آواز کس کی ہے۔ آنے والا اس کے قریب پہنچ گیا پھر بولا۔

”بہت عرصے سے تم میرے دل میں اتری ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ تمہیں حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہاتھ نہیں آ سکا تو آخر کار میں نے تمہارے لئے جدوجہد کی اور تمہیں تمہاری خواب گاہ سے اٹھالایا۔ تم میری آرزوؤں کا مرکز ہو اور اب تمہیں میری خواہشات کے آگے سر بٹھا دینا چاہئے۔“

”کیا کو اس کر رہے ہو مجھے جانتے ہو میں کون ہو۔۔۔۔۔ ساند خانہ ان سے ٹکر لو گے۔۔۔۔۔ تلوہ ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔ برباد ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔ میں کہتی ہوں شرافت سے مجھے میرے گھر پہنچا

”اب کیا فائدہ جو کچھ ہو چکا ہے وہ اتنا ہے کہ اب تو میں دنیا کے سامنے بے لباس ہوتی ہوں۔“

”تمہاری مرضی ہے، اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ اس طرح ہمیں کوئی نقصان پہنچا لوگی تو اپنی اس حالت کو ذہن سے نکال دو، ہمارا مقام ہے یہ تم بھی جانتی ہو..... تمہارا باپ اور بھائی بھی۔“

”وہ تمہارے اپنے ہیں..... میں تمہاری اپنی ہوں پیار علی..... میں تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ جنہیں میں اپنی عزت کا محافظ سمجھتی ہوں وہی میری آبرو کے قاتل نکلیں گے۔“

”فلمی ڈائلاگ مت بولو لڑکی جب میرے دل میں تمہارے لئے رحم کا کوئی جذبہ نہیں ہے تو تم بلاوجہ مجھے بھائی سمجھتی ہو۔ تم میرے تایا کی بیٹی ہو اور تایا بھی سگا نہیں۔ ہمارے تمہارے درمیان سب کچھ جائز ہے۔“

”تب پھر میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ لعنت ہے تم پر۔“

”بد زبانی کی کوشش نہ کرنا کسی کو علم نہیں ہے کہ میں تمہیں یہاں لے آیا ہوں..... میں تمہاری گردن دبا کر تمہاری لاش کو اس طرح غائب کر سکتا ہوں کہ کسی کے فرشتوں کو بھی اندازہ نہ ہو، میری بات سنو..... تم لوگ اپنی اوقات سے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور میرے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا..... بیٹھو، لباس پہن لو اور اس کے بعد میں تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔“ بحالت مجبوری زرینہ نے اپنی جسم پوشی کر لی تھی..... اس کے ذہن پر شدید خوف و ہراس اور ہیجان طاری تھا..... یہ جو کچھ ہوا تھا اس کے لئے ناقابل یقین تھا..... سارے خواب ٹوٹ گئے تھے..... زندگی میں کچھ بھی تو نہیں پایا تھا..... بڑی بے بسی طاری تھی..... اس وقت اس پر وار بھی کیا تھا تو اپنوں نے لیکن ایسا کیوں ہوا..... وہ وحشت بھرے انداز میں سوچ رہی تھی..... پیار علی نے کہا۔

”سنو زرینہ تمہارے لئے رانا حبیب کے بیٹے رانا محفوظ کا رشتہ آیا ہے..... ہم لوگ یہ بات پسند نہیں کرتے کسی بھی قیمت پر ہمارے خاندان کی لڑکی کسی غیر خاندان میں جائے اور وہ بھی رانا حبیب خاندان میں یہ ہمیں گوارا نہیں تھا..... تمہارے باپ اور بھائی کو سمجھانے کی بڑی کوشش کی گئی لیکن وہ بہت بڑے زمیندار بننے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ یہ خواب پایہ تکمیل کو نہیں پہنچنے چاہئیں..... غلطی تم لوگوں کی تھی، سمجھانے کے باوجود نہیں سمجھے تم

دور نہ اچھا نہیں ہو گا۔“ جواب میں ایک مصنوعی سا قہقہہ سنائی دیا تھا پھر اس شخص نے کہا۔

”اگر تم مدافعت کرنا چاہتی ہو تو میری طرف سے اجازت ہے..... میں ہاتھی کی طاقتور ہوں، تمہیں چیونٹی ہی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔ ورنہ خاموشی سے اپنے میرے حوالے کر دو۔“ وہ آہستہ آہستہ زرینہ کے قریب پہنچ گیا اور زرینہ کے ہوش گم ہونے لگے۔ اس نے حتی الامکان اس شخص کی وحشتوں سے بچنے کی کوشش کی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہاتھی ہی کی طرح طاقتور تھا۔ اس نے زرینہ کو دونوں بازوؤں سے دبوچا اور اٹھا کر بستر کی طرف لے گیا۔ پھر زرینہ کی چیخیں، آہیں اور سسکیاں ہی گونجنے لگیں تھیں اور اس کی عزت کا چراغ گل ہو گیا تھا۔ وہ آخر وقت تک شدید جدوجہد کرتی رہی لیکن اس بات سے بے خبر تھی کہ کوئی اور بھی یہاں اس کمرے میں موجود ہے جو اس کا روبرو کر رہا ہے..... البتہ وہ ایسی جگہ تھا کہ زرینہ کو نظر نہیں آ رہا تھا..... زرینہ سخت وحشت کے عالم میں اپنے قاتل کا نقاب نوج لیا اور دوسرے لمحے اس کے ہاتھ پاؤں سر پڑ گئے اس کے منہ سے دہشت بھری آواز نکلی۔

”پیار علی بھیا۔“

”پاگل ہے دیوانی ہے..... میں تیرا بھائی کہاں سے ہو گیا؟“

”یہ تم نے، یہ تم نے کیا کیا..... پیار علی بھیا؟ کیوں کیا ایسا؟ میں تو تمہارے لئے تھی..... ہمیشہ بھائی سمجھا میں نے تمہیں..... میں نے ہمیشہ تمہیں ایک بھائی کا درجہ دیا..... یہ تم نے کیا کر ڈالا..... اپنے دل پر گھونسا مار دیا۔“ پیار علی ہنسنے لگا پھر بولا۔

”بے وقوف لڑکی جو رشتے ہوتے ہیں وہی مناسب رہتے ہیں، کسی کو بھائی کا پکارنا حماقت کی بات ہے..... ہماری کوئی بہن نہیں ہے اور ہم نے تجھے کبھی بہن نہیں سمجھا تھا..... لڑکی تھی..... لڑکی ہے اور لڑکی رہے گی۔“

”تم نے، تم نے بہت بڑے جذبے کا قتل کیا ہے پیار علی تم نے..... تم نے مجھے آبرو کر دیا ہے..... آہ ہم نے تو تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑا تھا۔“

”بگاڑا ہی تو تھا جس کے لئے مجھے یہ سوچنا پڑا ورنہ سانا خان کو ایسے اقدامات کرنے کی ضرورت نہیں پیش آتی..... لوگ اپنی عزتوں کو ہمارے حوالے کرنا فخر سمجھتے ہیں..... لوگ زیادہ بڑھ رہے تھے..... چلو اب سنبھل جاؤ لباس وغیرہ پہن لو۔“

لوگ۔ ہمارے اپنے بھی کچھ مسائل ہیں اور اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا جائے..... اس کے علاوہ زرینہ ادھر دیکھو تمہارے لئے کچھ اور بھی کارروائیاں ہوئی ہیں..... آجاؤ۔“ پیار علی نے کہا اور ایک الماری کے عقب سے ایک شخص باہر نکل آیا، وہ بھی نقاب اوڑھے ہوئے تھا۔ یہ کون تھا زرینہ اس کے بارے کچھ نہیں جانتی تھی..... پیار علی نے کہا۔

”اس کے ہاتھ میں ایک کیمرا دیکھ رہی ہو۔ اس کیمرے میں تمہاری ایک ایک تصویر موجود ہے اور اس وقت جو کھیل یہاں ہوا ہے اس کی ساری داستان اس میں چھپی ہوئی ہے۔ یہ مجبوری تھی اور اب تمہیں یہ احساس ہو گیا ہو گا کہ اس مجبوری کے پیچھے کیا تھا..... کاش میرا چہرہ نہ دیکھتیں لیکن کوئی حرج نہیں ہے، جو کچھ دیکھ لیا ہے اسے تمہیں اپنے ذہن میں ہی رکھنا ہو گا..... تم اس واقعہ کا تذکرہ کسی سے نہیں کرو گی اور کسی کو نہیں بتاؤ گی کہ تمہارا ساتھ کیا ہوا ہے، لیکن تمہیں اس شادی سے خود ہی انکار کرنا ہو گا اور خبردار زیادہ مرد میدان بننے کی کوشش کی تو باپ اور بھائی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی..... سمجھ رہی ہو نا تم؟“ زرینہ کے بدن کا لہو خشک ہو گیا تھا..... ایک سادہ سی مزاج کی لڑکی تھی..... زندگی میں کبھی کسی سے سرکشی نہیں کی تھی..... بزدل اور کمزور بھی تھی..... سہم کر رہ گئی..... پیار علی نے کہا۔

”اور اب یہ تم پر منحصر ہے کہ ہر راز کو راز رکھو..... بس کسی بھی قیمت پر تم اس شادی کے لئے تیار نہیں ہو گی..... اگر مناسب سمجھو تو خود اپنے کمرے میں جا کر آرام سے سو جاؤ ورنہ پھر جو دل چاہے کرو..... یہ تمہاری مرضی ہے..... میں نے تمہیں سب کچھ سمجھا دیا ہے۔“ پیار علی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور زرینہ کا انتظار کرنے لگا..... زرینہ آہستہ آہستہ کمرے سے باہر نکل گئی..... چاروں طرف گہری خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ اپنے کمرے تک پہنچنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی لیکن جو کچھ ہو چکا تھا وہ اس کے لئے موت کے مترادف تھا۔ خاموشی سے اپنے بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ کیا کرے..... جان دے دے یا پھر اسی عالم میں زندہ رہے..... اس کی دنیا تو برباد ہو چکی تھی..... جینے کے لئے اب کوئی سہارا بھی نہیں رہا تھا..... ماں باپ کے زیر سایہ ایک سادہ سی زندگی گزاری تھی، یہ نہیں پتا تھا کہ زندگی میں ایک ایسا بھنور بھی آئے گا جو اسے پاتال کی گہرائیوں تک لے جائے گا..... ایک ایک بات یاد کر رہی تھی اور سخت دہشت زدہ تھی..... ہاشم علی ساندہ بھی اسی خاندان کے فرد

راگ علی ساندہ کے دور کے ایک تباہ کے بیٹے اور وراثت میں انہیں بھی کچھ زمینیں ملے..... اپنے طور پر زندگی گزار رہے تھے کہ راگ علی ساندہ کو محبت آئی۔ تباہ زاد بھائی کو بھلائے آئے..... بھلایا پھسلایا اتنا پیارا اتنی محبت دی کہ ہاشم علی ساندہ بھائی کے گردیدہ بنے اور پھر بہت محبت کے ساتھ ان کی زمینیں بھی راگ علی ساندہ کی زمینوں میں ضم کر لیں..... کچھ اصول طے پا گئے تھے اور ان کے مطابق کام کیا گیا تھا، چنانچہ حویلی ہی میں رہا۔ ان کے لئے منتخب کر دیا گیا، اپنوں کو دور نہیں رہنا چاہئے..... آصف علی ساندہ اور ہاشم علی ساندہ کی بیوی کے ساتھ یہیں حویلی میں رہ رہے تھے۔ انہیں بن مقول وظیفہ ملتا تھا اور ابھی تک کوئی ایسی چپقلش نہیں ہوئی تھی..... راگ علی ساندہ نے ہاں کوئی بیٹی نہیں تھی لیکن اس کے ذہن میں کبھی یہ تصور نہیں آیا تھا کہ زرینہ کو اپنے بہن کی بہن بنالے..... اپنے بیٹوں کے لئے تو اس نے بہت بڑے بڑے معیار قائم کر رکھے تھے اور اسی انتظار میں تھا کہ کوئی ایسا رشتہ طے جس سے اس خاندان کی عظمت کو چار چاند لگ جائے..... بھلا ہاشم علی ساندہ اس قابل ہے۔ آصف علی کو البتہ باپ سے اختلاف رہا تھا لیکن حرام نے کبھی زبان کھولنے نہیں دی تھی..... پھر ایک اور خاندان سے زرینہ کے لئے رشتہ البتہ رانا حبیب بہت بڑی حیثیت کا مالک تھا بلکہ اس کی زمینیں راگ علی ساندہ سے بھی زیادہ ملے..... البتہ وہ بالکل ہی الگ جگہ کا باشندہ تھا، ہاشم علی سے ملاقات تھی، چنانچہ اس نے اپنے لئے رشتہ دیا اور ہاشم علی یہ رشتہ کرنے پر تیار ہو گیا..... حالانکہ راگ علی ساندہ نے بہنوں سے مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ غیر خاندان میں رشتہ کسی طور مناسب نہیں ہے..... اپنے ہی خاندان میں کوئی لڑکا تلاش کر لیا جائے گا..... ہاشم علی نے راگ علی ساندہ کو بڑا مکرراتے ہوئے کہا کہ بھائی جی لڑکے تو اپنے ہاں دو دو ہیں اگر آپ کے دل میں ان سے کوئی خیال ہے تو ظاہر ہے میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات کوئی اور نہیں ہے..... راگ علی ساندہ ادانت پیتا رہ گیا..... اس نے کہا۔

”ہاشم علی خدا سے ڈرو کیا تم یہ بھول گئے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کتنا فرق ہے..... کیا تم میرے دونوں بیٹوں کے لئے اپنی بیٹی کو مناسب سمجھتے ہو..... تم خود فیصلہ کرو..... ان کا مقام کیا ہے اور تم کیا ہو؟“ ہاشم علی کو پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ راگ علی ساندہ سے کچھ اور ہے..... وہ ساری محبت زمینوں کو ہتھیانے کے لئے تھی..... حالانکہ

پیارے ہاتھوں نے موچوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”تم سے زیادہ سمجھدار ہے بھائی ہاشم علی اس خاندان میں اس کا گزر نہیں
میشہ جوتیوں کے نیچے رہے گی۔ تم اتنے فکر مند مت ہو۔ منع کردوان لوگوں

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا جواب دوں۔“

”پیشانی تم چھوڑ دو بس ہماری ہاں میں ہاں ملائے رکھنا۔ رانا حبیب کو جواب ہم
”تم اس کے لئے فکر مند نہ ہو۔“

”جیسا آپ مناسب سمجھو بھائی بہر حال یہ آپ ہی کا خاندان ہے۔“ ہاشم علی مان
پیار علی اور نور علی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی تھی اور وہ دونوں مطمئن
ہوئے تھے۔



ایسی ویرانی، ایسا سناٹا سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہاں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ پورا
گزر گیا تھا نہ تو اس کو ٹھہری میں کوئی داخل ہوا تھا نہ کوئی باہر نکلا تھا۔ چھوٹی سی خوشنما
وغی تھی جس کے سامنے کے احاطے میں بہت سے درخت لگے ہوئے تھے۔ عمارت
کی خاصی اچھی تھی لیکن بس اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ پھر سردار علی کی
لوہنی ہی گھوم گئی۔ اس نے سوچا کہ ممکن ہے شہنشاہ کو اس عمارت کے بارے میں کچھ غلط
طمانت ملی ہوں اس میں کوئی رہتا ہی نہ ہو، کم از کم معلومات تو حاصل کی جائیں اور رپورٹ
دینے کی جائے۔ اہل محلہ سے احتیاطاً ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ
ان کی ہدایت نہیں تھی۔ ویسے بھی کوٹھیاں کافی کافی فاصلے پر تھیں اور یہ اندازہ ہو گیا تھا
کہ یہاں کے لوگ ایک دوسرے سے رابطہ نہیں رکھتے۔ گھومی ہوئی کھوپڑی نے سردار علی
سے عقل چھین لی۔ سامنے کا حصہ تو خیر غیر محفوظ تھا، لیکن اگر اس لمبے راستے کو عبور
کئے کوٹھی کے عقبی حصے میں پہنچا دیا جائے تو شاید کچھ اندازہ ہو سکے۔ کوٹھی کی صحیح
مست حال جاننے کے لئے اس نے ایک نشان منتخب کیا اور پھر فاصلہ طے کر کے کوٹھی کے
غیر مل پہنچ گیا۔ چھوٹی سی گلی تھی جس کے دوسری جانب اور بھی کوٹھیاں تھیں، لیکن
سب خاموش اور پرسکون۔ البتہ ان میں کہیں کہیں چوکیدار وغیرہ نظر آ جاتے تھے۔

بٹے نے ہمیشہ منع کیا تھا لیکن ہاشم علی ٹریپ ہو گیا تھا۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ رانا
ساندانے اسے اپنا طفیلی بنالیا ہے، لیکن صلح جو آدمی تھا۔ زندہ رہنے کا خواہش مند
اور جانتا تھا کہ راگ علی کیا چیز ہے، چنانچہ خاموش ہو گیا لیکن دل میں ایک پھانسی نہ بٹو
تھی اور اب ساری تصویریں اس کے سامنے عیاں ہو گئی تھیں لیکن سب کچھ ہاتھ سے نہ
تھا کیا کر سکتا تھا۔ رانا حبیب سے ہونے والا رشتہ اس نے ختم نہیں کیا البتہ راگ علی
ضرور کہہ دیا کہ رشتہ بہت اچھا ہے اور وہ اپنی بیٹی کو اپنے پسند کے مطابق بیاتے کا
ہے۔ راگ علی اس سلسلے میں کوئی مداخلت نہ کرے، چنانچہ راگ علی خاموش ہو گیا۔
کی جو زبان تھی وہ ہی بیٹوں کی تھی۔ پیار علی اور نور علی سوچوں میں ڈوب گئے۔
کہا طور اتنے بڑے خاندان میں نہیں جانا چاہئے تھا، بعد کے معاملات بھی تھے جن کا
ضروری تھا۔ آخر کار دونوں شیطانوں نے یہ فیصلہ کیا اور اس پر عمل کر ڈالا۔

گزرتی رہی اور زرینہ سوچتی رہی کہ اسے کرنا کیا چاہئے۔ خود کشی بہت آسان چیز ہے۔
مر بھی جاؤں تو بعد میں زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ باپ اور بھائی کو اس کے بارے میں
شاید وہ برداشت نہ کر سکیں، کچھ ہونا چاہئے کوئی ایسی تدبیر کوئی ایسی تجویز جس سے
حال بدل جائے اور ان شیطانوں سے انتقام لیا جاسکے۔ کچھ کرنا ضروری ہے دیے
اب ایک باعزت مرد کی بیوی بننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ صبح اذان کے وقت اس نے
سوچوں کی تکمیل کر لی اور فیصلہ کیا کہ فی الحال پیار علی کی ہدایت کے مطابق ہی عمل کرے
اور موقع کی تاک میں رہے گی کہ ان شیطانوں کو فنا کیا جاسکے۔ باپ اور بھائی کی
خطرے میں ڈالنا بالکل مناسب نہیں ہے، چنانچہ وہ بالکل خاموش رہی اس نے اندازہ
کہ پیار علی اس پر گہری نگاہ رکھ رہا ہے چونکہ ہاشم علی اور آصف علی کو اس سلسلے میں
نہیں معلوم تھا اس لئے ان کے رویے میں بھی کوئی فرق نظر نہیں آیا تھا۔ پیار
اس وقت مزید اطمینان ہو گیا جب رانا حبیب کی جانب سے اس سلسلے میں بات ہوئی۔
زرینہ نے اس شادی سے انکار کر دیا کیونکہ ہاشم علی نے راگ علی سے مشورہ کیا تھا۔
دونوں بھائی بھی پاؤں سو جوتھے۔ ہاشم نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔
”وہ لڑکی بالکل خود سر نہیں ہے۔ زندگی میں کبھی اس نے سر اٹھا کر بات
لیکن نہ جانے کیوں رانا حبیب کے ہاں کے رشتے سے وہ منکر ہو گئی ہے۔“

”پستول ہی کا کھیل اچھا ہوتا ہے انکل..... آئیے آپ کو ہم اپنی دادی سے ملائیں۔“
”سک..... کیا مطلب؟“

”انکل، بلکہ چور انکل! اگر آپ نے ذرا بھی ادھر ادھر جنبش کی تو آپ کا بدن گولیوں سے چھلنی ہو جائے گا اور ہم خاموشی سے آپ کی لاش اپنی کوٹھی کے بائیں گوشے میں بنے پڑے اس گھر سے گڑھے میں پھینک دیں گے جہاں پہلے کبھی ٹیوب ویل لگا ہوا تھا اور اب وہ صرف دیل ہے۔ اس میں پتا بھی نہیں چلے گا کہ ایک انسان دفن ہو گیا ہے۔“ لڑکے کے لہجے میں ایسی سفاکی تھی کہ سردار علی کو اپنے بدن میں سنسنی کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے بولا۔

”نہیں بچو! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ چلو دادی جان سے بھی مل لیتے ہیں۔“

”مخم دروازہ کھولو، میں انکل کی نگرانی رکھوں گا، انکل یہ تو آپ کو پتا ہی ہے کہ ہمارے ہاتھوں پر سائی لینسر لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی چیخ ہی کی آواز زیادہ سے زیادہ یہ ظاہر کر سکتی ہے کہ کوئی مر گیا، پستول سے تو آواز نہیں ہوگی۔“

”نہیں نہیں اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، چلو۔“ سردار علی پھنس گیا تھا اور اس کی حالت خراب تھی۔ ایک لڑکے نے عقبی دروازہ کھولا، دوسرا پوری طرح چوکس تھا..... سردار علی کی کھوپڑی ہوا میں اڑ رہی تھی۔ بچوں کے ہاتھوں اس طرح بے بس ہونے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، ایک لڑکا آگے چل رہا تھا اور ایک پیچھے اور دونوں اتنے مستعد تھے کہ سردار علی کو ایک لمحہ بھی کچھ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ایک لمبی راہداری گزیر کر ان کے بعد وہ ایک ہال میں پہنچے..... بڑا سا ہال تھا جس میں قالین بچھا ہوا تھا..... کچھ شیش بھی تھیں..... تھوڑے سے ڈیکوریشن پیس رکھے ہوئے تھے غالباً یہ سامنے کے حصے سے داخل ہونے کے بعد پہلی نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا..... یہاں ایک بچے نے آواز دی۔

”دادی جان، دادی جان..... دیکھئے کون آیا ہے۔“ ایک جانب بنی ہوئی چوڑی بڑھیل پر ایک عمر رسیدہ عورت نظر آئی..... سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھی، دوپٹہ سر پر لٹا ہوا تھا، آنکھوں پر چشمہ لگا ہوا تھا..... عمر اچھی خاصی تھی لیکن جسمانی موزونیت بے مثال تھی۔ اس نے جبران نگاہوں سے سردار علی کو دیکھا..... پھر میزریاں اتر کر نیچے آگئی..... تعجب لہجے میں بولی۔

سردار علی نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور اس کے بعد اچھل کر اس دیوار پر چڑھ گیا۔ اوپچی نہیں تھی کہ اسے عبور نہ کیا جاسکے۔ پھر دیوار کے دوسری جانب وہ کیاری میں گر پڑا اور اس کے لباس پر کچھ لگ گئی تھی..... کیاری خوب بھیگی ہوئی تھی اور اس میں پانی نہ تھا..... سردار علی نے اپنے لباس کو دیکھ کر برا سا منہ بنایا، جوتے بھی مٹی میں تھسے..... لیکن اب جب ایک کوٹھی میں گھسا تھا تو پھر ان چیزوں کا خیال نہیں کیا جاسکتا تھا، چنانچہ وہ جھکا سا آگے بڑھنے لگا اور عمارت کے عقبی حصے کے بالکل قریب پہنچ گیا لیکن وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے کہ اچانک ہی اسے آہٹیں محسوس ہوئیں..... دو لڑکے نظر آئے جو اسے دلچسپی کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے..... عمریں گیارہ بارہ سال یا زیادہ سے زیادہ، سال سے زیادہ نہیں تھیں..... دونوں نہایت خوب صورت لباس میں ملبوس تھے اور ان کے چہرے روشن نظر آ رہے تھے..... خوب صورت بچوں کو دیکھ کر سردار علی مسکرا دیا اور ان میں سے ایک بچے نے بے باکی سے کہا۔

”ہیلو انکل، کہئے چوری کرنے آئے ہیں۔“ سردار علی کو فوراً ہی سوجھ گئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”جہاں تم جیسے مستعد بچے موجود ہوں وہاں چوری کیسے کی جاسکتی ہے۔“
”ہماری مستعدی کا اندازہ تو ابھی آپ نے لگایا ہی نہیں انکل بلکہ چور انکل۔“ دوسرے لڑکے نے کہا اور اپنے لباس سے ایک پستول نکال لیا۔ سردار علی نے پریشان نگاہوں سے پستول کو دیکھا، اعلیٰ درجے کا پستول تھا اور اس پر سائی لینسر لگا ہوا تھا۔ یہی عمل دوسرے لڑکے نے بھی کیا تھا۔ ان چھوٹی عمر کے بچوں کے ہاتھوں میں اصلی پستول دیکھ کر سردار کو شدید خطرے کا احساس ہوا..... وہ مسکرا کر بولا۔

”پستول اصلی ہیں؟“
”ملاحظہ فرمائیے۔“ ایک لڑکے نے کہا اور پھر اس نے سردار علی کے پیروں کے تین فائر کئے..... سردار علی سناکت رہ گیا تھا۔ دوسرا لڑکا بولا۔

”اور انکل، میرا پستول بھی ایسے ہی کمالات دکھا سکتا ہے۔ آپ ہوا میں پیسہ اچھال دیکھئے ہم اسے نشانہ بنالیں گے۔“
”یقیناً یقیناً اندازہ ہوتا ہے، لیکن پیارے بچو! پستول کا کھیل اچھا نہیں ہوتا۔“

بہارنا چاہئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”میڈم۔ میں خاندانی چور ہوں..... اگر بھیک مانگتا ہوتا تو اب تک لکھ پتی بن چکا ہوتا۔
نہ ایسے ہی چھوٹی موٹی چوریاں کر کے گزارا کر لیتا ہوں۔ یہاں میں کامیاب نہیں ہو سکا تو
بات نہیں۔ اب فیصلہ آپ پر منحصر ہے کہ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں یا یہاں سے
بہنے دیں۔ یہ دوہزار روپے کا مذاق مجھ سے نہ کریں آپ۔“

”یہ بالکل مذاق نہیں ہے۔ رقم لو اور یہاں سے نکل جاؤ اور اگر واقعی خاندانی ہو تو پھر
مجھے یہ دوہزار کاچر کا بھی نہ دو، جہاں تک پولیس میں اطلاع کرنے کا معاملہ ہے تو ب فکر رہو
مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، جو کچھ کر رہے ہو اس سے کسی نہ کسی دن بری طرح
نشان اٹھاؤ گے۔ یہ نقصان میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں نہیں پہنچانا چاہتی..... ہو سکے تو
سنبھل جانا اور نہ سنبھل سکو تو جہنم میں جاؤ۔ لو لڑ کو یہ پستول لو اور انہیں دروازے سے باہر
نکل دو۔“

”کون سے دروازے سے دادی جان، میرا خیال ہے ان کے لئے عقبی دروازہ ہی زیادہ
مناسب رہے گا، پچھلے دروازے سے آنے والے مہمانوں کو پچھلے دروازے ہی سے واپس
بلا چاہئے۔“

”چھوڑو بس..... زیادہ باتیں نہیں کرتے۔“

”چلے انکل۔ ہمارے پستولوں میں ابھی کافی گولیاں موجود ہیں اور ہم آپ کو بتا ہی چکے
ہیں۔ آئیے۔“

سردار علی ٹھنڈا ٹھنڈا واپس چلا گیا۔ یہ حیرت ناک ماحول اس کے لئے واقعی بڑا عجیب
نما۔ اس سے پہلے ایسا ماحول اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا..... بہر حال، یہ بھی ایک دلچسپ
نما تھا۔ لڑکے قیامت نظر آرہے تھے۔ انہوں نے دیوار کے پاس آکر پوچھا۔
”اب یہ بتائیے انکل اگر ہم یہ دروازہ نہ کھولیں تو آپ یہ چوڑی کیاری عبور کر کے
دیوار پر کیسے جائیں گے؟“

”اے۔“ سردار علی نے کہا اور ایک لمبی چھلانگ لگا کر دیوار پر پہنچ گیا۔ پھر دوسری
طرف کودنے کے بعد اس نے لمبی دوڑ لگا دی تھی۔



”کون ہو تم؟“

”دادی جان یہ چور انکل ہیں۔“

”کیا؟“

”یہ چور انکل ہیں دادی جان۔“

”کیا شرارت ہے فہیم، کون ہیں یہ اور کہاں سے آئے ہیں۔ مجھے ان کے آنے کی
اطلاع کیوں نہیں ملی؟“

”اس لئے دادی جان کہ یہ پیچھے کی دیوار کو دھڑکے آئے ہیں، دیکھئے ان کے جوتے اور
کپڑے کتنے خراب ہو رہے ہیں۔ ویسے چور انکل! آپ ہمارا قالین خراب کر دیں گے لیکن
بہر حال آپ آئے ہیں تو آپ کی خاطر مدارات تو ضروری ہے۔“
”تم نے بتایا نہیں کہ تم کون ہو۔“ معمر عورت نے پوچھا۔

”اب جب یہ بچے بتا ہی چکے ہیں تو میری زبان سے کیوں سننا چاہتی ہیں محترم خاتون،
یہ سچ کہہ رہے ہیں..... بس حالات کا ستایا ہوا ہوں، کیا بتاؤں آپ کو بتانے کی کوئی بات ہو تو
بتاؤں..... چوری کی نیت سے ہی داخل ہوا تھا۔“

”انجمن، فہیم پستول میرے حوالے کر دو، کیا فضول بات ہے۔“
”یہ لیجئے دادی جان، لیکن ہمیں اجازت دیجئے کہ چور انکل کی تھوڑی بہت خاطر
مدارت کر دیں۔“

”نہیں، بہت عرصے کے بعد گھر میں ایک مہمان آیا ہے اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ، اس کی
آرزو پوری کر دو۔ دیکھو نوجوان تم کون ہو، کیا ہو میں نہیں جانتا چاہتی۔ چوری کی نیت سے
داخل ہوئے ہو تو میں تمہیں بتا دوں کہ ہم زیادہ خوش حال لوگ نہیں ہیں۔ بس زندگی کی
گاڑی دھکیل رہے ہیں۔ میں تمہیں تمہاری ابتدائی ضرورت پوری کرنے کے لئے دوہزار
روپے دے سکتی ہوں، بس یہی میری اوقات ہے۔ قبول کرنا چاہو قبول کر لو ورنہ یہ بچے
جنہیں تم دیکھ رہے ہو، پستولوں کے بغیر ہی تمہاری وہ درگت بنائیں گے کہ تم زندگی بھر
رکھو گے..... یہ مارشل آرٹ کے ماہر ہیں۔ تم ان کی عمروں پر توجہ مت دو۔“

سردار علی واقعی بوکھلایا ہوا تھا۔ یہ بات تو خیر اس کا دل تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ بچے
زیر کر سکیں گے لیکن صورت حال بڑی عجیب سی تھی۔ ایک لمحے میں اسے فیصلہ کرنا تھا۔

مورت ہی سے نیک اور دین دار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں کو حیرانی سے دیکھا۔

”میں شرمندہ ہوں کہ آپ لوگوں کو پہچان نہیں سکا۔۔۔۔۔ فرمائیے میں کیا خدمت سہوں؟“

”مولوی صاحب آپ کے اس بھانجے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں ایک واردات کے سلسلے میں سزا کاٹ رہا ہے۔“

مولوی ارشاد بری طرح چونک پڑے۔ گھر کی عورتیں شاید اندر تھیں۔۔۔۔۔ دلائل میں انہی مونڈھے پر بیٹھے ہوئے تھے۔

انہوں نے کہا۔

”ہری صحبتوں کا برا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ پتا نہیں ہمارے چہرے پر بدنامی کا یہ داغ کیوں اٹھا، خدا ہی جانے کیا ہوا ہے۔“

”کیا نام ہے اس بچے کا جو سزا کاٹ رہا ہے؟“

”بھائی معاف کرنا ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ تم لوگ ہو کون اور پھر یہ بالکل ذاتی انی ہیں۔ ان باتوں سے تمہارا کیا تعلق ہے۔“

”مولوی صاحب بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہم ایسے واقعات جمع کر رہے ہیں جن میں کچھ بے گناہ لوگ سزا پا رہے ہیں۔ ہمارا لہذا یہ ہے کہ ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں۔“

”نہیں بھائی جو بے گناہ نہیں ہے اسے بے گناہ کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ فیروز بری فیتوں میں پڑ گیا تھا اور اس کا نتیجہ اس نے بھگتنا۔“

”غلط ہے یہ غلط ہے، میں کہتی ہوں غلط ہے خدا کی قسم غلط ہے، میرا بچہ کسی بری صحبت میں نہیں تھا۔۔۔۔۔ ارشاد علی کیجئے پورا تجھ رکھ کر بات کرو۔ تم بھی صاحب اولاد ہو، ایک لڑکے سامنے اس کی اولاد کو بد کردار کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔ صرف تمہارے خوف کی بھینٹ بن گیا ہے۔ تم کہو اسے ایسا۔۔۔۔۔ میرا کیجئے کہتا ہے۔“ اندرونی دروازے سے ایک عمر رسیدہ عورت چنچنی ہوئی باہر نکلی اور مونڈھے سے ٹکرا کر گرتے گرتے پچی۔ اس نے مونڈھے کے ٹکڑے کھینچے ہوئے کہا۔

”بے گناہ ہے میرا بیٹا۔۔۔۔۔ خدا کی قسم میں سچ کہتی ہوں وہ بے گناہ ہے، بس اسے چار

تمام جگہوں سے رپورٹیں موصول ہو گئی تھیں، بیٹا بڑی خوش اسلوبی سے اپنا فرض انجام دے رہی تھی۔ اس نے شہاب کو رپورٹ پیش کی۔

خادم شاہ کی جلی ہوئی حویلی جوں کی توں ہے اس کے بارے میں معلومات کرنے سے پہلے چلا ہے کہ اس حویلی کا دعویٰ ارباب کوئی نہیں رہا ہے۔ دور کے رشتہ داروں نے بھی اس کے لئے کوئی کلیم نہیں کیا کہ وہ سب ہی جانتے تھے کہ یہ دشمنی راگ علی سانداسے تھی اور راگ علی سانداسے کوئی اور دشمنی مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ بستی مہر جان کے ان اطراف میں رہنے والے پرانے بزرگ راگ علی سانداسے کے خلاف دل میں شدید نفرت رکھتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ڈاکوؤں کا کھیل رچایا گیا ہے۔ اصل دشمنی تو راگ علی سانداسے نکالی ہے جسے پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ دوسری رپورٹ بستی نور الہی کی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ راگ علی سانداسکون اور عیش کی زندگی بسر کر رہا ہے اور وہاں کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے جو قابل ذکر ہو البتہ سردار علی کی رپورٹ سب سے زیادہ دلچسپ تھی، جسے سناتے ہوئے بیٹا بھی ہنس پڑی تھی لیکن شہاب نے دلچسپی سے کہا تھا۔

”یہ ایک نیا تصور ذہن میں ابھر رہا ہے، بیگم گوہر جہاں ان بچوں کو کیا بنا رہی ہے اور اس کا طریقہ کار کیا ہے۔ ویسے خاصی گہری عورت معلوم ہوتی ہے لیکن بہر طور عورت ہے ممکن ہے اس نے سردار علی کے بارے میں کسی اور انداز میں سوچا ہو لیکن اس کا اظہار نہیں کیا۔“

پھر مولوی ارشاد علی کے بارے میں بھی تفصیلات موصول ہوئیں۔ ان کے بارے میں بھی یہی پتا چلا تھا کہ گھر میں وہ ہیں ان کی بیوی ہے اور بچے ہیں اور وہ اندھی اور بڑبڑاہن بھی موجود ہے، پہلے شاید اندھی نہیں تھی اب اندھی ہو گئی ہے۔“

شہاب نے بیٹا سے کہا۔

”میرا خیال ہے بیٹا ان لوگوں سے ملاقات کر لینی چاہئے کیونکہ ان لوگوں سے ملاقات کی روشنی میں ہم جیل سے اس لڑکے کو نکالیں گے جو مولوی ارشاد علی کا بھانجا ہے کم از کم ایک ایسا خاندان ہمارے علم میں ہے جس تک ہم با آسانی پہنچ سکتے ہیں۔ باقی تینوں کے بارے میں تو کوئی تفصیل کہیں سے نہیں ملے گی۔ مطلب یہ کہ ان کے پس منظر کے بارے میں۔“

”اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں سر تو ٹھیک ہے۔“ پھر بیٹا اور شہاب خود پرانے تجربے کے بنا پر مولوی ارشاد علی کے گھر پہنچے تھے۔

”عزیزی حقیقت تو بستی نور الہی کے ہر شخص کے علم میں ہے۔ حقیقت کون نہیں
بند شہزاد علی ساند ایک مرد و انسان تھا۔ مہر جان کے بد نصیب خاندان پر ظلم ہوا۔ خادم
بیک بی شہناز کو بے عزت کر کے قتل کر دیا گیا۔ غیرت مند کو جوش آنا ہی چاہئے تھا۔
نہوں نے انتقام لیا اور ساندوں نے انہیں خاکستر کر دیا لیکن وہ غیرت مند مر کر بھی سرخرو
ہئے۔ مجھے تو قانون سے شکوہ ہے۔ کیا یہ صرف دولت مندوں کے تحفظ کے لئے بنایا گیا
ہے۔ کاغذ کے ٹکڑوں اور چمکتی دھات نے انسانیت کو کس طرح پچھاڑ دیا ہے دیکھ رہے ہو۔
ہزار ہا ہوئی۔ قانون کے کاغذوں کو پر کرنے کے لئے سرخ سیاہی درکار ہوئی تو غلام چن لئے
مے جنہوں نے سزا پائی وہ بے گناہ تھے۔ اس بد نصیب کی کہانی یہ ہے کہ وہ پیار علی ساند کے
معاہدوں کے ساتھ بیٹھنے لگا تھا۔ اس سے قربانی مانگی گئی یہ کہہ کر کہ اگر اس نے وفاداری نہ
کی تب بھی قربان کر دیا جائے گا مگر اکیلا نہیں اپنے اہل خانہ کے ساتھ۔ بچہ تھا۔ ڈر گیا اور
نور کو ڈاکو درج کرا دیا۔ بس یہ کہانی ہے۔ ہم عزت اور جان بچا کر یہاں آچھپے۔ بتاؤ کیا
کروں۔ کہاں جاؤں۔ اگر اب پولیس اسٹیشن جا کر حقیقت حال بتاؤں تو پاگل خانے
پہنچا دیا جائے گا۔ کوئی ہوگا میرا پرسان حال۔ ساندوں کو پتا چلے گا تو جان سے مار دیں
گے۔ نہ صرف مجھے بلکہ ان سب کو بتائے آپ ان بے گناہوں کی زندگی کا دشمن بن
جاؤں، اگر مجھے ہلاک کر دینے سے بات بن سکتی ہے تو سومر تہ اپنی قربانی دینے کے لئے تیار
ہوں، ان سب کو کیسے قربان کر دوں کچھ کر سکتا ہوں، میں آپ ہی اپنے سینوں پر ہاتھ رکھ
کر بتاؤں، کیا کروں میں کیا کروں، میری بہن اندھی ہو گئی ہے اپنے بیٹے کے غم میں، میں
اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ سوائے دعاؤں کے ایک آس تو ہے کہ آخر کار ایک نہ
ایک دن اس کی سزا پوری ہو جائے گی۔ واپس آجائے گا اس دن کے لئے میں اس عورت کو
زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ سینے سے لگا تو لے گی اپنی اولاد کو۔ ارے اگر جدوجہد کروں، بھاگ
دور کروں تو کیا ساندوں سے مقابلہ کر سکتا ہوں، کیا میں اس قابل نظر آتا ہوں آپ کو۔
تائے کیا کروں۔ کیا کر سکتا ہوں میں۔ بس جی رہا ہوں اس آس پر کہ آخر کار اس کی سزا
ختم ہو جائے گی۔ ہمارے ہاں بھی سورج نکل آئے گا۔ اس وقت میں اس کے بیٹے کو اس کے
والے کر کے اس سے معافی مانگ لوں گا اور کہوں گا میری بہن کبھی ایسی قربانیاں بھی
ڈنڈا پڑ جاتی ہیں جن کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔ بس یہ گردش تقدیر ہے اور ہم تقدیر سے لڑ

بنالیا گیا ہے، ارے میری کوئی آواز نہیں ہے کس سے فریاد کروں، کس سے کہوں، اندر
ہو گئی ہوں میں اس کی یاد میں روتے روتے، کسی کا دل نہیں پیچھا، کسی نے ایک بے سہار
عورت کی فریاد نہیں سنی، اس کا باپ زندہ ہوتا جان کی بازی لگا کر اسے بچاتا۔ کوئی نہیں
ہے ہمارا۔ کوئی نہیں ہے ہمارا۔“

”آپ اندر جائیے عائشہ بہن آپ اندر جائیے آپ کیوں باہر آگئیں۔ جناب فرید
ان کا بیٹا ہے، بے چاری در حقیقت اسے یاد کر کے آنکھیں کھو چکی ہیں اور اب ذہنی توازن بحال
متاثر ہو رہا ہے۔“

”ارشاد علی خدا کو منہ دکھانا ہے، خدا کو بھی یاد کر لو اپنی زندگی اور اپنے بچوں کو بچانے
کے لئے میرے بچے کو اس قدر بے کردار نہ بناؤ، تمہیں خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔“
مولوی ارشاد علی رو پڑے۔ انہوں نے بے اختیار روتے ہوئے کہا۔

”آپ اندر جائیے عائشہ بہن آپ اندر جائیے۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ میری
زندگی چلی جائے تو ہزار بار اپنے آپ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن میرے بچے
میرا گھر۔ عائشہ بہن آپ کو خدا کا واسطہ آپ اندر چلی جائیے۔“

”چلی جاتی ہوں، خدا را ان سے یہ نہ کہو کہ میرا بچہ گناہ گار ہے، تم جانتے ہو وہ بے گناہ
ہے۔ ارے وہ ڈاکہ تو کیا ڈالے گا۔ کسی کی حویلی کو کیا ہی جلائے گا وہ تو کسی چڑیا کے بچے کو
بھی نہیں مار سکتا مگر تقدیر کا بیٹا تھا آگیا جال میں دشمنوں کے، جارہی ہوں بھائی، رہنا تو نہیں
ہے اب تو آنکھوں کا سہارا بھی چھن گیا ہے۔ کہیں اور جاؤں گی تو کیا کروں گی سوائے
سزائوں پر بھیک مانگنے کے۔ جارہی ہوں بھائی جارہی ہوں۔“ معمر عورت ٹٹولتی ہوئی
دروازے کی جانب بڑھی اور اندر چلی گئی۔ شہاب اور مینا کے روٹنے کھڑے ہوئے تھے۔
دونوں ہی سخت متاثر نظر آرہے تھے۔ مولوی ارشاد بلک بلک کر روتے رہے۔ شہاب نے
ہمدردی سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کی مجبوری جانتا ہوں۔ یقیناً آپ بہت نیک انسان ہیں لیکن کبھی کبھی
انسان کو اپنے ضمیر کے خلاف بھی کچھ کرنا پڑ جاتا ہے لیکن کہا جاتا ہے ہر تاریک رات
کے بعد روشن صبح ضرور ہوتی ہے۔ آپ اگر مناسب سمجھیں تو مجھے حقیقت بتا دیں۔“
وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو نقصان نہ پہنچنے دوں گا۔“

نی تھی۔“

”یاد آگیا مجھے۔ میں انتظام کرتا ہوں۔“ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے متعلقہ افراد کو بلایا ہندوات نکلائے گئے، نام دیکھے گئے۔ باقی تین نام بھی درج تھے لیکن ان کا پس منظر شہاب کو معلوم نہیں تھا اور پھر ایک آدمی سے کام چل جاتا تھا تو بات چاروں کے لئے بے کار تھی، چنانچہ فیروز کو طلب کر لیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے بڑی اپنائیت کے ساتھ ایک کمرے میں ملاقات کا بندوبست بھی کر دیا تھا اور فیروز نامی نوجوان کے بارے میں معلومات بھی حاصل کی تھیں مگر ان نے بتایا۔

”نہیں جناب وہ تو بڑا سیدھا سادہ لڑکا ہے بلکہ نمازی پر ہیز گار ہے۔ آج تک اس نے کوئی سرکشی نہیں کی اس کا ریکارڈ بہت اچھلے۔“

”ٹھیک ہے لے آؤ اسے۔“

چھوٹی سی داڑھی، پیلا مدقوق چہرہ، خوف زدہ آنکھیں زیادہ عمر بھی نہیں تھی۔ شہاب نے فیروز کو بغور دیکھا۔ ہاتھ آگے بڑھا کر ہاتھ ملایا اور نرمی اور محبت سے بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ فیروز خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ہونٹ سوکھے ہوئے تھے، بدن میں خوف کی لرزشیں تھیں، شہاب کو ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا کہ یہ بے چارہ بھلا کیا ڈاکہ زنی کر سکتا ہے۔ وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”فیروز میں محکمہ پولیس سے تعلق رکھتا ہوں۔ تمہارے سلسلے میں نئے سرے سے تفتیش کا آغاز کر رہا ہوں اور تم سے مدد چاہتا ہوں کیا تم خلوص دل سے میرے سوالات کے جواب دینا پسند کرو گے؟“

”جی سرکار میں وعدہ کرتا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ اس نے کھر کھراتی آواز میں کہا۔

”فیروز کیا تم بستی مہر جان میں ڈاکہ زنی کرنے گئے تھے؟“ اس کی آنکھیں حلقوں میں گردش کرنے لگیں۔ سخت زروس نظر آ رہا تھا پھر اس نے کوئی فیصلہ کر لیا اور آہستہ سے بولا۔ ”نہیں جناب میں کہیں نہیں گیا تھا۔ میں تو بس اپنی بستی میں رہتا تھا۔ کچھ غلطیاں ہوئی تھیں مجھ سے مثلاً میری ماں کہتی تھی کہ کوئی کام کروں، محنت مزدوری کروں، کھیتی باڑی کروں، کہیں بھی کوئی کام تلاش کروں، یہاں کام نہیں کر سکتا تو شہر چلا جاؤں، بس میں نے ماں کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی اور اس وقت بھی میرا ایمان ہے کہ مجھے اس وقت جو

نہیں سکتے۔ میں آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں بھیک مانگتا ہوں آپ سے کہ لوگ اس سلسلے میں کچھ نہ کریں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ ورنہ ہم مارے جائیں گے۔ مارے جائیں گے ہماری وکالت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔“ مولوی ارشاد پھر رہنے شہاب نے چند لمحات خاموشی اختیار کی پھر جب ان کے دل کی بھڑاس نکل گئی تو اس نے ”آپ دین دار آدمی ہیں، ہر فرعون کے لئے موسیٰ کا تصور پیش کیا گیا ہے کیا آپ کی ذات پر یقین نہیں رکھتے، کیا یہ نہیں سوچتے کہ ایک نہ ایک دن ساندوں کا زوال بھی آئے گا اور اس وقت آپ کو سرخروئی حاصل ہوگی۔ خیر میں ابھی آپ سے کچھ نہیں کہتا۔ اس تصور کو دل سے نکال دیجئے جو کہ گفتگو میرے اور آپ کے درمیان ہوئی ہے۔ وہ اس سے آگے بڑھے گی، کوئی نقصان نہیں ہوگا آپ کو، بالکل اطمینان رکھے گا اور اب ہم چلتے ہیں۔“

مولوی ارشاد علی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ شہاب اور بیٹا وہاں سے اٹھ گئے لیکن جو غم ماحول جو صورت حال ان کے علم میں آئی تھی اس نے انہیں مضطرب کر دیا تھا۔



سپرنٹنڈنٹ جیل خانہ جات نے غیر متوقع طور پر شہاب کو خوش آمدید کہا تھا اور محبت سے پیش آیا تھا اس نے کہا۔

”بھلا آپ کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے جناب، کہیں نہ کہیں ہمارے آپ کے غلام کمرہ ای جاتے ہیں ایک دوسرے سے تعاون کرنا بہت اچھی بات ہے، فرمائیے میرے لائی خدمت ہے؟“

”بعض اوقات کسی معاملے کی تفتیش کے لئے ایسے پرانے مجرموں کو سامنے لائے جے جو سزا کاٹ رہے ہوتے ہیں، میں ایسے ہی ایک مجرم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ہماری جیل میں ہے؟“

”جی ہاں۔“

”تو پھر مل لیجئے نام بتائیے مجھے؟“

”فیروز نام ہے اس کا بستی مہر جان میں ڈاکے کے الزام میں گرفتار ہوا تھا۔ یہ ہے جس میں بستی مہر جان کے ایک زمیندار کا گھر خاستر ہو گیا تھا اور چار ڈاکوئل

”تمہارے ماموں بھی نہیں؟“

”نہیں جناب۔ وہ نیک اور دین دار آدمی ہیں۔ ہمیں بری صحبت سے بچنے کے لئے

تھے۔“

”ماں بھی تو ہے تمہاری؟“

”جی سرکار!“

”یاد آتی ہے؟“ شہاب نے پوچھا اور فیروز کی گردن جھک گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے تھے۔

”چھوٹے ساندے نے کبھی اپنا کوئی آدمی بھی نہیں بھیجا تمہارے پاس؟“ شہاب نے ہال کیا اور فیروز نے نفی میں گردن ہلا دی، پھر شہاب وہاں سے اٹھ گیا۔ فیروز کو اس نے دلی تسلی وغیرہ بھی نہیں دی تھی۔ یہ مصلحت ضروری تھی..... سپرنٹنڈنٹ کا شکریہ ادا رکے وہ باہر آ گیا تھا۔

ہیڈ آفس میں اپنے دفتر میں پہنچا تو نادر حیات صاحب کا پیغام نوٹ تھا۔ ”مسٹر شہاب! اب آئیں تو مجھے فون کریں۔“ شہاب نے ریسیور اٹھا کر کنٹیکٹ کیا۔ ”سر میں شہاب بول رہا ہوں۔“

”ایک گھنٹے کے بعد میرے پاس آ جاؤ۔“

”بہتر ہے۔“ شہاب نے جواب دیا۔ ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد وہ ڈی آئی جی صاحب کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے..... نادر حیات صاحب نے گھڑی میں اہٹ دیکھ کر کہا۔

”آپ سے اجازت..... وقت ہو چکا ہے..... باقی پھر سہی۔“ وہ لوگ اٹھ گئے..... ان کے دروازے سے باہر نکلنے کے بعد ڈی آئی جی صاحب نے میز کے نیچے لگا مٹن دبایا اور آٹو لاک دروازہ لاک ہو گیا۔ تب وہ بولے۔

”یہ سوال بیکار ہے کہ تم ساندوں پر کام کر رہے ہو۔“

”جی سرکار جاری ہے۔“

”کوئی پیش رفت ہوئی؟“

”جی سر اطمینان بخش۔“

سزا ملی ہے وہ ماں کی نافرمانی کی وجہ سے ملی ہے۔ میں جناب ماں کی بات نہیں مانتا تھا۔ دوستوں کے ٹولے میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ میرے یہ دوست جو اکھیلتے تھے اور مجھے بھی جوڑ کی عادت پڑ گئی تھی، پھر چھوٹے ساندے صاحب نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ میں ان کے غلاموں میں شامل ہو گیا ہوں۔ مجھے وظیفہ ملنے لگا جناب۔“

”چھوٹے ساندے کون؟“ شہاب نے پوچھا۔

”پیار علی نام ہے ان کا۔ بستی نور الہی کے مالک ہیں۔“

”ٹھیک..... آگے کہو۔“

”جناب علی۔ میری گڈی چڑھ گئی..... بستی کے لوگ ہم سے ڈرتے تھے اور ہم سارا بستی میں عیش کرتے پھرتے تھے..... جیسے بندے تھے ہم جو ساندے صاحب کے غلام تھے۔ پھر کوئی واردات ہو گئی جس کا الزام ساندوں پر آیا۔ پیار علی صاحب نے ہمیں بلا کر کہا کہ وفاداری دکھانے کا وقت آیا ہے۔ ہمیں ان کا ساتھ دینا ہے۔ ہم سب نے سینے تان لئے اور وفاداری کے لئے تیار ہو گئے۔ تب ایک وکیل صاحب ہمیں ملے اور انہوں نے ہمیں سبق پڑھایا۔ ہم نے سبق یاد کر لیا اور پولیس کے سامنے وہ سبق سنا دیا۔ تو ہم پکڑے گئے پھر کیا کیا ہوا ہمیں نہیں معلوم تھا، مگر چھوٹے ساندے صاحب ہم سے ملے اور بولے کہ ہمیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ وہ ہمارا بندہ دست کر لیں گے مگر ہمیں سزا ملے ہوئے جیسے مینے ہوئے ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوا ہمارے لئے۔“

”تمہارے ساتھ تین آدمی اور ہیں؟“

”جی سرکار۔“

”ان کے گھروالے ہیں؟“

”دو کے ہیں جی۔“

”وہ کیا کہتے ہیں؟“

”اب پریشان ہو گئے ہیں جی۔ کہتے ہیں دھوکا ہو گیا ہمارے ساتھ۔ ساندے صاحب

ہمیں بند کرا کے بھول گئے اور اب ہماری زندگی جیل میں گزرے گی۔“

”جیل میں تم بے ملنے کوئی آتا ہے؟“ شہاب نے پوچھا۔

”کوئی نہیں جناب۔ بے آسرا پڑے ہوئے ہیں۔“

”جی ہر۔“ شہاب نے جواب دیا۔

”تو یوں کروڈیہ شہاب کہ اس وقت تو تم اس کام کے سلسلے میں ان خاتون سے رابطہ کرو اور اس کام کو سرانجام دو۔ بعد میں ان کا اپائنٹ کر لیا جائے گا۔ تم جس وقت بھی چاہو میں تمہاری بستی نورالہی رواجی کا بندوبست کر لوں۔ وہ اصل لوگ تم سے مل لیں گے جنہیں تمہاری جگہ اس سودے کاری کے لئے جانا تھا۔ انہیں بریف کر دیا جائے گا اور وہ تمہیں بریف کر دیں گے کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“

”سر یہ بہت اچھا ہوا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس سے ہمیں بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔“

”یقیناً..... اچھا اب ایک اور حیرت ناک چیز سے روشناس ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“

ڈی آئی جی صاحب نے کہا اور میز کی دراز کھول کر ایک لفافہ نکال لیا، جس پر ڈاک کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ اوپری حصے پر ڈی آئی جی نادر حیات صاحب محکمہ پولیس کا پتہ درج تھا اور سرخ روشنائی سے خاص پرائیویٹ لکھا ہوا تھا..... ڈی آئی جی صاحب نے لفافہ شہاب کے سامنے ڈال دیا اور بولے۔

”اس میں جو پرچار رکھا ہوا ہے اسے نکال کر پڑھو۔“ شہاب نے حیرت و دلچسپی کے ساتھ وہ کاغذات نکال لیا..... نہایت خوش خطا اردو تحریر تھی اور آغاز اس طرح ہوا تھا۔

جناب ڈی آئی جی صاحب۔

میں آپ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں کہ آپ کا محکمہ بے گناہوں کو گرفتار کر کے سزا دینے میں بڑی مہارت رکھتا ہے اور آپ کے محکمہ کی کارکردگی بے مثال ہے، اس کی خوبی ہے کہ یہ کبھی صحیح آدمی کو نہیں گرفتار کرتا بلکہ اپنے مطلب کے قیدی تلاش کر لیتا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے اس کے لئے یقیناً آپ کو بڑی محنت کرنا پڑتی ہوگی، خبر یہ سب کچھ تو ہے لیکن ہم جیسے لوگ کیا کریں جن کے پاس اس کے سوا چارہ کار ہی نہیں ہے کہ لے دے کر وہ آپ ہی سے رجوع کریں اور اس وقت میں بھی یہی کوشش کر رہی ہوں آپ کی توجہ ایک ایسے خاندان کی جانب مبذول کرانا چاہتی ہوں جو بڑا صاحب حیثیت ہے اور اگر وہ یہ کہے کہ قانون پر اس کی حکمرانی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ وہ واقعی قانون پر حکمرانی کر رہا ہے جرم وہ کرتا ہے سزا جسے چاہے دلوادیتا ہے اس کے لئے کوئی مشعل نہیں ہوتی۔ اس خاندان کا سرنیم ساندہ ہے بستی نورالہی کے ساندے جن کا سربراہ ابن وقت راگ علی ساندہ ہے اور اس کے دست و

”خیر۔ میں اس سلسلے میں کوئی تفصیل نہیں معلوم کروں گا۔ میں اسٹھی رپورٹ ہوں..... میں نے تمہارے لئے ایک ایذاذریعہ نکالا ہے جس کے تحت اگر تم ساندہ کی قریب ہونا چاہو تو ہو سکتے ہو..... کیا تمہیں اس کی ضرورت پیش آئے گی؟“

”جی سر..... یقیناً۔“

”تم نے اس کے لئے کچھ سوچا تھا؟“

”ابھی نہیں لیکن اب یہ کرنا ہے۔“

”ساندوں کی کچھ زمینوں کی سرکار کو ضرورت تھی۔ وہاں کچھ پلانٹ لگانے پر ساندے خوشی سے یہ زمین فروخت کرنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں لیکن وہ اس گڈ جوائن لگ گئے ہیں کہ انہیں ان زمینوں کی بھاری قیمت مل جائے۔ اس سلسلے میں متعلقہ محکمے سے دے دار ارکان کو بھیجا جا رہا ہے۔ جن میں ایک خاتون اور ایک مرد ہے، اگر ان کی جگہ نہ ہو جاؤ تو؟“

”بہترین ہے۔ کیونکہ اس طرح ہمیں ان کی قربت حاصل رہے گی۔“

”بالکل۔ تو پھر میں انتظام کر دوں؟“

”اگر ممکن ہو تو ضرور۔“

”کیا تم کسی نوجوان خاتون کو اپنے ساتھ لے جانے کا بندوبست کر سکتے ہو؟“

”آسانی سے۔“

”بہت شارپ اور معاملہ فہم خاتون ہونی چاہئیں۔“

”ایسا ہی ہو گا سر۔“

”ویسے بھی تمہارے محکمے کے لئے ایسی کسی خاتون کی ضرورت ہے لیکن اس کا

کوالٹی ہونی چاہئے۔“

”میں انہیں خاتون کا نام پیش کر دوں گا سر۔“

”کون ہے۔“

”بینا واسطی۔ ایڈووکیٹ ہے اور ایک ایڈووکیٹ کی بیٹی ہے۔ امیر علی شاہ کی

عدنان واسطی صاحب کا نام سامنے آیا ہے۔ انہی کی تربیت یافتہ بیٹی ہے۔“

”ویری گڈ، گویا تم مجھ سے مطمئن ہو؟“



”نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“
 ”ہاں..... الفاظ بڑے تکیے اور تپش لئے ہوئے ہیں۔ انہیں نہ تو مذاق سمجھا جاسکتا۔“

بہن بول گیا تھا اور زندگی گزر رہی تھی پھر بہن کے رشتے کا مسئلہ درمیان میں آیا..... رانا بہن بہت شاندار تھا اور اس خاندان کے چرچے آصف علی نے بھی سنے تھے۔ یہ بہت بڑا راجہ جو ہاشم علی کو مل رہا تھا اور اس کا ذریعہ ایک اور شخصیت تھی لیکن جب زرینہ نے اس سے سخت انحراف کیا تو باپ بیٹے بڑی مشکل میں پڑ گئے۔ زرینہ سے پوچھا بھی گیا لیکن اس نے اس کی کوئی وجہ بتانے سے انکار کر دیا تھا، بس اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے اس شادی کے لئے مجبور نہ کیا جائے ورنہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ بہن بھائی کے درمیان اچھی خاصی تکلفی تھی، خود آصف علی نے بہن سے پوچھا تھا کہ آخر اس انکار کی وجہ کیا ہے، ابھی تک رانا محفوظ علی کو دیکھا بھی نہیں گیا ہے..... ایک اچھا خاندان ہے اور اس میں رہنے کے بعد ہمارے خاندان کو اور بھی برتری حاصل ہوگی لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ بہن نے بھائی سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس کے لئے مجبور نہ کرے وہ کچھ نہیں مانگی۔ بہر حال یہ معاملہ ذہنوں میں الجھ گیا تھا اور ابھی تک اس کا کوئی حل سامنے نہیں آیا۔ راگ علی نے ایک ذمے داری آصف علی کے سپرد کی، ایک بہت بڑی رقم کی دہائی کا معاملہ تھا ایسے کام وہ اکثر آصف علی کے سپرد کر دیا کرتا تھا اور آصف علی خوش دلی سے انہیں سرانجام دیتا تھا، چنانچہ اس کام سے بھی اس نے انکار نہیں کیا تھا..... بہن بستی جانا پڑا تھا۔ راگ علی نے اسے اپنی بچاؤ دے دی تھی اور وہ بچاؤ لے کر چل پڑا ایک ڈرائیور بھی ساتھ کر دیا گیا تھا جو بھروسے کا آدمی تھا کیونکہ معاملہ بہت بڑی رقم کا تھا۔ آصف علی نے یہ رقم وصول کی اور اس کے بعد احتیاط سے واپس چل پڑا۔ راستے میں نہیں تھے اور اچھی طرح جانے پہچانے تھے۔ چنانچہ ایسی کوئی بات نہیں تھی، جب کہ رقم کے بارے میں مجبوری نہ ہو جائے اور کوئی خاص طور سے اس کی تاک میں نہ لگے۔ آصف علی کو گمان بھی نہیں تھا کہ زندگی میں پہلی بار اس کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جائے گا۔ یہ ایک جانا پہچانا علاقہ تھا..... سنسان اور کسی قدر خطرناک، کیونکہ دونوں علاقوں میں اور اس سڑک پر پانی کی نمی رہتی تھی۔ جس کی وجہ سے ڈرائیونگ میں احتیاط نہ ہوتی تھی۔ ڈرائیور اس وقت بھی نہایت احتیاط سے گاڑی آگے بڑھا رہا تھا اور رفتار سب سے تھی۔ اچانک ایک دھماکہ سنائی دیا اور بچاؤ لنگڑی ہو گئی۔ شکر تھا کہ رفتار تیز نہیں تھی۔ سیدھی ڈھلوانوں میں جاتی اور الٹ جاتی۔ ڈرائیور نے گاڑی با آسانی روک لی تھی

آصف علی ساند اسادہ مزاج نوجوان تھا..... باپ کے احکامات کے تابع تھا اور خوشدلی سے اس بات سے متفق ہو جاتا تھا جس کا فیصلہ باپ نے کیا ہو۔ اپنی زمینوں کی دل سے دیکھ بھال کرتا تھا اور بیشتر بار اس نے ہاریوں کے ساتھ مل کر زمینوں پر کام کیا تھا اور اپنی محنت سے ان زمینوں کو بہترین کاشت کے قابل بنایا تھا، پھر ہاشم علی ساند نے راگ علی ساند اسے مل کر معاہدہ کیا اور زمینیں راگ علی ساند کی زمینوں میں شامل ہو گئیں تو آصف علی کو شدید دکھ ہوا تھا..... اسے اپنی زمینوں سے پیار تھا اور اس نے ان پر جتنی محنت کی تھی اب یہ زمینیں اسے اس محنت کا صلہ دینے کے قابل ہوئی تھیں۔ ایسے وقت باپ نے بھائی کے ساتھ مل کر یہ کھیل کھیل ڈالا لیکن وہ بچپن ہی سے باپ کے احکامات کا تابع رہا تھا اور کبھی کسی بھی بات پر باپ سے انحراف نہیں کرتا تھا..... دل مسوس کر خاموش ہو گیا اور باپ کی خواہش پر سر جھکا دیا لیکن اسے سخت رنج تھا..... اس کا دل مجھ سا گیا تھا..... راگ علی ساند نے ان لوگوں کو اپنی حویلی میں بلایا تھا..... ہاشم علی خوشی خوشی اس حویلی میں پہنچ گیا تھا یہ سوچ کر کہ مل جل کر رہیں گے اور زندگی خوشگوار گزرے گی، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں آصف علی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ راگ علی ساند کے بیٹے ان لوگوں کو تیسرے درجے کا انسان سمجھتے ہیں اور خود کو ان سے برتر و اعلیٰ۔ ہاشم کی کیفیت یہ تھی کہ وہ راگ علی، راگ علی کرتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔ عام طور سے بھائی کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ اب باپ کی محبت دیکھ کر آصف علی نے صبر کر لیا تھا اور خود بھی خوش رہنے کی کوشش کرنے لگا تھا لیکن بیشتر مواقع ایسے آجاتے تھے جب اسے یہ احساس ہوتا تھا کہ باپ نے اس کے ساتھ زیادتی کر ڈالی ہے اور ان مغرور لوگوں کے در پر آکر غلطی کی ہے۔ بہر حال اپنی فطرت کے مطابق

اور آصف علی بے چین ہو گیا تھا۔

”کیا بات ہے گلزار کیا ہو گیا یہ؟“

”صاحب نائز برست ہو گیا ہے۔“

”مگر کیسے؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا دیکھتا ہوں، نائز تو نئے ہیں صاحب، برست ہونے کا امکان نہیں ہے۔ نئی ہوا بھی نہیں بھری جس سے یہ خیال ہو کہ شاید باؤ زیادہ ہونے کی وجہ سے نائز پھٹ گیا ہے۔“ ڈرائیور گلزار نیچے اترا اور آصف علی بھی سادگی سے گاڑی سے نیچے آیا۔ تبھی بائیں سمت کے ڈھلان سے سات آٹھ نقاب پوش ہتھیار لئے ہوئے اوپر آئے اور آصف علی چونک پڑا۔ بندوقیں دونوں کی جانب تن گئیں، ایک طاقتور سے نقاب پوش نے آگے بڑھ کر بندوق کی نالی آصف علی کے سینے پر رکھ دی اور غرائی ہوئی آواز بولا۔

”دوبائیں خاص طور سے محسوس کرو۔ پہلی تو یہ کہ ہم نے یہ جگہ اس لئے منتخب کی ہے کہ یہاں تمہاری گاڑی کی رفتار سست ہو گئی ہے اور ایسی شکل میں اگر نائز پھٹ جائے گاڑی کے اُلٹنے یا بے قابو رہنے کا خطرہ نہیں رہتا۔ دوسری بات یہ کہ فائر گاڑی کے باؤ پر کیا گیا ہے، اگر یہ فائر ڈرائیور کی کھوپڑی پر ہوتا تو اس کے پرچے اسی طرح اڑ گئے ہوتے جن کی طرح نائز پھٹ گیا ہے اور پھر تم دونوں کی موت لازمی تھی۔ سمجھ رہے ہو ہماری بات نہیں تمہاری زندگی کے بجائے اس رقم کی ضرورت ہے جو تمہارے پاس موجود ہے۔“

”مگر تم کون ہو؟“ آصف علی نے کہا اور جواب میں نقاب پوش کا قبچہ ابھرا۔

”لو یا اب تمہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم کون ہیں، یار بہت بے وقوف معلوم ہونے ہو، ڈاکو ہیں ہم لوگ سیدھی سی بات ہے۔“

”لیکن دوست میں یہ رقم راگ علی کو پہنچانے کا ذمہ دار ہوں، اگر تم اس طرف لوٹ لے جاؤ گے تو میری زندگی مشکل میں پڑ جائے گی۔“

”زیادہ باتیں مت بناؤ۔۔۔۔۔ چلو رقم نکال کر ہمارے حوالے کرو۔“ نقاب پوش نے بندوق کی نالی سے آصف علی کو دھکیلا لیکن پھر اچانک ہی ایک فائر ہوا اور نقاب پوش کی گردن میں سوراخ ہو گیا۔ آصف علی نے ایک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنی تھی وہ نقاب پوش جس کی گردن میں گولی لگی تھی غالباً ان ڈاکوؤں کا سردار تھا، کیونکہ دوسرے ڈاکو ایک

بستہ زدہ ہو گئے تھے اور ادھر دیکھنے لگے جدھر سے گولی آئی تھی۔۔۔۔۔ یہ ایک گھڑ سوار تھا، اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اس نے گھوڑا دوڑاتے ہوئے نقاب پوش پر فائر کیا تھا۔۔۔۔۔ اس نے اندھا دھند اس طرف فائرنگ شروع کر دی جدھر گھڑ سوار نظر آیا تھا۔۔۔۔۔ گھڑ سوار نے برق رفتاری سے ڈھلان عبور کیا اور سڑک پر آکر ایک دم سے دوسری طرف ڈھلان میں اتر گیا۔۔۔۔۔ وہ ایک مشاق سوار ہی نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ ایک بہت پھرتیلا جوان فائر کرنے کے اصول جانتا تھا۔۔۔۔۔ دوسری ڈھلان پر پہنچ کر اس نے پھر اپنی رائفل سے تین فائرے کیے۔۔۔۔۔ ساتھی کامیاب نشانے لگائے کہ تین نقاب پوش پھر زمین پر آ رہے تھے لیکن اس نے ساتھ ہی باقی نقاب پوشوں میں کھلبلی مچ گئی تھی اور وہ بری طرح دوسری ڈھلانوں کی جانب دوڑ پڑے اور اس طرح اپنی زندگی بچانے میں کامیاب ہو گئے لیکن ان کے چار ساتھی بہت زندگی کی کشمکش میں گرفتار تھے اور زمین پر اڑیاں رگڑ رہے تھے۔ گولیاں کارگر ہوئی تھیں اور وہ دم توڑ رہے تھے۔ آصف علی اور اس کا ڈرائیور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس فائرے کو دیکھ رہے تھے جس نے ان کی عزت بھی بچالی تھی اور زندگی بھی، گھڑ سوار دوسری طرف کی ڈھلان عبور کر کے پھر اوپر آگیا اور اس نے دوسری جانب کی ڈھلانوں میں بٹے ہوئے نقاب پوشوں پر گولیاں چلائیں لیکن ان کی زندگی باقی تھی کہ وہ ان گولیوں کا ٹھکانہ نہیں ہوئے اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ جب وہ بھاگ گئے تو گھڑ سوار آہستہ آہستہ اپنے گھوڑے کو آگے بڑھاتا ہوا ان لوگوں کے قریب آگیا، وہ دونوں احقوں کی طرح ناشائستہ لڑے اس ساری ہنگامہ خیزی کو دیکھ رہے تھے۔۔۔۔۔ گھڑ سوار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مبارک باد پیش کرتا ہوں جناب نہ جانے یہ کون تھے اور آپ سے کیا چاہتے تھے جن میں نے اتنا ضرور سمجھ لیا تھا کہ یہ آپ کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں کیونکہ نقابوں میں چھپے ہوئے تھے اس لئے مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ جرائم پیشہ ہیں یا پھر آپ کے دشمن۔“ آصف علی ایک دم سنبھل گیا، اس نے جھر جھری لے کر گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

”آپ نے نہ صرف میری زندگی بلکہ میری عزت بھی بچالی ہے، ایسے موقع پر شریعہ کے الفاظ کہے جاتے ہیں لیکن میں انہیں ناکافی سمجھتا ہوں۔ میں آپ کا بے حد احسان مند ہوں۔“

”کچھ بتا سکتے ہیں آپ یہ دشمنی تھی یا ڈاکہ زنی؟“ گھڑ سوار نے پوچھا۔

پہلے وہ سمجھتا تھا کہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ تو آپ سے یہ کہتا کہ رقم بھی نہیں چھوڑ دیجئے اور میرے ساتھ رہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ کبھی ہو سکتا تھا۔ یہ تو آپ سے یہ کہتا کہ رقم بھی نہیں چھوڑ دیجئے اور میرے ساتھ رہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ کبھی ہو سکتا تھا۔ یہ تو آپ سے یہ کہتا کہ رقم بھی نہیں چھوڑ دیجئے اور میرے ساتھ رہیں۔

”تمہارے پاس اسٹینپن ہے..... تاہم بدل لو اور اس کے بعد اس ڈھلان میں گاڑی لے کر جاؤ جو سامنے تمہیں سفید نشان نظر آرہے ہیں وہاں سے گاڑی با آسانی نیچے اتر سکتی ہے اور یہ کمزور جو باغ نظر آرہا ہے بس سیدھے اسی باغ پر آجاؤ۔ آئیے ساند صاحب، آئیے۔“

نوجوان نے کہا اور آصف علی بیگ اٹھائے اس کے ساتھ چل پڑا..... اچھا خاصا فاصلہ طے کرنا پڑا..... سامنے ہی خوب صورت آموں کا باغ نظر آرہا تھا..... آموں کی مہک فضا میں غری ہوئی تھی۔ باغ بے حد خوب صورت تھا اور اس کے اندر داخل ہونے کے لئے ایک پتھر پر راستہ بنا ہوا تھا..... اس راستے سے تھوڑا سا آگے بڑھے تو ایک چھوٹی سی خوشنما غارت نظر آئی جو ایک منزلہ تھی اور درختوں میں چھپی ہوئی تھی..... نوجوان گھڑ سوار نے اندر داخل ہو کر آصف علی کو بیٹھنے کے لئے کہا اور پھر ایک ملازم سے کہا۔

”سڑک پر ایک جیپ کھڑی ہوئی ہے اور جیپ کے پاس چار ڈاکوؤں کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ آدمیوں کو ساتھ لے جاؤ اور لاشیں اٹھوا کر باغ میں لے آؤ اور سٹو سڑک پر سے فون وغیرہ صاف کر دینا بعد میں دیکھ لیا جائے گا کہ کیا کرتا ہے، کوئی نشان ایسا باقی نہیں چھوڑتا جس سے سڑک پر سے گزرنے والوں کو کوئی شک ہو اور وہاں اگر ڈرائیور کو مدد کی ضرورت ہو تو ایک آدمی کو اس کے ساتھ چھوڑ دینا اور بعد میں گاڑی لے کر اس طرف ہی آجانا۔“

”لام گردن جھکا کر باہر چلا گیا تھا۔ نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہاں آپ کو چائے بھی پیش کی جاسکتی ہے کافی بھی یہاں اگر کوئی مشروب پینا چاہیں تو۔“

”آپ کا رویہ بے حد پراسرار ہے جناب، آپ کون ہیں، مجھے کیسے جانتے ہیں، اتنا تو خیر نمٹانے سمجھ لیا ہے کہ آپ کو اس رقم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جو اپنے ساتھ لایا ہوں ورنہ بیکل میرے بجائے آپ کے ہاتھ میں ہوتا۔“ نوجوان ہنس پڑا پھر بولا۔

”ساند صاحب مجھے واقعی اس رقم کی کوئی فکر نہیں ہے بلکہ میں تو خوش ہوں کہ آپ

”سو فیصد ڈاکہ زنی، کیونکہ میرے پاس بہت بڑی رقم موجود ہے۔ جسے یہ لوگ لوٹ چاہتے تھے۔“ آصف علی نے جواب دیا اور نوجوان بے اختیار مسکرا پڑا۔ اس نے دلچسپ نگاہوں سے آصف علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ساندہ صاحب، آپ اتنی بڑی رقم لے کر چل کیوں پڑے اور پھر اس طرح اس کی پلٹنی کر رہے ہیں۔ اب تو میں خود آپ کو نہیں چھوڑوں گا کیونکہ اتنی بڑی رقم مجھے بھی درکار ہے۔“ آصف علی نے پریشان نگاہوں سے نوجوان گھڑسوار کو دیکھا اور بولا۔

”یار چچی بات تو یہ ہے کہ تم نے رُم کے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی بچالی ہے۔ رُم واقعی لڑائی بھڑائی کا آدمی نہیں ہوں۔ لے جاؤ بھائی ان سے بچے تو تمہارے ہاتھوں میں پھنس سکتے ہیں، کیا کیا جائے؟“

”تو پھر دیکھ لیجئے بندوق میرے ہاتھ میں ہے اور آپ نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ جب میں ان چار ڈاکوؤں کو مار سکتا ہوں تو آپ کو نشانہ بنالینا بھی میرے لئے مشکل نہیں ہوگا۔ کیا آپ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں؟“

”ہاں تسلیم کرتا ہوں۔“ آصف علی نے جواب دیا۔

”تو پھر رقم کا تھیلا اٹھائیے اور میرے ساتھ آجائیے۔“

گھر سوار نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا۔

”بھائی سچ بتاؤ مذاق کر رہے ہو یا سچ کچ تمہاری نیت بھی خراب ہو گئی ہے؟“ آصف علی بولا۔

”سو فیصد میری نیت خراب ہو گئی ہے۔ آپ تھملا اٹھائیے ساند صاحب۔“ نوبولان نے کہا اور آصف علی گہری گہری سانسیں لینے لگا پھر چونک کر بولا۔

”ارے کیا تم مجھے جانتے ہو۔ تم نے مجھے سنا دیا کہہ کر مخاطب کیا ہے؟“

”اگر آصف علی ساند اکھوں تو کیسارے گا؟“

”ہاں کل ٹھک ہے۔“

”آصف علی صاحب آجائے مجھے آپ کی رقم نہیں چاہئے، ڈرائیور جب تک ٹائر بدلے گا آپ میرے ساتھ تھوڑا وقت گزار لیجئے۔ آئیے اور بھی انتظامات کرتے ہیں..... آپ کو احتیاط کے ساتھ واپس پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا میں۔ رقم یہاں نہیں

”میں جانتا ہوں آپ کو، دور سے دیکھا بھی ہے، بس یوں سمجھ لیجئے قربتوں کی کوشش
”رانا محفوظ کے لہجے میں ایک عجیب سی اداسی کھل گئی تھی اور آصف علی کو اس
”میں تو اس بات پر مسرور ہوں آصف صاحب کہ آپ کی تھوڑی بہت خدمت
”آصف علی اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکا اور خاموشی سے بیٹھا زمین کریدتا
رانا محفوظ نے کہا۔

”آصف علی صاحب، انسان کی اپنی ایک انا ہوتی ہے اور انا ٹوٹنے تو آپ یقین کیجئے کہ
نہیں ٹوٹ جاتا ہے، رشتے آسمانوں میں بنتے ہیں، ہم لاکھ سرچٹیں اللہ کی مرضی کے خلاف
نہیں کر سکتے لیکن بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک احساس ہوتا ہے انسان کے دل میں۔ وہ اپنی
اپنی کمزوری، اپنی بد بختی جاننا چاہتا ہے، میرے دل میں یہ آرزو تھی کہ اگر مجھے کبھی اس کا
موقع مل سکے کہ میں آپ لوگوں میں سے کسی سے ملاقات کروں تو صرف ایک بار آپ سے
یہ ضرور پوچھوں کہ مجھے ذلیل کیوں کیا گیا۔ وہ کمی ضرور بتائی جائے ہمیں جو ہمارے خاندان
میں ہے، ہماری شخصیت میں ہے، معافی چاہتا ہوں آصف علی صاحب، خدا را یہ نہ سمجھئے گا کہ
آپ کی ایک چھوٹی سی خدمت کر کے میں آپ سے کسی مسئلے میں جواب طلبی کر رہا ہوں۔
ایک خواہش تھی جو آج قدرتی طور پر پوری ہوئی ہے، اگر آپ اس سلسلے میں کچھ بتانا پسند
ریں۔“ آصف علی نے ٹھنڈی سانس لی اور آہستہ سے بولا۔

”رانا صاحب، شاید آپ نے یہ اندازہ لگالیا ہو کہ میں ایک سادہ سی فطرت کا انسان
ہوں۔ ابھی تک والدین کے زیر اثر ہوں اور والدین کے ہر فیصلے پر سر جھکانے کا عادی بھی
ہوں۔ آپ یقین کیجئے میں اور میرے والد آپ کی طرف سے دیئے گئے رشتے پر بہت خوش
نہیں اور ہم نے اپنے طور پر اپنے ذہنوں میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہماری خوش بختی ہمارا ساتھ
دے رہی ہے جو اتنے اعلیٰ خاندان کے لوگ ہمیں اپنے آپ میں قبول کر رہے ہیں۔ میری
”اللہ کو بھی اس پر اعتراض نہیں تھا، لیکن نہ جانے زینہ کو کیا ہو گیا۔ نہ جانے کیوں اس نے
”مبارے میں سرکشی کا اظہار کیا۔ آپ یقین کریں ہم خود بھی نہیں سمجھ پائے۔ ایک انوکھی
”ہوتی ہے یہ، کیونکہ زینہ بھی ایک خاموش مشرقی قسم کی لڑکی ہے وہ دوسرے معاملات میں
”نہایت لڑکتی تو اپنے معاملے میں کیا بولتی، لیکن اس سلسلے میں اس نے ایسا کیوں کیا تو اس نے کہا

کے کسی کام آسکا اور یہ بھی اتفاق ہے کہ میں نے ان نقاب پوشوں کو دیکھ لیا تھا جو گھٹا کر
ہوئے بیٹھے تھے۔۔۔۔۔ آپ یہ رقم جہاں سے بھی لارہے ہیں۔ یقیناً وہیں سے اس کی تیز
ہوئی ہے اور ان لوگوں نے اس جگہ کا انتخاب کر کے آپ پر حملہ کیا ہے، وہ تو شکر ہے
بد بختوں نے آپ کی زندگی لینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔
”میں غیر مسلح نہیں ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں
ہوں اور جہاں تک رقم لانے کا معاملہ ہے تو بس۔“

آصف علی ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا پھر چونک کر بولا۔
”آپ مجھے باقاعدہ میرے نام سے جانتے ہیں لیکن میری کتنی بد قسمتی ہے کہ میں آپ
کو نہیں جانتا۔“
”یہ آپ کی بد قسمتی نہیں ہے جناب، بلکہ میں اسے اپنی بد قسمتی کہہ سکتا ہوں۔
نوجوان اچانک سنجیدہ ہو گیا پھر ایک دم سنبھل کر بولا۔
”آپ براہ کرم یہ بتائیے کہ کیا پلاؤں آپ کو؟“
”آپ کے ساتھ کچھ وقت بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ چائے پلوادیتے یا کافی۔“
”بہتر۔“ نوجوان نے کہا اور پھر کسی اور ملازم کو آواز دی جو پچھلے دروازے سے اندر
آیا تھا۔

”بہت عمدہ قسم کی کافی بنا کر لاؤ، میرے معزز مہمان ہیں۔“
ملازم گردن جھکا کر چلا گیا تھا۔۔۔۔۔ آصف علی نے کہا۔
”یہ باغ آپ کا ہے، یقیناً آپ ہی کا ہے؟“
”جی، میرا نام رانا محفوظ ہے۔“ نوجوان نے جواب دیا اور آصف علی کے ذہن میں ایک
دھماکا سا ہوا۔ ”رانا محفوظ“ رانا حبیب کا بیٹا، وہ نوجوان جس کے لئے آصف علی کی بہن زینہ
کارشتہ آیا تھا اور ہاشم علی نے اپنے بیٹے کو اس خاندان کے بارے میں تفصیل بتائی تھی رانا
حبیب کی شخصیت کا تذکرہ کیا تھا۔۔۔۔۔ بہت بڑا خاندان تھا، بہت بڑے زمیندار تھے یہ لوگ
بھی، کسی طرح ساندوں سے کم نہیں تھے لیکن زینہ نے اس رشتے کو ٹھکرا کر سب کچھ
چوہٹ کر دیا تھا۔ آصف علی حیران نگاہوں سے رانا محفوظ کو دیکھنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔
”افسوس میری آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“

کہ یہ اس کے مستقبل کا معاملہ ہے اور اس سلسلے میں اسے آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہماری تقدیر نے ہمیں آپ کا عزیز بنے دیا۔“

”نہیں آصف صاحب، عزیز تو آپ مجھے اب بھی ہیں اور میں اپنی اس خوش بختی کرتا ہوں کہ مجھے آپ کی خدمت کرنے کا ایک موقع نصیب ہوا۔ بہر حال تقدیر کے یہ فیصلے اجنبی نہیں، ہو جاتا ہے کبھی ایسا بھی اور بات زندگی کی آخری سانس تک سمجھ میں نہیں آتی بس ایک بے چینی تھی دل کو، ایک احساس تھا کہ اگر کچھ پتا چل جاتا تو بڑا ہی اچھا ہوتا۔ بہر حال، ہاں آصف صاحب یہ غلط ہمیشہ دل میں رہے گی۔ میں بس اس غلطی کو دور کرتا چاہتا ہوں اور بخدا میرا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ دل کی بات زبان پر نہیں لاسکا، حالانکہ اصولی طور پر مجھے آپ سے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ بس ایک بار پتا چل جاتا۔ صرف ایک بار۔“ اچانک ہی آصف علی کے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوئی اتنے اچھے انسان کو ان لوگوں کی بات سے ایسا دکھ پہنچا کہ وہ اپنے دکھ کو زبان پر لائے بغیر نہیں رہ سکا تو کیا ایسے کسی انسان کو اس طرح تشنہ چھوڑ دیا جائے۔ کچھ وضاحت تو ہونی چاہئے، کچھ پتا تو چلنا چاہئے اسے، چنانچہ ایک فیصلہ کرنے کے بعد آصف نے کہا۔

”رانا صاحب، ایک کام میں کر سکتا ہوں۔“

”کیا؟“ رانا محفوظ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”زرینہ کو میں آپ کے پاس لے آؤں گا۔ میں آپ سے اس کی ملاقات کراؤں گا۔ آپ براہ راست اس سے یہ سوال کر لیجئے گا، اصل میں رانا صاحب میں آپ سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ آپ کے ذہن کی خلش میرے دل کی خلش بن گئی ہے۔ میں آپ کی یہ خلش دور کرنا چاہتا ہوں اور اسی لئے میں نے آپ کو یہ پیشکش کی ہے۔

آپ جیسے اچھے انسان کی دوستی میرے لئے انتہائی قیمتی شے ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ رشتہ ہو یا نہ ہو لیکن آپ کی دوستی مجھے حاصل رہے۔ رانا صاحب صرف اس جذبہ مددگارہ رکھتے ہوئے میں یہ کام ضرور کروں گا۔ سب لوگوں سے ہٹ کر نہ اپنے والد کو یہ بتانا گناہ والدہ کو، کسی اور کو بتانے کی ضرورت تو ہے ہی نہیں، میں آپ کی ملاقات براہ راست زرینہ سے کراؤں گا۔ حالانکہ آپ خود سمجھتے ہیں کہ ایک بھائی کے لئے یہ کتنا عجیب ہے لیکن رانا صاحب یہ ایک شریف آدمی کا شریف آدمی سے وعدہ ہے۔“

آصف علی مدہم سے انداز میں مسکرا دیا پھر ملازم کافی لے آیا تھا۔ خاصے لوازمات کافین کے ساتھ تھے اور رانا محفوظ نے بڑی محبت اور مہربانی کے ساتھ خاطر مدارت کی تھی۔ آصف علی نے کافی پیتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ لاشیں آپ کے لئے مشکل نہیں بنیں گی رانا صاحب؟“

”ڈاکو ہیں اور ڈاکہ زنی کی کوشش میں مارے گئے ہیں، بات صرف یہ ہے کہ اگر ہم پولیس کو اس بارے میں اطلاع دے دیں گے تو پولیس اپنا کھیل کھیلے گی، اس لئے میں ان لاشوں کو کہیں پھکوا دوں گا۔ برے لوگوں کی زندگی اگر چلی جائے تو ملال کی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ آپ کی زندگی بھی لے سکتے تھے۔ باقی اگر کوئی اہم ہی مسئلہ ہوتا تو پھر دیکھ لیا جائے۔“ رانا محفوظ کے سچے سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ ایک مضبوط آدمی بول رہا ہے اور وہ اتنا زور نہیں ہے کہ معمولی معمولی باتوں کو خاطر میں لائے، اس کی شخصیت جہاں ایک طرف

نکی و شرافت کا نمونہ تھی۔ وہیں اس کے اندر سے ایک طاقتور زمیندار بھی جھانک رہا تھا۔ اس بات کو آصف علی نے خاص طور سے محسوس کیا تھا۔

رانا محفوظ کافی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا اس دوران آصف علی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو دوپہر کو وہ زرینہ کے ساتھ یہاں آئے گا، اگر رانا محفوظ کے لئے ممکن ہو تو وہ یہاں آجائے اور رانا محفوظ نے وعدہ کر لیا تھا۔

الغرض ان کے درمیان یہ باتیں ہوتی رہیں اور تھوڑی دیر میں گلزار پجوار کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ ملازم اس کے ساتھ تھا پھر رانا محفوظ نے اپنے دو آدمیوں کو جو مسلح تھے آصف علی ساندہ کے ساتھ کر دیا تاکہ وہ اسے بحفاظت بستی نور الہی تک چھوڑ آئیں۔



سوتے سوتے بینا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خواب دیکھ رہی تھی اور اس خواب میں آج اس نے ایک ایسی عجیب و غریب چیز دیکھی تھی جس نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ اپنے ذہن کے پردوں پر اس خواب کے اثرات محسوس کر رہی تھی۔ بے شک وہ ایک باعمل اور باکردار لڑکی تھی اور نوجوانی کی اس عمر میں بھی اس نے کبھی اپنے آپ پر ایسی کسی کیفیت کو مسلط نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک باعمل باپ کی باعمل بیٹی تھی اور زندگی کی حقیقتوں سے آشکار ہونا چاہتی تھی۔ محبت اور رومان جیسی شے اس کی زندگی میں کبھی داخل نہیں ہوئی تھی۔ بہت ہی دوست تھیں..... ان کے اپنے خیالات تھے، اپنی اپنی کہانیاں تھیں اور دوستوں کی کہانیاں اس نے بار بار سنی تھیں لیکن نہ جانے کیوں اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ لوگ زندگی سے دور کی باتیں کرتی ہیں، زندگی صرف ایک رومان نہیں ہے البتہ اس بات سے اس نے کبھی انحراف نہیں کیا تھا کہ رومان کا زندگی میں ایک دخل ہے، لیکن شاید اس وقت جب انسان کے بارے کرنے کے لئے کچھ اور نہ ہو۔ کم از کم اس کے اپنے یہی خیالات تھے۔ باپ کے ساتھ جب سے مصروف ہوئی تھی زندگی کو اور بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور پھر یہ گنجائش ہی ختم ہو گئی تھی لیکن کچھ عرصے سے وہ اپنے دل میں ایک گداز پارہی تھی اور اس کی اپنی ذات میں کشمکش ہو رہی تھی۔ وہ شہاب ثاقب کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتی تھی، پہلی ہی نگاہ میں اس شخص سے ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک معلوم ہوا تھا۔ معلوم ہوا تھا۔ اپنے پیشے کے برعکس ایک الگ مزاج کا مالک ورنہ ایک وکیل کی حیثیت سے زندگی گزارتے ہوئے اس

”سر میں بیٹا بول رہی ہوں۔“

”مس بینا میں آپ کو چاہتا ہوں۔“ شہاب نے کہا اور بینا کے ہاتھ سے ریسور گرتے گرتے بچا۔ وہ ایک لمحے تک کچھ نہیں بول سکی تھی۔ شہاب نے فوراً ہی کہا۔

”کیا آپ زحمت کر سکتی ہیں؟“

”جی..... جی سر کیوں نہیں۔“ بینا نے جواب دیا۔ بڑا عجیب جملہ تھا..... چاہنے کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہ اسے کریم سوسائٹی بلانا چاہتا تھا لیکن جملہ ذومعنی تھا اس لئے وہ ایک لمحے کے

نے۔ ”پینا کی آواز میں ایک لمحے کے لئے لرزش پیدا ہو گئی۔

”جی ہاں واقعی، واقعی مس بینا ڈی آئی جی نادر حیات صاحب نے جو کیس میرے سپرد کیا ہے اس کے تین ٹریک ہیں۔ ہم تین ٹریک میں چل رہے ہیں۔ پہلا ٹریک مولوی ارشاد جی، ان کی اندھی بہن عائشہ اور فیروز کا ہے، جو ایک بے گناہ قیدی ہے اور کسی اور کے ظلم و ستم کا شکار ہو کر یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ کسی اور کے ہاتھوں ٹریپ ہو کر ایک ناکردہ گناہ کی سزا بھگتا رہا ہے۔“

”جی سر۔“ بینا اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہمارا دوسرا ٹریک گوہر جہاں اور اس کے پوتے ہیں، ہمارا تیسرا ٹریک کیا ہے بینا آپ بتائیں گی؟“

”سر سیدھی سیدھی سی بات ہے ساندے۔“ بینا نے جواب دیا اور شہاب ایک ٹھنڈی مانس لے کر خاموش ہو گیا۔

”سر میں نے کچھ غلط کہا۔“

”پتا نہیں..... خیر تو مس بینا ڈی آئی جی صاحب نے ایک اور آئیڈیا دیا ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمیں ایک بدلی ہوئی شخصیت میں بستی نور الہی جانا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب کا حکم ہے کہ ہم جس حیثیت سے وہاں جائیں گے اس میں ہمیں ساندوں سے قریب ہونے کا موقع ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں ڈی آئی جی صاحب نے یہ کوشش اپنے طور پر کی ہے اور چونکہ وہ یہ کوشش کر چکے ہیں اس لئے میں انہیں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اگر وہ یہ نہ بھی کر سکتے تو ہم اپنے طور پر کچھ نہ کچھ کرتے لیکن چونکہ ڈی آئی جی صاحب ایک ایماندار اور با اصول آدمی ہیں اور پھر ایک بہت بڑی شخصیت کے مالک بھی ہیں اس لئے مس بینا ان کی خواہش کی تکمیل کرنی پڑے گی۔“

”سر کیا اس سے ہمیں فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟“

”مختصر۔ مثلاً یہ کہ ہمیں ذرا ساندوں کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے گا، جبکہ میرے ذہن میں اس سلسلے میں ذرا بھی کوئی شک و شبہ نہیں ہے کیونکہ بات بالکل سناٹے کی ہے اور وہ سب کچھ ایک حقیقت ہے، جواب تک ہمارے علم میں آئی ہے۔ مس بینا میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے سب سے ساتھ چلیں۔“

لئے ہکا بکارہ کی تھی، پھر اس نے فوراً ہی کہا۔

”سر آپ مجھے حکم دیجئے۔“

”میں نے کہا نا اگر زحمت نہ ہو تو تشریف لے آئیے ویسے خیریت کچھ پریشان پریشان سی محسوس ہو رہی ہیں؟“

”نہیں سر بالکل نہیں۔“

”میں پہنچ رہی ہوں سر۔“ بینا نے جواب دیا اور پھر ریسور رکھ کر جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کریم سوسائٹی کی کوٹھی کے سامنے ٹیکسی سے اتر رہی تھی۔ جوہر خان نے اسے سلام کیا اور صاحب کے اندر موجود ہونے کی اطلاع دی۔ بینا اندر داخل ہو گئی تھی..... اس نے اب اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال لیا تھا۔ شہاب نے بیرونی کمرے میں جسے ایک شاندار نشست گاہ کی حیثیت دی گئی تھی اس کا استقبال کیا۔ بہت خوب صورت شلووار قمیض میں تھا اور بڑا فینچ رہا تھا..... بینا کی نگاہوں میں اس کے لئے تعریفی تاثرات نمودار ہوئے بغیر نہ رہ سکے..... تاہم اس نے فوراً ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

”سر کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“

”ٹھیک ہوں بینا آئیے۔“ شہاب نے سنجیدگی سے کہا اور بینا اسکے سامنے جا بیٹھی۔

”مس بینا واقعات بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں، اب تک کی رپورٹ آپ کے پاس موجود ہے، میں آپ سے آئندہ کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی سر۔“ بینا نے کہا اور اپنی ٹیبل سے پیڈ نکال لائی جس پر اسے پوائنٹ نوٹ کرنے تھے، شہاب سنجیدہ نظر آ رہا تھا، حالانکہ یقینی طور پر اس نے بینا کو مخاطب کرنے کا پہلا جملہ شرارنا کہا تھا، اکثر ایسی شرارت وہ سنجیدگی سے کر ڈالتا تھا۔ بینا منتظر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی..... شہاب خاموشی سے بینا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کی کیفیت کو کھوٹی سی تھی جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ اسے بینا سے کیا کہنا ہے۔ جب یہ خاموشی طویل ہو گئی تو بینا نے پہلو بدلا اور اس کی نگاہیں جھک گئیں..... شہاب نے آہستہ سے کہا۔

”جی مس بینا۔ عموماً میں آپ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کھوجاتا ہوں نہ جانے کیا سوچنے لگتا ہوں اور اصل بات بھول جاتا ہوں۔ میں نے کیا کہا تھا آپ سے؟“

”سسر آپ..... آپ..... آپ..... آپ اس کیس کے بارے میں کچھ کہہ رہے“

”نہیں سر میرے ڈیڈی بہت کو آپریٹو ہیں، میری ان سے بارہا گفتگو ہو چکی ہے۔ وہ ہر طرح سے مجھے آپ کی تحویل میں دینے کے لئے تیار ہیں۔“

”جی!“ شہاب نے حیرت سے منہ کھول کر کہا اور مینا اس کے تعجب پر خود بھی اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

”جی شہاب صاحب کیوں؟“

”اوہ..... اوہ.....“ شہاب نے اوپری اوپری سانس لے کر کہا اور اب مینا کو اپنے الفاظ دئے، اس کا چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا..... شہاب نے پھر فوراً ہی موضوع بدل دیا اور بولا۔

”اس کے علاوہ مس مینا جس طرح مجھے ڈی آئی جی نادر حیات صاحب نے اس بارے میں تفصیلات بتائی تھیں بالکل انہی کے انداز میں، میں آپ کو بتا رہا ہوں بس کچھ ذاتی باتیں لے رہا ہوں جاتی ہیں۔ یہ خط دیکھئے گا۔“ شہاب نے وہ گناہ خط مینا کے حوالے کر دیا جو اسے ڈی آئی جی نادر حیات نے دیا تھا اور مینا اس میں سے پرچا نکال کر پڑھنے لگی۔ پورا پرچا پڑھنے کے بعد اس کے چہرے پر بھی حیرت کے نقوش پھیل گئے۔

”یہ تو بڑی انوکھی تحریر ہے سر..... بڑی ہی انوکھی..... کوئی دل جلی شخصیت معلوم ہوتی ہے لیکن آج غالباً نچ جون ہے۔ ہمیں وہاں کب جانا ہو گا۔“

”میرا خیال ہے مس مینا بہت جلد ہماری روانگی ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے سر بہر حال یہ ایک دلچسپ اور سنسنی خیز مرحلہ ہے۔“

”تو پھر آپ پہلے گوہر جہاں کے سلسلے میں لوگوں کو متعین کر دیں۔“

”کیا آپ مجھے اس سلسلے میں ہدایات دیں گے کہ میں کس کس کو اس کے لئے مقرر ہوں؟“

”نہیں۔“ شہاب نے جواب دیا۔

”جی سر۔“ مینا چند لمحات سوچتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”سر میرے خیال میں ہم انجمن شیخ فراست علی کو اس کام پر مامور کر دیتے ہیں۔ سر دار علی بہت ایکٹو ہے لیکن چونکہ پہلی بار اس کو بھی میں داخل ہو چکا ہے اس لئے اسے دوبارہ مقرر نہیں کیا جاسکتا۔“

”ٹھیک ہے آپ ان دونوں کو ہدایت دے دیجئے۔“ شہاب نے کہا اور مینا وہ ٹرانسمیٹر لائی جس پر ڈبل اوگینگ سے گفتگو کی جاسکتی تھی۔ فراست علی اور انجمن شیخ کی ڈیوٹیاں

”سر میں تو خوشی سے تیار ہوں۔“

”اس کے ساتھ ساتھ ہی مینا ہمیں گوہر جہاں کے مسئلے کو ذرا پس پشت ڈالنا ہو گا۔“

اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے آدمی گوہر جہاں کی رہائش گاہ کی نگرانی کریں، اس کے ساتھ ساتھ ہی میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ غلام قادر کو بھی تنہا نہ چھوڑا جائے کیونکہ وہ اس سلسلے میں ایک اہم گواہ کی حیثیت رکھتا ہے۔“

”سر آپ حکم دیجئے۔“

”تو پھر آپ شہنشاہ کی اسٹنٹ کے طور پر زیر و گینگ کو ہدایات جاری کریں۔“

”سر آپ مجھے حکم دے دیجئے گا۔“

”افوہ مینا..... تم نے یہ سر سر کر کے میرا سر دکھا دیا ہے۔“

”جج..... جی سر..... جی..... بہت بہتر..... مم میرا مطلب ہے شش..... شش..... شہاب صاحب۔“

”کمال ہے میرا پورا نام تو آج تک کسی نے نہیں لیا آپ نے شش..... شش..... شش..... کر کے اس نام کو بڑی عزت بخش دی ہے۔“ شہاب بولا اور مینا بے اختیار ہنس پڑی۔

”سوری سس..... سس سر۔“

”ویری گڈ یہ آج سارا زور شش..... اور س پر ہے۔“ شہاب نے شرارت سے کہا اور بنا کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

”معافی چاہتی ہوں، ذرا مشکل ہو گی لیکن یہ بھی آپ ہی کا حکم ہے شہاب صاحب ورنہ میں اس کی جرات کبھی نہ کر پاتی۔“

”مس مینا انسان بڑا دلچسپ ہوتا ہے، جب اس کی ایک بات مان لی جاتی ہے تو پھر نہ جانے کیا کیا خواہش کرنے لگتا ہے، اس لئے اتنی آسانی سے میری ہر بات نہ مان لیا کریں۔“

مینا آپ کو وہ تمام تفصیلات بتا دوں جو ڈی آئی جی نادر حیات نے مجھے بتائی ہیں اور ہمیں جن کے تحت وہاں جانا ہے..... مس مینا ذرا سا جھجک رہا تھا میں کیونکہ آپ کو کافی دن تک شہر سے باہر رہنا پڑے گا میرا مطلب ہے بستی نور الہی۔“

”تو اس میں جھجکنے کی کیا بات ہے۔“

”میرا مطلب ہے عدنان واسطی صاحب کہیں اعتراض نہ کریں؟“

لگانے کے بعد اس نے کہا۔

”جی جناب اب کیا حکم ہے؟“

”چائے بنائیے۔“ شہاب بولا اور بیٹا ایک لمحے کے لئے چونک پڑی پھر جلدی سے اٹھ گئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔

”ابھی لاتی ہوں۔“ پھر چائے کے دوران اس خط پر گفتگو ہوتی رہی۔ بیٹا نے کہا۔

”واقعی یہ بڑا سنسنی خیز خط ہے لیکن شہاب صاحب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ مرض

ایک مذاق ہو؟“

”ممکن ہے..... کیا کہا جاسکتا ہے لیکن الفاظ بڑے تلخ ہیں اور تحریر میں جو ایک آگ

سلگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے وہ اس بات کا اظہار کرتی ہے کہ کچھ مسئلہ ہے ضرور۔“

”جی..... یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔“

”او کے مس بیٹا۔ گھوڑا دور ہے نہ میدان، دیکھ لیتے ہیں، ویسے آپ تیاریاں مکمل

کر لیجئے۔“

”سر مجھے کس حیثیت سے آپ کے ساتھ جانا ہوگا؟“ بیٹا نے سوال کیا۔

”ابھی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے مس بیٹا۔ اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔“

شہاب نے سوکھے سے منہ سے کہا۔

”جی؟“ بیٹا چونک کر بولی۔

”میرا مطلب ہے یہ بات ڈی آئی جی صاحب نے کلیئر نہیں کی ہے۔“

بیٹا نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ شہاب نے اسے ذومعنی جملوں سے مخاطب کیا ہے۔ ابتدا

ثیلی فون پر ہی کر دی تھی اور اس کے بعد کئی جملے ایسے کہے تھے جو چھتے ہوئے تھے لیکن اس نے

بڑی خوب صورتی سے انہیں دوسرا رخ دے دیا تھا..... کافی دیر کے بعد وہ اٹھی تو شہاب نے کہا۔

”آئیے میں آپ کو آپ کے آفس پہنچا دوں۔ چھوڑنا اس لئے نہیں کہوں گا کہ میں

آپ کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ آئیے۔“ بیٹا ایک بار پھر اسے دیکھ کر رہ گئی تھی کچھ دیر کے بعد

شہاب نے اسے اس کے آفس کے سامنے اتار دیا تھا۔



زرینہ اپنے اندر نہ جانے کیسی کیسی تبدیلیاں محسوس کر رہی تھی..... اس سے پہلے
نے کبھی دنیا کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ سوچنے والے ماں باپ تھے، بھائی تھے، وہ تو
ایک معصوم درخت کی مانند پروان چڑھ رہی تھی..... ماں باپ جس انداز میں اس کی
بل چاہتے تھے اسی انداز میں مکمل ہو رہی تھی..... اسے احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ کب
ان ہو گئی اور کب دوسروں کی نگاہوں کا مرکز بنی۔ کب کسی نے اس کے بارے میں یہ سوچا
کہ وہ ایک عورت ہے اور اس کی رعنائیاں کسی کے لئے قابل توجہ ہو سکتی ہیں۔ اپنے گھر میں
اتنی قلمی، عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہی تھی، سہیلیاں تھیں، دوسرے لوگ تھے جو
بت سے اس کے ساتھ پیش آتے تھے اور اس نے کبھی کسی کے بارے میں برے انداز میں
دہائی نہیں تھا، پھر نہ جانے باپ کو کیا سوچا کہ گھر بار چھوڑ دیا..... اپنی زمینیں راگ علی
انڈیا زمینوں میں ضم کر دیں اور اس کے بعد اپنے لئے مصیبتوں کی انبار خرید لئے، حالانکہ
ثم علی ساند ایک صلح جو اور اچھی فطرت کا انسان تھا اور شاید اپنی اسی فطرت کی بنا پر وہ مارا
با۔ بھائی سے کبھی تعلقات خراب نہیں ہوئے تھے اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس نے
ٹالیے کسی مسئلے میں راگ علی ساند اسے انحراف بھی نہیں کیا تھا جس کی خواہش راگ علی
نے کی ہو مگر زرینہ یہاں آکر خوش نہیں تھی۔ ویسے تو اس کے لئے بھی یہاں کوئی مشکل
نما پیدا کی گئی تھی۔ سہیلیاں اور ان کے والدین ملنے آ جاتے تھے۔ انہیں پذیرائی ملتی تھی
زرینہ کو بس اتنی سی تکلیف ہوئی تھی کہ وہ اب اپنی سہیلیوں کے ساتھ آزادانہ طور پر
گول میں جھولے نہیں جھول سکتی تھی۔ ایک محدود زندگی ہو گئی تھی لیکن ماں باپ جو
نستے ہیں وہی مناسب ہوتا ہے۔ نہ کبھی ان سے انحراف کیا تھا اور نہ اب کر رہی تھی لیکن اس

کی زندگی میں یہ انوکھا انقلاب جس طرح رونما ہوا تھا اس نے اسے جھنجھوڑ کر ایک دم سے جو ان کر دیا تھا اور اب اس کی سوچوں میں بڑی گہرائیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اپنی زندگی کے سب سے بدترین حادثے سے دوچار ہونے کے بعد اس نے اپنے ماحول پر نظر ڈالی تھی سوچا تھا اس کے بارے میں اور اس کی سوچوں نے اس کے بہت سے احساسات جگا دیئے تھے اسے اندازہ ہوا تھا کہ بزرگ بھی غلطیاں کر سکتے ہیں۔ ان پر ہی مکمل بھروسہ نہیں کر لینا چاہئے اپنے بچہ وہ انتظام کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن اب یہ سوچیں بعد از وقت تھیں اور اب ان سوچوں سے اسے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ جو حادثہ اس کے ساتھ پیش آیا تھا اس کے بارے میں وہ اپنی عزیز ترین سہیلی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ محسوس کر رہی تھی کہ ماں باپ اور بھائی بظاہر زندگی کے خوشگوار لمحات گزار رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ یہاں اس حویلے کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ دیوانگی کی تھی انہوں نے۔ نہیں کرنا چاہئے تھا انہیں ایسا۔ پتا نہیں کیوں آصف علی نے بھی مزاحمت نہیں کی اور خاموشی سے باپ کے احکامات پر سر جھکا دیا اور نتیجہ یہ نکلا تھا کہ کسی کا کچھ نہیں بگڑا تھا لیکن خود اس کی اپنی زندگی آہوں اور آنسوؤں کے درمیان گھر گئی تھی اور اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

زرینہ کے اندر جو تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں ان میں ایک نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ وہ بے حد دلیر ہو گئی تھی، اس کی سوچوں میں بڑی گہرائیاں آ گئی تھیں۔ پیار علی ساند اور نور علی ساند اکو وہ جب بھی دیکھتی اس کی آنکھوں میں ایک سانپ جیسی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ دونوں نیولے بن گئے تھے اب اس کے سامنے۔ بیشتر ایسے مواقع آئے جب وہ ان کے ماں باپ کے درمیان ان دونوں کو با آسانی قتل کر سکتی تھی، کئی بار اس نے اپنے طور پر یہ منصوبے بھی بنائے تھے کہ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے وہ پھلوں کو کاٹنے والی لمبی چھری اٹھائے اور ان دونوں کے زخروں میں پیوست کر دے۔ یہ کام با آسانی ہو سکتا تھا لیکن بات وہی تھی کہ اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ وہ بے شک ان دونوں کو قتل کر سکتی تھی اور اب کام اس کے لئے مشکل نہیں تھا، ان دونوں کی زندگی لینا اسے دنیا کا سب سے دلکش کام محسوس ہوتا تھا لیکن اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔ وہ مر جائے گی، گرفتار ہو جائے گی، پھانسی چڑھ جائے گی لیکن اس کے ماں باپ، اس کے بھائی وہ سب راگ علی ساند کے انتقام کا نشانہ بنیں گے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے، جو کچھ بھی ہو میرے ساتھ ہی ہو، میرے

بے شک کا شکار نہ ہوں اور پھر بات کچھ بھی نہیں ہوگی۔ دنیا یہ کبھی بھی نہیں جان سکے گی۔ پیار علی اور نور علی کو اس کی تایا زاد بہن نے کیوں قتل کیا..... اصل کام تو یہ ہے کہ ان کو منظر عام پر لایا جائے۔ بہت سے معاملات اب اس کے علم میں آتے جا رہے تھے۔ علی ساند کا قتل اور بستی مہرجان میں جو کچھ ہوا تھا وہ بھی اس کے علم میں تھا۔ بالکل اسی طرح دوسرے لوگ اس بات کو جانتے تھے۔ یہ لوگ تو تھے ہی بدکار لیکن آہ نہ جانے ہاشم علی ساند کا دماغ خراب ہو گیا تھا..... وہ نہ جانے کیوں ان بدکاروں کے درمیان تھا۔ ان لوگوں کا تو کچھ نہیں بگڑا، میری جان لے لی ان لوگوں نے، سب کچھ چھین لیا مجھ سے کبھی کبھی تنہائیوں میں اسے خود پر رحم آنے لگتا تھا۔ نہ جانے وہ کون تھا جس نے اس کا دماغ کی کوشش کی تھی۔ نام رانا محفوظ بتایا گیا تھا، کیونکہ خود اس کے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں بسی ہوئی تھی جس سے اس کی طبیعت رجوع ہوتی لیکن رانا محفوظ کے نام کے بارے میں اس کے ہونٹوں پر شریگیں مسکراہٹ پھیل جاتی تھی اور وہ اکثر اس بارے میں بے لگتی تھی لیکن پھر وہ ہو گیا جو خواب و خیال میں بھی نہیں تھا وہ سہم گئی، اس خوف کا وہ ہو گئی کہ صورت حال اگر اس طرح منظر عام پر آئی تو کیا ہوگا، لیکن پھر اس کے اندر وہ

نی جاگ اٹھی اس نے بے شک ان لوگوں کی خواہش کے مطابق اس شادی سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کے دل میں لاکھوں منصوبے بننے لگے اور آخر کار اس نے کیا کہ جس طرح بھی بن پڑے گا اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنائے گی۔ وہ اپنے آپ کو بے وفائی تبدیلیوں پر خود بھی حیران تھی، محکمہ پولیس کے ڈی آئی جی کو خط لکھنے کے بعد اسے با آسانی پوسٹ بھی کر دیا تھا اور اس خط میں اس نے اپنے منصوبے کی تفصیلات لکھ کر نہیں بتائی تھیں لیکن اپنے عزم کا اظہار کر دیا تھا۔ ایک فیصلہ کیا تھا اس نے ایک ایسا کام جو اس کی اپنی سوچوں کے مطابق تھا لیکن یہ عمل بلاشبہ بڑی اہمیت کا حامل تھا کسی اور کا تو نہیں بگاڑ سکتی تھی، لیکن اپنی جان دینے کا تہیہ کر لیا تھا اس نے کھلے عام انکشاف کرنے کے بعد یہ بتانے کے بعد کہ راگ علی ساند کا خاندان کس حیثیت کا حامل ہے، اس نے اس کے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ فیصلہ بڑا انوکھا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ سترہ جون کو وہ نور الہی کے سب سے بڑے چوک پر پہنچ جائے گی۔ وہاں لوگوں کو جمع کرے گی اور پھر

مند تھی، پھر وہی ہوا۔ پیار علی آگیا اور اس نے حیرانی سے اپنے دروازے پر دستک دی تو وہ بے فکری کے انداز میں دروازے پر پہنچ گئی اور اس نے دروازہ کھول دیا، پیار علی نے مشتبہ لگا ہوں سے اسے دیکھا اور بولا۔

”تم..... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”کیوں؟“ ”زیرینہ مسکراہو۔“

”کیا مطلب ہے۔ یہ میرا کمرہ ہے تم یہاں کیسے آگئیں؟“

”یہ کمرہ میرے لئے اجنبی تو نہیں ہے پیار علی۔“

”کیا مطلب؟“

”بس تم نے مجھے جن جذبوں سے آشنا کر دیا ہے کبھی کبھی وہ جذبے میرے دل میں ابھر آتے ہیں۔ آگئی تھی بس یونہی تمہاری تلاش میں۔“ اس نے اوباش لہجے میں کہا اور پیار علی خوف زدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”زیرینہ تم بالکل ہو بالکل پاگل۔“

”ارے کیوں؟“

”اگر کسی نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو؟“

”تو پھر؟“

”کمال ہے بھئی، عجب بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو اور پھر..... اور پھر زیرینہ سچی بات یہ ہے کہ..... کہ..... برا نہیں مانتا تم۔“

”کیا مطلب ہے، میں نے برا ماننا تمہاری بات کا، برا مانا تو اس عالم میں ہوتی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن بات سنو..... میں..... میں..... میں..... پھر ملوں گا تم سے، کہیں اور ملوں گا، یہاں نہیں۔ سمجھ رہی ہو نا میرا مطلب؟“

”کیوں پہلے کہیں اور لے گئے تھے مجھے؟“ ”زیرینہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔“

”بے وقوف لڑکی سمجھتی کیوں نہیں ہو، یہاں ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ وہ تو ایک الگ مسئلہ تھا۔“

”کون سا؟“

”وہی بھئی۔“

آگ لگا کر خود کشی کرے گی، اس کے لئے اس نے انتظامات شروع کر دیئے تھے۔ وہ دنیا کو بے طرح کے ثبوت بھی دینا چاہتی تھی اور ان دنوں وہ اس کے لئے کام بھی کر رہی تھی۔ تصویریں جو یقینی طور پر نور علی ساندانے بنائی تھیں، انہی کے پاس محفوظ ہوں گی وہ ان تصویروں کو بھی دنیا سے نہیں چھپانا چاہتی تھی بلکہ یہ تو ایک طرح کا ثبوت ہو تا وہ ان تصویروں کو مجمع عام کے حوالے کر دینا چاہتی تھی تاکہ راگ علی ساندانے کے خاندان کی ساری قلعی کھل جائے لیکن ان تصویروں کا حصول اس کے لئے ذرا مشکل تھا اور ان دنوں وہ اپنی کام کر رہی تھی۔ نور علی ساندانے اور پیار علی ساندانے، رانا محفوظ سے شادی کے انکار کے بعد مطمئن تھے اور اس بات سے خوش تھے کہ اس نے ان کی بات مان لی ہے چنانچہ ان کا رویہ بھی خاصا بہتر تھا۔ کھانے کی میز پر جب سب لوگ ہوا کرتے تھے تو وہ بڑی محبت اور پیار سے اس سے باتیں کیا کرتے تھے اور وہ بھی دبے دبے انداز میں ان کی باتوں کا جواب دے دیتی تھی، گویا اس بات کا اظہار کرنا چاہتی تھی کہ جو کچھ ہو چکا ہے وہ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

لیکن اب اسے ان تصویروں کی تلاش تھی جو یقینی طور پر نور علی یا پیار علی کے پاس موجود ہوں گی، اس نے اپنی ذات کو بالکل فنا کر لیا تھا۔ دنیا کی کسی شے سے اب اسے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ ماں باپ اور بھائی بے شک اس کے لئے پہلے ہی کی مانند تھے لیکن حقیقتوں سے لاعلم کبھی کبھی وہ انہیں ایسی نگاہوں سے دیکھنے لگتی تھی جن میں ایک شکایت ہوتی تھی، ایک دکھ کا احساس ہوتا تھا۔ یہ وہ ماں باپ تھے جو اس کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے جنہوں نے اپنی غلط سوچوں سے اپنی بیٹی کے لئے زندگی ختم کرنے کے سامان پیدا کر دیئے تھے۔ نہیں ہونا چاہئے ایسے ماں باپوں کو۔ نہیں ہونا چاہئے جو پیدا کرنے کے بعد اولاد کے مستقبل کا تحفظ نہ کر سکیں۔

غرض یہ کہ وقت گزر رہا تھا پھر ایک دن وہ پیار علی کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔ علی اس وقت موجود نہیں تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر دروازہ بند کر کے اپنے میں مصروف ہو گئی، اس نے ایک ایک جگہ کی تلاشی لے ڈالی اور ہر وہ چیز دیکھی جس میں تصویروں کی موجودگی کے امکانات ہو سکتے تھے۔ وہ خوف زدہ نہیں تھی پیار علی کسی بھی وقت آ سکتا تھا لیکن پیار علی کی خواب گاہ میں اسے وہ چیزیں دستیاب نہیں ہو سکیں جن کی وہ خواہش

ای دن وہ نور علی کے کمرے میں اس وقت داخل ہو گئی جب نور علی اس کے سامنے ہی باہر نکلا۔ پیار علی بھی اس کے ساتھ تھا۔۔۔۔۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔۔۔۔۔ اب اسے کسی بات کا خوف تو تھا نہیں اگر کوئی دیکھ بھی لے گا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے وہ تو زندگی دینے پر تل گئی تھی۔ عزت تو چلی ہی گئی تھی اب یہ ایک جان ہی باقی رہ گئی تھی اسے وہ ایک مناسب طریقہ کار کے مطابق دینا چاہتی تھی۔ نور علی کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور پھر نور علی کی الماریوں کے ہول ڈالا بہت دیر تک وہ تلاشی لیتی رہی اور اس کے بعد الماری کے ایک خفیہ خانے میں اسے تصویروں کا پیکٹ مل گیا، اس نے یہ تصویریں نکال لیں اور وہیں ان کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی اپنی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، ایسی شرمناک تصویریں تھیں کہ انہیں دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔ بہر حال اس نے جذباتی کیفیت کو اپنے ذہن سے جھٹکا۔۔۔۔۔ تصویروں کا لفافہ اپنے لباس میں چھپایا اور خاموشی سے باہر نکل آئی۔ آج اس کا سب سے اہم کام ہو گیا تھا۔ اپنے کمرے میں آکر وہ اپنے منصوبے کے بارے میں غور کرنے لگی۔



نادر حیات نے آخر کار شہاب کو طلب کر لیا اور شہاب ان کے پاس پہنچ گیا۔۔۔۔۔ نادر حیات صاحب نے اسے اپنی کوٹھی ہی میں بلایا تھا اور پر خلوص انداز میں اس کا استقبال کیا تھا، ان کی آنکھوں میں شہاب کے لئے نرمی اور محبت کے آثار تھے۔ اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر انہوں نے شہاب سے کہا۔

”اصل میں ڈیئر شہاب میں تھوڑا سا ابتار مل آدمی ہوں۔ مختصر آئیں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری زندگی کا پس منظر کچھ ایسا ہے کہ یہ ملازمت میں نے ایک چیلنج کے طور پر قبول کی تھی اور یہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ اس میں کچھ ندرت پیدا کروں گا، اس وقت اگر کسی عام شہری سے پولیس کے بارے میں بات کروں تو اس کے ماتھے پر خود بخود بل پڑ جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کوئی بھی پولیس کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ محکمہ پولیس میں دوسرے محکموں کی طرح برے لوگ بھی ہیں اور وہ اپنے اختیارات سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو شدید نقصانات پہنچاتے ہیں لیکن صرف ایک یہی محکمہ ہے جو اس قدر بدنام ہے جب کہ کرپشن دوسرے محکموں میں بھی ہے یقین کرو میں اس محکمے کا وقار بحال کرنا چاہتا ہوں اور یہ

”مجھے وضاحت کر کے بتاؤ۔“ زرینہ نے اس کی مسہری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کمرے پر اپنا حق جتا رہی تھی۔

”وہ زرینہ۔۔۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔۔۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ بات بالکل الگ تھی اس میں ہم سب شریک تھے تم یہ نہ سمجھنا کہ وہ صرف میرے اکیلے کا کام تھا۔۔۔۔۔ ہمیں اس کی پوری پوری اجازت تھی اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہم تمہیں رانا حبیب کے خاندان میں شامل نہیں کرنا چاہتے تھے اور اس کا یہی ایک طریقہ ہمارے ذہنوں میں آیا تھا۔“

”کون کون شریک تھا میرے خلاف اس سازش میں؟“

”زرینہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ دیکھو اس طرح تمہارا تنہا میرے کمرے میں بیٹھنا مناسب نہیں ہو گا۔“

”اور جب تم مجھے تنہا اس کمرے میں لے آئے تھے تو؟“

”بے وقوف لڑکی وہ یہ کمرہ تھا ہی نہیں۔“

”خیر کچھ بھی ہو۔ میں بس آج نہیں جاؤں گی یہاں سے، آج تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ کل صبح کو جاؤں گی۔“

”افوہ پاگل۔۔۔۔۔ پاگل، بے وقوف بالکل بے وقوف چلو چلو خاموشی سے نکل جاؤں یہاں سے۔ میں تمہارے ساتھ سخت گیری سے بھی پیش آ سکتا ہوں۔“

”مگر کیوں آخر کیوں۔ ایک بار تم مجھے اپنی مرضی سے یہاں لائے تھے اور مجھے بے آبرو کیا تھا۔ اب جبکہ میرے دل میں تمہارے لئے ایک جذبہ پیدا ہو گیا ہے تو تم مجھے اس طرح ٹھکرا رہے ہو۔“

”زرینہ تم نکل جاؤ یہاں سے، دیکھو میں بعد میں تم سے بات کروں گا۔ پلیز تم چلی جاؤ۔“

”پھر آؤں گی میں۔“

”ہاں ہاں میں خود تمہیں بتاؤں گا، میں خود ایک پروگرام تیار کروں گا اور اس کے بعد۔“

”سمجھ رہی ہوں میری بات؟“

”مجھے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔“ زرینہ نے کہا اور اس کے بعد وہ اس کے کمرے سے نکل آئی لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ تصویریں یہاں نہیں لی تھیں اب انہیں نور علی کے کمرے میں تلاش کرنا ہو گا لیکن فوراً ہی یہ عمل ممکن نہیں تھا۔

میرا عزم ہے۔ جس حد تک بھی اس کے لئے کام کر سکوں گا ضرور کروں گا لیکن لوگ اس نکلے کی مجبوریوں کو جان کر بھی نظر انداز کرتے ہیں اور بلاوجہ اس کے خلاف نفرت پروان چڑھتی جا رہی ہے، ہم لوگوں کو صاحب اثر لوگ جس طرح اپنے اشاروں پر نچاتے ہیں ہمارے دل اس پر بھی خون کے آنسو روتے ہیں اور پھر ہمارے اندر ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے، ہم سمجھ بھلا کر بہت سے ایسے اقدامات کرتے ہیں جو خود ہمیں بھی ناپسند ہوتے ہیں۔ خیر یہ گفتگو میں بہت باز کر چکا ہوں، بلاوجہ اسے دہرانا نہیں چاہتا میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری ڈرامائی زندگی میں مجھے ایسا موقع بہت کم ملا ہے جب میں اپنی سوچوں کے مطابق عمل کر سکوں، اب تمہارے مل جانے سے میرا حوصلہ بڑا گیا ہے اور بعض اوقات میں یہ سوچنے لگتا ہوں کہ میرے وجود کا ایک حصہ تم ہو جو باعمل ہے اور دوسرا حصہ میں ہوں جو تمہاری پشت پر ہے اور اس وجہ سے میں نے اس روایتی انداز میں کچھ تبدیلیاں پیدا کر لی ہیں جو بہت عرصے سے اختیار کئے ہوئے تھا اب میں اپنے اس خیال کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں جو میرے دل میں بہت پہلے سے تھا اور صرف خوابوں کی حیثیت رکھتا تھا۔

”سر میرے لئے اس سے زیادہ خوش بختی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ آپ جیسی ٹھوس شخصیت نے مجھ پر اعتبار کیا ہے۔“

”باخدا میں شاید ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے آپ پر بھی اعتبار نہیں کرتے اور یہ گنجائش رکھتے ہیں کہ کسی بھی جگہ بھٹک جائیں گے لیکن تم نے مجھے اپنے عمل سے اس کا یقین دلایا ہے۔ شہاب کچھ کر جاؤ اس دنیا میں، دنیا کچھ دے یا نہ دے تمہارے اپنے اندر جو ایک گلستان کھلے گا وہ تمہیں زندگی کے آخری سانس تک سرشار رکھے گا۔“

”سر میری ہر سانس میرے مقصد کے لئے وقف ہے، آپ نے جب مجھے اس قدر مقام دیا ہے تو میں بھی اتنا بے حس انسان نہیں ہوں کہ اپنی ذات کی کمزوریوں کا آپ کے سامنے اعتراف نہ کروں۔۔۔۔۔ سر میرے والد ایک سچے صحافی تھے اور ساری عمر سچ لکھتے اور سچ بولتے رہے اور آخر کار سچائی کے کفن میں لپٹ کر اہل خانہ کو ایک بے بسی کی زندگی میں جھوڑ کر قبر میں داخل ہو گئے۔ سر میرے بھائیوں نے میرے والد کے نقش قدم اپنائے اور وہ بے کس گھرانہ اسی انداز میں زندگی گزارنے لگا، لیکن میں نے الگ فیصلہ کیا اور اپنے لئے ایک راہ منتخب کی، سر میں اسی راہ پر چل رہا ہوں۔ تین بارہ دری میں میرا تعین ہو اور میں نے وہاں

نئے نئے طریقہ کار کی بنیاد ڈالی وہاں بھی معمول کے مطابق رشوت خوری کا بازار گرم تھا۔ میں نے وہ دکان بند نہیں کی سر بلکہ فروخت کا انداز بدل دیا، میں نے وہاں اپنے عملے کو ہدایت دی کہ کسی ضرورت مند غریب سے ایک روپیہ نہ وصول کیا جائے۔ کسی ایسے شخص کو ایک ٹیبلٹ نہ مارا جائے جو باعزت اور باوقار ہو اور کسی کی برائیوں کا شکار ہو گیا ہو۔ میں نے ان لوگوں کو اجازت ہی نہیں دی بلکہ ان کی مدد بھی کی اس سلسلے میں کہ وہ ہر اس شخص سے اپنی ضرورتیں پوری کریں جو دوسروں کے حلق میں ہاتھ ڈال کر ان کا حق چھین رہے ہو اور اس طریقہ کار کی بنیاد پڑ گئی۔ سر میں نے خود بھی وہی طریقہ کار اختیار کیا اور اپنے حالات کسی حد تک بدل لئے ہیں۔ یہ میرا اعتراف نامہ ہے اور آئندہ بھی سر میں اپنا یہ عمل جاری رکھوں گا۔ میں آپ سے اس لئے عرض کر رہا ہوں اگر کبھی میری کوئی شکایت آپ کے علم میں آئے اور کسی بڑے آدمی کی طرف سے آئے تو آپ اسے غلط نہ سمجھیں۔ یہ اعتراف میں آج ہمیشہ کے لئے کر رہا ہوں لیکن میرے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ صرف یہ اندازہ لگا لیا جائے کہ جس شخص نے شکایت کی ہے وہ اس قابل ہے یا نہیں کہ بغیر کسی تکلیف کے مجھے کچھ دے سکے اور یہ سب میں اس سے کیسے وصول کر سکتا ہوں، اسے مجھ پر چھوڑ دیا جائے۔ سر اگر میرا یہ راستہ روکا گیا تو شاید میں اپنی یہ ملازمت جاری نہ رکھوں اور نہ ہی میں اس سے ہاتھ اٹھاؤں گا۔“ ڈی آئی جی نادر حیات حیرت سے شہاب کو دیکھ رہے تھے، کچھ دیر تک وہ سوچتے رہے اور پھر بے اختیار مسکرا پڑے۔

”بھلے آدمی کم از کم مجھے اس بارے میں بتانا تو نہیں چاہئے تھا تمہیں۔“

”نہیں سر جس اعتماد کا اظہار آپ نے مجھ پر کیا ہے اس کے بعد مجھے اپنے آپ سے قریب کرنے یا جھوٹ بولنے کا موقع نہ دیجئے گا۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔“ ڈی آئی جی نادر حیات نے متاثر نگاہوں سے شہاب کو دیکھا اور انہیں ایک لمحے میں احساس ہو گیا کہ ٹھنڈوں کا فرق بے شک ہے لیکن انسانوں کا فرق اس پر حاوی ہے۔ یہ شخص جس آواز میں بول رہا ہے اس آواز کو نادر حیات صاحب اپنی تمام پولیس فورس کے ساتھ بھی نہیں دبا سکتے تھے اور یہاں ان کی شخصیت شہاب کے سامنے ہلکی پڑ جاتی تھی وہ انہیں خود سے زیادہ قد آور نظر آ رہا تھا اور ہر قد آور نے ٹکرانا مناسب عمل نہیں ہوتا۔ انہوں نے ردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”خیر میں تمہاری اس سچائی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، لیکن شرط یہی ہے کہ کبھی

”تو بس پھر تم کل روانہ ہو جاؤ تمام انتظامات کر دیئے گئے ہیں اور بے فکر ہو سب کچھ زمین رہے گا تمہیں وہاں کوئی ذلت نہیں ہوگی اور اگر کوئی اتفاقی واقعہ پیش آئے تو تم کوئی سے اپنا دفاع کر کے وہاں سے فرار ہو سکتے ہو۔“

”سر آپ نے اس کام کو میری پسند کے مطابق بنادیا ہے۔“ شہاب نے کہا۔
اسی لئے تو خود کو ابنازل کہہ رہا ہوں۔“ ڈی آئی جی صاحب نے مسکرا کر کہا اور اس کے بعد وہ شہاب کو اس سلسلے میں مکمل تفصیلات سمجھانے لگے۔ انہوں نے کچھ کاغذات ایک بیف کیس کے ساتھ شہاب کے حوالے کر کے آخر کار اسے خدا حافظ کہا تھا اور شہاب دل بہ خوشی کی لہر لئے وہاں سے واپس پلٹا تھا وہ اپنے آس پاس کے راستوں کو صاف کر دینا چاہتا تھا اپنی پوزیشن کو بہت دور تک محفوظ رکھنے کا خواہش مند تھا، پھر وہ عدنان واسطی سے ملا رہا اس نے اپنے مقصد کا اظہار ان پر کر دیا وہ مسکرا کر بولا۔

”واسطی صاحب اصل میں دنیا کو سدھارنے کے لئے بے شمار لوگ منظر عام پر آتے ہیں لیکن اپنے آپ کو سدھار کر واپس چلے جاتے ہیں۔ میں نے دہرا دیہ اختیار کیا ہے یعنی یہ اپنی بساط کے مطابق کچھ کر بھی لوں اور اپنے آپ کو بھی سدھاروں، آپ کے سلسلے میں بعض اوقات سوچتا ہوں تو یہ خیال دل میں آتا ہے کہ کہیں کچھ آپ کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔ عدنان صاحب اس بات کا طلب گار ہوں آپ سے اپنے ان تعلقات کو مزید آگے بڑھانے والے تعلقات کی روشنی میں کہ اگر کبھی کوئی ایسی مشکل پیش آئے تو مجھے بتا ضرور دیجئے گا۔“

”عزیزی ان الفاظ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”مس مینا کو ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ وقت کافی لگ جائے گا۔ خود پر اعتماد دلانے کا خواہش مند ہوں۔“

”مجھے تم پر بھی اعتماد ہے اور مینا پر بھی اور پھر شہاب ہم دونوں کو تم نے ایک نئی روشنی عروشاں کر لیا ہے، یقین کرو میں نے بہت سوچا ہے تمہارے بارے میں اور آخر کار تم نے منقہ ہو گیا ہوں، اللہ کی مرضی اگر زندگی اسی انداز میں بہتری کی طرف بڑھتی ہے تو تمہارے قدم روک نہیں سکتا۔“ عدنان صاحب نے کہا اور شہاب مسکراتے لگا، پھر اس نے لہجے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

رنگے ہاتھوں میرے سامنے نہیں آنا۔“

”جی سر اگر ایسا ہو گیا تو میرا وعدہ ہے کہ تعلقات کی بنیاد پر آپ سے رعایت نہیں مانگوں گا۔“

”اچھا ابھی چھوڑو ہم دونوں جذبات میں ڈوب گئے ہیں۔ اصل میں تمہیں یہ بتانا چاہیے ہوں میں کہ میں نے ذرا ڈرامائی طریقہ کار اختیار کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں یہ گنجائش چھوڑنا چاہتا ہوں۔“

”جی سر۔“

”وہ دونوں افراد جو اس محکمہ سے تعلق رکھتے ہیں جو محکمہ اس زمین کی خریداری کے لئے مخصوص ہے ان میں سے ایک خاتون ہیں جن کا نام فرخندہ رشید ہے اور دوسرے مسٹر شاد ہیں دونوں ہی نوجوان ہیں اور کسی کو اس بات کا علم نہیں ہے..... میرا مطلب ہے راگ فی ساندایا اس کے اہل خاندان یہ نہیں جانتے کہ ان دونوں کی شکل و صورت کیا ہے، تم جس خاتون کے ساتھ وہاں جاؤ گے اسے فرخندہ رشید کی حیثیت سے متعارف کراؤ گے، میں نے ان دونوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے لیکن ان کے بارے میں کسی کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ کہیں ایسی جگہ چلے گئے ہیں بس ایک نظریہ ہے میرا جس کے تحت میں نے ایسا کیا ہے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا وہ دونوں غیر سرکاری طور پر میرے قبضے میں آچکے ہیں اور میں انہیں عزت و احترام کے ساتھ ایک ایسی جگہ منتقل کر دیا ہے جس کے بارے میں وہ نہیں جانتے کہ وہ کون سی جگہ ہے اور انہیں یہاں تک لانے والے کون ہیں۔“ شہاب کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی وہ خوش نظر آنے لگا اور اس نے کہا۔

”سر میں آپ کے اس اقدام کا پس منظر سمجھ رہا ہوں اور میرے خیال میں یہ بہت نا شاندار پس منظر ہے۔“

”ہاں اصل میں اس طرح تم ان لوگوں سے ہر طرح سے کھل کر بات بھی کر سکتے ہو اور اگر اس کی کوئی مختلف صورت حال نکلی تو تم وہ ہو ہی نہیں جو اصل لوگ ہیں۔ سمجھ رہے ہو نا تم میری بات؟“

”ونڈر فل سر، ونڈر فل میں اس سلسلے میں آپ سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں۔ شہاب نے پر مسرت لہجے میں نادر حیات سے کہا۔

ہمارے بارے میں۔ اب تو زبان بھی تھک گئی ہے انہیں برا کہتے کہتے، زندگی کے مختصر لمحے کے بارے میں نہیں سوچتے اور اپنے جیسے انسانوں کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں۔“
نے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ محسوس کر رہی تھی کہ شہاب کوئی ذومعنی بات کہنے کے بعد اسی موضوع بدل دیتا ہے تاکہ پچھلی کہی ہوئی بات کا تاثر ختم ہو جائے اب وہ اسے کیسے کہہ کر یہ تاثر اس کے لئے بڑا دلکش ہے۔ بستی نور الہی پہنچ گئے اور سرکاری گیسٹ ہاؤس کی بیل پڑے جس کے بارے میں انہیں بتا بھی دیا گیا تھا اور سرکاری گیسٹ ہاؤس کو فون کر دیا گیا تھا۔ گیسٹ ہاؤس میں دو افراد نے ان سے ملاقات کی۔ ایک گیسٹ ہاؤس کا بندہ تھا اور دوسرا خصوصی طور پر وہاں بھیجا گیا تھا تاکہ وہ ان افراد کو اینڈ کرے جو وہاں اہم مسئلے میں پہنچ رہے ہیں۔ ناصر نامی اس شخص نے جو ایک دہلا پتلانا مل آدمی تھا ان دنوں کا ادب سے خیر مقدم کیا اور انہیں گیسٹ ہاؤس کے اندر لے گیا ناصر نے کہا۔

”سر، یہ چار بیڈ روم ہیں یہاں۔ ہدایت کے مطابق دو بیڈ روم تیار کر دیئے گئے ہیں۔ بے بڑی محفوظ جگہ ہے۔ اطراف میں کھیت بکھرے ہوئے ہیں لیکن جانور وغیرہ یہاں تک نہیں آتے، کچن تیار کر دیا گیا ہے۔ باورچی کا انتظام نہیں ہو سکا ہے لیکن نور الہی میں ایک نچھوٹا ہوٹل ہے آپ کے لئے کھانا وغیرہ وہیں سے آجایا کرے گا۔ ایک بزرگ خاتون نے کہا ہے وہ شاید رات تک پہنچ جائیں۔ چوکیدار کی رشتہ دار ہیں، باقی صفائی ستھرائی کا غلام آرام سے ہو جائے گا اور اس میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی، سر۔“

”ٹیلی فون کس حالت میں ہے؟“

”ورکنگ آرڈر میں ہے سر، بالکل ورکنگ آرڈر میں ہے مگر ایک ہی لائن ہے۔“

”ٹھیک ہے شکر یہ مسٹر ناصر آپ؟“

”سر، میں یہاں آپ کی ہر ضرورت پوری کرنے کے لئے حاضر ہوں۔ سرورنٹ

ارٹس آپ کو ہر وقت مل جاؤں گا۔ بس آواز دینے کی زحمت ہوگی۔“

”شکریہ۔“ شہاب نے جواب دیا۔

”اور کوئی خدمت سر، ویسے میں آپ کے لئے بہت عمدہ چائے یا کافی بھی بنا سکتا ہوں۔“

”دل تو چاہ رہا ہے مسٹر ناصر مگر آپ سے کہتے ہوئے؟“

”نہیں سر، چائے پیس گے یا کافی۔“

”آپ کو مایوسی نہیں ہوگی، ہم لوگ کل روانہ ہو رہے ہیں۔“ مینا بہت خوش تھی مینا اندرونی کیفیات کا اظہار وہ کسی پر نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دل کی دھڑکنوں کو بھی خاموش رہنے کا اشارہ کرتی تھی کہ کہیں یہ آواز کسی کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ ان دھڑکنوں میں اب شہاب کا نام سنائی دینے لگا تھا۔ شہاب کے ساتھ ایک خوب صورت گاڑی میں بستی نور الہی کی طرف سفر کرتے ہوئے وہ نہ جانے کیسے کیسے خیالات کا شکار تھی۔ اعتماد ہو گیا ہے اس شخص پر۔ کوئی احساس ہی باقی نہیں رہ گیا ہے اجنبیت کا۔ خاموشی بہت طویل ہو گئی تو اس نے چونک کر شہاب کو دیکھا۔ اس کا دل چاہا کہ شہاب بھی ایسے ہی جذبہ اظہار کرے۔ شہاب خاموشی سے سامنے نگاہ جمائے گا رڈ رائیو کر رہا تھا۔

”کوئی خاص بات سوچ رہے ہیں سر؟“

”ہاں۔“ شہاب نے سنجیدگی سے کہا۔

مینا اخلافا خاموش ہو گئی۔ شہاب جو کچھ سوچ رہا ہے وہ مینا کو بتانا ضروری تو نہیں ہے چرخیات انتظار کرنے کے بعد شہاب نے خود ہی کہا۔

”آپ نے پوچھا نہیں مس مینا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟“

”بتا دیجئے سر۔“

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جس کے بعد تم مجھے سر کے بجائے مستقل طور پر شہاب کہنا شروع کر دو۔“ مینا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ جملے بھی ذومعنی تھے۔ یعنی بے تکلفی سے مخاطب کرنے کے تو بہت سے طریقے ہو سکتے تھے۔ نہ جانے شہاب کا مفہوم کیا ہے۔ وہ آہستہ سے بولی۔

”بس عادت مشکل ہی سے تبدیل ہوگی شہاب صاحب۔“

”کتنا اچھا لگتا ہے جب آپ شہاب صاحب یا مسٹر شہاب کہتی ہیں۔ حالانکہ یہ مسٹر اور صاحب بھی مجھے بڑی مشکل سے ہضم ہوتا ہے لیکن خیر ہاضمہ تھوڑا بہت تو خراب ہوتا ہے۔“

”جی سر۔“ مینا نے کہا اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ شہاب بھی مسکراتا رہا تھا پھر ان

نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

”ہم بستی نور الہی جا رہے ہیں۔ برے لوگوں کی بستی ہے۔ بس مینا کیا کہا جائے ان

”چائے ہی پلوادو۔“

”بہت بہتر جناب۔“ وہ چلا گیا، دونوں کمرے دیکھے گئے۔ مناسب تھے اور وقت جاسکتا تھا۔ شہاب نے کہا۔

”لیکن ہم یہاں بے مقصد وقت نہیں گزاریں گے۔ کیا تم بہت تھکن محسوس ہو رہی ہے؟“

”بالکل نہیں جناب، بھلا تھکن کا کیا سوال ہے؟“

”ہاں ہاں بالکل، بھلا تھکن کا بھی کوئی سوال ہے۔“

شہاب نے کہا اور بیٹا بننے لگی۔ چائے پی گئی اور اس کے بعد شہاب نے ٹیلی فون پر سامنے رکھ لیا۔ اسے رائے علی ساندہ کی حویلی کے نمبر بتادیئے گئے تھے۔ ٹیلی فون پر نے یہ نمبر ڈائل کیا۔ بیٹا بھی نزدیک بیٹھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف سے رابطہ قائم ہو گیا۔ ایک بھاری آواز سنائی دی۔

”ہاں جی، کس سے بات کرنی ہے؟“

”راگ علی ساندہ، پیار علی ساندہ یا نور علی ساندہ تینوں میں سے کسی سے بھی بات کرنا چاہئے۔“

”آپ کون صاحب ہیں؟“

”میرا نام شاہد ایاز ہے، دارالحکومت سے آیا ہوں۔“

”براہ کرم ہولڈ کیجئے۔“ دوسری طرف سے جواب ملا اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد دوسری آواز سنائی دی۔

”ہیلو، شاہد ایاز صاحب، میں پیار علی ساندہ بول رہا ہوں۔“

”ہیلو، ساندہ صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“

”بالکل ٹھیک ہوں لیکن آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟“

”سرکاری گیسٹ ہاؤس سے، شاید آپ اس کے بارے میں جانتے ہوں۔“

”میں جانتا تو ہوں بے شک لیکن یہ کیا کیا ہے آپ نے..... بھلا اتنی بڑی جگہ

ہوتے ہوئے آپ لوگ سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہریں گے، یہ کیسے ممکن ہے؟“

”بے حد شکریہ پیار علی صاحب لیکن ہم لوگ یہاں بالکل اطمینان سے ہیں

”میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں شہاب صاحب۔ ہمارا یہاں رہنا بہت مناسب ہے اور مجھے بہت ہی نوب صورت ہے۔“ بیٹا نے بے اختیار کہا۔ شہاب نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ لوگ انتظار کرتے رہے پھر ایک بہت ہی قیمتی پجارو وہاں آکر رک گئی۔ اسے سفید شلوار قمیض میں شانوں پر مخصوص انداز کی چادر لئے ایک شخص نیچے اترا۔ اُسے پیچھے پیچھے دو گن مین بھی نیچے اتارے تھے، اچھی شخصیت کا مالک تھا اور بڑے پروقار آدمی چلتا ہو گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوا تھا۔ پیار علی کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا..... بیٹا شہاب نے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ پیار علی نے بڑی گرم جوشی سے شہاب سے ملایا اور پھر بیٹا کی طرف بھی رخ کر کے گردن خم کی، شہاب اسے احترام کے ساتھ سے گیا تھا۔

میرا نام پیار علی ہے اور یقینی طور پر میں مس فرخندہ رشید اور مسٹر شاہد ایاز سے مل رہا ہوں۔“

”بالکل بالکل، کہئے آپ کے کیسے مزاج ہیں پیار علی صاحب، ویسے آپ کو اندازہ ہے

کہ سرکاری کام سرکاری بنی ہوتے ہیں۔ ہم آپ کے شایان شان یہاں استقبال کر سکیں گے۔

”نہیں شاہد صاحب، آپ ہمارے مہمان ہیں۔ بھلا مہمان بھی کہیں میرا استقبال کرتے ہیں۔ کہئے آپ لوگ کیسے ہیں۔۔۔۔۔ ویسے مجھے اطلاع تو مل گئی تھی کہ آپ لوگ آرہے ہیں لیکن وقت نہیں بتایا گیا تھا۔۔۔۔۔ بس آپ نے ٹھیک ہی کہا سرکاری کام سرکاری ہی ہوتے ہیں اور دیر نہ کیجئے گا۔ باقی باتیں حویلی میں چل کر ہی ہوں گی۔“

”آپ سے معذرت چاہتے ہیں بیار علی صاحب لیکن کچھ باتوں پر غور کر لیجئے گا یقیناً ہمیں قابل معافی سمجھیں گے۔ سرکاری کام سے آئے ہیں اور زمینوں کی قیمت کاغذ کرنا ہے ہمیں، اگر ہم نے آپ کی ضامنتوں کو قبول کر لیا اور حویلی میں رہے تو پھر یہی ہو جائے گا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گھپلا ہو سکتا ہے آپ سمجھتے ہیں تا، ہزار دوست ہزار دشمن، ہزار الزامات کی بھرمار ہو جائے گی۔ اس لئے یہی جگہ قیام کے لئے مناسب ہے۔ ہاں حویلی ہزار بار حاضری دیں گے۔ آپ کی محبت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

”اوہو بھئی، یہ تو ہمارے لئے بڑی بے عزتی کی بات ہے کہ بستی نور الہی میں ہمارا مہمان آئیں اور سرکاری گیٹ ہاؤس میں ٹھہریں۔“

”اصل بات میں نے آپ کو بتادی ہے، اگر آپ یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں الزامات ہم پر عائد ہو جائیں تو پھر ہم آپ کا حکم نہیں ٹال سکتے۔“ بیار علی سوچ میں ڈوب تھا۔ پھر اس نے ہونٹ سکڑ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”نہیں میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ کو مشکل ہو۔ ویسے مس فرخندہ آپ بڑی شخصیت کی مالک ہیں۔ سرکاری عہدے دار ایسے بھی ہوتے ہیں۔ آپ کی تو عمر بھی نہیں ہے۔“

”ملازمت تو ملازمت ہوتی ہے ساندہ صاحب اور ہر عمر میں ملازمت کی جاسکتی ہے۔ بیار نے جواب دیا لیکن اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی ناگوار کیفیت نظر آرہی تھی۔ بیار نے ان کے ساتھ رہا اس نے رات کے کھانے کی دعوت دی تھی لیکن شہاب نے اسے مسترد کر دیا تھا اور دوسرے دن دوپہر کی دعوت قبول کر لی جس کے بارے میں یہ طے تھا کہ کھانے کے بعد زمینوں کا جائزہ لیا جائے گا اور پھر اس بارے میں مزید گفتگو کی جائے

”ملازمت تو ملازمت ہوتی ہے ساندہ صاحب اور ہر عمر میں ملازمت کی جاسکتی ہے۔ بیار نے جواب دیا لیکن اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی ناگوار کیفیت نظر آرہی تھی۔ بیار نے ان کے ساتھ رہا اس نے رات کے کھانے کی دعوت دی تھی لیکن شہاب نے اسے مسترد کر دیا تھا اور دوسرے دن دوپہر کی دعوت قبول کر لی جس کے بارے میں یہ طے تھا کہ کھانے کے بعد زمینوں کا جائزہ لیا جائے گا اور پھر اس بارے میں مزید گفتگو کی جائے

شہاب کے ان الفاظ پر بیار چونک پڑی اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”آپ کی نگاہیں بہت تیز ہیں شہاب صاحب؟“

”ہونا نہیں چاہئیں..... بھی دیکھیں نا اپنی زندگی کی حفاظت تو ہر انسان پر فرض نا..... میرا مطلب ہے مس مینا آپ کو کوئی تند نگاہوں سے دیکھے تو میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں..... میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ شہاب نے سوال کیا۔

”نہیں..... شہاب صاحب۔“

”تھینک یو، تھینک یو دیری مچ۔“ شہاب نے شرارت سے کہا اور مینا کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی، پہلے تو وہ یہی اندازہ لگاتی رہی تھی کہ شہاب یہ جملے رواروی میں کہہ جاتا ہے یا جان بوجھ کر مگر کوئی ایک بار کی بات ہو تو رواروی میں تصور کر لی جائے۔ موقع موقع سے ایسے ذومعنی جملے کہہ جاتا تھا جن کا مفہوم بڑا گہرا ہوتا تھا..... ایک خوش گوار ماحول میں وقت گزارہ گیاراں ہو گئی، مناصر نے ان کے لئے بہت عمدہ کھانا مہیا کیا، اس سلسلے میں راگ علی ساندہ کی طرف سے کوئی مہربانی نہیں ہوئی تھی، پھر دوسری صبح ناشتے کے بعد مینا اور شہاب باہر نکل آئے اور اس کے بعد انہوں نے بستی نور الہی کی سیر کی۔

ایک درمیانہ درجے کی بستی تھی اور زمینداروں کے علاقے کے علاوہ وہاں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی تھی جس سے یہ احساس ہوتا کہ زمینداروں نے اس بستی کے دوسرے علاقوں پر بھی توجہ دی ہے پھر دوپہر سے کچھ پہلے یہ لوگ واپس آگئے۔ راگ علی ساندہ کے گھر جانے کی تیاریاں ہونے لگیں اور جب راگ علی ساندہ کے آدمی ایک خوب صورت گاڑی میں وہاں پہنچے تو یہ دونوں ہی تیار تھے، انہیں بڑے احترام کے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر چلی کی جانب سفر کیا جانے لگا۔



نت دلائی اور پھر اس صبح کانپتے دل کے ساتھ اس نے باپ سے کہا۔

”میں زرینہ کو ساتھ لے کر گھونٹنے جانا چاہتا ہوں؟“

”کیا مطلب؟“ ہاشم علی نے حیرانی سے کہا۔

”آپ لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا..... میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ سخت مضحک رہتا ہے، پریشان اور اُداس اُداس سی رہتی ہے، بے شک میں اس کا بھائی ہوں اور اگر آپ اس کے ساتھ میری محبت کا حق بھی چھیننا چاہتے ہیں تو میں اسے آپ کی زیادتی تصور کروں۔“

”ہاں ابو سے پوچھ لیا۔“

”اور ان سے جو ہماری تقدیر کے مالک ہیں؟“

”نہیں زرینہ کم از کم میری تقدیر کے مالک نہیں ہیں وہ اور جب میری تقدیر کے مالک نہیں ہیں تو تمہاری تقدیر کے مالک بھی نہیں ہیں وہ۔ ابو کی بات میں اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ ابوان کے بھائی ہیں اور امی ابو کی بیوی۔ چلو تیار ہو جاؤ، خاموشی سے چلنا ہے، نہ کسی سے اجازت کی ضرورت ہے نہ کسی قسم کی جھجک کی۔“

زرینہ نے گردن جھکادی۔ تیار ہونے کے بعد اس نے تصویروں کا لفافہ اپنے لباس میں رکھ لیا۔ یہ ایک ایسی قیمتی چیز تھی جسے وہ خود سے جدا نہیں کر سکتی تھی اور پھر وہ خاموشی سے باہر نکل آئی اور آصف علی اسے لے کر چل پڑا۔ اتفاق سے راگ علی کے خاندان کے کسی فرد نے ان لوگوں کو باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے مہمانوں کی تیاریوں میں مصروف تھے جن کے بارے میں بس یہ پتا چلا تھا کہ دارالحکومت سے آئے ہیں اور سرکاری مہمان ہیں۔ آصف علی گاڑی دوڑاتا ہوا اس سڑک پر آگیا جہاں سے وہ رانا محفوظ کے باغ کی طرف جاسکتا تھا۔ آج ہی کا وعدہ کیا تھا اس نے اور اس کے ذہن میں نہ جانے کیا کیا خیالات رقصاں تھے جبکہ زرینہ یہ سوچ رہی تھی کہ بھائی کے ساتھ اس کی زندگی کا آخری سفر ہے اور اسی بنیاد پر اس نے آصف علی کی خواہش کا احترام بھی کیا تھا، اس کے بعد کہاں زندگی ہوگی کہ بھائی کی کوئی بات مانے۔ ان دنوں اس کے ذہن پر مایوسی کا غلبہ رہتا تھا اور اپنے عزم کو وہ اپنے دل میں پختہ کرتی رہتی تھی جو اس نے کیا تھا۔

راستے میں اتفاقیہ طور پر دونوں ہی سوچوں میں گم رہے اور زرینہ آصف علی سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ آخر وہ جا کہاں رہا ہے۔ ہاں جب ذیلی سڑک پر گاڑی اتری تو زرینہ نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور بولی۔

”کسی خاص جگہ جا رہے ہیں آپ؟“

”ہاں۔“

”کہاں؟“

”وہ دیکھو سامنے وہ باغ نظر آرہا ہے۔“

”ہاں۔“

گا۔ اس پر توجہ ضروری ہے کیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے؟“

ہاشم علی نے حیرانی سے کہا۔ ”آصف اگر تم اسے کہیں لیجانا چاہتے ہو تو بھلا اس میں روک ٹوک کی کیا گنجائش ہے؟“

”میں نے سوچا تھا کہ ہو سکتا ہے آپ کی محکومیت اسے قبول نہ کرے۔“

ہاشم علی ساند اکو اصولی طور پر بیٹھنے کی بات پر غصہ آنا چاہتے تھا لیکن ان الفاظ سے اب خود بھی متفق ہو چکے تھے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”مجھ پر طنز نہ کیا کرو بیٹے، میں اپنے جذبات تمہیں کیا بتا سکتا ہوں۔ بس تم سے درخواست ہی کر سکتا ہوں کہ مجھ پر طنز نہ کیا کرو۔ میں بھی ایک مجبور انسان تھا اپنے بزرگوں سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آصف کیونکہ تمہارا خون گرم ہے، نوجوان ہو جذبات میں ڈوب جاؤ گے اور میں نہ جانے کیا کیا کچھ کھو بیٹھوں گا۔“

”میں سمجھا نہیں؟“ آصف نے کہا۔

”اس سے آگے میں تمہیں کچھ سمجھانا بھی نہیں چاہتا زرینہ کو تم اپنے ساتھ لے جا رہے ہو لے جاؤ۔ میں انکار نہیں کروں گا۔“

زرینہ سے آصف علی نے یہ بات کہی تو وہ بھائی کو دیکھتی ہوئی بولی۔

”یہ آج آپ کو ایک نئی بات کیسے سوچ گئی؟“

”دیکھنا چاہتا ہوں زرینہ کہ ایک بھائی کی حیثیت سے میرا تم پر کچھ حق ہے یا نہیں؟“ زرینہ کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

”مجھ پر تو سب ہی کا حق ہے میرا کسی پر کوئی حق ہے یہ مجھے بالکل نہیں معلوم۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو زرینہ، تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس یونہی خیال آگیا تھا، کہاں جائیں گے؟“

”بس ایسے ہی ایک لمبی ڈرائیو پر، میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ لی

ڈرائیو کروں۔“

زرینہ نے محبت بھری نگاہوں سے بھائی کو دیکھا اور بولی۔

”آپ کا دل چاہ رہا ہے تو ٹھیک ہے، میں انکار نہیں کرتی، چلے امی ابو سے اجازت لے

لی آپ نے؟“

بہنہ بھیجی گئی تھی۔ نوجوان نے اسے بھی سلام کیا اور اس نے جواب بھی دیا، پھر وہ ان دونوں کے درمیان کھڑی ہوئی۔ عمارت کے اندر داخل ہو گیا، عمارت کے بڑے کمرے میں جو ڈرائنگ روم کی سیٹ رکھتا تھا نشستیں لگی ہوئی تھیں، نوجوان نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا، آصف علی کہنے لگا۔

”آپ کو زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟“

”نہیں، مجھے یقین تھا کہ آپ وقت پر پہنچ جائیں گے۔“

نوجوان نے جواب دیا۔

زرینہ اب بھی حیران حیران سی بیٹھی ہوئی تھی..... آخر کار آصف علی نے کہا۔

”میں آپ دونوں کا تعارف کراؤں؟“

”میرا خیال ہے کچھ وقت رُک جائیے۔ پہلے تھوڑا سا کچھ کھانے پینے کا انتظام ہو جائے۔“

”زحمت کیجئے گا اگر ات عجیب نہ محسوس کریں۔“

”نہیں..... عجیب کی کیا بات ہے..... کھانا پینا تو زندگی کی علامت ہے۔“ آصف علی نے تکیوں سے بولا اور دونوں اٹھ گئے..... زرینہ واقعی سخت حیران تھی..... آصف علی کا اگر کوئی دوست ہے تو پھر زرینہ کا اس دوستی سے کیا تعلق اور اس نے تعارف سے کیوں گریز کیا ہے۔ آخر کار کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے اور یہاں رانا محفوظ نے جو انتظام کیا تھا اسے دیکھ کر آصف علی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”آپ نے تو واقعی جنگل میں منگل بنا ڈالا ہے..... آپ کو کتنی زحمت ہوئی ہوگی یہاں یہ تمام انتظامات کرتے ہوئے۔“

”جناب عالی مجھے تو صرف یہ افسوس ہے کہ میں آپ کے شایان شان کچھ نہ کر سکا اور آپ اسے زحمت کہہ رہے ہیں؟“

”کمال ہے بھی پھر آپ نے ہماری شان کا غلط اندازہ لگایا ہے؟“

”نہیں کچھ لوگوں کا دل میں جو مقام ہوتا ہے اس سے تعین کیا جاتا ہے اور پھر آپ.....“

بہر حال نگلفانہ گفتگو کو پس پشت ڈال کر پہلے کھانے کے ساتھ انصاف کر لیا جائے۔“

زرینہ اب سنبھل گئی تھی اور پھر اب اس کی فطرت میں جو نمایاں تبدیلی رونما ہوئی تھی اس کے تحت وہ پہلے جیسی شرمیلی اور لجائی ہوئی لڑکی نہیں رہی تھی بلکہ وہ بے باک فطرت کا مظاہرہ بھی کر سکتی تھی اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بس ہم اس باغ میں جا رہے ہیں۔“

”کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟“

”ہاں۔“

”کیا؟“

”وہاں ہمیں کسی سے ملاقات کرنی ہے اور جس سے ملاقات کرنی ہے وہ ہمارا منتظر ہوگا۔“

”مگر کون؟“

”یہ تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو جائے گا۔“ آصف علی نے کہا اور زرینہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی پھر تعجب سے بولی۔

”آپ آج نہ جانے کیوں مجھے ایک پراسرار شخصیت کے مالک نظر آ رہے ہیں۔“

”ہاں زرینہ آج میں وہ کر رہا ہوں جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں کیا، جو معاشرتی طور پر ایک بری بات بھی تصور کی جاسکتی ہے لیکن ہو سکتا ہے اس کے نتائج اچھے نکل آئیں، بس زرینہ زندگی میں پہلی بار میں نے ایک ایسی جرات کی ہے جس کے بارے میں دوسرے سنین کے تو حیران رہ جائیں گے..... ہو سکتا ہے تم بھی اس بات پر ناراض ہو لیکن مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہے بس میرے دل نے ایک فیصلہ کیا اور میں یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔“

”آپ نے مجھے شدید حیران کر دیا ہے..... آخر ایسی کیا بات کر دی ہے کون ہے وہ جس کے پاس آپ جا رہے ہیں؟“ لیکن زرینہ کو اس کی اس بات کا کوئی جواب نہیں مل سکا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ باغ کے اس گوشے میں پہنچ گئے تھے جہاں سے اندر جانے کے لئے راستہ بنا ہوا تھا اور اس جگہ ایک خوب صورت نوجوان ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔

زرینہ سخت حیران تھی..... نوجوان مسکراتی نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا..... انتہائی خوب صورت، قد آور اور حسین نقوش کا نوجوان تھا جسے دیکھ کر دل میں خود بخود پسندیدگی کے جذبات ابھر آئیں..... آخر وہ کون ہے اور آصف علی اس کے پاس کیوں آیا ہے۔ اس بارے میں زرینہ کو کچھ نہیں معلوم تھا..... بہر حال بھائی کے ساتھ تھی اسی لئے کسی قسم کی فکر تو تھی نہیں..... نوجوان نے گردن خم کی اور پھر ہاتھ سے اشارہ کر کے گاڑی کے لئے پارکنگ کی جگہ بتائی اور خود انہیں آگے جانے کا راستہ دے دیا..... گاڑی مخصوص جگہ رُک گئی اور آصف علی نیچے اتر کر اس نوجوان سے بغلیں ہوا..... زرینہ بھی نیچے اتر آئی تھی لیکن کسی

اور میں محسوس کر رہی ہوں کہ نہایت عمدگی سے اردو کا استعمال کیا جا رہا ہے اور آصف بھائی نے ابھی تک آپ کو آپ کے نام سے نہیں پکارا، تاکہ مجھے علم نہ ہو جائے لیکن میں واقعی حیران ہوں، آخر ایسی کون سی شخصیت ہو سکتی ہے جس کے نام سے مجھے آشنا نہیں کیا جا رہا۔“ رانا محفوظ نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

”آپ کے ساتھ واقعی زیادتی ہے مس زرینہ، کیونکہ مجھے آپ کا نام معلوم ہے۔“

زرینہ کو چکر آرہے تھے..... آصف علی باہر نکل گیا، نوجوان کے چہرے سے یہ اندازہ برہا تھا کہ وہ واقعی اس قدر قابل اعتماد ہے کہ اس پر کوئی شک نہ کیا جائے۔ آصف کے باہر ہانے کے بعد وہ شدید حیرانی سے بولی۔

”واقعی یہ میری زندگی کا سب سے انوکھا وقت ہے اور میں آصف بھائی کے اس اقدام کے بارے میں کچھ بھی نہیں سمجھ پائی۔“

”آپ تشریف رکھئے، سمجھ جائیں گی۔ پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میری اور آصف صاحب کی ملاقات کیسے ہوئی اور..... مگر نہیں یہ ممکن ہے کہ انہوں نے آپ کو اس بارے میں بتا دیا ہو؟“

”مجھے تو یہ تک نہیں بتایا گیا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں، بس ہم لانگ ڈرائیو کے لئے نکلے تھے اور آصف بھائی سیدھے یہاں آگئے..... یہ کہہ کر ہی لائے تھے مجھے کہ آج بس ذرا آوارہ گردی ہی کریں گے لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ یہ کوئی منصوبہ بھی تھا۔“

”جی ہاں یہ ایک منصوبہ تھا۔ اتفاق سے آصف علی صاحب راگ علی ساندا کی کوئی رقم لے کر ادھر سے سفر کر رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے انہیں گھیر لیا۔ ان کی گاڑی کا ٹائر گولی مار کر پتھر کر دیا گیا اور پھر وہ بند و قیں تان کر ان پر کھڑے ہو گئے..... خوش قسمتی سے یہی وہ جگہ تھی جہاں یہ واقعہ پیش آیا..... میرا مطلب ہے وہ چوڑی سڑک جس سے گزر کر آپ یہاں تک تشریف لائی ہوں گی۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ میں نے آصف علی صاحب کی مدد کر کے جو سعادت حاصل کی ہے اس وقت میں کسی لالچ کا شکار نہیں تھا بلکہ انسانی ہمدردی کے تحت میں نے ان کی مدد کی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ آصف علی ساندا ہیں، یہ میری اور ان کی پہلی ملاقات تھی، بعد میں جب ہمارے درمیان گفتگو اور تعارف ہوا تو مجھے پتا چلا کہ میری تقدیر کا ایک تاریک باب پھر سے روشن ہو سکتا ہے اور اسی روشنی کے حصول کے لئے میری درخواست پر آصف علی ساندا صاحب آپ کو یہاں تک لے آئے ہیں۔“

”لیکن جناب یہ کتنی زیادتی ہے کہ میں ابھی تک آپ کے نام سے بھی واقف نہیں

”لیکن براہ کرم تھوڑے سے وقت کے لئے یہ زیادتی برداشت کر لیجئے گا، کیونکہ اس کے بعد ممکن ہے آپ میری ضیافت سے ہی انکار کر دیں۔“ رانا محفوظ کے لہجے میں ایک شکایت کا سا عنصر پیدا ہو گیا تھا جسے زرینہ نے بھی محسوس کیا اور آصف علی نے بھی بہر حال اس کے بعد کھانے کا آغاز ہو گیا۔ ملازمین خاموشی سے ہر کھانا ان کے سامنے سرو کر رہے تھے اور کم از کم زرینہ نے یہ ضرور محسوس کیا تھا کہ یہ شخص جو کچھ بھی ہے لیکن بڑی حیثیت کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کھانے کا انداز، یہ خوب صورت جگہ، یہ خوب صورت میز اور اس پر سجے ہوئے قیمتی برتن اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ جو شخصیت شہر سے دور راستے فاصلے پر اس باغ کے اندر اتنے اعلیٰ انتظامات کر سکتا ہے وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں ہو سکتی۔ بہر حال کھانے کے بعد کھانے کی تعریف بھی کی گئی تھی اور اس کے بعد زرینہ نے کہا۔

”کیا اب یہ طلسم توڑا جائے گا؟“

”زرینہ تم محسوس تو کرو گی کہ یہ کیسا بھائی ہے جس نے اتنا انوکھا اور اتنا عجیب طریقہ کار اختیار کیا ہے لیکن یہ صاحب میرے اتنے بڑے محسن ہیں اور اتنے گہرے دوست ہیں کہ میں یہ گھٹیا پن بھی کرنے پر مجبور ہوں۔ آئیے واپس اسی کمرے میں چلتے ہیں یا پھر کسی دوسری جگہ۔“

رانا محفوظ نے گردن خم کر دی۔ زرینہ کا ایک ایک قدم جھجک جھجک کر اٹھ رہا تھا۔ آصف کے ان الفاظ نے اسے شدید الجھن میں ڈال دیا تھا واقعی بھائی کا یہ کردار اس کے لئے بڑا انوکھا تھا اور اس وقت تو وہ شدید ترین حیران ہو گئی جب آصف نے کہا۔

”میں آپ لوگوں کو تھوڑا سا وقت دیتا ہوں، آپ لوگ گفتگو کر لیجئے۔ میں باغ کی طرف کروں گا اور زرینہ میرے اس اقدام کو کسی بھائی کی بے غیرتی نہ سمجھنا بلکہ یہ نہایت ضروری

”یہ ایک مختصر سا واقعہ ہے لیکن یہ واقعہ میری زندگی میں ایک انقلاب کا حامل ہے۔“
”مجھے بتائیے، پلیز؟“ زرینہ نے کہا۔

”میں آپ کو آپ ہی کی زندگی کا ایک چھوٹا سا واقعہ سنارہا ہوں مس زرینہ، چاندی پانی کا علاقہ تھا اور غالباً اگست کا مہینہ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور بارش تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اس طرح اچانک پھسل پڑتی تھی کہ گمان بھی نہ ہو۔ ایک پورا گروہ خوب سورت گاڑیوں میں چاندی پوری کی مشرقی وادی میں پکنک منانے آیا تھا جہاں ایک آبشار چاندی پوری کی چاندی میں اضافہ کرتا ہے اس گروہ میں سے ایک لڑکی دوسروں سے الگ ہو کر آبشار کے کنارے آگئی تھی اور پھر اس نے آبشار کے پانی سے بہنے والی پرشورندی کے لہلہ سرے پر کھڑے ہو کر ایک پتھر پر چڑھنے کی کوشش کی تھی جو کابھی کی وجہ سے پھسلواں پڑا تھا اور جیسے ہی وہ اوپر پہنچی اس کے دونوں پاؤں پھسل گئے اور وہ ندی میں آگری اس کی بہت زدہ چٹخیں گونجنے لگیں اور اس کا ہلکا سا نرم و نازک وجود پانی کی لہروں پر ڈولتا ہوا آگے بجاتب کسی دیوانے نے اس کی آواز سن لی اس نے پانی میں کود کر اسے پکڑا اور کنارے تک پہنچا، وہ لڑکی اس وقت اس بری طرح چکرائی ہوئی تھی کہ اپنی مدد کرنے والے کی صورت میں نہ دیکھ سکی اور متوحش انداز میں ادھر ادھر آنکھیں پھاڑنے لگی، اس کے گروہ کے افراد اس کی آواز سن کر اس کی جانب دوڑ پڑے تھے، نوجوان خاموشی سے وہاں سے واپس چلا آیا اور دریا عبور کر کے دوسرے کنارے پہنچا اور پھر وہاں سے ہٹ ہی گیا۔ سب لڑکی کے نہ پہنچ گئے اور اس سے اس کی خیریت معلوم کرنے لگے، پھر وہ اسے ساتھ لے کر چلے گئے لیکن نوجوان نے اپنا سب کچھ وہیں کھو دیا وہ اس لڑکی سے دل ہار بیٹھا تھا اور اس کے بارے میں جانے کیا کیا سوچنے لگا تھا، پھر اس نے اپنی زندگی کے اہم مشن پر کام شروع کر دیا، اس گروہ کے بارے میں اسے معلومات حاصل کرنے میں بڑی مشکو کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخر اس نے ہانک لیا کہ یہ لڑکی ساند خانہ ان کی زرینہ ہے۔ ہاشم علی ساند صاحب کی بیٹی اور ہاشم علی ساند کی بہن ایک اچھا خاندان تھا اور اچھے خاندان کی اس لڑکی سے اپنی زندگی کے نمونے کا تصور نوجوان پر اس طرح حاوی ہوا کہ وہ اسی کوشش میں مصروف ہو گیا، پھر زرینہ نے اس کا ساتھ دیا، اس کا رشتہ اس گھر میں پہنچا اور منظور بھی کر لیا گیا۔ نوجوان کی نیکیاں اٹھا کر پہنچی ہوئی تھیں اس کے دل میں بارہا یہ آرزو جاگی کہ کسی طرح لڑکی تک پہنچے

”ہوں؟“

”میرا نام رانا محفوظ ہے۔“ نوجوان نے جواب دیا۔

”رانا۔۔۔۔۔ محفوظ۔۔۔۔۔“ زرینہ کے منہ سے نکلا پھر اچانک اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ رانا محفوظ کا نام اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ لیکن۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ رانا محفوظ۔۔۔۔۔ یہاں اور آصف علی۔۔۔۔۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

”جی۔۔۔۔۔ شاید یہ نام آپ کی یادداشت میں محفوظ ہو۔“

”رانا صاحب۔۔۔۔۔ خدا کے لئے۔۔۔۔۔ مجھے سب کچھ بتا دیجئے۔۔۔۔۔ میں میں الجھنیں برداشت کرنے کے قابل نہیں رہی ہوں۔ میں بہت کمزور ہوں۔ آپ نے اپنا نام رانا محفوظ ہی بتایا ہے؟“

”جی۔۔۔۔۔ بالکل۔“

”اور آپ۔۔۔۔۔ رانا حبیب کے صاحبزادے ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”اور آپ نے۔۔۔۔۔ آپ نے ہی میرے گھر، میرے لئے رشتہ دیا تھا؟“

”جی میں وہی بد نصیب ہوں جسے ٹھکرا دیا گیا ہے۔“

”مگر رانا صاحب۔۔۔۔۔ آپ پہلے تو آصف بھائی کے دوست نہیں تھے؟“

”اس عجیب ملاقات کی تفصیل آپ کو بتا چکا ہوں۔۔۔۔۔ البتہ ان محسنوں کے ساتھ میں نے اچھا سلوک نہیں کیا جو ہماری ملاقات کا سبب بنے تھے۔“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ کون تھے؟“

”وہی ڈاکو۔۔۔۔۔ جو آصف علی کو لوٹنا چاہتے تھے۔“

”خدا کی قسم۔۔۔۔۔ گمان بھی نہیں تھا مگر آصف بھائی۔۔۔۔۔ میرے خدا کچھ سمجھ میں نہیں

آ رہا۔۔۔۔۔ ہم نے تو کبھی آپ کو دیکھا بھی نہیں تھا۔“

”میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“

”مجھے!“ زرینہ تعجب سے بولی۔

”جی۔“

”لیکن کب؟ کہاں؟“

اور اس سے یہ معلوم کر کے کہ کیا وہ اپنے والدین کی مرضی قبول کرے گی، کیا وہ اس نوجوان کو اپنی زندگی کا ساتھی بنالے گی لیکن ہمت نہ کر سکا اور اسے موقع بھی نہیں ملا، پھر اس وقت اس کا دل بند ہوتے ہوتے بچا جب اسے علم ہوا کہ لڑکی نے اس سے شادی سے انکار کر دیا ہے اور وہ ستم رسیدہ میں ہی تھا..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری زندگی کی سب سے خوش گھڑی اس طرح مجھ سے روٹھ جائے گی، پھر مس زریں نے مجھے قدرت نے ایک اور موقع عطا کیا۔ آصف علی صاحب اتفاقیہ طور پر مجھے اس طرح مل گئے اور میں جو اپنی آگ میں سلاک تھا ان سے یہ تذکرہ کئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نیک دل شخص نے میری اس خواہش کو منظور کر لیا کہ میں ایک بار صرف ایک بار آپ سے یہ پوچھوں کہ کیا آپ کے دل میں کوئی اور ہے؟ آپ مجھے کوئی بہت برانوجوان سمجھتی ہیں..... مس زریں نے میری زندگی کی بہت بڑی آرزو میں آپ لیکن اس کے باوجود اب جب تقدیر نے مجھے یہ موقع عطا کیا ہے تو میں آپ سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی بتا دوں مس زریں کہ انسان کو اپنی پسند کا حق حاصل ہے اور اگر آپ کسی کو چاہتی ہیں تو ایک اچھے انسان کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں خاموشی سے آپ کے راستے سے ہٹ جاؤں اور اپنی محبت اور اپنے خلوص میں کوئی کمی نہ پیدا کروں لیکن اس کے علاوہ اگر کوئی بات ہے تو آپ صرف مجھے بتادیں۔ بخدا میں آپ کو ایک لمحے کے لئے بھی مجبور نہیں کروں گا۔“ رانا محفوظ کی آواز لرز گئی..... زریں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی، وہ وقت اسے یاد آ رہا تھا جب وہ پنک منانے گئی تھی، چاندی پوری کا ابشار اسے نکلنے کے لئے تیار تھا اور ایک لمحے میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ زندگی کی شام قریب آگئی ہے لیکن پھر ایک مضبوط جسم نے اسے سہارا دیا اور کنارے پر پہنچا دیا۔ وہ اتنی بدحواس تھی کہ اس چہرے کو بھی نہ دیکھ سکی جس نے اسے دوبارہ زندگی دی تھی اور وہ واپس چلا گیا لیکن زندگی کی لاتعداد راتوں میں اس کے دل نے اس چوڑے چمکے وجود کے لمس کو محسوس کیا تھا جس نے اسے صرف ایک لمحہ دیا تھا، صرف ایک لمحہ حالانکہ وہ لمحہ اس کی زندگی بچانے کے لئے تھا لیکن وہ لمس ناقابل فراموش تھا، جسے محسوس کر کے وہ تنہائیوں میں بھی شرماتی تھی۔ اکثر وہ اسے یاد آتا تھا۔ آج وہ سامنے آگیا تھا جس نے اس کے بھائی کی بھی مدد کی اور اس نے بھی اور اس خاندان پر احسان عظیم کر دیا..... کیا کروں اب، کیا کروں، کیسے بتاؤں اسے۔ میرے دل میں کوئی اور نہیں ہے، کیسے اسے بتاؤں کہ وہ اپنی منزل کھو چکا ہے، کیسے اسے

غم زدہ لہجے میں بولا۔

”خدا کی قسم مس زریں آپ کو تکلیف دینا بالکل مقصود نہیں ہے، اگر آپ میری اتنے بڑی محبت کا کوئی صلہ مجھے دینا چاہتی ہیں تو تھوڑی سی زبان ہلا کر دے دیجئے، کم از کم مجھے یہ بتا جائے گا، یہ بے سکونی تو ختم ہو جائے گی، قدرت نے مجھے یہ موقع عطا کیا ہے مس زریں قدرت نے آصف کے دل کو یہ جذبہ دے دیا ہے کہ وہ مجھ پر اعتماد کر کے اپنی بہن کو یہ طرح میرے ساتھ تنہا چھوڑ دے تو براہ کرم آپ مجھ سے میری تقدیر کے یہ لمحات نہ بھینٹیں، زندگی بھر آپ کو دعائیں دیتا رہوں گا اور قسم کھاتا ہوں کہ دوبارہ کبھی ایسی جگہ سے نہیں گزروں گا جہاں میرا سایہ بھی آپ پر پڑ جائے..... یہ ملاقات، یہ لمحات اس کے بعد دوبارہ کبھی نہیں آئیں گے، یہ ایک شریف انسان کا وعدہ ہے آپ سے۔“

زریں کے دل پر زخم لگ رہے تھے، ایک اتنا اچھا شخص اس کی زندگی میں شامل ہونے والا تھا، کیا ہو گیا یہ، کیا ہو گیا اب کیا کروں آہ یہ شخص مجھ سے اتنے غرصے سے محبت کرتا ہے، اس نے میری زندگی بچائی ہے نہیں یہ تو غلط بات ہے اس کی کاوشوں کا صلہ اسے ملنا چاہئے، یہ زندگی جو اس نے خاموشی سے میرے سپرد کر دی ہے درحقیقت اس کی ملکیت ہے۔ میری زبان ہلانے سے اگر اس شخص کے دل کو قرار مل سکتا ہے تو اس کی بے سکونی ختم کے ہی اس کے احسانوں کا صلہ دیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ کچھ بھی ہو، نتیجے کی پروا کسے ہے، موت سے آگے تو کچھ نہیں ہوتا۔ موت میرا مقدر بن چکی ہے تو تھوڑی سی رسوائی بھی اگر مجھے مل جائے تو کیا حرج ہے۔ وہ اپنے اندر بہت سے جذباتوں کو زندہ کرتی رہی اور اچانک ہی اس کے اندر ایک ٹھوس پتھروں جیسی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ رانا محفوظ کو ہر بات بتانے کے لئے تیار ہوئی لیکن چند شرائط کے ساتھ اگر یہ اچھا انسان ہے تو اپنی اچھائیوں کا ثبوت دے گا اور اس سے راز کو اس وقت تک راز رکھے گا جب تک اس کا مقصد پورا نہ ہو جائے۔ زریں نے یہی فیصلہ کیا اور اس فیصلے کے تحت اس کے چہرے پر ایک نئی کیفیت بیدار ہو گئی۔ رانا محفوظ نے اسے دیکھ رہا تھا۔ زریں نے دروازے کی جانب دیکھا اور بولی۔

”کیا بھائی آصف علی اس وقت تک نہیں آئیں گے۔ جب تک ہم دونوں یہاں موجود ہیں؟“

”ہاں۔“

”کیا میری آواز یہاں سے باہر جاسکتی ہے؟“

”تمہائی کے یہ لمحات عطا کئے ہیں تو وہ چھپ کر ہماری باتیں سننے کی کوشش بھی نہیں کریں گے۔“

اس شخص کو دیکھا تھا جس نے میری زندگی بچائی تھی اور نہ آپ کو اور یہ بات میں نے کہ وہ جو کوئی بھی تھا میری زندگی سے اتنا دور جا چکا ہے کہ اگر میں اسے کبھی دیکھنا چاہوں تو میرے لئے ممکن نہ ہو لیکن اس بے لوث شخص کی اس عنایت کو میں نے کبھی بھن سے فراموش نہیں کیا۔ رانا صاحب فیصلہ میرے والدین کو کرنا تھا اور میں ان کے بل پر سر جھکانے کے لئے تیار تھی، لیکن رانا صاحب میری زندگی کو ایک اتنا بڑا حادثہ پیش کر کے میں زندہ ہی نہ رہی، مرگئی میں رانا صاحب مر چکی ہوں میں، قتل کر دیا گیا ہے مجھے میرے قاتل میرے اپنے ہی ہیں اور میں ان قاتلوں کے بارے میں اپنے بھائی اور باپ کو بتانا چاہتی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ شدت جوش سے بھر جائیں گے لیکن ان کا نہیں کر سکیں گے..... انہیں ختم نہیں کر سکیں گے رانا صاحب، میں نے انہیں خود ہی مارنے کا فیصلہ کیا ہے اور سترہ جون کو یعنی آج سے چند روز کے بعد میں اپنے ان قاتلوں کو قتل کروں گی اور اس کے بعد خود کشی کر لوں گی، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

”رانا محفوظ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں..... وہ خشک ہونٹوں پر زبان لڑبلا..... خدا راجھے کچھ اور بتائیے۔“

”جی ہاں بتا رہی ہوں اب کیا چھپاؤں گی آپ سے..... رانا صاحب میرے والد نے غلطی کی ایک ایسی غلطی جسے میں اور میرا بھائی کبھی معاف نہیں کر سکتے..... ان کی اپنی فحشیاں پھر ان کا اپنا خوف۔ جو انہیں اپنے بھائی راگ علی ساندہ سے تھا۔ حالانکہ ہم جیسے نفرت لوگ بھی جانتے ہیں کہ راگ علی ساندہ کے دل میں ہاشم علی ساندہ کی محبت نہیں تھی بلکہ اس کے دل میں ان زمینوں کی چاہت تھی جو ہاشم علی ساندہ کے پاس تھیں اور حصول کے لئے اس نے بھائی سے جذباتی طور پر یہ درخواست کی کہ وہ اپنی زمینوں کو ان زمینوں میں شامل کر دے اور خود اس کے ساتھ آ رہے تاکہ مل جل کر زندگی گزاریں۔ اصل مقصد یہی تھا کہ وہ زمینیں اس کی اپنی ہو جائیں۔ رانا صاحب میرے باپ کا فیصلہ کر لیا بھلا میں تو چیز ہی کیا تھی لیکن میرے بھائی آصف علی بھی اپنے والدین کی اطاعت گزار ہیں..... انہوں نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا اور ہم راگ علی کو ملنے میں پہنچ گئے۔ ہم رہ رہے تھے وہاں، ہم سمجھ رہے تھے یہ بات کہ اب وہاں ایک طفلی کی حیثیت رکھتے ہیں ہم، لیکن اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا یہ ہمت نہ میرے

”اگر آپ بھروسہ کریں تو؟“

”بھروسہ کر کے ہی تو یہ بات کہہ رہی ہوں میں آپ سے۔“

”تو پھر آپ یہ اطمینان رکھنے زریعہ صاحبہ جس طرح آپ یہ راز قبر میں لے جا چاہتی تھیں، آپ یوں سمجھ لیجئے کہ میرا بھی یہی عزم ہے۔“

”شکر یہ رانا صاحب اصل میں وہ واقعہ سنا کر آپ نے مجھے سب کچھ یاد دلادیا، یہ بھی یاد دلادیا آپ نے مجھے کہ اس دن میرے بچنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا، گویا ایک طرح سے میری زندگی ایک نامعلوم شخص کی امانت ہو گئی تھی اور اگر کبھی وہ اس امانت کو طلب کرنا تو آپ یقین کریں اسے ایک جذباتی بات ہی کہہ لیں لیکن میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے سے گریز نہ کرتی۔ جبکہ میں اسے جانتی بھی نہیں تھی۔ رانا صاحب اب جو کچھ میں آپ سے کہنا چاہ رہی ہوں آپ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کی امانت آپ کے سامنے بول رہی ہے مجھ پر فرض بھی ہے اور قرض بھی، رانا صاحب مجھے اس رشتے سے انکار نہیں تھا..... نہ ان میں محبت اور لگن تھی اور نہ اس میں کوئی ایسا تصور جو میری راتوں کی نیندیں اڑا دیتا کیونکہ

”مس زرينہ“ میں نے یہ تصويریں ديكھ لي ہیں اور ان كا پس منظر جانا چاہتا ہوں۔ میں

”نوٹا جائے۔“

اب اس چہرے کو چھپانے سے بھی تو مجھے کچھ نہیں حاصل ہوگا۔“ زرینہ نے
 ہاتھ ہٹا دیئے۔

”کون تھا وہ؟“

”میرا چچا زاد بھائی پیار علی ساندہ۔“

”کیوں اس نے یہ دیوانگی کی؟“

”بتا چکی ہوں آپ کو اس لئے کہ میں بے آبرو ہو جاؤں اور رانا فیملی کے قابل نہ ہوں۔ خود اس بات سے انکار کردوں کہ میں رانا فیملی میں شادی نہیں کرنا چاہتی اور اس لئے یہ سلسلہ ختم ہو جائے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر بات آگے بڑھی تو مناسب وقت پر یہ تصویریں رانا خاندان تک پہنچادی جائیں گی۔ یہ تصویریں بنانے والا اس کا چھوٹا بھائی نور علی تھا۔ میرے ساتھ یہ سازش صرف اس لئے کی گئی تھی کہ ہم ان کے مد مقابل نہ بننے دیں اور آخر کار میں نے انکار کر دیا۔ رانا صاحب، میں اتنی کمزور نہیں ہوں کہ ان لوگوں سے ختم نہ لے سکوں لیکن اتنی کمزور میں بے شک ہوں کہ ایک نیک اور شریف خاندان کو غم کے میں رکھوں۔ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اپنی زندگی کا اختتام کر لوں گی ان تمام فضیلت کو بتانے کے بعد، موت کے بعد تو انسان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی لیکن بنائندگی میں یہ نہیں چاہتی تھی میں کہ یہ حقیقت میرے باپ اور بھائی کو معلوم ہو جائے۔ اسے بغیرت نہیں ہیں وہ میرے لئے اپنی جان دے دیتے مگر جو کچھ چا چکا ہے وہ کسی کی جان سے کبھی بھی واپس نہیں آسکتا۔ بس اس کے سوا میں کچھ اور نہیں سوچ پائی تھی اور اسی لئے نے آپ کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا تھا۔ میں ان کی آلہ کار بنی ہوئی ہوں اور وہ لوگ

والدین میں تھی اور شاید میرے بھائی میں بھی نہیں تھی، چنانچہ ہم ان کے محکوم بن گئے اور معمولوں کو اس بات کا حق کبھی نہیں دیا جاسکتا کہ انہیں کوئی اچھی زندگی حاصل ہو، آپ خاندان ایک بڑا خاندان ہے بلکہ ساند خاندان کا ہم پلہ ہے یا ہو سکتا ہے، اس سے کچھ آئے نہ حیثیت رکھتا ہو۔ بھلا ساند خاندان والے یہ بات کیسے پسند کر سکتے تھے کہ ہم ایک بار پھر ان کے مد مقابل آجائیں اور ایک بڑی حیثیت حاصل کر لیں، چنانچہ راگ علی ساند کے دونوں بیٹوں پیار علی ساند اور نور علی ساند نے ہم لوگوں کے خلاف ایک منصوبہ بنایا۔ آہ کاش میں آپ کو اپنی زبان سے وہ سب کچھ بتا سکتی جو بتانا چاہتی ہوں لیکن یہ بھی تقدیر کا ایک انوکھ کھیل ہے کہ میرے پاس اب وہ زبان موجود ہے جو آپ کو ساری حقیقتیں بتا سکتی ہے، جیسے اتفاق سے یہ میں نے اپنے پاس محفوظ رکھا ہے، اپنی زندگی کی اس امانت کے طور پر جو میری موت کے سپرد کرنے جا رہی ہوں۔ سترہ جون کو میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اپنی شخصیت اور لوگوں کی توقع کے خلاف بستی نور الہی کے بڑے چوک میں جا کر یہ اعلان کروں گی کہ لوگوں کو راگ علی خاندان ایک باعزت اور باوقار خاندان نہیں ہے، وہ مجرموں کا ٹولہ ہے اور وہ اپنا ان کے ساتھ بھی وہ برائی کر سکتے ہیں جو انہوں نے غیروں کے ساتھ کی ہے، آپ یقین کیجئے کہ انہوں نے وہ وہ کچھ کیا ہے جس کی داستان لوگوں کو سنا دی جائے تو وہ دانتوں میں انگلیاں دبائے رہ جائیں لیجئے رانا محفوظ صاحب یہ آپ کے تمام سوالوں کا جواب ہے۔“ زرینہ نے تصویروں کا لفافہ نکال کر رانا محفوظ کے حوالے کر دیا اور اس نے حیرانی سے لفافے کو دیکھا، لفافہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر اس میں سے وہ تصویریں نکالنے لگا جو انتہائی شرمناک تھیں۔ رانا محفوظ نے پہلی تصویر دیکھی اور اس پر نظر پڑتے ہی وہ کانپ کر رہ گیا۔ تصویر کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ زرینہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا تھا۔ رانا محفوظ نے گری ہوئی تصویر اٹھائی اور پھر لرزتے ہاتھوں سے لفافے میں موجود تمام تصویروں کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں، پھر اس نے زرینہ کا چہرہ دیکھا، وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے مینھی تھی۔ رانا محفوظ نے پورے وجود میں خوف و دہشت کی لہریں دوڑ رہی تھیں اور وہ عجیب سی کیفیتوں کا شکار ہو رہا تھا۔ چند لمحات وہ ان تصویروں کو ہاتھ میں تھامے رہا اور پھر لفافے میں رکھ دیا، اب اس کا ہر برق رفتاری سے کچھ فیصلے کر رہا تھا۔ جب یہ خاموشی طویل ہو گئی تو اس نے آہستہ سے

مطمئن ہیں کہ جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ ہو گیا۔ آپ کے دل کو اب قرار آ گیا ہو گا رانا صاحبہ ایک لٹی ہوئی زندگی کسی کی جھولی میں ڈالنا میرا شعار نہیں اور میں یہ کبھی نہیں کر سکتی۔“

محفوظ اسے دیکھتا رہا۔ بہت دیر تک دیکھتا رہا اور اس کے بعد اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھیل گئی۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور گھٹنوں کے بل زرینہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

”آپ نے اعتراف کیا ہے مس زرینہ کہ آبشار میں اگر میں آپ کی زندگی نہ بچاؤ تو اس وقت آپ کا بچنا مشکل تھا۔ مجھے اس میں بس تھوڑا سا اختلاف ہے اور وہ اختلاف یہ ہے کہ زندگی لینے اور دینے والی ذات، ذات باری کی ہے، وہ آپ کو ہر طرح بچا لیتا لیکن اس وقت اس نے مجھے آپ کو بچانے کا ذریعہ بنایا، کیا آپ یہ تسلیم نہیں کرتیں کہ اس لئے کہ بعد میں میں اپنا متاع حیات حاصل کر لوں۔ زرینہ صاحبہ آپ کے اس نظریے کے مطابق آپ کی زندگی اب میری ملکیت ہے اور اچھے لوگ امانت میں خیانت نہیں کرتے۔ آپ واقعی ایک شریف خاندان کی خاتون ہیں تو آپ مجھے یہ بتائیے کہ اب آپ کی زندگی آپ کی کہاں ہے، وہ تو میری ہے اور میری امانت کو ضائع کر دینا امانت میں خیانت کے مترادف ہے اور یہ بھی سن لیجئے مس زرینہ کو میں لفاظی سے کام نہیں لے رہا، نہ آپ پر رحم کھا کر آپ سے یہ الفاظ ادا کر رہا ہوں، بے شک ایک مرد کے لئے یہ ایک مشکل کام ہے کہ اس کی زندگی کا ساتھی کسی شکل میں داغدار ہو، آپ زیادہ سے زیادہ یہی حوالہ دے سکتی ہیں لیکن مس زرینہ سنئے یہ واقعہ میرے علم میں آپ نے لا کر جس بڑائی اور بلندی کا ثبوت دیا ہے اس پر میں ایسے لاکھوں دان قربان کر سکتا ہوں۔ آپ اپنے آپ کو عقل کل نہ سمجھئے، اس بات کی گنجائش چھوڑ دیجئے کہ آپ سے بہتر کوئی اور بھی سوچ سکتا ہے۔ مس زرینہ ہم مرد ہیں، ہمیں اپنی زندگی میں ایسے اونچ نیچ کے بہت سے واقعات سے گزرنا ہوتا ہے جس میں ہم الجھ جاتے ہیں، پریشان ہو جاتے ہیں لیکن پھر ان کا حل بھی ہمیں ہی دریافت کرنا ہوتا ہے اور جب ہم اپنا ایک گھر بساتے ہیں تو اسی گھر کے لئے ہمارا ایک نظریہ ہوتا ہے اور ہم اسی نظریے پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی کو ترتیب دیتے ہیں۔ یہاں اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ فرض کیجئے میری اور آپ کی شادی ہو گئی ہوتی اور اس کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش آ جاتا تو کیا میں اس میں آپ کو تنہا چھوڑ دیتا؟ مس زرینہ آپ اسے نہ تو ایثار سمجھئے، نہ کسی قسم کا احسان، آپ اسے میری مشکل سمجھئے اور اپنی مشکل سمجھ کر اس پر عمل کرنے کے لئے تنہا کوئی فیصلہ نہ کیجئے..... مس زرینہ اگر آپ خوش

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں رانا صاحبہ؟“

”یہ مس زرینہ کہ اب آپ اس سلسلے میں سوچنا چھوڑ دیجئے۔ آپ کو میری رائے پر ہونا چاہیے، اگر آپ مجھے ذرا سی بھی اہمیت دیتی ہیں تو باقی جہاں تک مستقبل کا معاملہ رہا تو میری رائے سے جس سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچے آپ اس بات پر آزاد ہوں گی کہ میرے منہ پر جو تاج مار کر لٹائیے اور یہ کہہ دیجئے کہ تم مرد اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ تم پر اعتبار کیا جائے۔“

”رانا محفوظ صاحب آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔“

”جذبات کو زندگی سے خارج تو نہیں کیا جاسکتا مس زرینہ، کیا ایک غیر جذباتی انسان انسان ہوتا ہے۔ جواب دینا پسند کریں گی آپ؟“

”نہیں وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔“

”نہیں مس زرینہ یا تو کسی کو اپنے آپ سے قائل کر دیجئے یا پھر کسی سے قائل ہائیے۔ آپ مجھے بتائیے جو کچھ میں نے کہا ہے اس میں ایسی کون سی بات ہے جس پر آپ نے کوئی سوال کریں؟“

”رانا صاحب۔ آپ برداشت کریں گے میری اس کی کو؟“

”کون سی کی، جو کی ہی نہیں ہے اسے کی سمجھنا کمینہ پن ہے۔“

”رانا صاحب آپ ذرا غور کر لیجئے۔“

”مس زرینہ میں آپ سے بڑے کھلے الفاظ میں کہہ چکا ہوں مرد ہوں چوڑا سینہ رکھتا ہوں اور اس سینے میں بڑی وسعتیں ہیں۔ میں آپ کو اس سلسلے میں ذرا برابر قصور وار نہیں سمجھتا دوسرے کے قصور کی سزا اپنے آپ کو کیوں دے رہی ہیں، آپ یا میں کسی دوسرے کے قصور کی سزا آپ کو کیوں دوں گا۔ یہ تو کھلا کھلا کمینہ پن ہے، کم ذات ہونے کی نشانی ہے۔“

”رانا صاحب، میں مر جاؤں گی یہ سوچ کر کہ آپ آپ۔“

”تو میں کیا کروں، مجھے بتائیے رانا، میں کیا کروں؟“

”کچھ نہیں، آصف علی کے ساتھ واپس جائیے اور ایک خوشگوار کیفیت کا اظہار کیجئے، آصف علی کو یہ احساس دلادیتے ہیں کہ میں نے آپ کو قائل کر لیا ہے اور اب آپ اس مسئلے میں انکار نہیں کریں گی۔ ہم اس مسئلے کو ابھی تھوڑا سا پس پشت ڈال دیتے ہیں اور باقی ذمہ داری آپ مجھ پر چھوڑ دیتے۔ آپ کا انتقام میں لوں گا مس زرینہ، آپ کا انتقام میں لوں گا۔“

”نہیں رانا صاحب، آپ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔“ رانا محفوظ مسکرا دیا اور بولا۔

”میں آپ کے لئے اس زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالوں گا۔ میرا آپ سے وعدہ ہے لیکن جو کچھ میں کروں گا وہ ایک الگ طریقہ کار ہو گا۔ آپ مجھے اس کے بارے میں سوچنے کا موقع دیجئے لیکن اس اطمینان کے بعد کہ آپ زندہ رہیں گی۔ کچھ بھی نہیں کریں گی مس زرینہ، کچھ بھی نہیں کریں گی۔“

زرینہ سوچ میں ڈوب گئی۔ واقعی بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا اس شخص نے اپنے چند الفاظ سے اس کی زندگی میں اور اب اس کا مرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔

”ٹھیک ہے رانا صاحب لیکن خدا را آصف علی کو یہ حقیقت نہ بتائیے۔“

”میں اپنے آپ کو یہ حقیقت دوبارہ کبھی نہیں بتاؤں گا مس زرینہ۔“

”تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”کچھ نہیں، خاموشی سے ہنستی مسکراتی آصف علی کے ساتھ گھر واپس جائیے وہاں ان لوگوں پر یہی اظہار کیجئے گا کہ آپ نے جو انکار کر دیا ہے اس پر قائم ہیں۔ باقی میرا انتظار کیجئے اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیے جو آپ کیلئے کسی بھی طور نقصان دہ ہو فیصلے مجھے کرنے دیجئے مس زرینہ۔“

”لیکن میرا آپ سے رابطہ؟“

”اس کا ذریعہ ہم بعد میں دریافت کر لیں گے۔“

”خدا آپ کو، خدا آپ کو ان نیکیوں کا اجر دے۔“

”آپ نے میری بات کو قبول کر لیا؟“ رانا محفوظ نے سوال کیا۔

”ہاں۔“ زرینہ آہستہ سے بولی۔



”نہیں مس زرینہ، آپ جنس یہ سوچ کر کہ آپ کا ساتھی ایک باظرف نوجوان ہے جس نے آپ کو مجرم نہیں سمجھا۔“

”رانا صاحب خدا کے لئے میری زندگی کا مقصد نہ بدلے، میرا پورا نظریہ یہی ہے ہو جائے گا۔“

”نہیں مس زرینہ دیکھئے میں دونوں باتیں کہہ چکا ہوں، میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا، آپ مرجائیں گی تب بھی میں آپ کو چاہتا رہوں گا، آپ زندہ رہیں صرف اس لئے کہ زندگی آپ کی اپنی نہیں، میری امانت ہے، زرینہ صاحبہ اس امانت میں خیانت نہ کیجئے گا، میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔“ رانا محفوظ نے زرینہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور وہ اس طرح بے اختیار ہو گئی کہ اس نے رانا کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

”فرشتہ صفت انسان ہو کر ایک گنہگار کے سامنے ہاتھ نہ جوڑیے خدا را، یہ یہ بڑا عجیب واقعہ ہوا ہے، میں تو رانا صاحب نہ جانے کیا کیا منصوبے بناتی رہی ہوں، میں نے اپنے آپ کو ان منصوبوں میں بہت مطمئن سمجھا ہے مگر آپ نے ایک لمحے میں میرے ذہن میں ہچکچاہٹ پیدا کر دی ہے۔“

”اگر کوئی غلط فیصلہ کر لے زرینہ صاحبہ اور صحیح فیصلہ اس کے سامنے آجائے تو اپنے غلط فیصلے کو بدل دینا چاہئے۔“

”تو گویا آپ چاہتے ہیں کہ میں۔“

”ہاں آپ زندہ رہیں۔“

”کیوں؟“ میرے لئے۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں مس زرینہ بالکل سچ، آزما کر دیکھ لیجئے ایک مرد نے آپ کو برباد کیا ہے، مرد آپ کو اپنے سینے سے لگا کر زندگی کی آخری سانس تک گزار دے گا اور اگر اس کی پیشانی آنکھوں میں کوئی خلش نظر آجائے آپ کو، تو میں آپ کو یہ حق دے چکا ہوں۔“

”کمال کے انسان ہیں آپ، کمال کے انسان ہیں، کیا، کیا ہو گیا یہ، کیا ہو گیا؟“

”بہت اچھا ہوا ہے اور آپ کیا سمجھتی ہیں مس زرینہ، یہ سب کچھ ایسے ہی ہو گیا۔ قدرت کا ہر فیصلہ اس کی مرضی کے تابع ہوتا ہے ہم اور آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔“

”اس کا نام فرخندہ رشید ہے۔“

”مس فرخندہ رشید؟“

”ہاں۔“

”گڈ لیکن کیا خاص بات ہے اس میں؟“

”دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔“

”کیا واقعی؟“

”ہاں۔ لاکھوں کی قیمت ہے اس کی، بہت بڑی قیمت ہے۔“

”تمہیں پسند آگئی ہے؟“

”نہ آئی ہوتی تو تذکرہ ہی نہ کرتا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے خرید لو۔“

”یہی تو مشکل ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”بکنے والی چیز نہیں معلوم ہوتی۔“

”ارے چھوڑو پیار علی۔ اتنا دے دو کہ ان کا منہ بند ہو جائے۔“

”مشکل ہے، مشکل ہے، مشکل ہے۔“

”تو پھر؟“

”لیکن یہ بھی مشکل ہے کہ میں اپنی پسند کو اپنے ہاتھ سے نکل جانے دوں۔“

”سرکاری لوگ ہیں غور کر لو۔“

”کوئی فرق نہیں پڑتا لوگ تو ہیں نا، روبرو تو نہیں ہیں..... مشینیں متاثر نہیں: باتیں

مان بہر حال متاثر ہوتے ہیں۔“

”خطرہ مول لو گے؟“

”لیتا ہی رہا ہوں، زندگی بھر خطرے مول لیتا رہا ہوں۔“

”بہت زیادہ مضطرب ہو؟“

”ہاں۔“

”تو پھر کیا ارادہ ہے؟“

پیار علی نے مسکراتی نگاہوں سے نور علی کو دیکھا اور نور علی بولا۔

”کیوں خیریت..... وہ آگئے؟“

”ہاں لیکن وہ سرکاری گیٹ ہاؤس ہی میں ٹھہرنا چاہتے ہیں اور میں نے ان کے موقف کو تسلیم کر لیا ہے۔“

”کیا موقف ہے ان کا؟“ نور علی نے پوچھا۔

”ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ خالصتاً ہمارے مہمان رہے تو ان پر شبہ کیا جاسکتا ہے کہ قیمتوں کے تعین میں جانبداری سے کام لیا گیا ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے نور علی کہ کام کے لوگ ہیں اور آسانی سے قابو میں آجائیں گے..... بہر حال ہمارا ایک نظریہ ہے اور میرا خیال ہے ہم اس میں آسانی سے کامیاب ہو جائیں گے۔“

”کیا ان لوگوں کو قیمتوں کا تعین کرنے کا اختیار حاصل ہے؟“

”ہاں، یہ بات میں پہلے ہی معلوم کر چکا ہوں۔“

”تب تو ٹھیک ہے۔“ نور علی نے پر خیال انداز میں گردن ہلا کر کہا پھر بولا۔

”لیکن انہیں حویلی میں دعوت تو دینی چاہئے، مذاکرات کہاں ہوں گے؟“

”حویلی میں اور کل دوپہر کو وہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد ہم زمینوں

کی سیر کریں گے۔“

”گڈ، ٹھیک پروگرام ہے، اب اس میں اور کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جو قابل غور ہو۔“

”بات تو نہیں ہے لیکن جو دو افراد آئے ہیں ان میں ایک شخصیت قابل غور ہے نور علی۔“

”کیا مطلب؟“

”کل دوپہر کو وہ ہمارے پاس آ رہے ہیں کام کی باتیں کریں گے اور اس کے بعد پھر یہ گھمانے لے جائیں گے دو خیال ہیں میرے ذہن میں یا تو یہ کہ وہاں زمینوں سے لڑکی کو اغوا کر دیا جائے اور اس کے بعد اس کی بازیابی بھی ہمارے ہی ہاتھوں ہو، سمجھ رہے ہوتا؟“

”ہاں لیکن اس میں ایک خطرہ ہے۔“

”کیا؟“

”یہ سودا مشکل میں پڑ جائے گا۔“ نور علی نے کہا اور پیار علی نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر غور کرنے لگا پھر بولا۔

”ہاں یہ تو بے بات وقت سے پہلے خراب ہو جائے گی۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“

”اگر تم اتنے ہی زیادہ مضطرب ہو اس کے لئے تو منصوبہ بنایا جاسکتا ہے؟“

”غور کرو نور علی یہ بات میں نے بارہا تسلیم کی ہے کہ ذہنی طور پر تم مجھ سے بہت برتر ہو اور ہمیشہ دور کی کوڑی لاتے ہو۔“

”چھوڑو یار بڑے بھائی ہو کر ہمیشہ میری حق تلفی کرتے ہو اور میں جو کچھ کرتا ہوں تمہارے ہی لئے کرتا ہوں۔“

”میری جان کبھی حکم دے کر دیکھ مجھے..... اشارہ کر دے کہ اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں زندگی کی بازی لگا کر اسے تیرے لئے حاصل کر لوں گا۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے دیکھ لوں گا کبھی یہ بھی اب زرینہ کے مسئلے کو دیکھ لو..... وہ لڑکی مجھے بھی پسند تھی۔“

”تو منع کس نے کیا ہے اب تو وہ ہماری ملکیت ہے اب ہمارے ساتھ وہ بھرپور تعاون کرے گی۔“

”بس پیار علی میری زبان نہ کھلو اوچلو خیر ٹھیک ہے ہم دونوں میں ایک معاہدہ یہ بھی ہے کہ کبھی کسی لڑکی کے لئے آپس میں نہیں لڑیں گے۔“

”میں نے کہا دیا تم سے اگر کوئی ایسی شخصیت بھی ہو جسے میں پسند کرتا ہوں اور تم اس کی جانب اشارہ کر دو تو سمجھ لو میری طرف سے وہ تمہاری۔“ نور علی ہنسنے لگا پھر بولا۔

”اب یہ غور کرو کرنا کیا چاہئے۔“ دونوں بہت دیر تک سوچتے رہے اور اس کے بعد نور

”زمینوں پر اسے اغوا کرنا جیسے کہ میں نے تمہیں بتایا خطرناک ہو سکتا ہے۔ پھر ایک مسئلہ چل جائے گا اور وہ بڑا کام نہیں ہو سکے گا اور والد بزرگوار بھی اس بات کو پسند نہیں کریں گے..... کہیں ان کے علم میں یہ بات آگئی تو ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا اور وہ نہائے کہ ہم اب کاروبار میں بھی رخنہ انداز ہونے لگے ہیں۔“

”ہاں یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔“ پیار علی نے اس بات کو تسلیم کیا۔

”تو پھر یوں کرتے ہیں کہ اس سودے کی تکمیل کے بعد اسے کسی نہ کسی طرح حاصل لیتے ہیں۔“

”سودا تو میرا خیال ہے کل ہی مکمل ہو جائے گا اگر کوئی مشکل بھی باقی رہ گئی تو کل کے بعد لیکن پھر اس کے بعد کیا کریں گے ہم اور یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سودے کی تکمیل کے بعد یہاں قیام ہی کر لیں۔“

”کل اگر ان سے گفتگو مکمل ہو جاتی ہے تو یوں کرو کہ کل دوپہر کی گفتگو میں راگ علی باب کو شریک نہ کرو بلکہ ان سے کوئی بات کئے لیتے ہیں کہہ دیں گے کہ ہم اس سودے کے لئے اسے تیار کر رہے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ وہ راگ علی صاحب کی موجودگی میں اس کے لئے تیار نہ ہو، چنانچہ ہمیں خود ہی کام کرنے دیا جائے رات کو معاہدے پر دستخط کے لئے ان شخص کو دوبارہ بلا لیں گے اور خاتون کو ۱۰ روپے دیں گے، بس پھر گیسٹ ہاؤس سے اسے آدمی اسے لے جائیں گے۔ ہماری طرف سے تو کام ہو گیا ہو گا اس کے بعد ہم خود اس کے ساتھ اس لڑکی کی بازیابی میں مدد کریں گے اور اسے بازیاب کر ادیں گے۔“

”لیکن؟“

”کیا تمہیں اپنا چہرہ دکھانا ضروری ہے؟“

”اوہو میں سمجھ گیا۔“

”اس کے علاوہ وہی زرینہ والا طریقہ کار اختیار کیا جائے گا بلکہ میری ایک اور رائے ہے کہ یہ رقم وغیرہ دے دیں گے اور کہیں گے کہ زبان بند رکھے ورنہ اسے نقصان پہنچ جائے

گا، لیکن وہ مشکل برقرار رہے گی۔ سمجھ رہے ہوں؟“
”ہوں..... کہاں لے جاؤ گے؟“

”میرا خیال ہے کالا بگلہ اس کے لئے مناسب رہے گا۔“

”تو پھر یہ ذمے داری میں تمہیں سوپ دوں۔“

”پہلے بھی تمہاری ذمے داریاں میں ہی قبول کرتا ہوں۔“ نور علی نے قبضہ لگا کر کہا

اور پیار علی بھی ہنسنے لگا پھر بولا۔

”بھائی ہو تو تم جیسا۔“

”بس..... بس..... بس، اچھا اب اس سلسلے میں یہ بتاؤ کہ آگے کیا کرتا ہے۔“ نور علی

نے کہا اور پیار علی گہری سوچ میں ڈوب گیا کچھ دیر کے بعد اس نے گردن اٹھائی اور بولا۔

”بس وہی منصوبہ زیادہ مناسب ہے انہیں بہت عمدگی سے خوش آمدید کہو، تمام تر

کاروباری باتیں کرو ذاتی طور پر اس کی دوستی حاصل کرنے کی کوشش کرو اور پھر اسی پروگرام

کے تحت روانہ کرو بعد کا منصوبہ تمہارے علم میں ہے؟“

”اور کوئی ایسی خاص بات تو نہیں جو ان سے کرنی ہو؟“

”میرا خیال ہے۔۔۔ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔“ نور علی بولا اور دونوں بھائی اس

پروگرام پر متفق ہو گئے۔



حویلی میں پیار علی اور نور علی نے ان کا پر تپاک خیر مقدم کیا تھا..... وہ انہیں اپنے ساتھ

لے کر ایک خوب صورت ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے..... پیار علی نے نور علی کا تعارف

کر لیا پھر بولا۔

”ہماری ملاقات خالص کاروباری بنیاد پر ہوئی ہے، مسٹر شاہد ایاز لیکن بعض لوگ کچھ

ایسی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں کہ وہ دلوں میں اپنا مقام الگ بنا لیتے ہیں اور آپ دونوں انہی

میں شامل ہیں۔“

”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میرے بھائی پیار علی آپ لوگوں سے ملاقات کر کے

واپس آئے تو آپ ہی کے گن گاتے ہوئے آئے تھے، کچھ زیادہ ہی متاثر کر لیا ہے آپ

حضرات نے انہیں۔“

شہاب ہنسنے لگا پھر بولا۔ ”یہ بات نہیں ہے اصل میں اچھے لوگ اچھی ہی شخصیت کے
ہوتے ہیں، آپ خود اتنے نفیس لوگ ہیں کہ ہم بھی آپ ہی کے بارے میں باتیں
رہتے رہے۔“

”ویسے معاف کیجئے گا مسٹر شاہد ایاز، محترمہ فرخندہ رشید سے آپ کا کوئی ایسا رشتہ ہے

جو بدنامی کیفیتوں کا حامل ہو؟“ نور علی نے سوال کیا پھر جلدی سے بولا۔ ”اصولی طور پر اس

نم کے سوالات احقرانہ ہوتے ہیں اور یہ نہیں کرنا چاہئیں لیکن وہی کیفیت ہے دوستیوں کو

نہم کرنے کے لئے اگر ذرا سی بے تکلفی کا انداز اختیار نہ کیا جائے تو مزہ نہیں آتا، اگر میرا یہ

بال ناگوار گزرا ہے تو معافی چاہتا ہوں۔“

”نہیں مسٹر نور علی معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے..... انسان کے ذہن میں

بالا ت پیدا ہوتے ہی ہیں، ہم بہترین دوست ہیں۔“

”اس کا مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ ویسے آپ کی زندگی تو بڑی دلچسپ ہوگی، اس قسم کے

یونچرز ہوتے رہتے ہوں گے۔“

”جی ہاں کبھی کبھی اچھے لوگوں سے بھی واسطہ پڑ جاتا ہے۔“ شہاب نے جواب دیا پھر

نور الہی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ شہاب نے کچھ ایسے سوالات بھی کئے جو بے

مانہ نوعیت کے تھے، لیکن ان میں ایسے پہلو پوشیدہ تھے جو ان لوگوں کو چونکانے کا باعث

ناجائیں لیکن ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ ان سوالات کی اصل نوعیت کیا ہے، وہ محتاط

بات دیتے رہے پھر کھانے کا پر تکلف دور شروع ہوا، ان لوگوں نے زبردست اہتمام کیا

مذاک علی ساندہا کے بارے میں شہاب نے سوال کیا تو نور علی بولا۔

”ابو کچھ ایسی مصروفیات میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ انہوں نے اس وقت کی میٹنگ میں

حضور کے لئے معذرت کر لی تھی۔“

”لیکن پھر ہماری گفتگو تو تشنہ رہ جائے گی؟“

”شاہد ایاز صاحب گفتگو تشنہ نہیں رہے گی ہم گفتگو کر لیں گے لیکن ان تمام باتوں کے

بہار کی دوستی کی پیش کش بھی تو قبول کرنی ہے آپ نے..... جلدی کیا ہے کم از کم

بہاری طور پر آپ کو اتنا وقت مل ہی جائے گا کہ اس میں سے کچھ وقت آپ ہمیں دے

سنا ہماری سیر گاہیں ہیں، چراگاہیں ہیں، باغات ہیں اور پھر شکار گاہیں ہیں۔ تھوڑی بہت

سیر کر لیجئے ان کی، آپ جیسے مصروف لوگوں کو وقت کہاں ملتا ہو گا ان تکلفات کے لئے لیکن ہم دیہاتیوں کا بھی دل رکھ لیجئے ہمیں خوشی ہو گی۔“

”مجھے اس بات کی مسرت ہے کہ اتنے اچھے لوگوں سے میرا تعارف ہوا۔۔۔۔۔ اس وقت تو خیر نہیں لیکن دوبارہ چھٹی لے کر یہاں آنے کی جرات آسانی سے ہو جائے گی کیوں کہ یہاں میرے دوست موجود ہوں گے۔“

”چلئے ٹھیک ہے جیسا آپ پسند کریں۔ بہر حال ابو سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی جائے گی۔“

”زمینوں کے مسئلے کو کون ذیل کرے گا؟“

”ہم دونوں بھائیوں کو مکمل اختیارات ہیں۔“

”آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے زمینوں کی سیر کرادی جائے گی؟“

”بالکل یہ تو ہماری ذمہ داری ہے، کھانے کے بعد چہل قدمی کے طور پر ادھر نکل چلیں گے اور زمینیں آپ کو دکھادی جائیں گی۔ ویسے یہ بات آپ کے علم میں ہو گی کہ سرکاری اہل کار وہاں مارکنگ کر گئے ہیں۔“

”جی ہاں اس کے بارے میں مجھے بتادیا گیا ہے۔“

”بس یوں سمجھ لیجئے کہ زمینیں تو آپ کی ملکیت بن چکی ہیں ان کے سلسلے میں ضمنی کارروائی ہوئی ہے جس کی تکمیل آپ کر لیجئے گا۔ ویسے معافی چاہتا ہوں کیا آپ کو زمینوں کی سودے کاری کے لئے مکمل اختیارات دیئے گئے ہیں؟“

”جی قطعی۔“

”ویری گڈ، ویری گڈ۔ تو اب ہم اپنے دوستوں سے اس بات کی امید کر سکتے ہیں کہ حق حقدار تک پہنچ جائے گا۔“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔ بالکل پہنچ جائے گا۔“ شہاب نے مسکراتے ہوئے کھانا اس پر تکلف گفتگو کے دوران ختم ہو گیا اور پھر گاڑیاں تیار کر لی گئیں۔ شہاب اپنی گاڑی گیسٹ ہاؤس پر ہی چھوڑ آیا تھا کیونکہ پیار علی نے اسے پہلے ہی بتادیا تھا کہ وہ ان کے لئے اپنی گاڑی بھیجے گا ایک بہت ہی شاندار گاڑی میں یہ سفر کیا گیا۔ شہاب اور بیٹا بستی نور الہی کے بیرونی علاقوں کو دیکھ کر کافی متاثر ہوئے تھے کیونکہ ان علاقوں پر کافی محنت کی گئی تھی اور یہاں ایسی شادابی تھی کہ

”نور الہی کے قرب وجوار میں بے شمار زمینیں ہیں اور ہم خاندانی جاگیر دار ہیں۔۔۔۔۔ ان نبوں میں سے جتنی زمین آپ پسند کریں، دوستی کے نام پر آپ کو دی جاسکتی ہے، بلکہ یہ زمین جو حکومت کو درکار ہے شاہد ایاز کے نام رجسٹر کرائی جاسکتی ہے۔ بعد میں شاہد ایاز اس کا مال چاہے کریں۔ حکومت کو فروخت کریں یا انکار کر دیں۔۔۔۔۔ یہ ایک رئیس زادے کی زمین ہے۔ آزما لی جائے۔“ پیار علی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”میں سمجھا نہیں؟“

”مطلب یہ تھا کہ یا تو ان زمینوں کی قیمت ہمارے شایان شان دلوائی جائے یا ان کو بے

”اس کے لئے تو میری معذرت قبول کریں البتہ میری خواہش ہے کہ ہم گیسٹ ہاؤس پر اس موضوع پر بات کر لیں۔“

”نہایت مناسب ہے۔“ پیار علی تیار ہو گیا۔

وہ لوگ بڑے احترام سے انہیں گیسٹ ہاؤس پر لے آئے اور یہاں ناصر نے ان کے لئے چائے وغیرہ بندوبست کیا پھر کاروباری گفتگو شروع ہو گئی جس میں بیٹا بھی پوری دلچسپی لے رہا تھا حصہ لے رہی تھی اور کافی دیر تک اس موضوع پر گفتگو جاری رہی۔ سرکاری طور پر بی بی آئی جی نادر حیات نے شہاب کو بریف کر دیا تھا اور شہاب وہی زبان بول رہا تھا جو اسے بھائی گئی تھی۔ اس نے زمین کی قیمت بتائی تو پیار علی نے کہا۔

”یہ تو سرکاری حساب رہا۔ دوستی کا حساب کیا ہو گا؟“

”میں سمجھا نہیں۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں پیار علی صاحب۔“ شہاب نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور پیار علی سوچ میں ڈوب گیا پھر بولا۔

”ہمارے پاس بھی ان کا ایک حساب درج ہے لیکن اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ کیوں نہ اس سلسلے میں ابو کو بھی شریک کر لیا جائے۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے شہاب صاحب کہ رات کو آپ تھوڑی دیر کے لئے زحمت کر لیں اور ابو کے سامنے ان قیوتوں کا تعین ہو جائے۔“

”میں نے تو پہلے ہی آپ سے کہا تھا لیکن آپ نے کہا کہ آپ کو اس کے اختیارات ہیں؟“

”مجھے اتنے اختیارات بے شک ہیں کہ میں یہ زمینیں تحفے کے طور پر اپنے دوست شہاب ایاز کو دے دوں۔ آپ انہیں قبول کر لیجئے اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، ہم انہیں آپ کے نام رجسٹر کروادیں گے اور اگر ان کی قیمت حکومت سے دلوای رہے ہیں تو پھر ہماری پسند کی قیمت دلوادی جائے۔“

”وہی میں آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”نہیں شہاب صاحب اب صورت حال کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ آپ کو صرف تھوڑی دیر کے لئے زحمت کرنا ہی ہوگی۔ مس فرخندہ کو یہیں رہنے دیں آپ، بس آپ تھوڑی دیر کے لئے حویلی آجائیں۔“

”ٹھیک ہے اگر آپ یہ چاہتے ہیں تو مجھے اعتراض نہیں ہے۔“ بات یہاں ختم ہو گئی تھی اور اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے تھے۔ شہاب نے مسکراتی نگاہوں سے بیٹا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا ان لوگوں سے جو گفتگو اب تک ہوئی ہے اس سے بس اتنا ہی اظہار ہوتا ہے کہ بڑے شاطر اور کمینہ صفت لوگ ہیں سب ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک اور خیال بھی میرے دل میں آیا ہے، جب ہم یہاں تک آئے ہی ہیں تو واپسی میں ایک چکر بستی مہر جان کا بھی لگاتے چلیں کچھ معلومات وہاں سے بھی حاصل ہو جائیں گی۔ ابھی تک کوئی اتنی بہتر صورت حال سامنے نہیں آئی ہے جو اس کیس میں معاون ہو لیکن ان لوگوں سے شناسائی آگے چل کر بہ لوگوں کے لئے سودمند ہو سکتی ہے۔“

”جی شہاب صاحب آپ اس سلسلے میں جو بھی بہتر سمجھیں۔“

”بھان اللہ، گویا اب آپ ذہنی طور پر مجھ سے متفق ہو گئی ہیں مس بیٹا؟“

”کس سلسلے میں سر؟“

”ارے ارے ایک لمحے میں بھٹک گئیں۔۔۔۔۔ میں اصل میں شہاب صاحب کہنے کی بات اٹھان لیں آپ نے پھر سر کہہ کر سب کچھ چوٹ کر دیا۔“ بیٹا پھر ہنس پڑی تھی۔ بعد کا ٹیٹ ہاؤس میں ہی گزرا دونوں مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے تھے۔ شہاب یہاں آمد کو کوئی زیادہ کارآمد بات نہیں سمجھ رہا تھا۔۔۔۔۔ نادر حیات صاحب کی خواہش تھی لئے اس نے اسے قبول ہی کر لیا تھا لیکن اسے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ان حالات میں یہاں کوئی خاص معلومات نہیں ملیں گی۔ بہر حال رات کو ایک بار پھر حویلی سے گاڑی آگئی۔۔۔۔۔

بے بیٹا کو آرام کرنے کیلئے کہا اور اس کے بعد ان لوگوں کے ساتھ چل پڑا۔

ایک بار پھر اسے حویلی میں خوش آمدید کہا گیا تھا۔۔۔۔۔ پیار علی اور نور علی دونوں ہی اس استقبال کے لئے موجود تھے۔ شہاب کو ڈرائنگ روم میں پہنچادیا گیا اور کچھ دیر کے بعد علی ساندرا ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ بھی بڑے روف کا آدمی تھا شخصیت سے بانٹتا تھا اس نے شہاب سے ہاتھ ملایا اور اسے بیٹھنے کی پیشکش کی پھر خود بھی اس کے ذہنی بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا۔

”آپ کا نام مجھے شاہد ایاز بتایا گیا ہے۔ اصل میں شاہد ایاز صاحب بچے زندگی میں آگے کی کوشش کر رہے ہیں میرے پاس سب کچھ موجود ہے اور تھوڑی بہت رقم کی میں مل کر تا، ان کی خواہش ہے کہ میں آپ سے زمینوں کی قیمت کے بارے میں بات اصل میں شاہد ایاز صاحب ایک بڑی کمزوری ہے میرے اندر۔۔۔۔۔ وہ یہ کہ اگر کوئی بات سے نکالتا ہوں تو پھر دل میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ بات پوری ہو جائے، میری بات کو اگر ٹھکرا دیا جاتا ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ میں دیوانہ ہو جاتا ہوں، بچوں سے منع فائدہ مجھے اس معاملے میں شریک نہ کرو لیکن ضد کرنے لگے ایسی جھوٹی موٹی زمینوں کوئی پروا نہیں ہوتی، لیکن بچے مجھے یہاں تک لے آئے ہیں تو آپ کو میری بات کی حوا ہوگی۔ ہم نے ایک قیمت کا تعین کیا ہے آپ اسے منظور کر دیں۔۔۔۔۔ وہ رقم سرکار قبول کرنا ہمارا اپنا کام ہے، آپ کو ہمارا فیگر درج کرنا ہے بس، سمجھ رہے ہیں نا آپ اور

رات کی پیش کش کرتا ہوں..... ظاہر ہے مس فرخندہ آپ کی مسرت تو ہیں نہیں جو کو باز پرس کا خطرہ ہو۔“ پیار علی نے ہنس کر کہا۔

”اس کے بعد میری آپ سے دوسری ملاقات کی نوعیت مختلف ہوگی پیار علی اب..... اس وقت کے لئے یہ دلچسپیاں محفوظ رکھیں..... اب میں جانا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسے آپ پسند کریں..... میں آپ کی واپسی کا بندوبست کئے دیتا ہوں۔“ کچھ دیر کے بعد شہاب واپس گیٹ ہاؤس پہنچ گیا..... پچیس لاکھ روپے کے نوٹ اس کے پاس موجود تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس کیس کی آمدنی بھی غیر معقول نہیں رہی۔ یہ خبری وہ نئے منصوبوں کے ساتھ مینا کو دینا چاہتا تھا۔

گیٹ ہاؤس کے دروازے پر چوکیدار موجود نہیں تھا..... شہاب نے اس بات پر توجہ ہی لیکن برآمدے میں چوکیدار کو زمین پر بے سدھ پڑے دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا..... وہ با اختیار اس پر جھک پڑا..... چوکیدار کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بے ہوش پڑا ہوا..... شہاب کے بدن میں سنسنی دوڑ گئی پھر وہ بے تحاشا مینا کے کمرے کی طرف دوڑا..... بے کادروازہ کھلا ہوا تھا اور بستر پر مینا موجود نہیں تھی..... اس کے سلیپر بھی نیچے موجود باور بستر کی چادر بے ترتیب تھی۔

”کچھ ہو گیا۔“ شہاب کے ذہن نے نعرہ لگایا۔ ”مگر کیا؟“



باب ارے لڑکھو کیا دیکھ رہے ہو، ایک تحفہ رکھا تھا ہم نے ان کے لئے..... کہاں ہے وہ؟“

”لاتا ہوں۔“ پیار علی نے کہا اور دونوں بھائی باہر نکل گئے، پھر تھوڑی دیر کے بعد علی واپس آگیا اور اس نے ایک چرمی کیس لاکر راگ علی کے حوالے کر دیا..... راگ علی نے کیس میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں..... ہزار ہزار کے نوٹوں کی پچیس گڈیاں تھیں اس نے وہ گڈیاں ایک جگہ جمائیں اور پھر انہیں شہاب کی طرف سرکادیا۔

”یہ ایک چھوٹا سا تحفہ قبول کر لو..... ہر بات ہونے سے پہلے۔“

”ارے نہیں اس کی کیا ضرورت تھی۔“

”رکھ لو، رکھ لو بلکہ ایسا کرو اسی بیگ میں رکھ لو۔ بچے تکلف نہیں کیا کرتے بزرگوں کے سامنے۔“

”آپ نے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔“ شہاب نے کہا اور نوٹوں کی گڈیاں چرمی بیگ میں جمانے لگا پھر اس نے بیگ کی زپ بند کر دی، راگ علی مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتا تھا..... اس کے بعد اس نے ایک فارم شہاب کے سامنے کر دیا جس پر زمینوں کی قیمت راگ علی کی جانب سے درج کی گئی تھی۔

”بس یہاں آؤ گراف دے دو، بات ختم۔“ شہاب نے درج شدہ رقم پڑھی، مسکرا راگ علی کی طرف دیکھا اور بولا۔

”جب آپ جیسے مہربان بزرگوں کا سامنا ہو تو بھلا کسی کی مجال ہے کہ انکار کرے اس نے قلم لے کر اس جگہ دستخط کر دیئے جہاں ان دستخطوں کی ضرورت تھی۔ راگ نے ہنس کر وہ فارم اٹھایا اور پیار علی کے حوالے کر دیا۔

”دیکھا تم نے کسی نیک کام میں بزرگوں کی شمولیت کا نتیجہ..... ہمارے بغیر کوئی کرنے کی کوشش مت کیا کرو آپ کا بہت بہت شکریہ شاہد صاحب آپ نے ہماری زبان لالچ رکھ لی۔“

”خادم ہوں آپ کا۔“ شہاب نے نیاز مندی سے کہا۔

”تم جیسے اچھے اچھے لوگوں کا مستقبل تابناک ہوتا ہے۔ اچھا بچو تم لوگ اپنے شاد شروع کرو، میں چلتا ہوں۔“ راگ علی ان کے درمیان سے اٹھ گیا۔

فرمائیے شاہد صاحب..... اب آپ کی کیا خدمت کی جائے..... میں آپ کو ایک نو

نہیں آئی..... اچانک ہی کمرے میں ایک ہلکی سی بوکا احساس ہوا تھا اور اس بو کو شہاب نے غریب پہچانتا تھا..... یہ کوئی خواب آور گیس تھی اس کا مطلب ہے کہ ناصر کو بے ہوش کیا ہے۔ چونکہ ارنزخمی اور ناصر بے ہوش، بیٹا غائب ہے..... اب اس میں کسی شک و کا امکان نہیں تھا کہ یہ اغوا کا کیس ہے لیکن بیٹا کو اغوا کرنے والے کون ہو سکتے تھے بستی نور الہی کے دوسرے لوگوں کے بارے میں تو اسے معلومات حاصل نہیں تھیں..... یہ تو یقینی بات ہے کہ یہاں اور بھی جرائم پیشہ لوگ ہوں گے..... اگر ذہن پیار علی انداز کی طرف جائے تو اس کا کوئی ثبوت شہاب کے پاس نہیں تھا کیونکہ نہ صرف پیار علی اور علی بلکہ راگ علی ساندرا بھی وہاں موجود تھے..... اب پاگلوں کی طرح سڑکوں پر تو نہیں رہتا تھا..... بیٹا کو منظم طریقے سے اغوا کیا گیا ہے اور اغوا کرنے والے تجربے کار لوگ ملوم ہوتے ہیں، لیکن آخریوں؟“

ناصر کے کمرے سے باہر نکل آیا، اس سے اب کچھ نہیں لینا تھا، لیکن بیٹا کے لئے دل جو وحشت محسوس کر رہا تھا وہ اسے احساس دلارہی تھی کہ بیٹا کا مقام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اس کی ساتھی بن گئی ہے بلکہ بیٹا کے لئے دل کی گہرائیوں میں واقعی ایسے جذبات پیدا ہو گئے ہیں جن پر کچھ عرصے پہلے وہ ہنستا تھا، لیکن اب یہ ہنسی اس کے ہونٹوں سے غائب ہو چکی تھی، شدید پریشانی کے احساس نے اسے چند لمحات کے لئے مفلوج کر دیا تھا..... بیٹا کو روکونی نقصان پہنچ گیا تو وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا لیکن اب صورت حال ہی ایسی ہو گئی تھی کہ بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔



بیٹا کو زور سے چھینک آئی اور اس کی آنکھیں کھل گئیں، ایک لمحے کے اندر اندر اسے یہ حس ہو گیا کہ کوئی اہم بات ہے..... شہاب اس سے تمام تر گفتگو کرنے کے بعد راگ علی ماندرا کی حویلی گیا تھا اور وہ آرام کرنے لیٹ گئی تھی، پھر نجانے کیا ہوا کہ اس کی نیند گہری آواز چلی گئی، حالانکہ وہ شہاب کے بارے میں سوچ رہی تھی..... بہت سے خیالات ذہن میں آئے لیکن یہ خیالات چند لمحوں میں سو گئے تھے اور اس نیند کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن اب جبکہ چھینک آئی تو اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے ایک لمحے میں یہ اندازہ لگا لیا کہ اسے اتنا ہی کا وقت ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی اس کی چھٹی حس نے اسے بتایا کہ وہ تنہا

دیر تک وہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا..... بیٹا کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہے لیکن کیسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر اس کے ذہن میں چھٹکا ہوا..... ناصر! وہ بے تحاشا اس طرف بھاگا، جہاں ناصر کی قیام گاہ تھی..... ناصر کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا..... اس نے کان لگا کر اندر کی آوازیں سننے کی کوشش کی، لیکن اندر مکمل خاموشی طاری تھی..... شہاب نے دروازے پر دستک دی..... کئی بار دستک کے باوجود دروازہ نہ کھلا تو شہاب پیچھے ہٹ گیا..... دروازہ اندر سے بند ہے لیکن کوئی آوازیں نہیں سنائی دے رہیں، کم از کم یہ اندازہ تو ہے کہ اندر کوئی موجود ہے اس خاموشی کا کیا راز ہو سکتا ہے، دروازے کے بارے میں شہاب نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کی کیفیت کیا ہے، ایسی چٹخنیوں کو آرام سے توڑا جا سکتا تھا، اگر ان پر صحیح ضرب لگ جائے۔ چنانچہ پیچھے ہٹنے کے بعد شہاب نے ایک زوردار ٹکڑ دروازے پر ماری اور تڑاخ کی آواز کے ساتھ دروازے کی چٹخنی اکھڑ گئی، شہاب دوڑتا ہوا اندر داخل ہو گیا تھا، کمرے میں مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس میں بھیجی ہوئی مسہری پر ناصر سوراہا تھا..... زوردار دستک، دروازہ ٹوٹنے کی آواز، اس پر تو ہر طرح کی گہری سے گہری نیند ٹوٹ سکتی تھی..... وہ ناصر کے قریب پہنچ گیا..... جھک کر اسے دیکھا پھر واپس پلٹ کر کمرے کی تیز روشنی جلادی، ناصر اپنے پلنگ پر بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا، کیا یہ مر چکا ہے..... شہاب نے سوچا اور جھک کر ناصر کے گالوں پر تھپڑ لگانے لگا..... زوردار تھپڑوں سے اس کا چہرہ ادھر ادھر تو ہو رہا تھا لیکن ہوش کے آثار نظر نہیں آتے تھے..... شہاب نے اس کے سینے سے کان لگا کر دل کی دھڑکنوں کو سنا، سانسیں ترتیب سے تھیں لیکن وہ بے ہوش تھا..... یہ جائزہ لینا بھی ضروری تھا کہ کیا وہ بے ہوش ہونے کی اداکاری کر رہا ہے لیکن پھر اس کی ضرورت

”حق معلوم ہوتے ہو ایک طرف تو کسی کی پوجا کی بات کرتے ہو اور دوسری طرف
نہ بے اعتمادی کی جو اگر ذہنوں میں سرایت کر جائے تو پھر کوئی تعاون نہیں ہو سکتا۔“
نقاب پوش شاید بیٹا کے الفاظ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس نے آہستہ سے کہا۔
”تمہیں اس طرح یہاں لائے جانے پر اعتراض نہیں ہے؟“
”تم اعتراض کی بات کرتے ہو میرا بس چلے تو میں تمہیں زخموں سے چور کر دوں۔“
”ہاں یہ سچ بات ہے ظاہر ہے اس طرح کسی کو لائے جانے کے بعد مقابل کے لئے
ہل میں کوئی گنجائش تو نہیں رہتی مس فرخندہ رشید۔“
”تم مجھے جانتے ہو؟“

”نہ صرف جاننے کی بات کریں آپ بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ آپ کی پہلی بھلک نے
میرے ہوش و حواس کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔“
”حق آدمی میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ تم کون ہو اور اس فضول حرکت سے تمہارا
مقصد کیا ہے۔ جہاں تک حسن کی بات کرتے ہو تو میں اپنے آپ سے ناواقف بھی نہیں
ہوں، معمولی سی شکل و صورت کی لڑکی ہوں، لیکن اس کے باوجود اپنی حفاظت بھی کرنا
چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ تم نے غالباً کسی ذریعے سے مجھے بے ہوش کر کے یہاں تک لانے کی
جرات کی ہے۔“

”کھلی سی بات ہے، ہوش و حواس کے عالم میں کیا تم یہاں آنا پسند کرتی؟“

”کیا چاہتے ہو؟“

”تمہیں۔“

”کیا میرا حصول اس قدر آسان ہوگا؟“

”نہیں۔“

”پھر تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ میں تمہارے چنگل میں آ جاؤں گی؟“

”تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور دیکھو مس فرخندہ رشید جب انسان کسی سے تعاون کا

طلب گار ہوتا ہے تو اس کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ اس کا مد مقابل اسے توجہ دے۔“

”کیا اس طرح مجھے لانے کی کوشش میرے دل کے گوشے نرم کر سکتی ہے؟“

”بے شک نہیں، لیکن طلب کی شدت ہر طرح کے اقدامات پر مجبور کر دیتی ہے۔“

نہیں ہے کوئی اور بھی اس کے قریب موجود ہے، ذہن میں نور اشہاب کا خیال آیا تھا اور اس
نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تھا، لیکن سامنے جو کوئی بھی موجود تھا، وہ شہاب کسی قیمت پر
نہیں ہو سکتا تھا، اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور جسم پر خاص لباس تھا، ایک لمحے کے اندر
اندر بیٹا کے پورے جسم میں ایک برق سی دوڑ گئی، اس نے فوراً ہی کروٹ بدلی اور پھرتی سے
مسہری کے دوسری جانب جا کھڑی ہوئی۔۔۔۔۔ تب اسے ایک اور احساس ہوا اور یہ احساس یہ تھا
کہ یہ وہ کمرہ بھی نہیں ہے جس میں وہ سونے لیٹی تھی، جگہ بدل گئی ہے، یہ ساری باتیں تو بعد
میں بھی سوچی جاسکتی ہیں، لیکن یہ نقاب پوش کون ہے۔۔۔۔۔ نقاب پوش اس کے اتنے قریب
تھا کہ با آسانی ہاتھ بڑھا کر بیٹا کو چھو سکتا تھا، لیکن اب اس سے فاصلہ ہو گیا تھا اور بیٹا ہر طرح
سے مستعد کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ ایک لمحے میں اس نے اپنے حواس سنبھال لئے اور
سر دلچے میں بولی۔ ”کون ہو تم؟“

نقاب کے پیچھے نقاب پوش کی کیفیت کچھ بھی ہوئی ہو، لیکن اس کی آواز سے
مسکراہٹ ٹپک رہی تھی۔۔۔۔۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”حسن کے پجاری کو کوئی بھی نام دے
لیا جائے لیکن وہ پجاری ہی ہوتا ہے اور بستی نور الہی میں ایسے بہت ہی کم لوگ ہیں جو میری
طرح اس خوش ذوق کے حامل ہوں۔“

یہ آواز، یہ انداز اور یہ لہجہ بیٹا کے لئے قطعی اجنبی تھا، لیکن اس کی ذہنی کیفیت بہتر
تھی اور وہ صورت حال کو پوری طرح سمجھ سکتی تھی۔ شہاب نے اسے بلاوجہ ہی اپنے
ساتھیوں میں شامل نہیں کیا تھا، بلکہ یہ بیٹا کی صلاحیتیں تھیں، جنہوں نے شہاب کو متاثر کیا
تھا اور ان میں سب سے اعلیٰ صلاحیت برق رفتاری سے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی تھی۔ اس
نے اپنے لہجے سے کسی خوف یا پریشانی کا احساس نہ ہونے دیا اور آہستہ سے بولی۔ ”کیا تم مجھے
میری رہائش گاہ سے اٹھا کر لائے ہو؟“

”سوال ہی بیکار ہے ظاہر ہے یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں تم اپنی مسہری پر محو استراحت
تھیں۔“

”پھر کون سی جگہ ہے؟“

”اگر کوئی کسی کو اس طرح اس کی مرضی کے خلاف اٹھا کر لے آتا ہے تو پھر کیا؟“

جواب دینے کا پابند ہے کہ یہ جگہ کون سی ہے؟“

”آپ کی قیمت دس لاکھ روپے نہیں ہوتی۔“

”نہیں مس فرخندہ..... یہ صرف انسان کی جذباتی سوچ ہوتی ہے..... دس لاکھ روپے ایک آسان نام ہے البتہ، میں یہ نہیں جانتا کہ آپ کا بیک گراؤنڈ کیا ہے، لیکن یہ رقم معمولی نہیں ہوتی۔“

”تم مجھے دولت کا فریب دے کر خریدنا چاہتے ہو؟“

”فریب نہیں، دولت دے کر، یہ دس لاکھ روپے میں تمہاری قربت حاصل کرنے کے پہلے تمہیں پیش کر سکتا ہوں۔“

”کیا تم دس لاکھ کی اوقات کے مالک ہو؟“

”ایک منٹ مس فرخندہ۔“ نقاب پوش نے کہا اور ایک جانب بڑھ گیا..... بینا کی نظریں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ نقاب پوش نے ایک الماری کھولی اور ایک چھوٹا سا بیگ نکال کر ہانے رکھا، پھر اس میں سے دس لاکھ روپے کے نوٹ نکال کر بینا کے سامنے رکھ دیئے۔

”میں سچائیوں کا پجاری ہوں اور شوق کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، یہ رقم تم اپنی تحویل میں لے لو اور اس کے بعد مجھ پر یقین کر لو۔“

بینا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے نوٹ اٹھائے اور پھر انہیں سنبھال کر ایک جانب رکھ دیا، اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ چل کر مسہری پر آگئی۔ اس کی نگاہیں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں..... نقاب پوش اسے آمادہ پا کر خوشی کا اظہار کرنے لگا، پھر بولا۔ ”تم میری توقع سے بہت مختلف نکلیں فرخندہ، درحقیقت میں تمہیں پسند کرنے لگا تھا۔“

”مگر تم کون ہو؟“

”کہانا بس تمہارا پجاری تمہیں پسند کر لیا تھا میں نے اور میں جس چیز کو پسند کر لیتا ہوں اسے حاصل کرنے کے لئے پھر کچھ نہیں سوچتا اس کے سوا کہ وہ میری ملکیت بن جائے۔“

”لیکن بزدل ہو۔“

”کیوں؟“

”نقاب جو پہنے ہوئے ہو۔“

”نہیں یہ نقاب ایک پردہ ہے میرے اور تمہارے درمیان، آج کے بعد ظاہر ہے کہ ہم دونوں نہیں ملیں گے لیکن کم از کم تمہارے دل میں میری خلش نہیں رہ جائے گی۔“

”میں پوچھتی ہوں آخر کیا چاہتے ہو؟“

”تمہاری توجہ، تمہاری طلب، تمہاری قربت۔“

”کیا تم مجھے کوئی فاحشہ سمجھتے ہو؟“

”نہیں مس فرخندہ فاحشائیں تو بہت سستے داموں خریدی جاسکتی ہیں۔ بات اصل میں ذوق نظر کی ہوتی ہے..... تم نے اپنے آپ کو معمولی شکل و صورت کی لڑکی کہا ہے۔ میں تمہارے حسن کی شان میں قصیدہ خوانی نہیں کرنا چاہتا، لیکن کسی کی پسند کے لئے تم کیا کہتی ہو؟“

”مطلب؟“

”اگر کسی کی نگاہ میں کوئی بہت بڑی اہمیت اختیار کر جائے تو پھر بات حسن و جمال کی نہیں رہ جاتی تم مجھے اتنی ہی پسند آئی ہو کہ میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“

”دیکھو شرافت سے مجھے واپس پہنچادو، میں تمہارے لئے آسان نہیں ثابت ہوں گی۔“

”میں مشکلات سے کھیلنے کا عادی ہوں لیکن تمہیں ایک پیشکش کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“

”سرکاری ملازم ہو اور ظاہر ہے لڑکیاں جب ملازمت کے لئے نکلتی ہیں تو ان کی مجبوریات ان کے سامنے ہوتی ہیں، بہت سے تصورات ہوتے ہیں ان کے دل میں اچھے مستقبل کی خواہش، کسی کو پرورش کرنے کے جذبے، دولت حاصل کرنے کی امنگ، ایک اچھی زندگی حاصل کرنے کے خواب، لیکن یہ سارے خواب آسانی سے پورے نہیں ہو جاتے۔ باہر کی دنیا میں نکلنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دولت کا حصول دنیا کا سب سے مشکل کام ہے، لیکن وہ خوش نصیب جسے آسانی سے دولت حاصل ہو جائے میری نگاہ میں تو خوش نصیب ہی ہوتا ہے، مس فرخندہ سرکاری ملازمت میں تمہیں زیادہ سے زیادہ کیا مل جاتا ہوگا، اگر دس لاکھ روپے کی رقم تمہیں آسانی سے حاصل ہو جائے اور ہر طرح کے راز، راز رکھنے کا وعدہ کیا جائے تو کیا یہ سودا مہنگا رہے گا؟“

بینا کا ذہن مسلسل برق رفتاری سے کام کر رہا تھا، اب وہ اس لمحے اور اس آواز کو تھوڑا تھوڑا سا پہچان رہی تھی اور پھر دس لاکھ روپے کی پیشکش ظاہر ہے کوئی معمولی شخصیت نہیں کر سکتی تھی، چند لحات خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

تہا نے بس اتنا ہی کیا کہ تمہیں یہاں بلانے میں ذرا مختلف انداز سے کام لیا ورنہ میرے ذہن میں پہلے ہی یہ بات تھی کہ میں تمہیں آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

”ساند اصاحب آپ کا خیال ہے کوئی لڑکی اور ایک ایسی لڑکی جو عزت و آبرو سے روٹی ہماری ہوا اپنے آپ کو تھوڑی سی دولت کے لئے بے آبرو کرنا پسند کرے گی۔“

”ہر کام دولت کے لئے ہی نہیں ہوتا زندگی میں اور بھی بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔“

”یقیناً، لیکن نور علی ساند اصاحب میں، اچھا ایک بات بتائیے؟“ بینا نے جملہ ادھورا چھوڑ کر دوسرا سوال کر دیا۔

”کیا؟“

”وہ میرے ساتھی کہاں ہیں؟“

”اوہ..... وہ بس یوں سمجھ لو کہ مسٹر شاہد اب گھر پہنچ چکے ہوں گے اور آپ کے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے لیکن وہ بھی کام کے ہی آدمی نکلے، راگ علی ساند انے انہیں پچیس لاکھ روپے رشوت پیش کی ہے، اس بات کی کہ وہ زمینوں کی قیمت ہماری پسند کے مطابق لگا دیں۔“

انہوں نے قبول کر لئے؟“

”سمجھ دار آدمی ہمیشہ دولت کی قدر کرتا ہے۔“

”تو وہ واپس پہنچ چکے ہوں گے۔“

”ہاں اور یقیناً تمہارے لئے پریشان ہوں گے ویسے ڈارلنگ ان کے اور تمہارے درمیان کیا تعلقات ہیں؟“

”بہت اچھے تعلقات ہیں ساند اصاحب لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ اتنے بڑے آدمی ہونے کے باوجود بے وقوف بھی ہیں۔“

”کیوں؟“ نور علی نے چونک کر پوچھا۔

”آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اس طرح مجھے اغوا کر کے یہاں لانے کے بعد آپ کو میری توجہ کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیا مقصد ہوا اس بات کا؟“

”مطلب یہ ہے ساند اصاحب کہ آپ اپنی زندگی کے سب سے بڑے نقصان سے

”تم کیا سمجھتے ہو میں اب بھی تم سے یہی کہتی ہوں کہ میں کوئی فاحشہ نہیں ہوں بے شک یہ دس لاکھ روپے میری توقع سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہیں اور میں نے کبھی اتنی رقم کیجا نہیں دیکھی لیکن اس کے باوجود میں عورت تو ہوں۔“

نقاب پوش کشمکش کا شکار ہو گیا..... کچھ دیر غور کرتا رہا پھر بولا۔ ”دیکھو بہتر یہ ہے کہ پردہ پردہ ہی رہنے دو۔“

”تمہاری مرضی ہے میں انکار نہیں کرتی، لیکن بہر حال یہ جاننا تو چاہوں گی میں کہ میری زندگی میں پہلا مرد کون تھا؟“

نقاب پوش چند لحات سوچتا رہا پھر اس نے آہستہ سے اپنے چہرے سے نقاب جدا کر دی اور بینا شدید حیرت سے اُچھل پڑی۔ ”ساند اصاحب۔“

”ہاں نور علی ساند اور اب تمہیں اس بات کا علم ہو گیا ہو گا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں غلط نہیں ہے۔“

”آپ تو بہت بڑی شخصیت کے مالک ہیں ساند اصاحب۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، حسن جب انسان کو متاثر کرتا ہے تو وہ سلطنتیں چھوڑ دیتا ہے، میں تو ایک عام سا آدمی ہوں۔“

”اگر آپ بھی اپنے آپ کو عام کہیں گے ساند اصاحب تو پھر خاص آدمی کون ہو گا؟“

”ارے نہیں، یہ صرف تمہاری محبت ہے ویسے مس فرخندہ اس تعاون کا دلی شکر گزار ہوں اور یہ ایک سچائی ہے کہ جو کچھ میں نے تمہیں دیا ہے وہ تو تمہاری ملکیت ہو جی گیا، لیکن اس کے بعد جب بھی تم کبھی بستی نور الہی آؤ گی میں تمہاری پذیرائی کروں گا۔“

”اور تم بھی یہ نہ سمجھنا کہ میں صرف دولت کے حصول کے لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔“

”ارے نہیں میری جان ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ نور علی ساند ابیٹھ گیا۔ بینا پور اعتماد سے مسکرا رہی تھی، اس نے کہا۔

”مگر ساند اصاحب آپ لوگوں کے وسائل تو لامحدود ہیں، مجھ میں آپ نے ایسی خاص بات پائی؟“

”بس یوں سمجھ لو کہ مزاج ایسا ہی شاہانہ ہے تمہارے ساتھ کوئی بھی سختی ہو سکتی تھی

دو چار ہو رہے ہیں۔“

”کیوں؟“ نور علی اب بھی نہیں سمجھا تھا۔

”اس لئے کہ میں نے آپ کو بے وقوف بنا کر آپ کی نقاب کشائی بھی کر لی اور اس کے بعد آپ کو اس بد تمیزی کی سزا دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔“

”ایں!“ ساند اکام نہ حیرت سے کھل گیا، لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ ایک نرم و نازک ہاتھ کی مالک لڑکی کا گھونسا اتنا زبردست بھی ہو سکتا ہے اور یہ گھونسا اس کی تھوڑی کے نیچے حصے پر پڑا اور یقینی طور پر کوئی ایسی رگ متاثر ہوئی جس نے نور علی ساند اکا سانس ایک لمبے کے لئے بند کر دیا۔ وہ ہاتھ پاؤں مارنے لگا اور بیٹھے بیٹھے اوندھا جھک گیا، لیکن بینا کو نجانے اس وقت کیا ہو گیا تھا وہ اپنی نسوانیت کی تمام باریکیاں بھول کر نور علی ساند اکا کی پشت پر سوار ہو گئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں نور علی ساند اکا کے نتھنوں میں ڈال دیں اور پھر ایک خوفناک غراہٹ کے ساتھ ساتھ ہی نور علی ساند اکا کی بھیانک چیخ اُبھری۔ اس کے دونوں نتھنے ادھر گئے تھے اور ناک اوپر تک پھٹ گئی تھی۔ یہ اتنی خوفناک کارروائی تھی کہ سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا اور انگلیوں کی یہ بے پناہ قوت نور علی ساند اکا کے لئے ناقابل یقین تھی۔ شدید تکلیف کی وجہ سے وہ تھوڑی کے نیچے ہونے والی تکلیف کو بھول گیا اور اس نے دھاڑتی ہوئی آواز کے ساتھ اُٹھنے کی کوشش کی لیکن بینا نے بستر پر ہی لیٹے لیٹے اپنے پاؤں کی ٹھوکرا اس کے جسم کے انتہائی نازک حصے پر ماری اور نور علی ساند اکا کے حلق سے دہشت زدہ آواز نکلی۔

”ارے مر گیا۔۔۔ مر گیا میں مر گیا۔“

”نہیں نور علی ساند امیر اکام جو کچھ بھی ہے لیکن تم مجھے ہمیشہ یاد رکھو گے ایسے یاد رکھو گے نور علی ساند اکا شاید کسی نے کسی کو نہ یاد رکھا ہو۔“ بینا نیچے اتر آئی۔ نور علی ساند اکا زمین پر گر گیا تھا، بے شک زیادہ چوٹیں نہیں لگی تھیں اسے لیکن جو چوٹیں لگی تھیں وہ ایسی تھیں کہ اس کے بعد اس میں کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی تھی۔ بینا ایک بار پھر اس پر چھانگی اور نور علی ساند اکا سے دونوں ہاتھوں سے دُور رکھنے کی کوشش کر کے فرش پر کھٹکنے لگا، بینا نے ایک ٹھوکرا اس کے سر پر ماری اور نور علی ساند اکا پھر ساکت ہو گیا۔

”معاف کر دو، معاف کر دو مجھے معاف کر دو آہ، آہ معاف کر دو۔“ اس کے منہ میں

سے بننے والا خون بھر رہا تھا۔ پناہ وحشت بھرے انداز میں نیچے جھکی اور پھر اس کے ہاتھوں کی انگلیاں نور علی ساند اکا کی آنکھوں میں گھس گئیں۔ ایک مکروہ آواز اُبھری اور نور علی ساند اکا کے دیدے پھوٹ گئے۔ اس کے حلق سے پھر ایک دلخراش چیخ نکلی اور وہ پاؤں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر زمین پر لوٹیں لگانے لگا، شاید آس پاس کوئی ملازم بھی موجود ہیں تھا، وہ پوری طرح بندوبست کر کے آیا تھا لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ کیسی بلا سے اس پر پڑا ہے۔ اس کی آنکھوں سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں اور وہ زمین پر ترپ رہا تھا پھر ان تمام چوٹوں نے مل کر اس سے اس کے ہوش و حواس چھین لئے، وہ سجدے کے انداز میں زمین پر پڑا ہوا تھا اور اسی انداز میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ بینا کی وحشت زدہ اہیں اس کا جائزہ لے رہی تھیں اور اس کے بعد اس نے نور علی ساند اکا پر تھوک دیا۔

”ذلیل کتے جو کچھ تو کرتا رہا ہے، تیرا خیال تھا کہ دنیا میں کوئی بھی تیرا مقابلہ نہیں کرے گا، لیکن یاد رکھے گا یہ آنکھیں تجھے دوبارہ نہیں مل سکیں گی اور تیرا چہرہ، تیرا مکروہ چہرہ ہمیشہ مجھ دیکھے گا اسے یقین ہو جائے گا کہ تو نے اپنی زندگی میں ایسے ہی گناہ کئے ہیں۔“ اس نے ہاتھوں میں ڈوبی ہوئی انگلیوں کو دیکھا اور پھر محتاط انداز میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ سامنے ہی ہاتھ روم تھا۔ ہاتھ روم جا کر اس نے اپنی انگلیاں دھوئیں، یہ انگلیاں وہ ناک پڑے سے پونچھ بھی سکتی تھی لیکن اس طرح اس کی انگلیوں کے نشانات واضح جاتے۔ شہاب کی تربیت یافتہ تھی اور خود بھی اعلیٰ ذہانت کی مالک تھی۔ اسے اندازہ تھا ابھی کچھ وقت تک تو کسی کو یہ سب کچھ نہیں معلوم ہو سکے گا لیکن اس کے بعد ایک اتنی شخصیت کا جب یہ عالم سامنے آئے گا تو بہت کچھ ہو گا اس لئے کم از کم کوئی ایسی نشاندہی مل ہوئی چاہئے جس سے بینا منظر عام پر آ سکے، پورے اعتماد کے ساتھ اس نے چاروں طرف دیکھا اور اپنی ذہانت کے مطابق ہر وہ نشان مٹانے کی کوشش کی جس سے اس کی اندہی ہو سکے۔ یہاں تک کہ ہاتھ روم کے ٹل کی ٹوٹی پر سے بھی اس نے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کئے اور پھر باہر نکل آئی، دس لاکھ روپے کے نوٹ وہاں موجود تھے لیکن ماکے ساتھ ساتھ ہی وہ بیگ بھی جس میں سے یہ نوٹ نکال کر دیئے گئے تھے، اس بیگ میں پورے پندرہ لاکھ اور موجود تھے۔ بینا نے یہ نوٹ اسی بیگ میں رکھے اور اس کے بعد لاکا ایک گلہ ان اٹھا کر ہاتھ میں لے لیا جو زنی بھی تھا اور اتنی جسامت کا مالک بھی کہ اگر

تہائی زندگی کے سب سے بدترین دور سے گزرنا ہو گا..... اگر اس خاندان کو زندہ جلا کر نہ
ہوں تو میرا نام شہاب نہیں ہے، لیکن ثابت تو ہو یہ بات اور کیسے ثابت ہو سکتی ہے پھر
نہی اسے ایک خیال آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے خیال کو کوئی عملی جامہ پہنا تاثر انسمیٹر
نہرہ موصول ہو اور اس نے جلدی سے ٹرانسمیٹر آن کر کے چہرے کے قریب کر لیا۔
”ہاں کون ہے؟“ وہ شہنشاہ کی آواز میں بولا۔

”سالک بول رہا ہوں صاحب۔“

میں تم سے ہی رابطہ کرنے والا تھا مالک، کہو خیریت ہے سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔
”نہیں جناب ٹھیک ٹھاک نہیں ہے، آپ نے جن لوگوں کی نگرانی پر مجھے اور فراز کو
ہر کیا تھا ہم مسلسل ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کی بقیہ رپورٹ تو میں
پاکو تفصیل سے بعد میں دوں گا اس سے پہلے میں آپ کو ایک رپورٹ دینا چاہتا ہوں۔“
”ہاں بولو۔“

”وہ شخص جو سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا پیار علی ساند کی حویلی میں گیا ہوا
اس کی ساتھی لڑکی گیسٹ ہاؤس میں ہی تھی لیکن چارپانچ نقاب پوش گیسٹ ہاؤس میں
لے..... اندر کسی کارروائی میں مصروف رہے اور اس کے بعد وہ لڑکی کو بے ہوشی کے عالم
میں لے کر لے گئے ہیں۔“

”کہاں لے گئے ہیں؟“

”میں اس عمارت کی نشاندہی کئے دیتا ہوں آپ براہ کرم یہ تفصیل نوٹ کر لیجئے؟“

”ہاں بتاؤ۔“ شہاب بولا اور سالک اسے راستوں کی تفصیل بتانے لگا۔ شہاب ان ساری
بات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا پھر اس نے کہا..... ”تم کہاں ہو اس وقت؟“

”اسی عمارت کے سامنے۔“

”فراز کہاں ہے؟“

”فراز اس شخص کے پیچھے ساند خاندان کی حویلی پر گیا ہوا ہے اور ابھی تک اس کی
نہ نہیں ہوئی لیکن میں انہوں نے والی لڑکی کا تعاقب کرتا ہوں اس عمارت کے پاس پہنچ گیا
..... البتہ میں نے اس معاملے میں ابھی تک کوئی مداخلت نہیں کی ہے۔“

”انہوں نے والے افراد وہیں موجود ہیں؟“

کہیں سے کوئی مزاحمت ہو تو اس سے نمٹا جاسکے، پھر وہ بیگ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل
آئی..... عمارت کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں تھا لیکن بستی نور الہی کو جس حد تک دیکھ
تھا اس سے مطمئن تھی اتنی وسیع جگہ نہیں تھی کہ اسے اپنی وہ رہائش گاہ تلاش کرنے میں زیادہ
وقت ہو باہر مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی..... وسیع احاطہ تھا لیکن اتنی روشنی ضرور تھی کہ وہ
احاطے کے گیٹ کو دیکھ سکتی، البتہ ان دونوں کو اس نے اتفاقاً ہی دیکھ لیا تھا..... کیونکہ ان میں
سے ایک غالباً سگریٹ کے کش لگا رہا تھا، مینا کے راستے میں پڑتے تھے دونوں اور یقینی طور پر
یہ نور علی ساند کے محافظ تھے، چنانچہ پینالی کی طرح دبے پاؤں چلتی ہوئی آگے بڑھی اور ان
کے سروں پر پہنچ گئی، دونوں مزے سے بیٹھے ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے، انہیں علم
نہیں تھا کہ ان کے عقب میں ایک عذاب ان کا انتظار کر رہا ہے، پھر ان میں سے ایک کی چوٹی
بلند ہوئی تو دوسرا چونک کر پلٹا لیکن یہ نہیں سمجھ پایا کہ ہوا کیا ہے اور جب تک وہ یہ سمجھے کی
کوشش کرتا اس کا سر بھی گلدان کی زد میں آگیا تھا..... اس کے حلق سے بھی دلخراش چیخ نکلی
اور اس نے اپنے ساتھی کو پکڑنے کی کوشش کی جو پہلے ہی اذیت سے دونوں ہاتھ سر پر رکھے
زمین پر اونڈھا لیتا چلا جا رہا تھا، چنانچہ دونوں ہی ڈھیر ہو گئے..... مینا نے اطمینان سے اپنی
قمیض کے دامن سے گلدان کا نچلا حصہ پکڑا اور پھر دوپٹے سے اس پر سے بھی اپنی انگلیوں
کے نشانات صاف کر دیئے اور گلدان ایک جانب پھینک کر تیزی سے دروازے کی جانب
دوڑی..... وہ بڑے مطمئن انداز میں پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہی تھی..... دروازے کے
قریب پہنچ کر اس نے سن گن لی اور پھر ایک دم ساکت ہو گئی..... یہ صورت حال ذرا ٹھہر
ہو گئی تھی، دروازے کی دوسری جانب کوئی کار آکر رُک چکی تھی۔



شہاب اس وقت واقعی بدحواس ہو گیا تھا اور اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی
تھی..... مینا پر غور کر رہا تھا..... بے ہوش کر کے لے جاتی گئی ہے ورنہ سخت جدوجہد کرتی لیکن
یہ کارکردگی کس کی ہو سکتی ہے، کون ایسا شخص ہے جو اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ ایک اجنبی
لڑکی کو اٹھا کر لے جائے..... نہ جانے کیوں ذہن بار بار ساند خاندان کی جانب جاتا تھا.....
ابھن تھی تو صرف یہ کہ نور علی ساند اور پیار علی ساند اس وقت اس کے سامنے موجود
تھے..... کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا لیکن بہر حال اگر ساند فیملی نے ایسی کوئی حرکت کی ہے تو

”بہن!“ اور گرنے والا جو ایک لمبی لوٹ لگا کر سیدھا ہو ہی رہا تھا ایک دم سے چونک پڑا اور اس کے منہ سے بھی آواز نکلی۔ ”شہاب صاحب۔“

”پھر صاحب..... ایک تو میری آنٹوں کا ستیاناس کر دیا اور پھر اوپر سے صاحب بھی۔“

”خجت پریشانی اور ذہنی بحران کے باوجود بولا اور بینا سیدھی کھڑی ہو گئی۔

”سوری شہاب صاحب ویری سوری۔ زور سے تو چوٹ نہیں لگی۔“

”جہنم میں جھوٹو میری چوٹ کو..... یہ بتاؤ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”بس ایسے ہی چہل قدمی کرتے ہوئے یہاں تک آ گئی تھی۔“ بینا نے کہا اور ہنس پڑی۔

”مورت حال کیا ہے؟“

”دوبے ہوش پڑنے ہوئے ہیں اور ایک شاید قریب المرگ ہو گا۔“

”کک..... کیا مطلب؟“

”آئیے زیارت کر لیجئے۔“

”بہن کیا کہہ رہی ہو بتاؤ تو سہی۔“

”سر دیکھنے کی چیز دیکھنے کے لئے ہوتی ہے..... بتانے سے مزہ نہیں آتا۔“ بینا نے بے ہمتی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور پھر شہاب کو گائیڈ کرنے لگی۔ شہاب نے بھی ان دو جسموں کو جو ہم بے ہوشی کی کیفیت میں تھے اور عجیب مزے تڑے انداز میں پڑے ہوئے تھے۔

”مر گئے۔“

”اصولی طور پر تو نہیں مرنا چاہئے لیکن اگر بے اصول ہیں تو مر گئے ہوں گے.....“

”بہن! گلہ ان سے لگائی ہیں جو کافی وزنی تھا۔“

”اوہ مائی گاڈ، لیکن..... لیکن.....“

”آئیے سر آئیے..... آپ کو ایک اور دلچسپ شخصیت سے متعارف کراؤں۔“

”یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

”زندگی!“ بینا نے جواب دیا۔

”کیسی زندگی؟“

”سر آئیے پہلے اس کا جائزہ لے لیجئے۔ ہو سکتا ہے آپ کی کچھ اور ہدایات ہوں اس کے

”ناہائے چھپی ہوئی زندگی کے بارے میں بھی آپ کو بتا ہی دوں گی۔“

”نہیں جناب کوئی موجود نہیں ہے..... البتہ ابھی ابھی ایک شخص ایک گاڑی پر یہاں آیا ہے اس کے بارے میں، میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ یہ کون ہے، کچھ عجیب سا لباس پہنے ہوئے تھا اور شاید اس کا چہرہ بھی اچھا ہو تھا۔“

”وہ لوگ چلے گئے جو اسے اغوا کر کے لائے تھے؟“

”جی ہاں وہ اپنی گاڑی میں جا چکے ہیں لیکن اندر دو افراد موجود ہیں۔“

”ٹھیک ہے سالک تم اپنی ڈیوٹی اسی انداز میں سر انجام دیتے رہو..... میں اس شخص کو آگاہ کروں کہ اس کی ساتھی اغوا ہو گئی ہے۔ اس کی..... کے لئے پہنچے۔“

”کیا میں اس کی مدد کروں جناب۔“

”نہیں سالک تمہیں اس سے ہر حالت میں پوشیدہ رہنا ہے۔ ہم کسی پر ظاہر نہیں ہونا چاہتے۔“ شہاب نے کہا۔

”اوکے..... تھینک یو ویری مچ۔“ سالک کی آواز بند ہوئی تو شہاب برق رفتاری سے اپنی گاڑی کی جانب دوڑا..... یہ انتہائی خوش بختی کی بات تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں اسے بینا پتا معلوم ہو گیا تھا لیکن وہ اس وقت آتش بنا ہوا تھا اور ہر چیز کو نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا..... بینا کے ساتھ اگر کوئی غلط بات ہو گئی تو وہ اپنے آپ کو بھی کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال برق رفتاری سے گاڑی دوڑاتا ہوا وہ اس نشانہ کی جانب سفر کر رہا تھا جو سالک نے کی تھی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد اسے وہ عمارت نظر آ گئی۔ وہ خاموشی سے گاڑی سے اتر اور گیٹ پر پہنچ گیا..... پھر گیٹ پھلانگنے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی، لیکن جیسے ہی اس نے گیٹ کے دوسری جانب قدم رکھا..... اچانک ہی کسی کی لات اس کے پیٹ پر پڑی۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ شہاب کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکل گئی..... اس نے دوسری ٹھوکر سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو جھکائی دی اور اس شخص کی ٹانگ پکڑ لی جس نے یہ حرکت کی تھی..... لات مارنے والا غالباً پلٹ کر اس کی گردن پر دوسری لات مارنا چاہتا تھا لیکن شہاب نے فوراً ہی اس کا پاؤں چھوڑ دیا جس سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے گر پڑا اور اس کے حلق سے ایک آواز نکل گئی لیکن یہ آواز نسوانی تھی اور شہاب اس آواز اچھی طرح پہچانتا تھا..... بینا کے علاوہ کسی اور کی آواز نہیں تھی..... دوسرے لمحے اس نے اسے آواز دی۔

www.pdfbo
 ملاوہ میرا خیال ہے اور کوئی نہیں تھا..... سر مجھے واقعی افسوس ہے، ٹھوکر بہت زور سے
 ”ہو گیا۔“

”ایسی مگر اس سے کم از کم مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ مستقبل میں تم سے بات بگاڑنی
 سب نہیں ہوگی۔ ورنہ اچھی خاصی مرمت ہو سکتی ہے۔“ شہاب ہنس کر بولا اور بیٹا بھی
 ہنسی۔ پھر بولی۔

”لیکن سر آپ یہاں کیسے آگئے؟“

”سائلک اور فرزند ہماری نگرانی پر مامور تھے بلکہ اس وقت بھی کہیں آس پاس موجود تھے۔“

”سنا کہ نے مجھے تمہارے اغوا کی اطلاع یہیں سے دی تھی۔ فراز میرے پیچھے سنا دیا کہ“

”مگر کس کیفیت میں سر؟“

”بس وہ شہنشاہ کے حکم سے ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔“ مینا نے ایک گہری سانس لے لی۔
”نہیں، بند کر لیں پھر بولی۔“ سر آپ نے میرے بارے میں کیا سوچا تھا؟“

”بنا بہت پریشان ہو گیا تھا میں۔ یقین کرو۔“

”کیوں؟“

”بھی اس میں کیوں کی گنجائش ہے؟ ظاہر ہے۔ کوئی تمہیں اغوا کر کے لے گیا تھا.....
تو سارا مستقبل تار یک ہو گیا۔“

بیٹا اس انداز پر ہنس پڑی اور بولی۔ ”کیوں سر..... اس سے مستقبل کا کیا تعلق؟“

”تم سے تو ہے۔“

“مجھ سے؟”

”کمال ہے یعنی اب بھی اس بات میں شبہ رہ گیا ہے کہ ہم دونوں جہنم جہنم کے ساتھی
 ”سر سیکر ٹیریاں تو بدلی بھی جاسکتی ہیں۔“

”سر سیکریٹریاں تو بدلی بھی جاسکتی ہیں۔“

”سکڑی۔“ شہاب حیرت سے بولا اور اس نے اس انداز سے پینا کو دیکھا کہ بیٹا کے پڑ پڑ کی سرخی پھیل گئی۔ شہاب نے کہا..... ”سکڑیاں اس طرح نہیں شرماتیں

شہاب حیران حیران سائینا کے ساتھ عمارت میں اندر داخل ہو گیا۔ مینانے اندر داخل ہونے کے بعد کمرے میں تیز روشنی کر دی اور شہاب نے زمین پر پڑے ہوئے شخص کو پاؤں کی ٹھوک سے سیدھا کر کے دیکھا اور اس کا دل لرز کر رہ گیا..... اس کی آنکھوں کی جگہ سوراخ تھے جن سے اب بھی خون اُبل رہا تھا..... اس کے علاوہ ناک اور پر تک ادھڑی ہوئی تھی لیکن اس بھیانک چہرے کو شہاب نے فوراً پہچان لیا..... نور علی ساند ا تھا اس کے منہ سے ایسا سرسراتی آواز نکلی۔ ”نور علی۔“

”ساندا۔“ بینا نفرت سے بولی۔

”ہاں..... لیکن..... لیکن..... لیکن۔“

”میری آبرو کا گاہک بن کر آیا تھا سر..... اپنے آدمیوں سے مجھے اغوا کرایا تھا اس نے اور اس کے بعد نقاب پہن کر یہاں تک پہنچا تھا لیکن آخر کار میں آپ کی سیکرٹری ہی نہیں آپ کی تربیت یافتہ بھی ہوں۔ اتنا آسان نہیں تھا یہ سب کچھ..... بے ہوش کر کے اٹھالائے تھے یہ لوگ مجھے۔ ورنہ سر شاید میں آپ کو وہیں گیسٹ ہاؤس میں ہی ملتی۔“

”اس کی یہ حالت تم نے بنائی ہے مینا؟“

”سریہ تو کچھ بھی نہیں ہے..... اصل میں..... میں اسے قتل کر دیتی تو کچھ مزہ نہیں آتا لیکن اب یہ اپنی ان پھوٹی ہوئی آنکھوں اور ادھڑی ہوئی ناک کے ساتھ اگر اسے زندگ مل گئی تو کم از کم یہ دوسروں کے لئے نشان عبرت بن جائے گا۔“

”خدا کی پناہ..... آؤ بیٹا..... تم نے ٹھیک کیا..... میں، میں تمہاری اس کارکردگی سے بے پناہ خوش ہوں..... تعریف نہیں کر سکتا تمہاری الفاظ میں..... آؤ چلتے ہیں۔“

”ایک منٹ سر..... اس سوچ بٹن پر میری انگلی کا نشان ہوگا۔ ذرا اسے صاف کر دوں۔“ بیٹا نے رومال نکال کر کہا اور سوچ بٹن پر سے نشان صاف کیا اور لائٹ بند کر دی۔

اس کے بعد اس رومال سے وہ دروازے کا پینڈا کھول کر باہر نکل آئی۔ شہاب مسرور نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مینا بڑے گیٹ سے بھی باہر نکل آئی۔ شہاب کی کار موج

تھی..... دونوں کار میں بیٹھ گئے اور شہاب نے کار اشارت کر کے آگے بڑھا دی تو مینا نے کہا:

”سر میں سمجھی نہیں تھی، بس یہاں سے نکل رہی تھی کہ گیٹ پر آ نہیں ہوئیں!“

میں سمجھی کہ شاید وہی لوگ واپس آ گئے ہیں جو مجھے اغوا کر کے لائے تھے..... یہاں ان

مس مینا اور آپ کو یہ اندازہ ہو جانا چاہئے کہ آپ سیکرٹری نہیں ہیں۔“

”پھر سر؟“ مینا نے کہا۔

”جب تک سر سر کرے جاؤ گی میں بھی سرسراتا رہوں گا۔ جب محبت سے شہاب کے پکارو گی تو تمہاری تمام باتوں کا جواب دے دوں گا۔“ اتنی دیر میں گیسٹ ہاؤس آگیا تھا اس لئے یہ سلسلہ گفتگو منقطع ہو گیا۔

شہاب اور مینا اندر آگئے۔ مینا کو ننگے پاؤں چلتے ہوئے عجیب لگ رہا تھا۔ شہاب نے اسے دیکھا تو مینا ہنس پڑی۔

”کیوں؟“ شہاب نے اس ہنسی کی وجہ پوچھی۔

”سر میں ننگے پاؤں ہوں۔“

”تمہارا یہ عالم بہت ہولناک ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جب تم ننگے پاؤں ہو تو ہوشیار رہنا چاہئے۔“

”کیوں سر؟“

”اس عالم میں ناک ادھر جاتی ہے اور آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں۔“ شہاب نے کہا۔ مینا اس بات پر خوب ہنسی تھی۔ شہاب اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اسے مینا کے معیار کا تو اندازہ ہو گیا تھا۔ اتنے خوفناک عمل سے گزرنے کے باوجود وہ بالکل نارمل تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف خطرناک لمحات میں اپنے حواس قائم رکھ سکتی ہے بلکہ اس حد تک عمل بھی کر سکتی ہے اور یہ مینا کی کوالٹی تھی۔

کمرے میں بیٹھ کر مینا نے بیگ شہاب کے سامنے رکھا اور ہنس پڑی۔ شہاب مسکرا کر بولا۔ ”اس کیس نمبر چھ کی وجہ بھی بتاؤ۔“

”آپ خود دیکھ لیجئے۔“

”کیس؟“

”نہیں یہ بیگ۔“

”ارے ہاں کیا ہے اس بیگ میں؟“

”مزید پچیس لاکھ ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ شہاب چونک پڑا۔

”دس لاکھ میری آبرو کی قیمت۔۔۔۔۔ پندرہ لاکھ کی ڈاکہ زنی کی ہے میں نے۔۔۔۔۔ شہاب ناراض نہیں ہوں گے میری یہ حرکت اصولی طور پر غلط نہیں ہے۔ ان بھیانک لمحات میں نے جذباتی ہونے کے بجائے عقل سے کام لیا اور اس طرح مجھے کامیابی ہوئی ورنہ بدوہ اتنی آسانی سے شکار نہ ہوتا۔۔۔۔۔ عموماً ہمارے ہاں کی فلموں اور ڈراموں میں ایسے نقوں پر ولن بھیانک قہقہے لگاتا ہے اور مظلوم لڑکی بچاؤ بچاؤ کے بے تکے نعرے لگاتی ہے۔“

”لیکن!“ شہاب حیرت سے بولا۔

”میں آپ کو پورا سکرپٹ سناتی ہوں۔“ مینا نے کہا اور شہاب کو شروع سے آخر تک ری داستان سنا دی۔ شہاب پھٹی پھٹی آنکھوں سے مینا کو دیکھ رہا تھا۔ یہ تفصیل سنانے کے بعد مینا نے کہا۔

”سر انتہائی معذرت خواہ ہوں اپنے طور پر یہ کام کر بیٹھی ہوں۔ پتا نہیں آپ کے راج کے مطابق ہو یا نہ ہو لیکن سر آپ ناراض نہیں ہوں گے بلکہ مجھے گائیڈ کریں گے۔“

”تم نے کہا تھا کہ دس لاکھ تمہاری آبرو کی قیمت۔ بس ان الفاظ کے علاوہ مجھے اور کسی پر اعتراض نہیں ہے۔ تمہاری آبرو کی قیمت مینا دس ارب بھی نہیں ہو سکتی۔ دس لاکھ انہیں برکتے ہیں۔“

”معذرت کی گنجائش ہمیشہ رکھا کریں آئندہ ایسے الفاظ نہیں ادا کروں گی؟“

”مجھے یقین نہیں ہے۔“ شہاب نے کہا۔

”نہیں سر میں وعدہ کرتی ہوں۔“

”کہانا مجھے یقین نہیں ہے۔“ شہاب بدستور اسی انداز میں بولا۔

”کیوں آخر سر؟“

”اس لئے کہ درجنوں بار وعدہ کرنے کے باوجود تم نے مجھے سر، سر کہنا نہیں چھوڑا ہے۔“

”اوہ میرے خدا! میں تو واقعی خوف زدہ ہو گئی تھی چلے یہ بھی اب آخری بار سہی۔“

”ویسے پینا ڈراما واقعی زبردست رہا ہے۔۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے ان شریف لوگوں نے ہمارا پورا کمیشن ادا کر دیا۔۔۔۔۔۔ اب ہمیں صرف کام کرنا ہے۔“

”جی سر۔۔۔۔۔۔ مم۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے شہاب صاحب۔ آپ کو اعتراض نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔“

اس سے زیادہ خوشی مجھے اور کسی بات کی نہیں ہو سکتی۔“

”میرا خیال ہے تک ویلوٹ کی طرح ہماری فیس بھی پچاس لاکھ ہو گئی ہے اس سے کم پر تو بات آہی نہیں رہی۔“

”نہیں مسٹر شہاب پچیس لاکھ۔“ بینا نے خود کو سنبھال کر کہا۔

”جی نہیں پچاس لاکھ۔“

”جی۔“

”جی ہاں۔“

”وہ کیسے؟“

”پچیس لاکھ یہ موجود ہیں۔۔۔۔۔۔ مجھے ان کاغذات پر دستخط کرنے کی رشوت دی گئی ہے جن کے تحت زمین کی قیمت متعین کی گئی ہے۔“

”اوہو یہ رشوت راگ علی ساندانے دی ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔۔ اس وقت وہ بدبخت اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔“ شہاب

نے ان دستخطوں کی پوری تفصیل بتائی پھر وہ بولا۔

”بینا پروگرام میں فوری تبدیلی ضروری ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”بس تیار ہو جاؤ ہمیں فوراً ہی یہاں سے نکل جانا چاہئے۔“

”دارالحکومت واپس چلیں گے۔“

”یقیناً۔۔۔۔۔۔ اور سب سے پہلے ڈی آئی جی نادر حیات صاحب کو یہ کہانی سنائیں گے۔“

آرام میں بڑی مناسب تبدیلی پیدا کرنی ہے کیونکہ ظاہر ہے اس واقعے کے بعد راگ علی انداماموش نہیں بیٹھے گا۔۔۔۔۔۔ بے غیرت قسم کے لوگ ہیں۔ کوئی نئی کہانی گھڑ کر انتظامیہ کو فک کر کے کی کوشش کریں گے۔۔۔۔۔۔ ہمیں اس سے پہلے اپنے لئے بچاؤ کا بندوبست کرنا

”ٹھیک ہے شہاب صاحب جیسا آپ کا حکم۔“

”تو پھر یہاں بھی ذرا اپنے نام و نشان مٹا دیئے جائیں کیونکہ اب صورت حال بدل چکی“

”کافی دیر تک وہ اس کام میں مصروف رہے تھے اور اس کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔۔۔۔۔۔ شہاب خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اور اس کے ذہن میں لاتعداد منصوبے تیار تھے۔۔۔۔۔۔ واقعات کی یہ کروٹ بڑی سنسنی خیز تھی اور جو کچھ کیا گیا تھا وہ بالکل مختلف راستے بھر بیٹانے بھی خاموشی ہی اختیار کئے رکھی، کم از کم اتنا اندازہ ہو گیا تھا اسے کہ ہاب خاموش رہنے والوں میں سے نہیں ہے، اس وقت لازمی طور پر اس کے ذہن میں بہت سے منصوبے بن رہے ہوں گے، دارالحکومت پہنچنے پہنچنے روشنی پھیل گئی تھی لیکن اس ہنگامی بات کی تھکن کے کوئی اثرات ان پر نہیں تھے۔۔۔۔۔۔ شہاب نے بینا کو کریم سوسائٹی والی کوٹھی بتا کر اور بولا۔

”تم یہاں آرام کرو کھانے پینے کا بندوبست رکھنا میں نادر حیات صاحب سے بات کر کے واپس یہیں آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ بینا نے جواب دیا اور شہاب اسے اتار کر نادر حیات صاحب کی رہائش گاہ کا جانب چل پڑا، ڈی آئی جی صاحب سے کچھ اتنی عقیدت اور لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کہ شہاب جانتا تھا کہ وہ اس کے اس اقدام کی پذیرائی کریں گے، پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ ڈی آئی جی صاحب کو ٹیچ پر پہنچ گیا ناوقت آیا تھا ڈرائیونگ روم میں انتظار کرنا پڑا لیکن یہ بھی ڈی آئی جی صاحب کی مہربانی اور ان کا لگاؤ تھا کہ وہ پیشانی پر بل ڈالے بغیر اپنے معمولات میں تبدیلی پیدا کر کے شہاب سے ملاقات کے لئے آگئے تھے۔۔۔۔۔۔ ایک گاؤن میں ملبوس تھے اور چہرے پر نیند کے آثار تھے۔

”سر، معذرت خواہ ہوں لیکن اس وقت آپ سے ملنا بے حد ضروری تھا۔“ ڈی آئی جی صاحب نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جب تم سمجھتے ہو کہ اس وقت ملنا اتنا ہی ضروری تھا تو پھر معذرت کی گنجائش تو نہیں

”جوان کے لئے تکلیف دہ نہیں ہے لیکن ضرور تائیا کر لیا گیا ہے۔“
”ہاں بالکل۔“

”کیا ان لوگوں کو علم ہے کہ وہ کس کی تحویل میں ہیں؟“
”بالکل نہیں..... ضرور تائیا قدم اٹھایا گیا تھا گو اس میں ایک تھوڑی سی مجرمانہ نیت بھی ہے، لیکن نہ تو ان کے اہل خاندان اس کے لئے پریشان ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں یہ دونوں ایک سرکاری مشن پر گئے ہوئے ہیں اور نہ ان لوگوں کو کوئی تکلیف دی گئی ہے۔“
”وزیری گڈ۔ اس کا مطلب ہے کہ رہائی کے بعد یہ لوگ نشاندہی نہیں کر سکتے کہ انہیں نے اغوا کیا تھا۔“

”بالکل نہیں۔“ ڈی آئی جی صاحب مدہم سی مسکراہٹ سے بولے۔
”سریہ کام انتہائی شاندار ہوا ہے۔ اب ہم یوں کر دیتے ہیں کہ انہیں رہا کئے دیتے ہیں..... ایک سوال اور کرنا چاہتا ہوں سر۔“
”ہاں بولو؟“

”کیا ان کے محکمے کے کسی فرد کو بھی اس بات کا علم ہے؟“
”بھی عجیب سوال ہے یہ، یعنی میں نے ایک عمل ضرور تائیا ہے اس کی تشہیر تو میں نہیں کر سکتا تھا..... تمام باتوں کو مکمل طور سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔“

”پھر تو جناب کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ گیا..... ہم ان دونوں کو آزاد کئے دیتے ہیں..... یہ دونوں اپنے گھروں کو واپس پہنچ جائیں گے..... اپنے محکموں کو رپورٹ دیں گے کہ ان کے ساتھ ایسا ہوا ہے، پھر بعد میں محکمے کو علم ہو گا کہ دو افراد جعلی طور پر بستی نور الہی پہنچے ہیں اور انہوں نے جعلی کارروائی کی ہے۔ راگ علی ساند اکو اس بات کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی کہ سرکاری افسران زمینوں کی قیمت کا تعین کرنے آرہے ہیں اور نہ ہی یہاں سے انہیں ان کے بارے میں کوئی تفصیل بتائی گئی تھی۔ کچھ جعل سازوں نے یہ جال پھیلایا اور وہاں جو کچھ تھا وہ اس کی ذمہ داری ان جعل سازوں پر ہی عائد ہوتی ہے۔ حکومت یا متعلقہ محکمہ اس کے لئے مجرم نہیں قرار پاتا۔ جعل ساز تو بہر طور جعل ساز ہوتے ہیں اور اب جرم ہوا ہے تو اس ناقتیش ہو جائے گی۔ بات ختم ہو جاتی ہے حکومت ذمہ دار نہیں ہوگی۔“ ڈی آئی جی صاحب ایک دم ہنس پڑے اور شہاب مطمئن نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔ ان کی ہنسی اس

رہ جاتی، میں خود تمہارا نام سن کر حیران رہ گیا ہوں کیونکہ تمہاری واپسی تو خاصی دیر کے بعد متوقع تھی۔“

”جی سر لیکن حالات نے جو کروٹ بدلی اس کے تحت مجھے وہاں سے واپس آنا پڑا۔“
”کب پہنچے ہو؟“
”سیدھا آ رہا ہوں سر۔“
”اوہو..... رات بھر سفر کر کے۔“
”جی سر۔“

”تو پھر میرا خیال ہے چائے کا انتظار کئے بغیر سلسلہ گفتگو شروع ہو جائے، ویسے میں ملازم سے چائے کے لئے کہہ کر آیا ہوں۔“

”شکریہ سر۔“ شہاب نے کہا اور پھر وہ راگ علی ساند اکے بارے میں ساری تفصیل بتانے لگا..... رشوت کی کہانی بھی سنائی اور اپنے ساتھ جانے والی لڑکی کے اغوا کی کہانی بھی لیکن ان دوسرے پچیس لاکھ کا تذکرہ اس نے ڈی آئی جی صاحب کے سامنے نہیں کیا تھا۔ نادر حیات صاحب بہت فرانچ چشم انسان تھے، بڑی توجہ اور سکون کے ساتھ یہ سب کچھ سنتے رہے اور تفصیل سننے کے بعد خاموش ہو گئے..... کافی دیر تک وہ گہری سوچ میں گم رہے تھے اس دوران ملازم چائے کا سامان اور اس کے ساتھ کچھ دوسرے لوازمات سامنے لگا گیا تھا..... ڈی آئی جی صاحب نے شہاب کو چائے کی پیشکش کی اور خود بھی اپنی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی، تھوڑی دیر کے بعد وہ بولے۔ ”یہ سب کچھ بالکل ٹھیک رہا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان بدکرداروں کو یہ سزا ملنی ہی چاہئے تھی، لیکن اب ہمیں فوری طور پر پروگرام میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔“

”یقیناً جناب۔“

”تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے؟“

”آپ کا حکم ہو تو پیش کروں؟“

”ہاں ہاں ضرور۔“ ڈی آئی جی صاحب نے کہا اور پھر خاموشی سے شہاب کی صورت دیکھنے لگے..... شہاب نے کہا۔
”آپ نے فرمایا تھا کہ شاہد ایاز اور مس فرخندہ رشید کو احتیاطاً ایک ایسی جگہ پہنچایا جائے

پس کر یہ دولت اکٹھی کی گئی ہوگی..... تم اسے استعمال کرو، ابھی کچھ دن کی خاموشی اختیار نہ پڑے گی ہمیں..... مجھے بس اس خط کے بارے میں تشویش ہے، اس خط کا کوئی جواز نہیں ہے ہمارے پاس..... نجانے کون ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے، بہر حال اب ان حالات کے تحت اس مسئلے میں کوئی موثر کارروائی فوری طور پر ممکن نہیں ہے..... جائزہ لیا جائے گا لیکن بہرہ وہ یہاں کام جاری رکھو۔“

”جی سر۔“ شہاب نے کہا اور پھر ڈی آئی جی صاحب سے اجازت لے کر وہاں سے اٹھ گیا..... وہ بہت خوش تھا۔ ڈی آئی جی صاحب نے مکمل تعاون کیا تھا، حالانکہ یہ تمام اقدامات خلاف پروگرام تھے لیکن نادر حیات صاحب نے اس جواز کو تسلیم کیا تھا جو ان اقدامات کی وجہ سے..... اصل میں یہ بہت بڑی بات تھی اور پھر ان کی فرار چشتی۔ پچیس لاکھ کی رقم معمولی نہیں ہوتی..... انہوں نے اس سے بھی چشم پوشی کی تھی۔

کریم سوسائٹی پہنچ گیا..... مینا جو ہر خان کے ساتھ مل کر بہت کچھ کر چکی تھی..... اس نے میز سجادی اور دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔

”تمہارے اندر بہت گھریلو پن ہے مینا۔“

”یہ میرا گھر ہے شہاب اور اس گھر میں ایک مکمل لڑکی ہوں میں۔“

”اور گھر سے باہر؟“ شہاب نے پوچھا..... مینا مسکرانے لگی پھر سوچ کر بولی۔

”گھر سے باہر بھی۔“

”میں تسلیم کرتا ہوں۔“ شہاب سنجیدگی سے بولا۔

”جی؟“

”ہاں مینا..... مکمل لڑکی کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ وقت بدل چکا ہے، اس دور کی لڑکی کا انداز مختلف تھا جب اسے گھر کی چار دیواری میں محصور رہنا ہوتا تھا..... اسے اس چار دیواری کا نقطہ حاصل تھا..... اب جب حالات نے اسے گھر سے نکال دیا ہے تو اسے اپنی سوانیت اور ذات کو خیر باد کہہ دینا بھی ضروری ہے۔ اسے پوری قوت سے ان بھڑیوں کا مقابلہ کرنا چاہئے جو اس پر حملہ آور ہوں۔“

”اور آپ..... آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“

”بالکل سچ مینا۔“

بات کا اظہار بھی تھی کہ وہ اس تجویز سے غیر متفق نہیں ہیں پھر انہوں نے کہا۔

”ہوں..... اچھی تجویز ہے بہت اچھی تجویز ہے اور میرے خیال میں اس کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں یہی کرنا چاہئے۔“

”تھینک یو ویری مچ سر۔“ شہاب نے کہا۔

”پھر اب یہ بتاؤ اس کے بعد کیا کرو گے؟“

”سر کام تو جاری رہے گا ابھی تو ہمیں راگ علی ساند کو پوری طرح اپنی ڈھب پر لانا ہے..... آپ ذرا دیکھئے ان لوگوں کا طرز زندگی کیا ہے۔ کیا اب بھی اس بات میں شبہ رہ جاتا ہے..... ڈی آئی جی صاحب کہ یہ اپنے علاقوں میں من مانی کرتے ہیں نہ انہیں کسی سرکاری افسر کا خوف ہے اور نہ کسی کی عزت و آبرو سے دلچسپی ہے۔“ ڈی آئی جی صاحب کے چہرے پر نفرت کے آثار پھیل گئے۔ وہ بولے۔

”یہ ایک بہت بڑا سچ ہے کچھ لوگوں نے انسان ہونے کے باوجود دولت کے بل بوتے پر اپنے آپ کو اس قدر آگے کی چیز سمجھ لیا ہے کہ وہ نہ انسانوں کو انسان سمجھتے ہیں نہ قانون کا قانون..... وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کریں گے اس کا حل ان کے پاس موجود ہے۔ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور شہاب افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کی دولت ان کی مدد کرتی ہے۔ ان سے تعاون کیا جاتا ہے اور اسی تعاون نے ان کی ہمت بڑھادی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا یہ قدم بھی غیر قانونی ہے لیکن کیا کیا جائے اور کوئی حل کبھی سامنے نہیں آیا..... بہر حال میں تمہارے اس تمام عمل سے بالکل اتفاق کرتا ہوں۔ ٹھیک ہے جب کوئی چارہ کار نہ رہے تو یہی سب کچھ کرنا مجبوری بن جاتا ہے۔ اب تم اپنا کام ذرا احتیاط کے ساتھ جاری رکھو..... تمہارا کوئی نشان تو وہاں سے دستیاب نہیں ہو سکے گا۔“

”نہیں سر۔“

”ویسے تم کافی ذہین اور چالاک آدمی ہو۔“

”تھینک یو سر لیکن وہ پچیس لاکھ روپے کی رشوت؟“

”نہیں مجھے اس کے لئے کوئی پیش کش نہ کرنا اس کی وجہ میں تمہیں نہیں بتا سکوں گا..... کچھ تمہیں حاصل ہوا ہے اس سے اپنے حالات سنوارنے کی کوشش کرو..... ہر شخص کو حق حاصل ہے اور پھر یہ کسی شریف یا غریب آدمی کی دولت نہیں بلکہ نجانے کتنے لوگوں کا خون

”اب کیا ہوگا؟“

”اندر چلو..... کہیں اس نے ساند ا صاحب کو بھی زخمی نہ کر دیا ہو۔“

دونوں گرتے پڑتے اندر آئے اور انہوں نے نور علی ساند کو دیکھا اور پھر اس کی نیت دیکھ کر دونوں کی حالت بری طرح بگڑ گئی..... ان کے حواس گم ہو گئے تھے..... یوں خوف سے کانپ اٹھے..... نور علی ساند کی آنکھوں کی جگہ گہرے غار جن پر اب خون بنے لگا تھا..... ادھڑی ہوئی ناک جس سے ابھی تک مسلسل خون بہہ رہا تھا..... انہوں نے اپنی پٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کی صورت دیکھی اور ان میں سے ایک بولا۔

”کہا تھا میں نے کوئی بڑا ہی کام ہو گیا ہے..... اب تو ہم مارے گئے ریاض خاں۔“

”اب کیا ہوگا بھائی بشیر؟“

”میری تو ہمت جواب دے گئی ہے تو ذرا دیکھ ساند ا صاحب زندہ ہیں یا مر گئے ہیں۔“

”ہے تو مردوں ہی کی طرح ہیں۔“

”میری ہمت نہیں پڑتی۔“

”ہمت کریا میرا دل بہت کمزور ہے۔ کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے تو دیکھ یہ زندہ ہیں یا مر گئے۔“ نور علی ساند کی دھڑکنوں کا جائزہ لیا گیا اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ زندہ ہے تو ریاض خاں نے بشیر سے کہا۔

”اب یہ بتا کیا کریں ہم لوگ۔ دونوں چلیں یا تو جا کر اطلاع دے گا۔“

”ایک بات کہوں بچنا ہم دونوں میں سے کسی کو نہیں ہے..... اس طرح کبھی کبھی لینے کے دینے پڑتے ہیں تو نے اندازہ لگایا برے کام کا برا نتیجہ۔ لڑکی ساند ا صاحب کو صحیح طور سے بڑا دے کر چلی گئی۔“

”پھر کیا کریں بھاگ چلیں یہاں سے؟“

”اور مصیبت آجائے گی۔“

”کیوں؟“

”ارے ان بڑے آدمیوں کو نہیں جانتا تو ہم پر سازش کا الزام لگ جائے گا۔ دونوں کو

بچنے ساند ا کی اس کیفیت کا مجرم قرار دیا جائے گا۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہم بھاگ جو نکلیں گے۔“

”تھینک یو سر..... میں نے اسے ان آنکھوں سے محروم کر دیا ہے جن آنکھوں سے اس نے مجھ پر بری نگاہ ڈالی تھی، پھر میں نے اس کے چہرے کو بد نما کر دیا تاکہ اسے اپنی برائی کا یہ دن یاد رہے۔“

”تمہارا انتقام بھر پور ہے بیٹا۔“

”آپ کے الفاظ نے میرا حوصلہ بہت بڑھا دیا ہے۔ شہاب میں آپ کی شکر گزار ہوں۔“

”میں نے اپنے تحفظ کے لئے بھی ایک فیصلہ کیا ہے۔“ شہاب نے پوری سنجیدگی سے

کہا۔ ”ہاں..... حوصلہ کچھ اور بڑھ گیا تو اس لئے میں سیاہ چشمہ لگایا کروں گا۔“

بیٹا پہلے تو اس کے الفاظ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر جب بات اس کی سمجھ میں آگئی تو بے اختیار ہنس پڑی۔

”آپ مجھے شرمندہ نہ کیا کریں۔“ اس نے کہا۔

”جی بہت بہت بہتر۔“ شہاب خوف زدہ لہجے میں بولا اور بیٹا کا قہقہہ بلند ہو گیا۔



صبح ہونے میں کچھ ہی دیر باقی رہ گئی تھی..... جب ان دونوں زخمیوں کو ہوش آیا جو پہرے پر موجود تھے اور جنہیں بیٹا نے گلدان مار کر زخمی کر دیا تھا..... دونوں کی حالت کافی خراب تھی..... چوٹیں بڑی زبردست تھیں اور ان چوٹوں نے انہیں کئی گھنٹوں کی نیند سلا دیا تھا..... جاگے تو چکر آرہے تھے لیکن پھر حواس بحال ہوئے تو دونوں ہی کی حالت خوف سے خراب ہو گئی..... یہ کیا ہوا ہے، کیا ہو گیا..... دونوں نے ایک دوسرے سے سوالات شروع کر دیئے۔

”پتا نہیں بھی کون کم بخت تھا..... میری تو حالت خراب ہو گئی ہے۔“

”یار بشیر مجھے تو کوئی لمبا چکر نظر آرہا ہے۔“

”کیسا؟“ دوسرے نے پوچھا۔

”اندر چل کر دیکھیں نور علی کا کیا حال ہے۔ میں نے ایک جھلک دیکھی تھی مگر سننے

سے پہلے ہی میرا کام کر دیا گیا۔“

”کون تھا وہ؟“

”وہی لڑکی جسے ہم لوگ اٹھا کر لائے تھے۔“

”سب کہاں کیسے، کیا بکواس کر رہے ہو؟“ راگ علی ساندانے انہیں کئی گالیاں دیتے ہوئے کہا۔

”وہ جی بس رات کو جی رات کو، وہ وہاں سے جی لڑکی کو اٹھایا تھا ہم نے، وہ زخمی کر کے ہائی ساند صاحب کو جی۔ بڑا زخمی کیا ہے۔“

”کس لڑکی کو اٹھایا تھا؟“ راگ علی ساندانے کہا۔

”وہ جی جو سرکاری افسر گیٹ ہاؤس کے بنگلے پر آکر ٹھہرے تھے ناجی، ان میں جو لڑکی نہایتی، بس ساند صاحب نے اس کو اٹھا کر لانے کا حکم دیا تھا۔“

”کیا؟“ راگ علی ساند کے چہرے پر زلزلے کے آثار نظر آنے لگے۔

”ہاں صاحب جی ہم اسے اٹھالائے..... تین بندے اور تھے ہمارے ساتھ۔ وہ جی ایاز، دلاور اور شبو، یہ بھی ہمارے ساتھ تھے جی، لڑکی کو ہم لاکر نو نمبر میں چھوڑ گئے۔ وہ بن چلے گئے..... ہماری ڈیوٹی لگادی گئی۔ سانداجی وہیں آگئے..... ہمیں پہرے پہ لگادیا گیا۔ بس پھر سانداجی اندر چلے گئے..... ہم بیٹھے ہوئے پہرہ دے رہے تھے کہ صاحب جی اے سروں پر زور دار چوٹ لگادی گئی اور ہم بے ہوش ہو گئے..... ابھی تھوڑی دیر پہلے میں ہوش آیا اور ہم اندر آگئے..... سانداجی، سانداجی وہیں پڑے ہوئے ہیں صاحب جی۔

بت نون بہہ گیا ہے ان کا اور..... اور۔“

”اوہ کتے کے بچو، کتے کے بچو تم لوگ حالات کو بگاڑنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہو۔“

”میرے ساتھ آؤ..... میرے ساتھ آؤ۔“ راگ علی ساندانے کہا اور ان دونوں کو ساتھ لے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ حویلی کے عقب حصے ہی کے ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا جو خالی اور بند پڑا رہتا تھا۔ راگ علی ساندانے ان دونوں کو اندر جانے کے لئے کہا اور وہ اندر پہنچے۔ تب راگ علی ساندانے ان سے کہا۔

”اگر یہاں سے ہلنے یا بولنے کی کوشش کی تو اتنے ٹکڑے کروں گا تمہارے کہ کوئی گن لٹکے گا سمجھے..... خاموشی سے یہاں بیٹھے رہو۔“ وہ دونوں سہم کچنا ماش ہو گئے۔

راگ علی ساند اوڑھتا ہوا باہر آیا تھا۔ ابھی چونکہ حویلی میں زندگی کے آثار نمودار نہیں آئے تھے اس لئے بات دب سکتی تھی..... ایک مخصوص حصے سے گزرنے کے بعد وہ ایک

”اب اپنے گھر والوں کا کیا کرو گے؟ ایک ایک کو چور ہے پر پھانسی دے دی جائے گی۔“

پولیس کو خبر بھی نہیں کی جائے گی..... سمجھے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“

”اب دیر نہ کرو چلو دونوں ہی چلتے ہیں انجام جو بھی ہو۔“

”چلو۔“ دونوں گرتے پڑتے حویلی پہنچے..... راستے میں یہ طے کیا کہ راگ علی ساند کو اطلاع دینے کے بجائے پیار علی کو اطلاع دی جائے کیونکہ یہ بات وہ بھی جانتے تھے کہ دونوں بھائیوں میں گٹھ جوڑ ہے اور دونوں ایک ساتھ برائیاں کرتے ہیں لیکن تقدیر کی خرابی کو کیا کرتے۔ راگ علی ساند اچھل قدمی کا عادی تھا اور جب وہ حویلی میں داخل ہوئے تو راگ علی ساند اچھولوں کی کیاری کے پاس کھڑا پھولوں کو دیکھ رہا تھا..... دونوں کے قدم ٹک گئے۔ راگ علی ساندانے انہیں دیکھ لیا تھا اور ان کے کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھ کر چونک پڑا تھا..... وہ خود کئی قدم آگے بڑھ آیا اور اس نے انہیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا؟ کیا ہو گیا تم دونوں کو، تم زخمی ہو؟“

”بڑے ساند صاحب ہم ہم۔“

”کیا ہم ہم لگا رکھی ہے۔ بات بتاؤ کیا بات ہے؟“

”وہ ساند صاحب بڑا حادثہ ہو گیا ہے جی، ہم تو تم تو بے موت مارے گئے جی..... ساند صاحب جی، ساند صاحب جی۔“ دونوں گڑگڑانے لگے..... راگ علی ساند انہیں غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ دونوں راگ علی ساند کے پیچھے پیچھے چل پڑے..... ساند انہیں حویلی کے عقبی حصے میں لے گیا اور پھر ایک کمرے میں پہنچ کر بولا۔

”کیا حادثہ ہو گیا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ مجھے فوراً ہی بات نہ بتانے کی سزا کیا ہوتی ہے۔“

”وہ ساند صاحب جی، چھوٹے ساند انور علی ساند۔“

”کیا؟“ راگ علی چونک پڑا۔

”ہاں جی، وہ بہت زخمی ہو گئے ہیں جی۔ سانداجی ان کے..... ان کے بڑے زخم آئے ہیں جی ان کے۔“

”وہاں کیوں چل رہے ہیں اباجی؟“

”نور علی ساند اشد یزد زخمی حالت میں وہاں پڑا ہوا ہے۔“ راگ علی ساند نے جواب دیا
پیار علی کا ہاتھ اسٹیرنگ پر لہرا گیا۔ اس کے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔
”زخمی!“

”ہاں، تجھے معلوم تھا کہ وہ وہاں گیا ہے۔“

”مم..... مجھے مجھے کیا معلوم کیوں گیا تھا وہ وہاں؟“

”جھوٹ بکواس کرتا ہے۔“

”نہیں اباجی قسم لے لو مجھے کیا معلوم مگر کس نے زخمی کیا اسے؟“

”اس لڑکی نے جس کی عزت لوٹنے کے لئے اس نے اسے وہاں اٹھوایا تھا۔“

”اوہ کیا زیادہ زخمی ہو گیا ہے؟“ پیار علی نے پوچھا اور راگ علی ساند کے ہونٹوں پر
ہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”تو نے اس کے زخموں کے بارے میں پوچھنے کے بجائے یہ کیوں نہیں پوچھا پیار علی
کے اس نے کون سی لڑکی کو اٹھوایا ہے؟“

”یہ تو اب پوچھنے والا تھا اباجی۔“

”تم دونوں بھائی میری اولاد ہو..... میں تم دونوں کے کر توت اچھی طرح جانتا ہوں۔“

اے عیاشی ہم نے بھی کی تھی اور ایسی کی تھی کہ تم سالو ابھی پچیس سال تک وہ سب کچھ

نہیں کر سکتے، لیکن ایسا پاگل پن ہم پر بھی کبھی سوار نہیں ہوا تھا..... بس میری زبان نہ کھلو،

دیکھو اس مردود کا کیا حال ہوا ہے..... وہ سرکاری لڑکی ہی رہ گئی تھی کمین کے بچو۔ کیا کرنا

ہائے تم؟ سب کچھ کیا دھرا خاک میں ملانے پر تل گئے ہو۔ کہاں لے جا کر چھوڑ دے

ٹھٹھے۔“ راگ علی غصے سے ان دونوں کو برا بھلا کہتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس عمارت پر

پنچنے لگا جہاں نور علی ساند اب ہوش میں آگیا تھا اور زمین پر پڑا کر رہا تھا..... پیار علی کو

معلوم تھا کہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔ سیدھا وہیں پہنچا تھا اور اس کے بعد کمرے کا دروازہ کھول کر

نڈر گھس گیا تھا کیونکہ نور علی ساند کی کراہیں باہر بھی سنائی دے رہی تھیں، لیکن اس کا چہرہ

اس کی آنکھیں دیکھ کر دونوں باپ بیٹوں کے حلق سے دلخراش چیخیں نکل گئی تھیں۔

راگ علی ساند کے دل میں باپ کی شفقت کا طوفان جاگ اٹھا..... بیٹے کو اس عالم میں دیکھ کر

کمرے کے دروازے پر رُک گیا اور پھر اس نے دروازہ زور زور سے پٹینا شروع کر دیا۔
پیار علی ساند کا دروازہ تھا..... پیار علی مست نیند سو رہا تھا..... سلپنگ سوٹ پہنے ہوئے
دروازے پر آگیا۔ چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے لیکن باپ کو دیکھ کر یہ غصہ ختم ہو گیا۔
ادب سے بولا۔

”خیریت تو ہے اباجان کیا بات ہے؟“

”ابا کے بچے تمہاری گندگی رنگ دکھا گئی ہے۔ جلدی سے کپڑے پہن کر میرے ساتھ
چل اور سن تین بندوں کو ان کے گھروں سے اٹھوانا ہے کسی کو کہہ دے۔“

”ہوا کیا ہے اباجی؟“

”ابھی بتاؤں تجھے ہوا کیا۔ جو ہوا ہے وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ میں کہتا ہوں کپڑے
بدل۔“ پیار علی ساند نے شاید راگ علی ساند کو اس بدحواسی کے عالم میں کبھی نہیں دیکھا
تھا۔ دوڑتا ہوا اندر گیا اور پھر اٹلے سیدھے کپڑے پہن کر باہر آگیا۔ ”ایاز خاں اور شگن وغیرہ
کو ان کے گھروں سے اٹھالو اور یہاں بند کرادو..... فوراً یہ کام کرو۔ کس سے کہو گے؟“

”اعجاز خاں سے کہے دیتا ہوں وہ کر لے گا۔“

”چلو چلو جلدی چلو، اعجاز خاں کدھر ہو گا۔“

”اپنے کوارٹر میں سو رہا ہو گا۔“

”چلو اسے اٹھاؤ..... گاڑی خود ہی چلائی ہے۔ میں گاڑی میں جا کر بیٹھتا ہوں..... تم اعجاز
خاں کو ہدایت کر کے فوراً آ جاؤ۔“ پیار علی ساند باپ کی ہدایت پر عمل کرنے لگا..... سارے
کام خاموشی سے ہو گئے۔ اعجاز خاں کو ان تین افراد کو اٹھانے کی ہدایت کر دی گئی اور اس سے
کہا گیا کہ وہ کسی قیمت پر نکلنے نہ پائیں، پھر پیار علی ساند گاڑی میں آ بیٹھا۔ حلیہ خراب تھا۔ بال
بکھرے ہوئے تھے..... آنکھوں میں اب بھی نیند کی سرخی باقی تھی۔ گاڑی شارٹ کر کے
حویلی سے باہر نکالی اور پوچھا کہ کہاں چلوں تو راگ علی ساند نے کہا۔

”نومبر۔“ پیار علی بری طرح چونک پڑا۔ ساری کہانی اسے معلوم تھی..... نور علی
ساند انومبر ہی میں ہو گا اور وہاں اس نے یقینی طور پر اپنی خواہشات کی تکمیل کر لی ہوگی لیکن
راگ علی کو اس کا پتا چل جانا کچھ بہتر نہیں ہے۔ تاہم باپ کی ہدایت کو ٹھکرا بھی نہیں سکتا
تھا۔ راگ علی کے غصے کو جانتا تھا..... بڑی ہمت کر کے اس نے پوچھا۔

معلوم کی..... وہ جانتا تھا کہ نور علی کا یہ حال کس نے کیا ہے لیکن ایسا کیسے ہوا؟ یہ سب کیسے ہو گیا؟ حالات بتا رہے تھے کہ راگ علی ساند کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اعجاز نے جن لوگوں کو اٹھوانے کے لئے کہا گیا تھا وہ یہ لوگ تھے جو ان دونوں بھائیوں کے بہکام کرتے تھے اور فرخندہ رشید کو اٹھانے کی ذمہ داری بھی انہیں دی گئی تھی۔ ڈاکٹر اپنا کام کر رہے تھے۔ معائنہ کر لیا گیا پھر ایک آئی سر جن نے کہا۔ ”حادثہ کس طرح ہوا جناب؟“

”کیفیت کیا ہے یہ بتاؤ سر جن۔“
 ”دونوں آنکھیں مکمل طور سے ضائع ہو چکی ہیں..... اب ان کے ٹھیک ہونے کا کوئی نل نہیں ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر؟“
 ”آپ خود بھی دیکھ سکتے ہیں۔“
 ”میں اسے دنیا کے ہر ملک لے جانے کے لئے تیار ہوں..... آپ مجھے مشورہ دیں۔“
 ”آپ ضرور لے جائیں لیکن اب یہ آنکھیں ٹھیک نہیں ہو سکتیں۔“ ڈاکٹر نے حتمی اب دیا۔



چند لمحوں کے لئے انسان بن گیا اور پھر کرب سے چیتا ہوا آگے بڑھا۔

”نور، نور میری جان، میری زندگی میرے بچے نور نور۔“ وہ دوڑ کر نور علی سے لپٹ گیا اور نور علی کراہتا ہوا بولا۔

”میں مر رہا ہوں، اباجی۔ میں مر رہا ہوں، میں مر گیا اباجی، میں مر گیا..... بچالو مجھے بچالو اباجی۔“ اس نے پوری قوت سے راگ علی ساند کو پکڑ لیا اور راگ علی اس سے بری طرح لپٹ گیا۔

”کیسے ہو گیا..... یہ سب کچھ کیسے ہو گیا یہ نور علی..... تیری آنکھیں آہ تیری آنکھیں کہاں گئیں..... اوہ میرے خدا..... تیری آنکھیں نور علی تیری آنکھیں اور یہ تیرا چہرہ۔“
 ”مر رہا ہوں اباجی..... بچالو مجھے۔“ نور علی کربناک آواز میں بولا اور راگ علی نے فوراً ہی پیار علی سے کہا۔

”جلدی چل پیار علی جلدی چل اسے شہر لے چلیں گے..... جلدی کر جلدی کر ہم اسے سیدھے شہر لے چلیں گے۔“

پیار علی نے آگے بڑھ کر بھائی کو سہارا دیا اور اسی طرح اسے سہارا دیئے ہوئے باہر تک لے آیا، پھر وہی گاڑی برق رفتاری سے شہر کی جانب دوڑنے لگی جس میں یہ لوگ یہاں تک آئے تھے..... باقی ساری باتیں بعد کی تھیں کہ کیا ہوا کیا نہیں ہوا..... یہ ایک الگ بات تھی۔ سب سے پہلے نور علی کو کسی ہسپتال میں داخل کرانا تھا..... راستے میں نور علی پھر بے ہوش ہو گیا..... راگ علی کا چہرہ بری طرح غمزہ ہو رہا تھا۔ بیٹے کا سر گود میں لئے بیٹھا ہوا تھا اور بھئی پھٹی آنکھوں سے اس کی آنکھوں کے گڑھے اور ناک دیکھ رہا تھا..... انتہائی بد نما چہرہ ہو گیا تھا نور علی کا لیکن باپ کی آنکھیں مختلف ہوتی ہیں..... وہ صرف اپنے بیٹے کی زندگی چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شہر میں داخل ہو گئے۔ پیار علی نے اس برق رفتاری سے گاڑی دوڑائی تھی کہ زندگی اور موت کو بھول گیا تھا اور مقررہ وقت سے بہت پہلے وہ لوگ شہر میں داخل ہو گئے تھے..... پھر ایک بہت بڑے مشہور آئی ہسپتال میں گاڑی رکی تھی۔ اعلیٰ درجے کا ہسپتال تھا اس لئے عملہ بھی مشہور تھا..... ذرا اسی دیر میں بہترین سپیشلسٹ جمع کر لئے گئے تھے اوہ نور علی کو آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔

راگ علی ساند اذیت سے تڑپ رہا تھا اور پیار علی کا چہرہ زرد ہو رہا تھا..... اصل بات

”تو پھر کیجئے اور مجھے خود سے الگ نہ سمجھئے۔“
”اور خود کو؟“ شہاب نے شرارت سے کہا۔
”خود کو بھی۔“

”زبانی؟“ شہاب بولا۔

”میں کیا کہوں؟“

”آپ کہئے نہیں کیجئے۔“ شہاب بولا اور مینا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
”کیا؟“ اس نے بوجھل آواز میں کہا۔

”اس رقم کے حصے۔“ شہاب بولا اور مینا نے سر جھکا لیا، اب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ باب اشاروں کنایوں میں اس سے بہت کچھ کہہ جاتا ہے اور بعد میں اپنی ذہانت سے انہی الفاظ کے رنگ بدل دیتا ہے..... کچھ دیر کے بعد شہاب نے کہا۔
”ڈی آئی جی صاحب ہمیں بطور نعمت مل گئے ہیں۔ صورت حال کو قبول کرنے والے ماون اور پگلدار..... میرے مشورے کو انہوں نے قبول کر لیا ہے۔“

”کام کا لطف آئے گا شہاب۔“

”آ رہا ہے۔“

”اب کیا پروگرام ہے؟“

”یہی میں سوچ رہا تھا..... جرم ہو چکا ہے، مجرم بااثر لوگ ہیں۔ اتفاق سے تم نے انہیں یہ اچھا سبق دے دیا ہے، کچھ وقت اس کاری ایکشن دیکھتے ہیں اس کے بعد دوبارہ انہیں توجہ کریں گے۔“

”سرا ایک درخواست کروں؟“

”نامنظور۔“ شہاب نے کہا۔

”سننے سے پہلے۔“

”ہاں۔“

”کیوں؟“

”سر کہہ کر کی جا رہی ہے۔“

”نہیں مس مینا، یہ تمہاری فنکاری ہے..... اس میں کسی کی شرکت ممکن نہیں ہے۔“ شہاب نے کہا اور مینا کے چہرے پر افسردگی طاری ہو گئی۔

”شہاب! اس نے آہستہ سے کہا۔

”کانوں میں رس اترتا ہے جب آپ مجھے شہاب کہہ کر پکارتی ہیں۔“

”ایک سوال کر سکتی ہوں؟“

”دس کی اجازت ہے۔“

”مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ نے میرے اس قدم کو ناپسند کیا ہو؟“

”کیا مطلب؟“ شہاب چونک کر بولا۔

”بعد میں خود میں نے بھی یہی سوچا۔“

”آخر کیا؟“

”آپ ان لوگوں کے حلق میں انگلی ڈال کر وہ سب کچھ حاصل کرتے ہیں اس میں ایک

”شان ہوتی ہے، جبکہ میں نے ایک عامیانہ قدم اٹھایا ہے۔“

”کیوں؟“

”بس ہے آپ کو اندازہ ہے؟“

”کیا بوری باتیں کر رہی ہو۔“

”پھر یہ سب کیا ہے..... آپ اس رقم کو میرا کیوں قرار دے رہے ہیں؟“

”خدا کی پناہ..... اتنی سی بات کو۔“

”اسے حسب معمول تقسیم کریں۔“

”ارے توبہ کیا کروں میں..... بار بار بھول جاتی ہوں..... اس کی تھوڑی سی رعایت دیجئے۔“

”دی..... لیکن زیادہ نہیں۔“

”بہتر..... میں تھوڑی سی رقم مولوی ارشد علی کو دینا چاہتی ہوں..... ان لوگوں کے بارے میں ہمیں علم ہو چکا ہے..... جب تک فیروز آزاد نہیں ہو جاتا ہمیں ان کی مالی مدد کرتے رہنا چاہئے..... سر اس کا ثواب بھی ملے گا۔“

”نہیں بیٹا..... یہ فنڈ تو میں نے ابتدا سے مخصوص رکھا ہے، ہم پورے زمانے کی مدد نہیں کر سکتے لیکن جس کیس میں کوئی مظلوم ہمیں نظر آتا ہے ہم حتی الامکان اس کی مدد کرتے ہیں..... یہ سلسلہ میں نے بہت پہلے سے جاری کیا ہوا ہے۔“

”یہی آپ کی کامیابی کا راز ہے۔“

”تم ان کے لئے جو چاہو کر دینا..... میرے خیال میں بیٹا اس دوران کیوں نہ ہم گوہر جہاں کو ٹٹول لیں۔“

”کیسے؟“

”اس سے ملاقات کرتے ہیں، بات کرتے ہیں..... سردار علی کی رپورٹ تمہیں یاد ہے؟“

”کیوں نہیں۔“

”کوئی اندازہ قائم کیا؟“

”جی شہاب۔“

”بھلا کیا؟“

”آپ میرے خیال کا مذاق تو نہیں اڑائیں گے؟“

”نہیں۔“

”میرا خیال ہے اس کے دل میں انتقام پل رہا ہے..... شوہر اور بیٹے کے قاتلوں سے“
روایتی انداز میں اپنے پوتوں کے ذریعہ انتقام لینا چاہتی ہے۔ اسی لئے شاید وہ انہیں تعلیم سے زیادہ اسلحے کے استعمال کی تربیت دے رہی ہے۔“

”سو فی صد۔“

”حالانکہ یہ ایک غیر دانش مندانہ عمل ہے۔“ شہاب نے کہا..... بیٹا نے اس بات

کوئی تجربہ نہیں کیا تھا۔ شہاب نے کہا۔ ”اس سے ایک باقاعدہ ملاقات کر لی جائے۔“

”تعاون نہیں کرنے گی۔“

”کوشش کریں گے۔“

”ٹھیک ہے..... کوئی حرج نہیں ہے۔“

دوسرے دن کا پروگرام طے ہو گیا تھا..... چنانچہ وقت مقررہ پر شہاب اور بیٹا گوہر جہاں کی کوٹھی پہنچ گئے..... دروازہ انہی دونوں لڑکوں نے کھولا تھا..... بے حد خوبصورت اور روشن بچے تھے۔

”آپ میں سے انجم کون ہے اور فہیم کون؟“ شہاب نے پوچھا۔

دونوں بچوں نے سنجیدگی سے ایک دوسرے کی صورت دیکھی پھر ایک بولا۔

”آپ کون ہیں انکل؟“

”آپ کے ملاقاتی۔“

”تو پھر تعارف دروازے پر نہیں ہو گا۔ آئیے معزز مہمانوں کی طرح اندر تشریف لائیے..... تعارف بھی ہو جائے گا۔“ دونوں نے کہا اور شہاب نے گردن خم کر دی.....

دونوں انہیں احترام سے اندر لائے پھر ایک راہداری سے گھما کر ایک دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ ”برائے کرم اندر تشریف لائیے۔“ ڈرائنگ روم بڑا اندر بنایا گیا تھا..... بیٹا اور

شہاب اندر داخل ہوئے لیکن حیران رہ گئے۔ یہ ایک کشادہ لیکن خالی کمرہ تھا..... فرش پر

قالین تک نہیں بچھا ہوا تھا۔ دونوں لڑکوں میں سے ایک دروازے پر کادوسرا کچھ اندر آگیا۔

”سوری انکل، سوری آئی۔ یہ دونوں پستول نقلی نہیں ہیں اور ہماری عمر تیس سال

ہے۔“ دروازے پر رُکے ہوئے لڑکے نے کہا اور پاؤں سے دروازہ بند کر کے اس کی چٹختی

پڑھادی..... دوسرے لڑکے کے ہاتھ میں بھی پستول تھا جس سے اس نے ان دونوں کو کور

کر رکھا تھا..... اس نے کہا۔

”اور انکل آپ اس پستول کی نال دیکھ رہے ہیں..... یہ غیر معمولی لمبی ہے۔“

شہاب اور بیٹا کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے..... ان کی باتوں سے واقعی تیس سالہ

چنگلی جھلک رہی تھی اور یہ سب ان دونوں کے لئے غیر متوقع تھا۔ اس نوعمری میں اتنی ذہانت

نا قابل یقین تھی..... بہر حال شہاب نے خود کو سنبھالا اور مسکرا کر بولا۔

"فراڈ انکل..... ہاتھ اٹھانا پسند کریں گے آپ۔ ہاں ہاں، جنبش؟ نہیں نہیں..... ابھی ہم شرافت کی حدود میں ہیں..... پلیز ہاتھ اوپر کر لیں۔"

بینا اور شہاب نے ہاتھ بلند کر لئے۔

"اصل میں انکل یہ شریفوں کا محلہ ہے اور ہم اس محلے کے شریف لوگ۔ اب اگر یہاں سے دھوم دھڑکوں کی آوازیں ابھریں تو لوگ کیا کہیں گے..... مثلاً اگر آپ غلط لوگ ہوں اور ہمیں آپ پر گولی چلائی پڑے تو۔ گھر کی بات گھر میں ہی رہے..... بلاوجہ باہر والے نہ سن پائیں اس لئے ہم نے اپنے پستولوں میں سالنسر لگائے ہوئے ہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے لیکن تم ہماری لاشوں کو کہاں چھپاؤ گے؟"

"ابھی تک ایسا ہوا نہیں ہے لیکن اس بارے میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔ قبل از مرگ واویلا کیوں ہو۔"

"خدا تمہیں ہر آفت سے محفوظ رکھے..... نظر نہ لگ جائے تمہیں۔" شہاب بولا اور دونوں ہنس پڑے۔

"یہ بھی متاثر کرنے کا ایک حربہ ہے لیکن ننھے بچوں کے لئے اور ہم اپنی عمر آپ کو بتا چکے ہیں۔"

"تو بقراط اعظم اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟" اس طرح تو ہمارے ہاتھ ڈھک جائیں گے۔"

"آپ لوگ صورت حال کی نزاکت پر اعتبار کر لیں تو ہم دوسرا مرحلہ شروع کریں۔"

"اعتبار کر تو لیا ہے۔ اب کیا ہاتھ چھت سے لگا دیں۔"

"او۔ کے۔ انجم! تم میرا ذرا میرا پستول سنبھالو۔ میں ذرا انکل اور آنٹی کو لوٹ لوں۔"

دروازے سے دور کھڑے ہوئے لڑکے نے کہا اور آگے بڑھ کر دوسرے لڑکے کو پستول تھمادیا..... اس نے دونوں پستول ان کی طرف تان لئے پھر مسکرا کر بولا۔

"انکل میرے دونوں ہاتھ صحیح نشانہ بازی کرتے ہیں..... اجازت ہو تو مظاہرہ کروں۔"

"ضرورت تو نہیں ہے ویسے تمہاری مرضی ہے۔"

"بہتر ہے ہم غریب لوگوں کے دوکار تو س ضائع نہ کرائیں۔" وہ بولا پھر لڑکان کے قریب آکر شہاب کی تلاشی لینے لگا لیکن اس نے صرف اسلحہ تلاش کیا تھا پھر وہ بینا کی طرف

مڑ کر بولا۔

"آنٹی..... اس وقت میری عمر گیارہ سال ہے..... اس لئے میری اس گستاخی کو آپ سمجھ کر معاف کر دیں..... پرس پلیز۔" بینا نے پرس اس کے حوالے کر دیا۔

ساری زندگی اتنے شارپ بچے نہیں دیکھے تھے..... ان کے الفاظ میں چٹنگی اور جملوں میں بھرپور طنز و مزاح تھا..... دونوں شدید حیران تھے..... بچے نے تلاشی لی پھر ادب سے بولا۔

برائے کرم ہاتھ نیچے کر لیجئے۔" شہاب نے گہری سانس لے کر ہاتھ گرائے تھے پھر وہ بولا۔

"جناب!"

"تھینک یو انکل، تھینک یو آنٹی..... ویسے آپ لوگوں کو ہمدے نام تو معلوم ہوگئے ہوں گے؟"

"ہاں تم انجم ہو اور یہ فہیم..... ابھی فہیم تم نے انہیں انجم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔"

شہاب بولا اور دونوں ہنسے لگے۔

"کیوں، ہنسے کیوں؟"

"انکل..... میں فہیم ہوں اور وہ انجم ہے۔"

"مگر میں نے غلط نہیں سنا تھا؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ..... اصل میں وہ ایک تجربہ تھا۔"

"کیسا؟" شہاب نے پوچھا۔

"یہ معلوم کرنا چاہتے تھے ہم کہ آپ صرف ہمارے نام ہی جانتے ہیں یا ہمیں پہچانتے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر فہیم کو انجم کہا تھا تاکہ اگر آپ ہمیں پہچانتے ہوں تو اس بات پر چونکیں لیکن آپ کے چہروں پر وہ تاثر نہیں پیدا ہوا جس کا مطلب تھا کہ آپ صرف ہمارے نام جانتے ہیں ہمیں پہچانتے نہیں ہیں۔"

"بینا۔" شہاب گہری سانس لے کر بولا۔

"جی۔"

"کیا ہم ایسے دو بچے پیدا کر سکتے ہیں۔"

"جی؟" بینا بھونچکی ہو کر بولی۔

"جناب انجم اور جناب فہیم صاحب۔ یہ خوب صورت تعارف ختم ہوا یا ابھی باقی

”دستک دیجئے۔“ فہیم بولا اور شہاب نے دروازہ بجا دیا۔

”آجاؤ!“ اندر سے آواز آئی اور بیٹا اور شہاب اندر داخل ہو گئے..... اندر ایک پروتار عورت موجود تھی جو انہیں دیکھ کر بری طرح چوک پڑی..... بیٹا اور شہاب نے سلام کیا، عورت سیدہ عورت نے جواب دیا پھر سوالیہ نظروں سے فہیم اور انجم کو دیکھا۔
”اطمینان کر لیا ہے دادی اماں..... آمد کی وجہ یہ خود بتائیں گے۔“
”لیکن میری اجازت کے بغیر؟“

”آپ نے انہیں اندر آنے کی اجازت دی تھی دادی اماں اور یہ گواہ ہیں کہ ہم جھوٹ نہیں بول رہے۔“

”میں نے اجازت دی تھی؟“

”آپ بتائیے جناب۔ دستک آپ نے دی تھی اور دادی اماں نے کہا تھا کہ آجاؤ۔“
فہیم نے کہا..... شہاب اور بیٹا بے اختیار ہنس پڑے تھے، بیٹا نے کہا۔
”اتنے پیارے اور ذہین بچوں کی دادی ہونے پر آپ کو یقیناً ناز ہوگا گوہر جہاں بیگم۔ ہم آپ کو اس تربیت پر مبارک باد دیتے ہیں۔“ بوڑھی کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں پیدا ہوا۔
چند لمحات وہ ساکت رہی پھر اس نے بچوں کو اشارہ کیا اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔ تب وہ آہستہ سے بولی۔

”آئیے..... تشریف رکھئے..... یہاں اس جگہ۔“ بوڑھی کے اشارے پر دونوں بیٹھ گئے۔
”میں نہیں جانتی کہ ان بچوں نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا لیکن اصل میں ہمارے یہاں کوئی نہیں آتا، ہم نے کسی سے رابطہ ہی نہیں رکھا ہے، کچھ ایسے دشمنوں کا خوف ہے ہمیں جو مجھے اور ان بچوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، میں خاموشی سے ان بچوں کی پرورش کر رہی ہوں، قدرتی طور پر یہ بے پناہ ذہین ہیں اور میری تربیت کا کوئی خاص دخل نہیں ہے اس میں، بہر حال اگر ان کی جانب سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو میں معافی چاہتی ہوں..... آپ لوگ اپنے چہروں سے شریف معلوم ہوتے ہیں، مجھ جیسی ناکارہ شخصیت سے ملاقات کی کیا وجہ ہے، بتانا پسند کریں گے؟“

”گوہر جہاں بیگم یقیناً آپ کے پڑوسی یا آپ کے شناسا آپ کا نام نہیں جانتے ہوں گے، کیونکہ اپنے شوہر اور بیٹے کے قتل کے بعد آپ نے ان بچوں کی زندگی کے لئے جو

ہے؟“ شہاب فوراً ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ہماری طرف سے تو ختم ہوا۔“

”آپ یہاں آنے والوں سے اسی طرح متعارف ہوتے ہیں؟“

”یہی تو مسئلہ ہے انکل کہ یہاں کوئی نہیں آتا۔ صرف چند شناساؤں سے ہماری شناسائی ہے ایسی حالت میں انکل اگر کوئی اجنبی آجائے تو ہمیں اپنے حالات کے تحت احتیاط کرنی پڑتی ہے۔“

”آپ کے حالات؟“

”جو آپ کو بتائے نہیں جاسکتے۔“

”تب آپ کے شناسا ہم سے زیادہ خوش نصیب ہیں؟“

”شاید لیکن ان میں ایک دودھ والا ہے، ایک مالی اور ایک صفائی کرنے والا۔“
”صرف؟“

”جی ہاں لیکن آپ اپنی آمد کی وجہ نہیں بتائیں گے؟“

”آپ پوچھیں گے تو ضرور بتائیں گے۔“

”بتائیے۔“

”ہم آپ کی دادی ماں سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”وجہ؟“

”آپ کو نہیں بتائی جاسکتی۔“

”آپ کے نام؟“

”بیٹا واسطی، شہاب ثاقب۔“

”آئیے۔“ لڑکوں نے کہا اور شہاب اور بیٹا گہری سانسیں لے کر ان کے ساتھ چل پڑے..... ان لڑکوں نے ان کی کھوپڑی کی پولیس ہلا دی تھیں..... راستے میں شہاب نے پوچھا۔

”یہ آپ لوگوں کا ڈرائنگ روم تھا جہاں آپ ہمیں لے گئے تھے؟“

”آپ اسے پولیس اسٹیشن والا ڈرائنگ روم کہہ سکتے ہیں..... ویسے مہمان تو ہمارے

ہاں کوئی نہیں آتا لیکن ایک ڈرائنگ روم نام کی چیز ہے ابھر پلیز..... اس طرف۔“ انجم نے کہا اور پھر انہیں ایک دروازے پر پہنچا دیا۔

بدو جہد کی ہے وہ قابل احترام ہے، ہم وہی سہارا لے سکتے ہیں اپنے مقصد کی وضاحت کے لئے جو دنیا میں لیا جاتا ہے، یعنی زبان اور اس زبان سے پہلی بار آپ کو یہ بات بتا رہے ہیں کہ حالات کچھ بھی ہوں، آپ کا رویہ کیسا بھی ہو ہم آپ کے دشمن نہیں ہیں آپ کے دوست ہیں اور ہماری ذات سے آپ کو صرف فائدہ پہنچے گا، کوئی نقصان نہیں۔“ گوہر جہاں کے چہرے کے عضلات تن گئے تھے اور چہرے کی سرخی بڑھ گئی تھی، یقیناً اس کا دوران خون ان الفاظ کو سن کر تیز ہو گیا تھا، لیکن اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جو اس عمر کی آنکھوں میں نہیں ہوتی وہ سادہ ساکت بیٹھی رہی، شہاب نے پھر کہا۔

”اور آپ نے روپوشی کی جو زندگی اختیار کی ہے اور یہاں آکر ہمیں جس بات کا احساس ہوا وہ یہ ہے محترمہ گوہر جہاں کہ آپ راگ علی ساند خانداں سے اپنے گھر اور اپنے خاندان کی تباہی کا انتقام لینا چاہتی ہیں اور اس انتقام کے لئے آپ نے وہی فلمی قسم کا روایتی انداز اختیار کیا ہے جو عام طور سے کہانیوں میں اختیار کیا جاتا ہے بے شک کہانیاں زندگی کی حقیقتیں ہوتی ہیں..... محترمہ گوہر جہاں لیکن تمام تر حالات ہمارے تابع نہیں ہوتے اور ہم ان کہانیوں سے ہٹ کر سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اگر آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ آپ کا انداز فکر غلط ہے تو میں اس کی وضاحت بھی کروں گا۔“ گوہر جہاں کی پلکیں تک نہیں چمک رہی تھیں، اس کے بدن میں کوئی جنبش نہیں تھی، بس پھر اُئی ہوئی بیٹھی خاموش لگا ہوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی..... شہاب نے موثر لہجے میں کہا۔

”آپ ان بچوں کو تیار کر رہی ہیں، آپ انہیں فنون حرب سے آراستہ کر رہی ہیں اور یقیناً آپ نے ان کے دلوں میں ساند خانداں سے انتقام کا جذبہ پیدا کیا ہو گا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ دونوں بچے بڑے ہو کر شاہکار بنیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آپ کے ارادوں کی تکمیل کر دیں لیکن آپ جانتی ہیں محترمہ گوہر جہاں ان کی تکمیل میں، کم از کم آپ کو دس سال تک محنت کرنا ہوگی، ان دس سالوں میں آپ اپنی زندگی اور اپنی صحت کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہیں، مزید یہ کہ آپ راگ علی ساند کے خاندان کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہیں ہو سکتا ہے یہ خاندان کسی قدر ترقی مشکل کا شکار ہو کر فنا ہو جائے کیونکہ خدا کی رسی دراز ہوتی ہے اور جب پہنچتی ہے تو پھر مجرم کو کہیں جائے پناہ نہیں ملتی، آپ نے اپنی زندگی کا یہ بیش قیمت حصہ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لئے صرف کر دیا اور آپ دنیا میں باقی نہیں

”تم کون ہو، اپنے بارے میں بتاؤ، تم کون ہو؟“

”اس سے پہلے ہم نے آپ کو اپنے بارے میں بتا دیا ہے، آپ کے مخلص آپ کے

”کہاں سے پیدا ہو گئے، میرے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتے ہو؟“

”ہماری ذاتی تحقیق ہے، میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا..... محترمہ گوہر

میرا تعلق انتظامیہ سے ہے اور یہ خاتون میری ساتھی ہیں، ہم لوگ راگ علی ساند کے مخالف تحقیقات کر رہے ہیں اور اس تحقیقات کے نتیجے میں آپ کا نام ہمارے سامنے آیا

ناظر آخر کار ہم نے آپ کو تلاش کر لیا ہے، جبکہ ہمارے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا کہ اس

مست میں رہنے والی خاتون اور یہ دو خوب صورت بچے کون ہیں، آپ سمجھ رہی ہیں نا؟“

”نہیں..... قانون آزاد ہے۔“

”جو اس کرتے ہو تم بالکل بکواس کرتے ہو لا تعداد کہانیاں میرے سامنے ہیں، جب نے قانون کو نشے میں مدہوش رقص کرتے دیکھا ہے اور مجرم جرم کرتا ہے۔“

”آپ کا مشاہدہ غلط ہے، گوہر جہاں بیگم قانون بہر طور اپنی ایک قوت رکھتا ہے کچھ اس کا راستہ تاریک ضرور کر دیتے ہیں لیکن آخر کار صحیح راستہ پانے کے بعد وہ عمل کرتا ہے۔ قانون کا محافظ ہوں میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ راگ علی ساند اکو کیفر کردار تک بنے بغیر زندگی کا تصور نہیں کروں گا، اگر میں زندہ ہوں تو راگ علی ساند زندہ نہیں ہے، اس کے خلاف ثبوت مہیا ہو جانے کے بعد۔“ گوہر جہاں ہنس پڑی پھر بولا۔

”اور وہ شہادت کہاں سے لاؤ گے تم جو شیلے نوجوان؟“

”مجھے آپ ہی لوگوں کا سہارا اور کار ہو گا۔“

”میرے پاس اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”آپ اور یہ بچے اس کے خلاف سب سے بڑا ثبوت ہیں۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”یہی خاتون گوہر جہاں کہ بچوں کی پرورش آپ بے شک اس انداز میں کریں لیکن ان ان جرم کی طرف مائل نہ کریں بلکہ انہیں ایک اچھا شہری بنانے کی کوشش کریں۔“

”اتجھے شہری بن کر یہ کون سے شہر میں رہیں گے؟“

گوہر جہاں کی آواز میں بے پناہ طنز تھا۔

”اسی وطن، اسی ملک اور اسی شہر میں، وہ سب کچھ حاصل کرنے کے بعد جو راگ علی

انے چھین لیا ہے۔“

”تم خوابوں کے سوداگر ہو مجھے خواب دکھا رہے ہو لیکن بوڑھی عورت ہوں آنکھوں روشنی اس لئے بھیک مانگی ہے کہ ابھی مجھے اپنا مقصد پورا کرنا ہے، مجھے خواب نہ دکھاؤ کچھ

ہو گا اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں حاصل ہو گا تمہیں، جو ان ہو جو..... ایسے لوگوں

خلاف قانون کا سہارا نہ حاصل کرو جن کی جیبوں میں قانون پڑا رہتا ہے۔“

”یہی تو کسوٹی ہے خاتون گوہر جہاں اور ہم یہ تہیہ کر چکے ہیں کہ اگر قانون کی صحیح طور

اعتد نہ کر سکے تو اپنے آپ کو قانون کا محافظ کہنا چھوڑ دیں گے۔“

”اپنے بارے میں تصدیق کر دو، ورنہ اچھا نہیں ہو گا میں تو مر چکی ہوں، اگر تم راگ علی ساند اکے بارے میں تحقیقات کر رہے ہو گے تو تمہیں معلوم ہو گا کہ بستی مہر جان میں کیا ہوا ہے..... خادم شاہ اور بدر شاہ کے ساتھ کیا وحشیانہ سلوک کیا گیا ہے، تمہیں ضرور علم ہو گیا ہو گا کہ راگ علی ساند اکے بیٹے نے میری بیٹی کے ساتھ کیا وحشت ناک سلوک کیا اور اس کے بعد اسے ہلاک کر دیا، پھر اگر خادم شاہ اور بدر شاہ نے اپنی بہن کا اور اپنی بیٹی کا انتقام لینے کے لئے راگ علی ساند اکے بیٹے کو قتل کر دیا تو کون سا برا کیا اور نتیجے میں راگ علی ساند نے ہمارے خاندان کو تباہی اور بربادی سے دوچار کر کے ہمارا سب کچھ اپنے قبضے میں لے لیا تو کبھی نہ اس کا کیا بگاڑ لیا تاؤ اگر تمہارا تعلق انتظامیہ سے ہے تو اس انتظامیہ نے ہمارے لئے کیا کیا ہے۔“

”میں نہیں کہتا خاتون گوہر جہاں کہ اس وقت حالات کیا تھے، وقت نے کس طرح راگ علی ساند اکا ساتھ دیا لیکن ایک بات آپ ذہن نشین کیجئے، کیا اس وقت انتظامیہ کو آواز دینے والا یا قانون کو پکارنے والا کوئی باقی رہ گیا تھا..... آپ ان بچوں کو لے کر روپوش ہو گئیں، قانون کس کا سہارا لیتا راگ علی ساند اکے خلاف ثبوت کون مہیا کرے گا، وہ ایک طاقتور آدمی ہے اور اس نے وہ تمام آوازیں بند کر دیں جو اس کے خلاف گواہی دے سکتی تھیں، اس نے نقلی مجرموں کو آپ کی بستی کی تباہی کا ذمے دار قرار دے کر قانون کے حوالے کر دیا، وہ ہر طرح کامیاب و کامران رہا اس کے خلاف کارروائی کرنے والا کون تھا۔ جواب دیجئے؟“

”جب قانون خادم شاہ اور بدر شاہ کو نہیں بچا سکا تو میری حفاظت کیسے کرتا، میں تو قانون سے مایوس ہو چکی ہوں، میرا قانون پر کوئی اعتماد نہیں ہے، میں جانتی ہوں کہ اگر اب بھی میں منظر عام پر آ کر راگ علی ساند اکے خلاف اس کے مظالم کی داستانیں سناؤں تو میرا مذاق اڑانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا جائے گا بلکہ جب راگ علی ساند اکو یہ معلوم ہو جائے گا کہ خادم شاہ کے پوتے اور اس کی بیوی زندہ ہے تو ہم آسانی سے موت کے گھاٹ اتار دیے جائیں گے، بولو انتظامیہ کے بہادر دلیر جوان، ہو گا کوئی میری حفاظت کرنے والا؟ راگ علی ساند اکے شہر کے چوراہے پر کھڑا کر کے گولی مار دے گا اور ہماری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہو گا کیونکہ قانون راگ علی ساند اکا ہے۔“

”دیکھئے خاتون گوہر جہاں جن لوگوں کو سہارے نہیں حاصل ہوتے وہ اپنے آپ پر
برت سے زیادہ اعتماد کر لیتے ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ اعتماد بری بات ہے لیکن آپ نے
غلط منتخب کئے ہیں، آپ ان بچوں کی دشمن نہ بنیں، انہیں آپ نے جو تربیت دی ہے
بے شک قائم رکھیں لیکن اس کے بعد انہیں اس بات پر آمادہ نہ کریں کہ بعد میں یہ
پ کے روکے نہ رکھیں، نارمل رہیں جب اگر کوئی آپ کے پاس ایک عزم لے کر آتا ہے
اس کا آپ سے کوئی لالچ نہیں ہوتا تو ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ اشارہ خداوندی ہے، میں اور
اسی ساتھی لڑکی مینا آپ سے یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم راگ علی ساند کے خلاف کام کریں
..... آپ خاموشی سے یہاں اپنا وقت گزارئے اگر ہم اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے
آپ کو مکمل حالات سے آگاہ کر کے آپ کا سہارا حاصل کریں گے، بس اس سے زیادہ ہمیں
پ سے اور کچھ درکار نہیں ہے، اپنے دل میں خدا کی طاقت کو برتر و اعلیٰ تصور کیجئے گا اور خدا
بندوں پر اعتماد میں یہ نہیں کہتا کہ ان میں راگ علی ساند کے خاندان کو بھی شامل کر لیں
راہم شہاب ثاقب ہے اور یہ مینا ہے ہم دونوں آپ سے وعدہ کر کے اٹھنا چاہتے ہیں کہ
راگ علی ساند کو پھانسی کے پھندے تک پہنچنا ہوگا۔“ معمر عورت نے دونوں ہاتھ
ٹے بڑھائے اور اس کے چہرے پر مامتا کی ایک جھلک پیدا ہوئی، اس نے شہاب کو طلب کیا
شہاب آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور بوڑھی عورت نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

”بہت عرصے کے بعد محبت اور ہمدردی کے وہ بول سنے ہیں جنہیں میں نے اپنی لغت
نکال پھینکا تھا، میرا بیٹا بدرشاہ، میرا بیٹا بدرشاہ اب اس دنیا میں نہیں ہے، بیٹے میں تمہیں
ان میں پہلی بار بیٹا کہہ رہی ہوں میری لالچ رکھنا اس مظلوم بوڑھی کو ایک اور ڈکھ نہ دینا۔“
”نہیں محترمہ گوہر جہاں ایسا نہیں ہو گا خدا کے بعد ہم پر اعتماد کیجئے۔“

”کر لیا میں نے اعتماد کر لیا ہے اور آج، آج میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کچھ کھلا پلا کر
مت کروں گی، بہت سی باتیں کروں گی ابھی تم سے، بہت سی باتیں کرنا ہے۔“ بوڑھی
بڑے انھی گئی ایک عجیب سی شگفتگی اس کے چہرے پر نظر آرہی تھی اور مینا اور شہاب
اسے تھے..... ان کا یہ مشن کامیاب ترین رہا تھا۔



راگ علی ساند اپنے غم میں دیوانہ ہو رہا تھا، اس نے کسی سے رابطہ نہیں قائم کیا تھا،

”مان لو میری بات میرے بچو دنیا میں کسی سے نفرت نہیں ہے مجھے سوائے راگ علی
ساند خاندان کے میں تمہاری جوانی، تمہاری زندگی، تمہاری صحت کی دعائیں کرتی ہوں
مت پڑو اس جھگڑے میں یہ جھگڑا میرا ہے، مجھے نمٹا لینے دو قانون کی سر بلندی کے لئے کہیں
اور جا کر کام کرو راگ علی ساند کا تم کچھ نہیں بگاڑ پاؤ گے۔“
”کیا آپ ہماری مدد کر سکتی ہیں خاتون گوہر جہاں؟“
”مجھے اس قابل پاتے ہو کہ میں کسی کی مدد کر سکوں؟“
”ہاں۔“

”تو بتاؤ کیا مدد کروں میں تمہاری؟“
”کچھ نہیں، آپ سے کچھ نہیں چاہتے ہم بس یہ چاہتے ہیں کہ اپنا مکمل تحفظ کریں
تا کہ جب راگ علی ساند ہمارے شکنجے میں آئے تو آپ ہمارے لئے ایک مضبوط ستون ثابت
ہوں، آپ اس کے خلاف وہ دعویٰ دائر کریں جو اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا دے۔“
گوہر جہاں ایک دم ٹنڈھال ہو گئی اور پھر ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا وہ زار و قطار رونے لگی، اتنا بلک
بلک کر روتی وہ کہ شہاب اور مینا کا کلیجہ پھٹ گیا۔

مینا اس کے پاس جا بیٹھی اس نے بوڑھی کا سر سینے سے لگا لیا اور اسے تسلیاں دینے لگی
بوڑھی اس طرح بے اختیار ہو گئی تھی کہ شہاب کی آنکھوں کی نمی بھی دور نہ رہ سکی، دونوں
ہی آبدیدہ ہو گئے تھے، بوڑھی نے روتے ہوئے کہا۔

”خدا کی لعنت تم پر، ہٹ جاؤ میرے پاس سے خدا..... خدا تم لوگوں کو، کیا کہوں کیا نہ
کہوں بہا دیئے میری آنکھوں سے آنسو ارے اس آگ کو تو میں نے نہ جانے کب سے پال
رکھا تھا، ارے اس آگ نے تو میرا سینہ روشن کیا ہوا تھا، ارے اس آگ نے تو میرے اندر
ہمت پیدا کی ہوئی تھی، نکال دیئے یہ آنسو تم نے میری آنکھوں سے، بہادی میرے دل کی
آگ اب کیا ہوگا، اب تو میں ایک کمزور بوڑھی ہوں اور کچھ بھی نہیں، آہ تم نے ظلم کیا ہے
میرے اوپر تم جو کوئی بھی ہو تم نے میرے اوپر ظلم کیا ہے، اس آگ کو میں اپنے سینے میں نہ
جانے کب سے پال رہی تھی اور نہ جانے کب تک یہ آگ میرے سینے میں بھڑکتی رہتی ہے
آنسو ہی تورو کے ہوئے تھے میں نے نیلن یہ پانی بہہ کیا ساری آگ ٹھنڈی ہو گئی، کمزور کر دیا
تم نے نہ کمزور کر دیا۔“

تک وہیں ہیں، کچھ ایسی ہی مصروفیات ہیں جنہیں اچانک دیکھنا ضروری تھا..... آپ لوگوں کو اطلاع نہیں دے سکے، یہاں تو سب ٹھیک ہے نا؟“

”سب ٹھیک ہے لیکن ایک ایک شخص تم لوگوں کے لئے پریشان تھا خدا کے بندے ٹھوڑی بہت اطلاع تو بھیج ہی دیتے..... میں تو عجیب گوگو کے عالم میں تھا، پولیس کو بھی اطلاع نہیں دے سکتا تھا، یہی سوچ کر کہ راگ علی بھائی اسے پسند کریں یا نہ کریں۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا، آپ لوگ اپنے کام سے کام رکھئے، کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے ہم سب ٹھیک ہیں، ابا جان بھی واپس آ جائیں گے اور نور علی بھی آپ فکر نہ کریں۔“ پیار علی نے خشک لہجے میں کہا، دوسرے اہل خاندان کو بھی اس نے تسلیاں دیں لیکن جو ہوائیاں چرے پر اڑی ہوئی تھیں وہ کسی کی نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی تھیں..... بہر حال اب اتنی مت بھی نہیں تھی کسی میں کہ زبردستی حالات معلوم کرتا، پیار علی ساند اسب سے پہلے اعجاز خان کے پاس پہنچا تھا..... اس نے سوالیہ نگاہوں سے اعجاز خان کو دیکھا تو اعجاز خان نے کہا۔

”جی چھوٹے ساند اصحاب، آپ کی ہدایت پر عمل کیا گیا ہے اور وہ پانچوں قید ہیں، میں خاموشی سے ان کی نگرانی کر رہا ہوں۔“

”کسی کو کچھ بتایا تو نہیں؟“

”نہیں سرکار، خود مجھے کچھ نہیں معلوم تھا تو میں کسی کو کیا بتاتا؟“

”ہوں مجھے وہاں لے چلو۔“ پیار علی ساند نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ اس قید خانے میں داخل ہو گیا جہاں وہ پانچواں تباہ حال موجود تھے، پیار علی نے اعجاز خان کو وہاں سے بنا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا اور خونی نگاہوں سے ان پانچوں کو گھورنے لگا۔

”کیا ہوا تھا، کیا ہو گیا تھا بد بختو، تم لوگوں نے ہمیں سولی پر لٹکا دیا، مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا؟“

”سرکار ہم تو حکم کے بندے ہیں، جو حکم ہمیں دیا گیا تھا..... ہم نے اسی پر عمل کیا، ہمارا بھلا کیا قصور ہے سرکار، آپ خود انصاف سے بتائیے۔“

”میں ابھی تمہارا انصاف کرتا ہوں، میں پوچھتا ہوں کتے کے بچو مجھے تفصیل بتاؤ۔“

”سرکار آپ کی ہدایت کے مطابق لڑکی کو وہاں سے اٹھا کر نو نمبر میں پہنچا دیا گیا..... بیکار کوزخی کر دیا گیا تھا اور گیٹ ہاؤس کی نگرانی کرنے والے ناصر کو بے ہوش، لڑکی کو ہم بے ہوش کر کے اٹھا کر لے آئے تھے، پھر نور علی ساند اصحاب وہاں آگئے..... لڑکی

شہر کے بڑے بڑے ہسپتالوں کے ڈاکٹر اس نے اس آئی ہسپتال میں جمع کر لئے تھے اور ایک سے نور علی ساند کا معائنہ کر رہا تھا، ان سے کہہ رہا تھا کہ جس طرح بھی بن پڑے میرے بیٹے کی آنکھیں بحال کر دی جائیں لیکن تمام ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ آنکھیں بحال نہیں ہو سکتیں، انہیں تو نوچ کر پھینک دیا گیا ہے، ان گڑھوں میں اب کچھ نہیں رہا۔

راگ علی ساند نے بہت سے ڈاکٹروں سے مشورے کئے تھے اور پوچھا تھا کہ کیا مصنوعی آنکھیں لگوائی جاسکتی ہیں لیکن تمام ڈاکٹروں کی طرف سے ناامیدی کے جواب ملے تھے۔ انہوں نے راگ علی ساند اسے ہمدردی ضرور کی تھی اور کہا تھا کہ وہ اگر چاہے تو غیر ممالک میں جا کر معلومات حاصل کر لے، مصنوعی آنکھوں سے قدرتی بینائی کی طور بحال نہیں کی جاسکتی۔ چار پانچ دن تک راگ علی ساند اسب کچھ بھول بھال کر شہر میں اپنے بیٹے کے لئے جدوجہد کرتا رہا تھا اور اس کے بعد ہی اس نے پیار علی کو بستی نور الہی واپس بھیجا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہاں باپ بیٹوں کی اچانک گمشدگی سے جو سنسنی پھیل گئی ہے اس پر قابو پائے بعد میں وہ دیکھے گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔ پہلے وہ اپنی جدوجہد کر لے، اگر کہیں سے امید کی کوئی جھلک نظر آجائے اور دنیا کے کسی بھی گوشے میں جانا پڑے تو نور علی کو وہاں لے جایا جائے لیکن کچھ امید تو بندھے، اس نے خصوصی ذرائع سے کام لے کر کچھ غیر ملکی ڈاکٹروں کو تمام تر اخراجات اور ان کے منہ مانگے معاوضے کا وعدہ کر کے طلب کر لیا تھا۔

پیار علی ساند اسب کو بھی پریشان تھا..... بہر حال باپ کی ہدایت پر بستی نور الہی واپس چل پڑا، خود پہنچا تو وہی ماحول ملا جس کی امید تھی، ہر شخص ششدر تھا..... راتوں رات باپ بیٹے کہاں غائب ہو گئے تھے، کسی کو علم نہیں تھا..... اعجاز خان معتمد خاص تھا، اس نے کسی کو اس رات کو کہانی نہیں سنائی تھی جب اس کے ذریعے پیار علی اور راگ علی ساند کے تینوں کارکنوں کو قید کیا گیا تھا، پانچوں قیدی ایک ہی جگہ جمع کر دیئے گئے تھے اور اعجاز خان خاموشی سے ان کی نگرانی کر رہا تھا..... ہاشم علی ساند سخت بدحواسی کے عالم میں پیار علی کی جانب لپکا تھا۔

آصف علی بھی اس کے ساتھ تھا۔

”کیا ہوا پیار علی، کیا ہو گیا؟ کہاں چلے گئے سب لوگ، بھائی راگ علی کہاں ہیں؟“

”کیا ساند کہاں ہے؟“

”وہ اصل میں چچا جان ہم ایک سرکاری کام کی الجھن میں پڑ گئے تھے..... ابا جان“

بے ہوش تھی، ہم نے اسے ساند ا صاحب کے حوالے کر دیا..... ساند ا صاحب نے کہا: صرف دو بندے پہرے پر رک جائیں باقی چلے جائیں تو یہی ہم نے کیا۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”اللہ جانے صاحب۔“

”کون دو بندے وہاں رُکے تھے؟“

”ہم دونوں صاحب۔“

”کیا کر رہے تھے تم دونوں؟“

”قسم لیجئے کچھ بھی نہیں، آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔“

”آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔“ پیار علی نے اوپری ہونٹ بھیج کر کہا۔

”تو کیا کرتے ہماری ڈیوٹی ہی تھی۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”یہی تو پتا نہیں چل سکا صاحب کہ پھر کیا ہوا..... بس ایک سایہ سا نظر آیا تھا..... اس کے بعد، ہم بے ہوش ہو گئے۔“ ریاض خان نے کہا۔

”بڑے ساند ا صاحب کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا..... کیا تم مجھے آکر نہیں بتا سکتے تھے؟“

”آپ ہی کو تو بتانے آئے تھے مگر سامنے بڑے ساند ا صاحب نظر آ گئے۔ ہمارے کپڑوں پر خون کے دھبے تھے اس لئے بات چھپائی نہ جاسکی۔“

”اور تم نے سب کچھ بتا دیا؟“

”بڑے ساند ا صاحب سے جھوٹ بھی تو نہیں بولا جاسکتا تھا، چھوٹے ساند ا صاحب۔“

پیار علی کچھ دیر سوچتا رہا، انہیں دیکھتا رہا پھر اعجاز خان کو بلا کر کہا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا اعجاز خان کیا کریں..... انہیں کھانے پینے کو دے رہے ہو یا بھوکا مار رکھا ہے؟“

”تھوڑا بہت صاحب۔“

”نہیں انہیں ایسی کوئی سزا دینے کی ضرورت نہیں..... ٹھیک سے کھلاؤ پلاؤ پھر ان کے بارے میں کچھ سوچیں گے..... انہیں بڑے ساند ا صاحب کے غصے سے بچانا ضروری ہے۔ آؤ۔“

اعجاز خان، پیار علی کے ساتھ آگیا..... پیار علی نے ان پانچوں کے لئے عمدہ ناشتا تیار کیا، خود اس کی نگرانی کی اور پھر اعجاز کے ہاتھ ناشتا اور چائے وغیرہ انہیں بھجوا دی۔

”ہمارے بارے میں کیا فیصلہ ہو گا اعجاز خان؟“ شگن نے پوچھا۔

”میرے خیال میں پیار علی ساند ا تمہیں نقصان نہ پہنچنے دیں گے۔“ اعجاز خان نے نہیں اطمینان دلایا..... وہ پانچوں ناشتا کرتے رہے پھر اچانک ہی ان کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ بگڑا پکڑے زمین پر لوٹنے لگے اور لمحوں میں اکڑا اکڑا کر ساکت ہو گئے، ان کی آنکھیں ایت سے اہل پڑی تھیں اور اعجاز خان دم بخود رہ گیا تھا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سب مر گئے لیکن.....

اسی وقت پیار علی مسکراتا ہوا اندر آگیا..... اعجاز خان کے کچھ بولنے سے پہلا بولا۔ ”میں نے ان سے بڑے ساند ا صاحب کے غصے سے بچانے کا وعدہ کیا تھا اعجاز خان۔ اس کے والد کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں انہیں زہر دے دوں..... کبھی ایک چھوٹا سا کام کرنے کے قابل بھی نہ تھے..... اب تمہاری ڈیوٹی یہ ہے کہ ایک ایک کر کے احتیاط کے ساتھ ان کی ٹیم ٹھکانے لگا دو خبردار ہوشیاری سے کام کرنا ہے۔“



آصف علی ساند ا بے وقوف نہیں تھا، راگ علی ساند ا اور اس کے بیٹوں کے رویے ان لوں کے ساتھ بہت خراب تھے، بس طفیلی بن کر رہ گئے تھے..... یہ سب کے سب، آصف نے بارہا محسوس کیا تھا کہ ہاشم علی بھی اسی احساس کا شکار ہے، لیکن اول تو بھائی کی ہیبت کی سب سے کچھ نہیں بول سکتا تھا، پھر اپنے ہاتھ بھی کٹا بیٹھا تھا اور بظاہر اس کے پاس کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا..... اس خیال سے اسے چپ سی لگ گئی تھی، بیٹی کے مسئلے میں راگ علی نے انہیں جس طرح رکاوٹ ڈال دی تھی اس سے بھی ہاشم علی ساند ا کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ اپنے ساتھ ساتھ وہ اپنے بچوں کا مستقبل بھی تار یک کر چکا ہے، لیکن کسی سے کہتا تو کیا کہتا مگر دن جھکائے زندگی گزار رہا تھا، لیکن آصف علی کا خون گرم تھا اور اب جب اس نے رانا نواز سے ملاقات کر لی تھی تو اسے ایک طاقتور سہارا بھی حاصل ہو گیا تھا۔ بہن کو ساتھ لے کر بارہانا محفوظ کے فارم ہاؤس تک جا چکا تھا اور کافی کافی دیر تک وہاں باتیں ہوتی رہتی تھیں، اس دن بھی وہ وہیں آئے ہوئے تھے، آصف علی نے مسکرا کر رانا محفوظ سے کہا۔

”وقت بہت سے فیصلے خود کرے گا رانا صاحب لیکن آپ کے الفاظ نے مجھے تقویت بخشی ہے، یہ حقیقت ہے کہ راگ علی اور اس کے دونوں بیٹے بڑی خطرناک شخصیت کے مالک ہیں، وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں اس لئے کوئی جذباتی قدم اٹھانے کے بجائے میں سوچ سمجھ کر کچھ کرنا چاہتا ہوں اور مجھے واقعی آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”آصف علی، کیا آپ کے والد ہاشم علی ساند صاحب ہمارے کسی اقدام کی مخالفت کریں گے؟“

”مجھے اس مخالفت کی پروا نہیں ہے، وہ جو بگاڑ سکتے تھے بگاڑ چکے ہیں، اب اس کے بعد انہیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم لوگوں کو مکمل طور سے تباہ کر دیں، میں اپنی بہن کا اچھا مستقبل چاہتا ہوں اور اپنا بھی، ہمیں آپ کی مدد درکار ہے۔“

”دل و جان سے حاضر ہوں، بس کسی انا کو اپنا مسئلہ نہ بنائیے۔“ تنہائی میں رانا محفوظ نے زریںہ سے کہا۔

”زریںہ صاحبہ آپ نے اب تک ان ملاقاتوں میں میرے کردار میں کوئی برائی نہیں پائی ہوگی، میں آپ کو مکمل احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، آج پھر آپ سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہوں کہ آپ نے اپنے ذہن سے وہ لمحات بھلا دیئے ہیں یا نہیں جنہوں نے آپ کو خود کشی تک پہنچا دیا تھا۔“

”رانا صاحب، ایک عورت ہوں، وہ بدنما لمحات تو شاید میری قبر میں بھی میرے ساتھ ہی جائیں لیکن آپ نے جو ہمت افزائی کی ہے اس نے جینے کا حوصلہ بخش دیا ہے، میں جینا چاہتی ہوں آپ کے قدموں میں۔“

”وہ تصویریں کہاں ہیں..... میرا مطلب ہے ان کے ٹیکہ؟“

”میں نے جس طرح یہ سارا کام کیا ہے، میں جانتی ہوں، ٹیکہ بھی میرے پاس موجود ہیں۔“

”دوسری ملاقات میں وہ ٹیکہ آپ لیتی آئیے اور اگر ان کے اور پرنٹ ہیں تو وہ برائے کرم میری امانت سمجھ کر مجھے لوٹا دیجئے گا۔“

”آپ کی امانت؟“

”ہاں زریںہ، کیا ایک غیور مرد کی حیثیت سے میں ان تصویروں کا وجود برداشت

”آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے رانا محفوظ صاحب، میں کیسا بھائی ہوں، جو بہن کو اس کے منگیتر سے ملانے چلا آتا ہوں، اس سے میرے کردار پر ایک داغ بھی آجاتا ہے، آپ کیا سچائی اور ایمانداری کے ساتھ مجھے یہ بتانا پسند کریں گے کہ میرے اس قدم سے آپ کیا سوچتے ہیں؟“

”سچائی کو درمیان میں رکھ دیا ہے آپ نے ساند صاحب چنانچہ جو کچھ میں کہوں اسے سچائی ہی کے ساتھ قبول کر لیجئے گا اور وعدہ کیجئے کہ برا نہیں مانیں گے۔“

”اسی بنیاد پر میں نے یہ موضوع آپ کے سامنے چھیڑا ہے۔“

”تو ساند صاحب، میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ والد بزرگوار نے جوش محبت میں یا بھائی کے خوف سے جو قدم اٹھایا ہے اس نے انہیں بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ اب آپ کے پاس کچھ نہیں ہے، راگ علی ساند صاحب جب چاہیں آپ کو اپنی حویلی سے نکال سکتے ہیں، آپ بے دست و پا ہو چکے ہیں اور آپ کو یہ احساس ہے کہ اپنے والد صاحب کی غلطی کی وجہ سے آپ نے اپنا مستقبل کھو دیا ہے۔“

”یہ ایک کھرا بچہ ہے۔“ آصف علی ساند نے کہا۔

”اور معافی چاہتا ہوں آپ نے یہ بھی سوچ لیا ہے کہ میں آپ کے حق میں برا انسان نہیں ہوں۔“

”یہ بھی ایک مکمل بچہ ہے۔“

”اور اس وقت صرف میں ہوں جو آپ کی مدد کر سکتا ہوں..... آصف علی ساند صاحب میں خود شرمندہ ہوں اس بات سے کہ اپنی ایک خواہش کے لئے آپ کے ضمیر کو داغ دار کر رہا ہوں لیکن خدا را ایسا نہ سوچئے گا دوست بھی ہوتے ہیں اس دنیا میں اور دوستی کا رشتہ بعض اوقات باقی تمام رشتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ میں اپنے مستقبل کی تکمیل کے لئے آپ کی مدد بھی حاصل کر رہا ہوں۔ آصف علی ساند صاحب ایک دوست کی حیثیت سے آپ کو بتا رہا ہوں کہ زریںہ کے بغیر میری زندگی ناممکن ہے، میں انہیں عزت کے تمام اصولوں کے ساتھ اپنی زندگی میں شامل کرنے کا خواہش مند ہوں، تھوڑا سا یہ لالچ اور باقی آپ کی دوستی یہ سب کچھ مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں جس طرح بھی بن پڑے آپ کی مدد کروں لیکن افسوس ابھی تک کوئی ایسا موثر قدم نہیں اٹھا سکا ہوں میں جو اس سلسلے میں کارآمد ہو۔“

”آپ مطمئن رہیں میں اب وہ پہلے جیسی بے وقوف زریںہ نہیں ہوں۔“ رانا محفوظ نے ان دونوں چیزوں کا آپریشن زریںہ کو بتایا اور اس نے پوری طرح اسے سمجھنے کے بعد اپنے پاس محفوظ کر لیا تو رانا محفوظ مسکرا کر بولا۔

”اور اب میں دوسری ملاقات میں ان ٹیکٹیو کا منتظر رہوں گا، جنہیں میں اپنے ہاتھ سے نالغ کرنا چاہتا ہوں لیکن آپ کے سامنے۔“

”مجھے آپ پر مکمل اعتماد ہے۔“ زریںہ نے شفاف لہجے میں کہا۔



راگ علی ساند اذیتوں میں گھرا ہوا تھا، بیٹے کو دیکھ کر دل پر جو بیتی تھی کبھی کبھی اسے برداشت کرنا مشکل ہو جاتا تھا لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ نور علی ساند کے زخموں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، وہ ہسپتال کے ایک شاندار کمرے میں مقیم تھا اور راگ علی ساند ابھی تک بستی نور الہی واپس نہیں گیا تھا۔ مصیبت بڑی تھی اس پر بھگت رہا تھا، نور علی کی کیفیت اب کافی بہتر ہو گئی تھی لیکن اسے چپ لگ گئی تھی، بات ہی نہیں کرتا تھا اس وقت بھی راگ علی ساند اور وازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو نور علی کے جسم میں جنبش پیدا ہوئی، اس نے آہستہ سے کہا۔

”نرس۔“

”نہیں بیٹے، میں ہوں راگ علی۔“ نور علی ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ راگ علی اس کے پاس جا بیٹھا تھا اس نے بیٹے کے شانے پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”تیری طبیعت اب کیسی ہے نور علی؟“

”پتا نہیں، پتا نہیں ابا جان۔“

”اب تو مجھے بتادے ظالم، کیا ہوا ہے تیرے ساتھ، کیا کیا تھا تو نے، کس نے یہ سب کچھ کیا ہے، کس نے تیری دنیا تاریک کی ہے؟“

”کچھ نہیں یاد مجھے، میں کچھ نہیں بتانا چاہتے، مجھے میری روشنی واپس دلوا دو، ورنہ مجھ پر اپنا کوئی حق نہ جتاؤ۔“

”تیری روشنی میں نے نہیں چھینی نور علی میں تو اس کا پتا چاہتا ہوں جس نے تجھ سے یہ

کر سکتا ہوں، آپ بے داغ ہیں، ظلم کی ایک منزل سے گزری تھیں آپ لیکن میں وہ ثبوت ہمیشہ کے لئے مٹا دینا چاہتا ہوں جن کا ظلم صرف مجھے اور آپ کو ہے، تاکہ مستقبل میں کبھی ہم ایسے کسی احساس کا شکار نہ ہوں۔“

”دوسری ملاقات پر میں وہ ٹیکٹیو آپ کو واپس کر دوں گی۔“

”شکریہ مس زریںہ اس کے علاوہ آپ جس قدر باہمت خاتون ہیں اور آپ نے جس طرح یہ سب کچھ کیا ہے اس کے بعد میں آپ سے توقع رکھنا ہوں کہ راگ علی ساند کو کینز کردار تک پہنچانے کے لئے آپ مزید کوشش کریں گی۔“

”جی فرمائیے، میں خلوص دل سے حاضر ہوں۔“

”تو پھر یہ چند چیزیں سنبھالنے جو میں آپ کے لئے لایا ہوں۔“ رانا محفوظ نے ایک ننھا سا کمرہ جو جرمنی کا ساختہ تھا زریںہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ الٹرا وائلٹ لینس رکھتا ہے، رات کی تاریکی میں بھی کسی فلیش کے بغیر آپ اس سے تصویریں بنا سکتی ہیں اور اس میں کبھی فلیش کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ اپنا ٹارگٹ خود حاصل کر لیتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اگر کچھ ایسی پراسرار سرگرمیاں آپ کے علم میں آجائیں جو راگ علی کے لئے قابل گرفت ہوں تو آپ ان لمحات کو اس کیمرے میں محفوظ کر لیں لیکن اپنی زندگی کی بقاء کے ساتھ آپ کو نہایت ہوشیاری سے یہ کام کرنا ہو گا، اس کے علاوہ یہ ایک طاقتور ٹیپ ریکارڈر ہے جو ریموٹ سے کنٹرول ہوتا ہے اور اسے کوئی ایسی جگہ درکار نہیں ہوتی جہاں سے اس کے اور ریموٹ کے درمیان رابطہ قائم رہے، یہ ننھا سائیکسٹ حساس اور طاقتور ہے کہ حشرات الارض کی آوازیں بھی ریکارڈ کر سکتا ہے، یہ دونوں چیزیں میں نے آپ کے لئے جرمنی سے منگوائی ہیں، آپ اسے راگ علی ساند کی اس مخصوص نشست گاہ میں رکھ دیں جہاں وہ لوگ اپنی خفیہ گفتگو کرتے ہیں اور یہ اس کا ریموٹ ہے، مس زریںہ اس میں ایک انوکھی خوبی ہے وہ یہ کہ جو گفتگو ٹیپ ریکارڈر ریکارڈ ہو رہی ہوگی، ریموٹ کے اس ننھے سے سپیکر پر آپ اسے تقریباً چار سو گز کے فاصلے سے سن سکتی ہیں، نہایت واضح بالکل صاف، اس کا آپریشن سیکھ لیجئے، آپ کو راگ علی ساند کی اس نشست گاہ میں ہونے والی گفتگو ریکارڈ کرنی ہے، میرا خیال ہے آپ یہ کام کر لیں گی۔“ زریںہ نے مسرور انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”میرے اعلیٰ کردار کے بیڑا باپ کے سامنے فرشتہ بننے کی کوشش مت کرو، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہارے کالے کرتوتوں سے ناواقف تھا تو یہ تمہاری بھول ہے، سب کچھ جانتا ہوں میں تمہارے بارے میں، سب کچھ جانتا ہوں ایک تھا جس نے بستی مہر جان کے خادم شاہ کی بیٹی کی عزت لوٹی اور پھر خادم شاہ کے بیٹے کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گیا، ٹھیک ہے ہم نے اس کے جواب میں خادم شاہ کا خاندان تباہ کر دیا۔ اسے اور اس کے بیٹے کو

”آپ دیکھ لیجئے ابا جان، آپ کوئی ایسا موقف اختیار کریں جس سے ہماری بچت
 سہل ہو۔“ پیار علی نے کہا اور راگ علی گہری سوچوں میں ڈوبا رہا پھر اس نے کہا۔

”ان دونوں کو پراسرار طریقے سے اغوا کر لیا گیا۔ کچھ دن قید رکھا گیا پھر آزاد کر دیا۔ ان کے اہل خاندان کا خیال تھا کہ یہ اغوا برائے تاوان ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اور یہ اب اس آگئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں نہایت عزت و احترام سے رکھا گیا اور کسی نے کوئی ہدف نہیں دی لیکن آپ خود سمجھتے ہیں کہ اغوا بہر حال اغوا ہوتا ہے۔“

”تو یہ کہانی سنائی ہے انہوں نے آپ کو۔“ راگ علی نے کہا اور ڈی جی چونک پڑا۔

”کہانی؟“

”ہاں۔ صرف کہانی..... ڈی جی صاحب میں ان دونوں سے مل سکتا ہوں؟“

”ضرور..... وہ ذمے دار افسر ہیں۔ کوئی جھوٹی بات نہیں کہیں گے پھر بھی میں انہیں طلب کئے لیتا ہوں لیکن کہانی کیا ہے آپ مجھے بتانا پسند کریں گے۔“

”وہ دونوں بستی نور الہی پہنچے۔ وہاں سرکاری گیٹ ہاؤس میں قیام کیا..... مجھ سے ملے، زمینوں کی قیمت طے کر کے کاغذات پر دستخط کئے اور مجھ سے پچیس لاکھ رشوت طلب کیا۔ جو میں نے نہ دی تو میرے گھر ڈاکازنی کی اور میرے بیٹے کے مزاحمت کرنے پر اسے شدید زخمی کر کے وہاں سے فرار ہو گئے۔“

”شاہد ایاز، فرخندہ رشید۔“ ڈی جی کے منہ سے حیرت زدہ آواز نکلی۔

”جی۔“

”او، نو، نام ممکن۔ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔“

”آپ انہیں بلائیے۔“

”میں ضرور بلاؤں گا لیکن سائنڈا صاحب کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔“

”یہ سرکاری کاغذ بھی غلط فہمی ہے؟ انہوں نے ذہنی کی مزاحمت کرنے پر میرے نوجوان بیٹے کو دونوں آنکھوں سے محروم کر دیا، اس کا چہرہ ادھیڑ ڈالا، وہ زندگی بھر کے لئے ندھا ہو گیا۔“ راگ علی کی آواز بھرا گئی۔ اس نے ایک سرکاری فارم نکال کر ڈی جی کے سامنے رکھ دیا۔ جس پر سرکاری مہر تھی اور زمینوں کی رقم کا تعین کر کے دستخط کئے گئے تھے۔

ڈی جی نے کاغذ اٹھاتے ہی کہا۔ ”نہیں، ہرگز نہیں۔ آپ خود غور کر لیجئے۔ یہ سرکاری فارم نہیں ہے، میں آپ کو سرکاری فارم دکھاتا ہوں۔“ ڈی جی نے اپنی میز کی دراز سے فارم کا پیڈ نکالا جو اس پیڈ سے بالکل مختلف تھا۔

”ٹھیک ہے، تم یہاں کے حالات کو نگاہوں میں رکھو سو دوست سود دشمن، کہیں کوئی بڑی مصیبت نہ آجائے۔“

”یہاں سے آپ اطمینان رکھئے گا لیکن آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

”میں شہر جا رہا ہوں، وہاں جا کر کارروائی کرتا ہوں، میرا خیال ہے ان لوگوں پر پورے علی کو نقصان پہنچانے کا الزام لگادیا جائے اور اس رقم کا حوالہ دیدیا جائے جو وہ نور علی سے لئے گئے ہیں۔“

”جو کچھ کیجئے سوچ کیجئے۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ راگ علی نے کہا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔



راگ علی شہر جا کر متعلقہ محکمے کے ڈائریکٹر جنرل سے ملا۔

”میرا نام راگ علی ساندہا ہے۔“ اس نے کہا اور ڈائریکٹر نے کھڑے ہو کر اس سے پر جوش مصافحہ کیا۔

”تشریف رکھئے سائنڈا صاحب۔ یقیناً آپ کو انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑی..... میں عموماً سرکاری دوروں پر رہتا ہوں اس لئے پہلے آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی، جبکہ ہماری ذیل بڑی اہمیت کی حامل ہے اور یہ جلد از جلد ہو جانی چاہئے۔ اچھا یہ فرمائیے آپ کیا لینا پسند کریں گے۔“

”میں آپ سے۔“ راگ علی ساندہا نے کہا، مگر ڈی جی نے اس کی بات درمیان سے کاٹ دی۔

”یقیناً یہ سوال کریں گے کہ وعدے کے مطابق ہمارے نمائندے آپ تک نہیں پہنچے..... اصل میں جو دو نمائندے آپ کے پاس جانے والے تھے وہ ایک عجیب حادثے کا شکار ہو گئے۔“

”کیا حادثہ؟“

”اپنی نوعیت کا ایک عجیب حادثہ۔ ان میں سے ایک خاتون میں جن کا نام فرخندہ رشید ہے ہمارے محکمے میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں، دوسرے مسٹر شاہد ایاز ہیں۔“

”جی۔ حادثہ کیا ہوا؟“

راگ علی نے یہ فارم دیکھا اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے وہ آہستہ سے بولا۔ ”نہیں..... یہ فارم نہیں ہے۔“

”ہمارے دفتر میں صرف یہی فارم استعمال ہوتا ہے۔“

”آپ انہیں بلائیے۔“ راگ علی ساند اڈھیلے لہجے میں بولا اور ڈی جی فون پر اپنی سیکرٹری کو ہدایات دینے لگا پھر اس نے کہا۔

”یہ کوئی اونچا فراڈ ہے، آپ نے کیس رجسٹرڈ کرایا؟“

”ابھی نہیں۔“

”ڈکیٹی ہوئی ہے؟“

”ہاں لیکن اس کے علاوہ میرے بیٹے کو شدید زخمی کر دیا گیا ہے۔“

”مجھے سخت افسوس ہے، وہ دونوں بھی اپنے اغوا کا کیس درج کرا چکے ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو میں اس سلسلے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟“ ڈی جی نے مخلصانہ پیشکش کی۔

”کیسی مدد؟“

”ڈی آئی جی نادر حیات سے میرے ذاتی تعلقات ہیں، میں آپ کو ان کے پاس لے جاسکتا ہوں۔ وہ بذات خود اس کیس کو دیکھیں گے۔“

”شکریہ لیکن آپ کو ان دونوں کے سلسلے میں گواہی دینا ہوگی۔“ راگ علی نے کہا۔

”پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ وہ دونوں کیا کہتے ہیں۔ میں تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا کہ

ایسے معزز لوگ کسی طرح جرم کر سکتے ہیں۔ بہر حال انسانی سرشت کے بارے میں کچھ نہیں

کہا جاسکتا..... کون جانے کہ اندر سے کون کیا ہے۔ بہر حال چونکہ کیس میرے محکمے سے کسی

قدر متعلق ہے اس لئے میں آپ سے پورا تعاون کروں گا۔“

”شکریہ۔“ راگ علی نے کہا۔ پھر دو افراد اندر داخل ہو گئے، ایک تقریباً تیس سالہ

خاتون تھیں، دوسرا ادھیڑ عمر آدمی۔ ڈی جی نے متعارف کرایا۔

”مسٹر شاہد ایاز، مسز فرخندہ رشید۔“

”کیا؟“ راگ علی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

”آپ انہیں پہچانتے ہیں؟“ ڈی جی نے پوچھا۔

”نہیں۔ یہ وہ نہیں ہیں۔“

”کیا بات ہے سر؟“ شاہد ایاز نے پوچھا۔

”آپ لوگوں کو اغوا کرنے کے بعد کچھ جعل سازوں نے راگ علی صاحب سے فراڈ

”جے۔“

ان دونوں کے چہروں پر خوف کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

”خدا جانے کیا قصہ ہے؟“ فرخندہ نے کہا۔

”کیا میں انہیں جانے کی اجازت دے دوں؟“

”ہاں..... ان شریف لوگوں کو تنگ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔“ راگ علی نے کہا

ان کے جانے کے بعد خود بھی اٹھ گیا۔

”آپ تشریف رکھیں..... میں آپ کی پریشانی میں براہ راست شریک ہوں، اگر آپ

مذکر میں ڈی آئی جی۔“

”نہیں مسز ڈی جی۔ شکریہ..... یہ سب کچھ میں خود بھی کر لوں گا۔“ راگ علی نے کہا

ڈی جی سے ہاتھ ملا کر کھڑا ہو گیا۔

”ان زمینوں کے بارے میں۔“

”نہیں ڈی جی۔ ابھی میں ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہوں۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ کو

بارہ دوں گا۔“ راگ علی وہاں سے نکل آیا..... اس کا سر بری طرح چکرایا ہوا تھا..... کچھ

نویں نہیں آ رہا تھا پھر وہ واپس بستی نور الہی آ گیا تھا..... بیٹوں سے سخت ناراض تھا لیکن ان

ماں کو اور کورازدار بھی نہیں بنا سکتا تھا، نہ جانے کیوں اسے ایک انوکھی تنہائی کا احساس

آ رہا تھا..... بڑی آن بان ہے، بڑی شان ہے لیکن ہمدردوں اور دوستوں کی کتنی کمی ہے.....

مہار کو پیار علی سے ہی رجوع ہوا۔ جو خود بھی بیمار بیمار نظر آنے لگا تھا..... پیار علی کو اس

ماپنے کمرے میں بلایا تھا۔

”میں تو یہاں قید ہو گیا ہوں ابا جان۔ آپ کے حکم کے بغیر باہر قدم بھی نہیں

”سکتا۔“

”تمہاری سعادت مندی نے ہی تو آج ہمیں اس حال کو پہنچایا ہے۔“

”غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے ابا جان۔“

”میں ان دنوں بڑے عجیب احساسات سے گزر رہا ہوں پیار علی۔“ راگ علی نے کہا۔

”کار ہے۔“

”تب انتظار کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔“ راگ علی خاموش ہو گیا۔ اسی رات ہاشم راگ علی کے پاس آ گیا۔

”حاضر ہو سکتا ہوں بھائی راگ علی؟“

”کیا بات ہے ہاشم علی؟“

”آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”آؤ..... کیا بات ہے؟“

”کچھ دن سے میں تمہیں پریشان دیکھ رہا ہوں؟“

”اصل بات کیا کہنا چاہتے ہو؟ وہ کہو۔“

”یہی اصل بات ہے۔“

”میری پریشانی مجھ تک رہنے دو۔“

”میں تمہارا بھائی ہوں۔“

”یہ میرا گناہ ہے۔“

”گناہ؟“

”اوہ ہاشم علی، کام کی بات کرو..... میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔“

میرے ساتھ تمہارا یہ رویہ اچھا نہیں ہے..... تم نے ابتدا کسی اور طرح کی تھی اور اب

اب تمہارے طفیلی بن کر رہ گئے ہیں۔“

”تو کیا میرے سر پرست بننا چاہتے ہو؟“

”نہیں۔“

”پھر؟“

”بھائی بننا چاہتا ہوں..... اب تو میرے پاس کچھ نہیں رہا..... میرے سامنے میرے

بچوں کا مستقبل ہے۔“

”اس کے بارے میں مجھے سوچنا چاہئے؟“

”پھر کون سوچے گا۔“

”بوڑھے ہو کر پاگل ہو گئے ہو ہاشم علی۔ کتنے دن سے میرے ساتھ ہو، کتنے اخراجات

”کیا اباجان؟“

”سب کچھ ہے میرے پاس، اتنا کچھ کہ میری نسلیں عیش کر سکتی ہیں لیکن سکون نہیں ہے۔ انسان پہلے اپنے لئے کچھ کرتا ہے پھر اپنی اولاد کے لئے، اولاد یہ سب کیوں نہیں سوچتی..... کیا نہیں کیا میں نے تمہارے لئے اور تم اس قدر بگڑے ہوئے ہو کہ۔“

”مجھے افسوس ہے اباجان۔“

”بڑے عجیب انکشافات ہوئے ہیں۔ وہ لوگ اصل لوگ ہی نہیں تھے۔“

”کون؟“

”وہی دونوں۔“ راگ علی نے کہا اور بھرپور تفصیل اسے سنا دی۔ پیار علی ہونق ہو گیا تھا..... وہ حیرت سے باپ کی صورت دیکھتا رہا پھر بولا۔

”کیا اندازہ ہوتا ہے اس سے؟“

”کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟“

”کوئی بہت قریب سے ہمارا جائزہ لے رہا ہے، کوئی یہ سب کچھ جانتا ہے اور..... اور اس نے ہمیں ایک بڑی رقم کی چوٹ دی ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے، کس کو معلوم تھا کہ ہم وہ زمینیں فروخت کر رہے ہیں اور سرکاری اہلکار ہمارے پاس آنے والے ہیں؟“

”سرکاری اہلکاروں کو۔“

”آپ کچھ بھی کہیں۔ میں دوسرے انداز میں سوچ رہا ہوں۔“

”مثلاً؟“

”نہیں اباجان۔ ہمیں سراغ لگانا پڑے گا۔“

”اس کے لئے کیا کروں؟“

”آپ نور علی کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں۔“

”کاش میں کچھ بتا سکتا لیکن ہم جائزہ لیتے رہیں گے ممکن ہے اس کی آنکھوں میں دوسری آنکھیں لگائی جاسکیں۔“

”صرف ایک ڈاکٹر نے مجھے امید دلائی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کے لئے طویل عرصہ

ہوئے ہیں تم پر، اب کیا باقی رہ گیا ہے تمہارا مجھ پر، بلکہ اچھا ہوا یہ بات تم نے کر لی، کی دلتی بھی زندہ رہتے ہیں۔ جاؤ زندہ رہنے کی کوشش کرو اور سنو اگر اس گھر میں جانا چاہتے ہو تو ضرور چلے جاؤ۔ نہ جانا چاہو تو جہاں دل چاہے چلے جاؤ لیکن کل دوپہر کے بعد تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہئے، سمجھ گئے۔“

”ہاشم علی، حویلی کے حالات میں کچھ ایسی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں کہ میں پریشان ہو گیا ہوں..... میں اب غیر ضروری لوگوں کو یہاں سے دور کر دینا چاہتا ہوں..... تم اگر چاہو تو میں تمہیں قیام کے لئے کوئی چھوٹا موٹا گھر دے دوں گا اور بس۔ جو ان بیٹا ہے تمہارا باپ بیٹے مل کر زندگی گزارنے کا بندوبست کرو۔“

”راگ علی۔“ ہاشم علی چیخ پڑا۔

”آنکھیں نکال رہے ہو مجھ پر؟“

”میری زمینوں کا کیا ہوگا؟“

”وہ اب تمہاری نہیں میری ہیں۔“

”اور میں؟“

”تمہیں اب زمینوں کی ضرورت نہیں ہے۔“

”ان کی رقم دو گے مجھے؟“

”وہ رقم میں تم پر خرچ کر چکا ہوں۔“

”خدا سے ڈرو راگ علی۔ یہ کیا کہہ رہے ہو۔“

”کل صبح تم..... حویلی خالی کر دو گے۔“

”راگ علی۔ رحم کرو ہم پر۔“

”کر تو رہا ہوں..... مسجد کے سامنے والے گھر میں چلے جاؤ..... تمہاری پرواز تو بہت اونچی ہے۔ رانا حبیب کے گھر رشتہ کرنے جا رہے تھے تم اپنی بیٹی کا۔ یہ نہیں معلوم تمہیں کہ وہ رشتہ رانا نے تمہیں کیوں دیا تھا۔“

”یہ سوچ کر کہ زینہ میری بھتیجی ہے..... اسے بہت کچھ ملے گا۔“

”وہ رشتہ تو ختم ہو چکا ہے۔“

”مجھ سے دور رہ کر اسے جوڑنے کی کوشش کرو۔“

”میں نے تو کچھ نہیں بگاڑا تمہارا..... مجھ پر یہ ظلم کیوں کر رہے ہو راگ علی؟“

”ہاشم علی..... بہت کم لوگ ایسے ہیں جو مجھ سے بحث کرتے ہیں اور کرنے کے بعد

اعجاز خان شدید بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کے دل میں کچھ کے لگ رہے تھے۔ جن لوگوں کی لاشیں اس نے ٹھکانے لگائی تھیں وہ اس کے برسوں کے دوست تھے۔ ان کے گھرانے تھے بلکہ اعجاز خان کی بیوی بھی ریاض خان کی رشتہ دار تھی۔ بہت اچھے تعلقات تھے۔ دونوں گھرانے کے لیکن سب تباہ گئے تھے..... اعجاز خان نے ان کی لاشیں ٹھکانے لگائی تھیں..... اس وقت سے اس کا دل پھنک رہا تھا۔ اسے کسی پل قرار نہیں آرہا تھا، کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا اور ان لوگوں کے چنگل سے نکل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس ہجوان نے اسے بخار میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس کی بیوی نے کہا۔ ”ماما اور لیس کی بیٹی کی شادی ہے ہمیں بلایا ہے۔“

”بھڑ میں جائیں تیرے ماما..... میری حالت دیکھ رہی ہے؟“

”کیسی باتیں کر رہے ہو اعجاز۔ میرا ایک ہی ماموں ہے..... میری مری ماں کی نشانی۔“

قریہ آنسو بھری آواز میں بولی اور اعجاز کا دماغ ایک دم روشن ہو گیا۔ اسے ایک ترکیب سوچ گئی..... اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بالکل ہی پاگل ہے مذاق بھی نہیں سمجھتی تیرا ماموں میرا ماموں نہیں ہے کیا، کمال ہے بھی مذاق کا برامان گئی۔“ اعجاز کی بات پر قریہ کے چہرے پر خوشی کے آثار پیدا ہوئے پھر اس نے کہا۔

”صفیہ میری بچپن کی سہیلی ہے بھلا اس کی شادی میں نہیں جاؤں گی میں۔“

”جانا بابا جاناکوں منع کرتا ہے تجھے۔“

”تو پھر اب کب تک چلو گے، تمہیں تو بخار چڑھا ہوا ہے۔“

بستی کی گئی اس نے دل کھول کر اخراجات کئے اور رقیہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی، بڑی عزت بخشی تھی چار دن وہاں رہنے کے بعد اعجاز خان نے ماموں اور لیس سے اجازت مانگ لی، وہ بہت پیچھے پڑے کہ کچھ دن اور رک جاتے لیکن اعجاز خان نے یہ کبہ ران سے معذرت زنی کہ نوکری تو نوکری ہی ہوتی ہے وہ نوکری کر رہا ہے اس لئے مجبوری ہے، البتہ جب نکلے اعجاز خان کو ایک اور بستی میں اتار اتور قیہ نے کہا۔

”یہ کون سی جگہ ہے بستی نور الہی تو نہیں ہے۔“

”نہیں یہاں تھوڑا سا گھومیں گے اس کے بعد پھر چلیں گے۔“ اعجاز خان اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، بھلا اس سے زیادہ ساندوں کو اور کون جان سکتا تھا، چنانچہ دو تین گھنٹے اس بستی میں گھوم کر اس نے کچھ چیزیں خریدیں پھر واپس تانگے میں آ بیٹھا اور اس کے بعد اس نے تانگے والے سے رحمان گڑھی چلنے کے لئے کہا، رقیہ حیران تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اعجاز خان کیا کر رہا ہے لیکن بستی رحمان گڑھی پہنچنے کے بعد اعجاز خان اپنے ایک دوست سلطان کے گھر کے سامنے تانگے سے اتر گیا، سلطان بھی اس کے بچپن کا دوست تھا اور اعجاز خان کو اس پر مکمل اعتماد تھا۔ دروازہ بجایا تو سلطان کی بیوی نے دروازہ کھولا اور ان دونوں کو دیکھ کر خوش ہو گئی، رقیہ اس وقت تو حیرت سے کچھ نہ بولی لیکن رسی باتوں کے بعد اب سلطان کی بیوی نے انہیں ایک چھوٹی سی جگہ آرام کرنے کے لئے دی تو اعجاز خان نے کہا۔

”رقیہ ہم نے بستی نور الہی چھوڑ دی ہے۔“

”کیا مطلب۔“ رقیہ حیرت سے بولی۔

”اب ہم بستی نور الہی واپس نہیں جائیں گے۔“

”کیا کہہ رہے ہو اعجاز۔“

”ہاں رقیہ تم نے غور نہیں کیا کہ میں نے ساری قیمتی چیزیں باندھ لی ہیں۔“

”مگر ہمارا دوسرا سامان اور پھر اچانک ہی تم نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔“

”کیا اس بات پر یقین کرو گی رقیہ کہ وہاں میری زندگی کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔“ رقیہ

کے چہرے پر خوف کے آثار ابھر آئے اس نے کہا۔

”میں سمجھی نہیں۔“

”ارے مردوں کو کبھی بخار چڑھتا ہے آج ہی ساند صاحب سے بات کرتا ہوں، مجھے لے لیتا ہوں اور پھر چلتا ہوں۔“ اعجاز نے پیار علی ساند سے سر جھکا کر کہا۔

”ساند اچی میرے ماموں کی بیٹی کی شادی ہے وہ چار دن کے لئے چھٹی چاہئے۔“ پیار علی ان دنوں اعجاز خان پر بہت مہربان تھا، کیونکہ اعجاز خان اس کا راز دار تھا، فراخ دلی سے بولا۔

”چلے جاؤ، چلے جاؤ شادی ہے تو پیسوں کی ضرورت بھی ہو گی لو یہ رکھ لو۔“ پیار علی نے کافی نوٹ نکال کر اعجاز خان کو دیئے اور اعجاز خان نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”بہت بہت شکریہ ساند اچی۔“

”بس ہمارے وفادار رہو ہمیشہ فائدے میں رہو گے۔“

”آپ کا وفادار ہوں ساند اچی۔“

”کب جارہے ہو؟“

”بس آپ کی اجازت مل گئی ہے تو اب دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”مگر جلدی آ جانا تم سے کام پڑتے رہتے ہیں۔“

”بس جی شادی میں شریک ہوں گا اور اگر بیوی وہاں رکی تو اسے چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔“ بات بن گئی تھی، اعجاز خان نے گھر آنے کے بعد سارا قیمتی سامان باندھا، غیر ضروری چیزوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، یہ آنی جانی ہوتی ہیں ویسے اس نے ساند اخاندان سے بہت کچھ کمایا تھا، اس لئے اس کی اپنی حیثیت بھی بہتر تھی، رقیہ نے خیال بھی نہیں کیا اور خوشی خوشی سارے کاموں میں مصروف رہی، بال بچہ تھا نہیں اس لئے کسی مسئلے میں مشکل بھی پیش نہیں آئی اور اعجاز خان بیوی کو لے کر چل پڑا اس کے دل میں جو کچھ تھا، رقیہ کو اس کی بھٹک بھی نہیں تھی، اعجاز خان نے ساندوں کی حویلی چھوڑ دی تھی اپنے گناہوں کا بھی احساس تھا، بہت کچھ کیا تھا اس نے ان لوگوں کے کہنے پر اس حملے میں شریک تھا جو بستی مہر جان کے خدام شاہ کی حویلی پر کیا گیا تھا لیکن ریاض خان کی موت کے بعد اس کا دل ٹوٹ گیا تھا، ویسے تو وہ پانچوں ہی ساندوں کے وفادار تھے لیکن ریاض خان سے اس کی زیادہ دوستی تھی اور ریاض خان کسی بھی طرح حیثیت میں اس سے کم نہیں تھا، جب ایک معمولی سی غلطی پر ریاض خان کو اس طرح زہر دے کر مار دیا گیا تو ایسا ہی کام اس کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا، اس نے طے کر لیا تھا کہ اب اس کا ساندوں کی طرف رُخ نہیں ہو گا، بہر حال ماموں اور لیس کے ہاں شادی میں

”تم میرے بارے میں ان سے بات کر لینا۔“

”ضرور ضرور تم یہاں آرام سے رہو جب تک کہ کوئی نوکری وغیرہ کا بندوبست نہ کیجائے، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تمہارا گھر ہے۔“ اعجاز خان نے ممنونیت سے رد ہلا دی تھی۔

سلطان خان نے اس کی بہترین خدمت کی پھر ایک دن اس نے اعجاز خان کو رانا محفوظ کے سامنے پیش کر دیا اور طے شدہ منصوبے کے تحت ساری بات رانا کو بتادی۔

رانا چونک پڑا تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ”تمہاری نوکری تو پکی ہو گئی۔ جہاں چاہو کام کرو، فارم ہاؤس پر یا یہاں بستی میں لیکن میں تم سے کچھ اور باتیں بھی کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور جناب۔“

رانا محفوظ نے اعجاز خان سے کہا۔ ”اعجاز خاں یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری کسی مجبوری سے نادمہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے ایک لفظ نہ بتاؤ اور آرام سے فارم ہاؤس پر نوکری کرو لیکن مجھے ایک بات بتاؤ۔“

”جی سرکار۔“

”اگر کبھی ساندے پولیس کے جال میں پھنسے تو تمہارا نام بھی سامنے آئے گا۔“

”جی سرکار۔“

”تمہیں ساری زندگی چھپنا پڑے گا اور پولیس تمہیں تلاش کرتی رہے گی۔“

”میں جانتا ہوں رانا صاحب۔“

”میں تمہیں بچا سکتا ہوں۔“

”کیسے رانا جی؟“

”ایک وعدہ معاف گواہ ہوتا ہے۔ ساندوں کے جرائم کی تفصیل اگر تم پولیس کو بتا دو تو

پولیس تمہیں معاف کر سکتی ہے اور تمہاری زندگی بچ جائے گی۔“

”مگر ساندے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”ساندوں کے خلاف کیس ہم کریں گے۔ ہمیں نقصان پہنچے گا تو تمہیں پہنچے گا ورنہ نہیں۔“

”ساندے بہت ظالم ہیں انہوں نے میرے بہت سے ساتھیوں کو ہلاک کر دیا اور اب میری باری تھی۔“

”کیا تم انہیں بتا کر آئے ہو؟“

”نہیں۔“

”تو پھر“

”کچھ نہیں یہاں ہم خاموشی سے رہیں گے سلطان میرا بہت اچھا دوست ہے، وہ کبھی کسی کو نہیں بتائے گا کہ میں یہاں ہوں۔“

”یہاں کرو گے کیا؟“

”اللہ مالک ہے کوئی ایسی بات نہیں ہے، پیسے بہت ہیں اور پھر کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ کرنے کو مل ہی جائے گا۔ سلطان سے بات کروں گا، وہ میرے لئے بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کر دے گا، رانا حبیب کے ہاں نوکری کر لوں گا یا پھر اور کوئی چھوٹا موٹا کام، ہم دو آدمی ہیں، ہمیں کیا پروا۔“

”رہو گے کہاں؟“

اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا، شام کو سلطان خان آیا تو اپنے دوست کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا، دونوں گلے ملے رات کے کھانے کے بعد اعجاز خان سلطان کو لے کر الگ جگہ جا بیٹھا اور اس نے سلطان خان کو ساری صورت حال بتادی، سلطان بڑا افسوس کرنے لگا تھا پھر اس نے کہا۔

”بس سلطان میرے لئے یہیں، کہیں بندوبست کر دو، میں خاموشی سے یہاں چھپ چھپا کر رہوں گا کوئی مشکل نہیں پیش آئے گی مجھے۔“

”بڑا اچھا فیصلہ کیا ہے تم نے ساندے جانور ہیں انسانوں کی کوئی عزت نہیں کرتے، میں رانا حبیب صاحب سے کہہ کر تمہاری ملازمت کا بھی بندوبست کر دوں گا۔“

”بس میرے بارے میں پتا نہیں چلنا چاہئے۔“

”رانا محفوظ بہت اچھے آدمی ہیں ان کے فارم ہاؤس پر جگہ بھی ہے اگر ہو سکا تو میں تمہیں وہاں پر ملازمت دلا دوں گا، ایک بار کہہ بھی رہے تھے مجھ سے کہ بھروسے کا کوئی آدمی ہو تو فارم ہاؤس کے لئے چاہئے، پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہو اور صورت حال کو جانتا ہو۔“

”نہیں..... میرے پردیہ کام کر کے اسے اطمینان ہو چکا ہے۔“

”ویری گڈ..... اچھا ایک بات اور بتاؤ..... کیا ہاشم علی ساند اور اس کا بیٹا بھی اس جرم شریک ہیں۔“

”وہ تو خود مظلوم ہیں رانا صاحب۔ بلکہ میں آپ کو ایک خاص بات بتاؤں آپ کا رشتہ ہاشم علی کی بیٹی کے لئے..... ساندے نہیں چاہتے تھے کہ یہ رشتہ ہو؟“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ ہاشم علی کو آپ جیسے مضبوط لوگوں کا سہارا نہ حاصل ہو جائے۔“

”ہوں..... میں سمجھتا ہوں ٹھیک ہے اعجاز خاں..... فارم ہاؤس پر دوسرے لوگ بھی مہم کرتے ہیں..... میں تمہیں شیر خاں کے نام سے سب سے متعارف کراؤں گا..... وہاں نہیں رہنے کے لئے عمدہ جگہ دی جائے گی۔ بس اس کی دیکھ بھال کرنا..... میں بھی وہاں آتا ہوں۔ جب بھی کبھی موقع ہوا تمہیں وعدہ معاف گواہ کے طور پر پولیس کے سامنے پیش دیا جائے گا..... آرام سے رہو۔“

”صاحب جی، مجھے اسلحہ چاہئے۔“

”تمہاری ضرورت کے مطابق مل جائے گا۔ ویسے میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ ہندوؤں کے انجام کو پہنچنے کے بعد تمہیں ہر جگہ آنے جانے کی پوری آزادی ہوگی۔“

”شکر یہ سرکار۔“

رانا محفوظ نے خود اعجاز خاں اور اس کی بیوی کو فارم ہاؤس پر چھوڑا تھا اور دوسرے لوگوں کو اس کے بارے میں ہدایت کر دی تھی کہ یہ میرا خاص آدمی ہے اسے کوئی تکلیف نہ دینے دی جائے..... اس کے بعد وہاں سے چلا گیا تھا۔

رقیہ نے کہا۔ ”ساندے تمہیں تلاش نہیں کریں گے۔“

”نٹ لوں گا ان سے..... تجھے بتایا نہیں ہے میں نے..... پیار علی نے ریاض خاں کو ٹھان دیا ہے۔ کسی دن میری باری بھی آجائے۔“ رقیہ آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی تھی۔



”آپ جیسا حکم دیں رانا صاحب۔“

”پہلے میں نے سوچا تھا کہ تمہیں واپس ساندوں کی حویلی بھیج دوں اور وہاں تم سے کام کراؤں لیکن وہاں تمہاری زندگی کو خطرہ ہے۔ اس لئے میں یہ خطرہ مول نہیں لوں گا۔“

”وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔“

”میں جانتا ہوں..... مجھے کچھ باتیں بتاؤ گے۔“

”اب تو آپ کا نمک خوار ہوں۔ مجھے جو معلوم ہے ضرور بتاؤں گا۔“

”خادم شاہ کی بیٹی ساندوں نے قتل کی تھی؟“

”ہاں..... اس کی عزت لوٹی گئی تھی۔“

”پھر بد رشاہ نے شہزاد علی ساند کو قتل کر دیا؟“

”جی۔“

”اس کے بعد؟“

”ساندوں نے خادم شاہ کے خاندان کو فنا کر دیا۔“

”کون کون شریک تھا اس میں؟“

اعجاز خاں نے بہت سے نام بتائے یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی اس کام میں شریک تھا۔

”یہ لوگ بستی نور الہی میں موجود ہیں؟“

”سب ہیں سرکار۔“

”اور وہ جو سزا پا چکے ہیں؟“

”وہ بے گنہہ ہیں۔ انہیں ساندوں نے یہ کیس خود پر لینے کے لئے تیار کیا تھا۔“

”یہ کتنے لوگ مارے گئے ہیں۔“

”پانچ۔“

”ان کی لاشیں تم نے ٹھکانے لگائی ہیں۔“

”جی سرکار۔ پیار علی کے حکم سے۔“

”کیا کیا ان لاشوں کا؟“

”ساند اصحاب کے باغ میں ایک گٹر میں دفن کیا ہے۔“

”پیار علی وہ جگہ جانتا ہے۔“

میں کسی وقت کا سامن نہیں کرنا پڑا۔ اعجاز خان کو بھی ساتھ لے لیا گیا تھا اور خاص بات کے تحت زرینہ بھی ان دونوں کے ساتھ کردی گئی تھی۔ ایک مشترکہ محاذ تھا اور دونوں طرف سے موت کی ہولناک آندھی راگ علی ساند کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ڈی جی نادر حیات صاحب نے خاص طور سے ان لوگوں کو اہمیت دی اور انہیں اپنے کمرہ خاص کا طلب کر لیا۔ باہر میٹنگ کی سختی لگادی گئی اور آپریٹر کو ہدایت کردی گئی کہ اس وقت کوئی ٹیلی فون کال انہیں نہ دی جائے۔ اصل میں نام ہی کچھ ایسے سامنے آتے تھے جن سے اتنی ہی اہمیت کی حامل تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے ان سب کا خیر مقدم کیا اور وہ بیٹھ گئے۔

”ساند خانان بڑی اہمیت کا حامل ہے اور دوسری بڑی شخصیت رانا حبیب خاندان کی ہیں۔ آپ لوگوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“

”شکریہ جناب آپ کے بارے میں ہمیں علم ہوا ہے کہ آپ اپنے پیشے کے ساتھ ماف کر رہے ہیں اور وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو آپ کی شخصیت کے متقاضی ہے۔ اس نے ہماری ہمت پڑی ورنہ معافی چاہتے ہیں جس کی لائٹھی اس کی بھینس والی بات تو عام ہے۔“

”نہیں میں اپنے فرض کی ادائیگی کر رہا ہوں اس احساس کے ساتھ کہ جو منصب رت نے مجھے دیا ہے اسے پورا کر سکوں، باقی سرکاری عہدے کم و بیش ملتے رہتے ہیں اور ان کی ادائیگی کا حلف بھی اٹھایا جاتا ہے لیکن بد قسمتی سے اس حلف کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا جائے، یہی ہوتا ہے کہ لوگ عہدوں کا حلف اٹھاتے ہیں اور اس کے بعد اس رسم کو بھول جاتے ہیں، خیر میرا خیال ہے گفتگو کا یہ سلسلہ طویل ہو گیا ہے، آپ لوگ اپنی آمد کی وجہ بتائیے اور معافی چاہتا ہوں کہ یہ سرکاری دفتر ہے یہاں خاطر مدارات کا سلسلہ میرے خیال سے غیر مناسب ہوتا ہے، اس لئے آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکوں گا۔“

”آپ کی محبت کے چند الفاظ اتنے بڑے ہیں ہمارے لئے کہ ہم انہیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ڈی آئی جی صاحب کچھ زیادہ وقت لیں گے آپ کا، کیونکہ بات کو ابتدا سے شروع کرنا چاہتے ہیں۔“ آصف علی ساند نے کہا۔

”ہاں ہاں کہئے۔“

”میں آصف علی ساند ہوں یہ رانا محفوظ ہیں، یہ میری بہن زرینہ ہے اور چونکہ یہ کچھ

قدرت نے ساندوں کی رسی کھینچ لی تھی..... یہی ہوتا ہے قدرت انسان کو پورا پورا موقع دیتی ہے کہ وہ گناہوں سے تائب ہو جائے لیکن بھول جاتے ہیں۔ ناپید ہو جاتے ہیں..... اللہ کے قانون سے رخ بدل لیتے ہیں اور پھر دردناک عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں۔ راگ علی ساند ابھی بد اعمالیوں کے اس گرداب میں ڈوب گیا تھا، دولت کے انبار تھے اس کے ارد گرد، ہر چیز کو خرید لینے پر یقین رکھتا تھا..... انسانوں کو فنا کرنے میں اسے کوئی عار نہیں تھی، احمق یہ نہیں جانتا تھا کہ زندگی اور موت کا مالک اللہ ہی ہے۔ اپنے سرگناہ اور الزام تو لے سکتا ہے انسان لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ وہ شکار ہو جاتا ہے، اپنی غلط کاریوں کا اور جہنم کا عذاب خرید لیتا ہے۔ اگر سنبھل جائے تو خوش بختی ورنہ عذاب ہی عذاب، کیا ملا تھا راگ علی ساند کو..... ایک بیٹا بدکاری کا شکار ہوا اور فنا کے گھاٹ اتر گیا، اس کے جواب میں راگ علی ساند کے دل میں بجائے اس کے کہ گداز پیدا ہوتا، اس نے بستی مہر جان میں غلام شاہ کے خاندان کو تباہ کر دیا..... بات یہیں پر ختم نہ ہوئی بجائے اس کے کہ وہ بعد میں اپنے بیٹوں کی نیک تربیت کرتا، سب کو برائیوں کے گڑھے میں دھکیلتا رہا۔ یہ احساس دلا کر کہ اس کی دولت کی برتری اس کا کچھ نہیں بگڑنے دے گی، حالانکہ جو بگڑنا تھا وہ بگڑ چکا تھا، اتنا بگڑ چکا تھا کہ سنبھالنا مشکل ہو جائے، سو یہی ہوا..... آخر کار نور علی ساند ابھی ایک ہولناک حادثے کا شکار ہو گیا اور اس پر بھی راگ علی ساند کی آنکھیں نہ کھلیں..... اس نے اپنی برائیوں کا وہی معیار قائم رکھا اور ہاشم علی ساند کو در بدر کر دیا، لیکن آخر کار وہ تمام قوتیں اس کے خلاف کھڑی ہو گئیں جو برائیوں کو ختم کرتی ہیں اور اب اس کے برے دنوں کا آغاز ہو گیا۔ آصف علی ساند، رانا محفوظ کے ساتھ چل پڑا تھا، صاحب اثر لوگ تھے، ڈی آئی جی نادر حیات تک

”اپنے الفاظ کی نفی مناسب نہیں ہوتی رانا محفوظ آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بلور کرایا تھا کہ آپ مجھے ایک نیک، شریف اور ایماندار افسر سمجھتے ہیں اور اب چند لمحوں

”واقعہ کچھ پیچھے لے جانا چاہتا ہوں اس وقت جب بہتی مہر جان کے بدر شاہ نے راگ علی ساند ا کے ایک بیٹے کو قتل کر دیا تھا، حقیقت یہی تھی کہ راگ علی ساند ا کے بیٹے نے خادم شاہ کی بیٹی اور بدر شاہ کی بہن کو بے آبرو کر دیا تھا اور راز کھل جانے کے خوف سے اسے قتل کر دیا تھا..... یہاں غلطی بدر شاہ سے ہوئی تھی کہ اس نے قانون کا سہارا لینے کی بجائے راگ علی ساند ا کے بیٹے کو قتل کر دیا..... یہ ایک انتقامی جذبہ تھا لیکن بہر طور غیر قانونی حرکت تھی لیکن راگ علی ساند ا نے اس کے جواب میں تمام تر قانونی اہمیتوں کو نظر انداز کر کے بہتی مہر جان پر حملہ کر لیا اور خادم شاہ اور اس کے بیٹے بدر شاہ اور دیگر تمام اہل خاندان کو قتل کر دیا..... یہ واقعہ در حقیقت بہت سے لوگوں کے علم میں تھا لیکن کون ایسا تھا جو اس کی نشاندہی کر کے ساند ا خاندان کی دشمنی مول لیتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے کچھ لڑکوں کو جو ساند ا خاندان کے دباؤ میں تھے ڈاکوؤں کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور انتہائی معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں ڈی آئی جی صاحب کہ قانون نے انہیں بخوشی مجرم تسلیم کر کے انہیں سزائیں دے دیں اور راگ علی ساند ا خاندان پھر سے محفوظ ہو گیا۔ جرم کرنے والے اگر قانون کا سہارا پالیں تو ان کے حوصلے بہت بلند ہو جاتے ہیں اور دنیا میں رہنے والوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کاش ان کی اہمیت سے قانون ساز ادارے نظر نہ چرائیں، راگ علی ساند ا اور اس کے دونوں بدکار بیٹے ہر وہ عمل کرنے لگے جس میں انہیں لذت حاصل ہو اور انہوں نے اپنے گناہوں کا دائرہ بے حد وسیع کر لیا..... بہت سے ایسے واقعات ہوئے جن میں بیٹیوں کی آبروریزی کی گئی۔ لوگوں کو ان کی زمینوں اور جائیدادوں سے محروم کیا گیا جیسے ہم لوگ۔ ہماری زمینیں چالاکی سے ہتھیالی گئیں اور اس کے بعد ہمیں گھروں سے نکال دیا گیا اور اب ہم نہایت بے کسی کے عالم میں ایک معمولی سے گھر میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔ راگ علی ساند ا سمجھتا ہے قانون اس کے ہاتھ میں کھلونا ہے حالانکہ قدرت اسے سزائیں دیتی

انفراد کے تش کی نشاندہی کرتے ہوئے وہ باقی تفصیل بھی درج کرائی تھی جو نور علی ساند ا کے سلسلے میں تھی اور جس کے نتیجے میں نور علی ساند اشہر کے ہسپتال میں داخل تھا۔
ڈی آئی جی صاحب نے درخواستیں پڑھیں اور ان پر ان لوگوں کے دستخط کرائے، پھر اعجاز خان سے کہا۔

”تمہارے ساتھ اور بھی کچھ افراد ہیں میرا مطلب ہے تمہارے بیوی بچے وغیرہ۔“
”جی صرف میری بیوی ہے میرا بچہ کوئی نہیں ہے۔“
”اگر تم چاہو تو اپنی بیوی کو بھی یہاں بلا سکتے ہو۔ میں تمہارے قیام کے لئے اپنی کوٹھی کے ایک کوارٹر میں بند و بست کر دوں گا۔ وہ ایک محفوظ جگہ ہوگی۔“
”جیسا رانا صاحب پسند کریں؟“

”نہیں ڈی آئی جی صاحب کا کہنا بالکل درست ہے۔ ہم بہت سی ذمہ داریاں قانون کے حوالے کر کے مزید بہتر کارروائی کر سکتے ہیں..... میں رقیہ کو تمہارے پاس پہنچا دوں گا۔“ رانا محفوظ نے کہا۔

ڈی آئی جی نادر حیات صاحب نے جس طرح ان لوگوں سے تعاون کیا تھا وہ ایک اعلیٰ ترین مثال تھی اور یہ لوگ اس سے بہت مطمئن ہوئے تھے۔ انہیں مکمل تحفظ دیا گیا تھا اور ڈی آئی جی صاحب نے پوری پوری دلچسپی لی تھی۔ اعجاز خان کو انہوں نے وہیں آفس میں بٹھالیا تھا..... بہر حال تمام ترامینان کے بعد رانا محفوظ، آصف علی ساند اور زرینہ باہر نکل آئے۔ آصف علی ساند انے کہا۔

”میرا خیال ہے ہم نے نہایت موثر قدم اٹھایا ہے اور خوش قسمتی سے ہمارا واسطہ ایک بالکل صحیح آدمی سے پڑا ہے۔ ڈی آئی جی نادر حیات قول و عمل کے سچے انسان لگتے ہیں۔ اب ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔“ رانا محفوظ نے کہا۔

”لیکن میں تمہارے لئے فکر مند ہوں آصف علی، اگر میں تمہیں اپنے ساتھ یہاں منتقل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو کم از کم مجھے اطمینان ہو جائے گا۔“

”بتاؤ میرے دوست مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”آؤ پہلے میں تمہیں وہ جگہ دکھا دوں جہاں تمہیں منتقل ہونا ہے۔ یہ میرے ایک دوست کا مکان ہے..... میرا دوست یورپ میں رہتا ہے..... مکان میں صرف دو تین ملازم

کے اندر اندر آپ نے اس خدشے کا اظہار کر کے میزری حیثیت کو گرانے کی کوشش کیوں کی ہے؟“

”بخدا یہ بات نہیں ہے ہم تو زندگی دینے کے لئے تیار ہیں، اگر زندگی کا کوئی صحیح مصرف ہو جائے۔“

”مطمئن رہیں..... تمام تر قانونی تحفظات کے ساتھ آپ کی رپورٹ درج کی جا رہی ہے اور میں آپ سب کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔“

”انتہائی شکریہ، ہم اس امید اور اس یقین کے ساتھ آپ کے پاس آئے ہیں۔“
”آپ لوگوں کا قیام کہاں ہے؟“

”فی الحال کہیں نہیں، لیکن ہمیں یہاں سے اس رپورٹ کی تشکیل کے بعد واپس جانا ہوگا۔“

”رانا محفوظ آپ کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، یہ بات نہیں سوچی جاسکتی کہ آپ راگ علی ساند ا کے خلاف کوئی کارروائی کر رہے ہیں لیکن جب یہاں سے کسی کارروائی کا آغاز ہوگا تو راگ علی ساند ابھی سمجھے گا کہ ہاشم نے کوئی کارروائی کی ہے..... اس لئے مسٹر آصف علی ساند امیری ہدایت ہے کہ آپ لوگ فوراً اپنے اہل خانہ کے ساتھ شہر منتقل ہو جائیں اور اس طرح روپوش رہیں کہ کسی کو علم نہ ہونے پائے، یہ کام آپ یہاں سے اٹھنے کے چند گھنٹوں کے بعد کر لیجئے گا اور اس سلسلے میں میری ہر امداد آپ کے لئے حاضر ہے، میں آپ کی رہائش کا بند و بست کر سکتا ہوں اور آپ کو پولیس کا پہرہ بھی دے سکتا ہوں۔“

رانا محفوظ نے مداخلت کی اجازت چاہتے ہوئے کہا۔

”یہاں شہر میں، میں ان لوگوں کی رہائش کا بند و بست کر سکتا ہوں، بس آپ ہمیں پولیس کی نفری دے دیجئے گا جو ان کا تحفظ کر سکے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں متعلقہ افراد کو آپ کے حوالے کر دوں گا، وہ اس سلسلے میں آپ کی پوری پوری مدد کریں گے۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔“

متعلقہ شخص یہ پوائنٹس لے کر چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد وہ درخواست تیار ہو کر آگئی جو آصف علی ساند اور زرینہ کی طرف سے تھی اور اس میں وہ تمام الزامات درج کئے گئے تھے، پھر ایک درخواست اعجاز خان کی طرف سے بھی درج کی گئی جس میں اس نے ان پانچ

ہوتے ہیں اور ہر طرح سے تمہارے لئے قابل قبول ہوگا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہاشم علی سائند صاحب اور والدہ صاحبہ کو یہاں تک کس طرح لایا جاسکتا ہے؟“

”نہیں میرا خیال ہے والد صاحب اس قدر بد دل ہو گئے ہیں، اپنے بھائی سے کہ اب وہ کسی بھی مسئلے میں بولیں گے نہیں۔“

”تو پھر آؤ پہلے وہ مکان دیکھ لو۔“

”رانا محفوظ ہمیں مکان نہ دکھاؤ، اگر اس بات کا یقین ہے تمہیں کہ ہم باآسانی اس میں منتقل ہو جائیں گے اور مکان ملنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی تو آؤ پہلے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کو لے آتے ہیں۔“

”ساراسامان وہیں چھوڑ دو، مکان ہر حالت میں مکمل ہے، یہاں باقی تمام انتظامات بھی ہو جائیں گے۔ بس ان لوگوں کو تیار کرنا ہے۔“

”تو پھر چلو۔ اللہ کا نام لے کر چلتے ہیں اور خاموشی سے ان لوگوں کو کچھ کہہ سن کر نکال لائیں گے۔ تفصیل بتانا ضروری نہیں ہے۔“

”میرا خیال ہے ہم اس میں کامیاب ہو جائیں گے۔“
شہاب ثاقب نے کہا۔

ڈی آئی جی نادر حیات نے شہاب کو اپنی کوٹھی پر طلب کر لیا اور شہاب تھوڑی دیر کے بعد وہاں پہنچ گیا۔ ڈی آئی جی نادر حیات صاحب نے مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا تھا، پھر انہوں نے کہا۔

”ہاں بھی شہاب ثاقب صاحب آپ کا راگ علی سانداب کس حال میں ہے؟“

”سرشدید کرب و اذیت کے عالم میں ہے اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہے۔ اصل میں جب جرم کی رسی کھینچتی ہے تو چاروں طرف سے اس طرح کھینچتی ہے کہ انسان کی ساری صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔“

”یہ درخواستیں پڑھو۔“ ڈی آئی جی صاحب نے درخواستوں کی فوٹو اسٹیٹ جو ایک فائل میں لگی ہوئی تھیں، شہاب کے سامنے رکھ دیں اور شہاب انہیں پڑھنے لگا۔ دونوں درخواستیں بڑھ کر اس نے دلچسپی سے آنکھیں گھمائیں اور بولا۔

”یہ ایک نیا رخ ہے جناب اور میں سمجھتا ہوں بے حد موثر۔ خاص طور سے اعجاز خان

”بہت بڑا کیس ہے، بڑی شہرت کا حامل ہو گا۔ واسطی صاحب آپ اپنے کو اس کے تیار کر لیجئے گا۔“ واسطی صاحب ہنسنے لگے تھے، پھر انہوں نے کہا۔
”کبھی کبھی تو تمہاری باتوں پر شرمندہ ہو جاتا ہوں..... میں۔“
”کیوں؟“

”بھئی بڑی معمولی سی شخصیت تھی میری اور اب، اب تم اسے جہاں چاہو پہنچا دو، میں

نہور کریں گی۔“

”دوسرا لفظ میں یہی کہنا چاہتی تھی کہ مجھے یہاں نہیں بلکہ کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا جائے جہاں میں اپنے آپ کو محفوظ کر سکوں۔“

”اس کی ذمہ داری ہم قبول کرتے ہیں۔“

”تو پھر تمہاری ہدایت پر چلنا میں قبول کرتی ہوں۔“ گوہر جہاں نے کہا۔ درخواست پر دستخط وغیرہ کر لئے گئے، دونوں بچوں کو ساتھ لیا گیا اور ہنگامی بنیاد پر ایک بار پھر ڈی آئی جی صاحب سے ملاقات کی گئی جہاں گوہر جہاں کی درخواست ان کے وکیل عدنان واسطی کے ذریعے ڈی آئی جی صاحب کو پیش کی گئی، اس کے بعد شہاب نے کچھ ذمہ داریاں اپنے پردیس اور ان لوگوں کو کریم سوسائٹی کی کونٹری میں پہنچا کر جوہر خان کو ہدایت کی گئی کہ ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا جائے اور انہیں ہر طرح کا تحفظ مہیا کیا جائے، گوہر جہاں بھی یہاں آکر مطمئن ہوئی تھی، کام کا آغاز ہوا تھا تو راگ علی ساند اکو وقت دینا مناسب نہیں تھا۔ ڈی آئی جی صاحب کی طرف سے احکامات جاری کئے گئے۔ پولیس کی ایک بہت بڑی پارٹی تیار کی گئی اور رات کو چار بجے راگ علی ساند اس اچانک آسمانی آفت سے بری طرح بدحواس ہو گیا تھا، ویسے بھی ان دونوں اس پر خوف اور دہشت کا حملہ رہتا تھا۔ ایک بیٹے کی زندگی کھو چکا تھا، دوسرا بیٹا اس سے زیادہ بدتر حالت میں تھا۔ تیسرا بیٹا اس کے ساتھ گرفتار ہو گیا تھا۔ افسر گرفتاری شہاب ثاقب تھا۔ راگ علی ساند نے خونی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ وارنٹ ڈی آئی جی نادر حیات نے ایشو کیا ہے۔ میں اس کی نقل چاہتا ہوں اور تمہیں فوری طور پر پولیس ہیڈ آفس پہنچنے کے بعد مجھے کچھ سہولتیں مہیا کرنی ہوں گی۔“

”آپ ان سہولتوں کی تفصیل ہمیں بتا دیجئے ساند صاحب۔“

”مجھے چند کیلوں سے رجوع کرنا ہوگا۔“

”اس کا فیصلہ ڈی آئی جی صاحب کریں گے کہ آپ کو ان وکیلوں سے رجوع کرنے کے لئے کتنا انتظار کرنا ہوگا۔“

”دیکھو ایک بات میں تمہیں بتا دوں، تمہارا قانون میری چٹکیوں میں ہے، وقتی طور پر اُریہ کو شش کر ڈالی گئی ہے اور اس میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل کر لی گئی ہے تو اسے دائمی

ص کیا کہہ سکتا ہوں۔“

پھر کافی دیر تک یہ لوگ گوہر جہاں کی طرف سے ایف آئی آر کی رپورٹ بناتے رہے تھے اور جب یہ تمام کام مکمل ہو گیا تو شہاب نے پینا سے درخواست کی کہ وہ اس کے ساتھ گوہر جہاں کے گھر چلے، اس وقت عدنان واسطی صاحب کو بھی ساتھ لے جانا مناسب تھا، کیونکہ اس سے گوہر جہاں پر اچھے اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔ چنانچہ واسطی صاحب بھی تیار ہو گئے اور اس کے بعد یہ تینوں مہم جو اپنی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔

انجم اور فہیم نے معمول کے مطابق سب سے پہلے ان سب سے ملاقات کی تھی اور انہیں پہچان لیا تھا۔ گوہر جہاں بہت متاثر تھیں ان سے، چنانچہ انہوں نے فوراً ہی ان سے ملاقات کی، دعائیں دیں اور شہاب نے واسطی صاحب کا تعارف کرایا۔

”یہ آپ کے وکیل ہیں؟“ گوہر جہاں نے نگاہیں اٹھا کر عدنان واسطی کو دیکھا اور بولی۔

”میرا وکیل تو خدا ہے، میں نے سب کچھ اسی کو سونپ دیا ہے، وہی میرا انصاف کرے گا۔“

”بے شک خاتون گوہر جہاں، لیکن کوئی نہ کوئی ذریعہ تو ضروری ہوتا ہے نا، اب ہم آپ کی طرف سے راگ علی ساند کے خلاف ایف آئی آر درج کر رہے ہیں۔“ گوہر جہاں نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولی۔

”اور جب اس ایف آئی آر کا علم راگ علی ساند کو ہوگا تو وہ یہاں ایک فوج بھیجے گا جو مجھے اور ان بچوں کو قتل کر دے گی۔“

”نہیں خاتون گوہر جہاں یہ ممکن نہیں ہے، آپ کو فوری طور پر تحفظ مہیا کیا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ اطلاع بھی دی جاتی ہے کہ آپ کی طرف سے ایف آئی آر درج ہونے کے تھوڑی ہی دیر کے اندر اندر راگ علی ساند اور ان لوگوں کو گرفتار کر لیا جائے گا جو اس کے دست راست ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن وقت سے کچھ ایسا خوف محسوس ہوتا ہے مجھے کہ جب تک اپنے آپ کو مطمئن نہ پالوں، کچھ سکون نصیب نہیں ہوتا۔“

”یہ ایف آئی آر آپ کی طرف سے درج کرالی گئی ہے، آپ کو متعلقہ افسر کے سامنے پیش ہونا ہوگا اور پھر ہم آپ کو ایک ایسی جگہ پہنچا دیں گے جہاں آپ خود اپنے آپ کو محفوظ

کامیابی نہ سمجھنا کیونکہ بعد میں شدید نقصانات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔“

”بہت بہتر جناب، ہم آپ کی ہدایت پر پورا پورا عمل کریں گے۔“

”ٹھیک ہے، اگر میری ہدایت پر عمل کرو گے تو اس کا صلہ بھی پالوئے، میں بہت صاحب اثر ہوں، ہو سکتا ہے تم مجھے نہ جانتے ہو آفسر لیکن بہت جلد تمہیں میری حقیقتوں کا ادراک ہو جائے گا۔“ شہاب نے نیاز مندی سے گردن جھکادی تھی اور اس کے بعد ان تمام افراد کو ہیڈ کوارٹر میں لا کر ایک انتہائی محفوظ لاک اپ میں بند کر دیا گیا تھا اور سنٹریوں کو وہاں سے ہٹالیا گیا تھا، انہیں ہدایت کر دی گئی تھی کہ جب تک افسر اعلیٰ کی جانب سے کوئی ہدایت نہ ملے اس لاک اپ کے پاس کوئی نہ جائے، اندر موجود لوگ اگر چیختے چلاتے ہیں تو ان پر کوئی توجہ نہ دی جائے اور اس کے بعد شہاب اس کام سے فارغ ہو کر مسکراتا ہوا واپس آ گیا تھا۔

ڈی آئی جی نادر حیات صاحب نے ایسا طریقہ کار اختیار کیا تھا کہ اس کیس کی تکمیل میں کوئی بڑی دقت نہ ہو اور اس کا فیصلہ بھی جلد از جلد سنایا جائے، چنانچہ چوبیس گھنٹے کے بعد راگ علی ساند کو ٹیلی فون کی سہولت فراہم کی گئی اور دوسرے لاک اپ میں منتقل کر دیا گیا، اس کے ساتھ ساتھ ہی اس ہسپتال کے گرد بھی پولیس پھیلا دی گئی تھی جس میں نور علی ساند داخل تھا اور ہدایت کر دی گئی تھی کہ اس مریض کو خصوصی نگرانی میں رکھا جائے۔ راگ علی ساند انے اپنے وکیلوں کو طلب کر لیا تھا، جنہیں اس سے ملاقات کی سہولت فراہم کی گئی اور اس کے بعد کیس کی تیاریاں شروع ہو گئیں..... عدنان واسطی صاحب بہت ذہانت کے ساتھ شہاب اور بینا کی مدد سے اس کیس کے پوائنٹس تیار کر رہے تھے۔ غرضیکہ کیس عدالت میں پہنچ گیا اور اس کے بعد اس کی کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ عدالت کو تمام شواہد مہیا کئے گئے اور خصوصی درخواست کی گئی کہ چونکہ کچھ بے گناہ نوجوان صرف ایک دولت مند شخص کے دباؤ میں آکر بلیک میل ہوئے اور طویل عرصے سے ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہے ہیں، اس لئے ان کی گلو خلاصی کے احساس کو مد نگاہ رکھا جائے اور اس کیس کی سماعت جلد از جلد ختم کی جائے۔ گواہوں کی اتنی بڑی فہرست تھی کہ راگ علی ساند کے وکیل بوکھلا گئے تھے، اعجاز خاں کے ذریعے ان تمام لاشوں کو برآمد کر لیا گیا، جنہیں پیار علی ساند نے زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔ وہ آڈیو کیسٹ بڑے کارآمد ثابت ہوئے تھے جو زینہ نے ان لوگوں کو فراہم کئے تھے، ایک کے بعد دوسرا ثبوت ایسا آ رہا تھا کہ راگ علی ساند کے وکیل پسینہ پسینہ

- دئے جا رہے تھے، حالانکہ بڑی بڑی رقومات انہیں دی گئی تھیں، لیکن حالات ایسے تھے کہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ راگ علی ساند کو احتیاط کے ساتھ لوگوں سے ملنے کی اجازت نہ دی جا رہی تھی۔ خاتون گوہر جہاں کا سخت تحفظ کیا جا رہا تھا، پھر جب خاتون گوہر جہاں کی واپسی عدالت میں ہوئی تو کون تھا جو انگبار نہیں تھا..... ایک مظلوم عورت اپنی مظلومیت کی داستان سنا رہی تھی، سماعتیں بہت مختصر وقفے کے لئے ملتوی ہوئیں اور اس کے بعد بہت جلد ان کا آغاز ہو جاتا، چنانچہ انتہائی مختصر وقت میں اس کیس کی سماعت مکمل ہو گئی۔ راگ علی ساند، پیار علی ساند اور نور علی ساند کو سزائے موت سنائی گئی تھی اور بظاہر یہ مسئلہ ختم ہو گیا تھا۔ ڈی آئی جی نادر حیات نے صرف اپنا فرض پورا کیا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ جرم کرنے والے کسی بھی شخص سے ان کی ذاتی دشمنی نہیں ہے لیکن جو لوگ قانون کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں، صرف انہی کے خلاف کمر کس کر میدان میں آئے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے اس کیس کو ناکام قرار نہیں دینا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں جس قدر کارروائی ممکن ہو سکتی تھی کر رہے تھے۔ راگ علی ساند کے وکیلوں کا پینل اب بھی کام کر رہا تھا اور انہیں سزائے موت سے بچانے میں کوشاں تھا۔ خانم گوہر جہاں اور اس کے دونوں پوتوں کو ان کی جائیدادیں واپس دلوائی گئیں، ان چاروں لڑکوں کو بھی رہا کر دیا گیا۔ خاص طور سے مولوی ارشاد اور ان کی بہن عائشہ دان کا بیٹا..... بھانجا اور بیٹا واپس ملا تو ایسے ایسے رقت آمیز منظر دیکھنے میں آئے کہ بڑے بڑوں کے دل کانپ اٹھیں، لیکن بہر طور حق بہ حق دار رسیدہ ہوا تھا اور شہاب ثاقب کی زندگی کا یہی مشن تھا، پھر وہ رقم جو پیار علی ساند اوغیرہ سے حاصل ہوئی تھی، مناسب حساب سے تمام لوگوں میں تقسیم کر دی گئی۔ عدنان واسطی نے اپنے حصے کی رقم وصول کرتے ہوئے کہا۔

”بھئی شہاب! باقی تو تم جو کچھ کر رہے ہو میں اس سے پورا پورا اتفاق کرتا ہوں، لیکن یہ دولت کا چرچا جو تم نے ہم لوگوں کو لگا دیا ہے یہ بہت برا ہے، اب ہمارا بھی دل نجانے کیا کیا چاہنے لگا ہے۔“ شہاب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”واسطی صاحب، معاشرہ اس قدر بگڑا ہوا ہے کہ اگر آپ اس میں اپنی زندگی اور اپنا مقام چاہتے ہیں تو آپ کو اپنے اطراف میں ادھر ادھر بھی دیکھنا ہوگا، لیکن میں آپ کو یہ نصیحت دیتا ہوں کہ جب بھی آپ کو یہ احساس ہو کہ میں نے غلط جگہ اور غلط طریقے سے

جئے بھی نکلیں تو لوگ ان کی شکل و صورت دیکھ کر لعنت ملامت کریں لیکن سر وہ اس قدر سخت ہوتے ہیں کہ اگر ان کی امداد نہ کی جائے تو خود کشی کے سوا ان کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ ہم نے اپنی حاصل شدہ رقومات سے ایک فنڈ جاری کیا ہے۔ مس بینا آپ واسطی صاحب کو اس بارے میں بتائیے؟“

”ہوں، ڈیڈی ہم ایسے لوگوں کو فوری امداد مہیا کرتے ہیں جو کسی مشکل سے نکلے ہوں، نہ ان کے خلاف ہو، کوئی انہیں کچھ دینے پر آمادہ نہ ہو..... وہ مجبور ہو کر وہی کام کریں یا تو ایک بار پھر جرم کی زندگی میں داخل ہو جائیں، یہ سوچ کر کہ اب دنیا انہیں صرف ایک مجرم کی حیثیت سے ہی دیکھ سکتی ہے اور ان کا اور کوئی پرسان حال نہیں ہو گیا پھر وہ حالات سے بے خبر خود کشی کر لیں۔ ہم انہیں مالی امداد فراہم کرتے ہیں۔“

”سبحان اللہ..... کیا واقعی۔“ عدنان واسطی نے جھوٹے ہوئے کہا۔

”جی ڈیڈی یہ سچ ہے۔“

”تب پھر میں کچھ نہیں کہوں گا، مگر بینا یہ ہمارے بینک بیلنس میں اتنا اضافہ کیوں ہوا ہے؟“ واسطی صاحب نے کڑی نگاہوں سے بینا کو دیکھتے ہوئے کہا اور بینا مسکرا دی۔

”نہیں ڈیڈی بالکل نہیں..... آپ برا سمجھتے ہیں مجھے۔“

”مجھے میرے سوال کا جواب چاہئے۔“

”ڈیڈی اس رقم کو میرا حصہ کہہ کر دیا گیا ہے لیکن میرا حصہ کتنا ہے میں جانتی ہوں..... باقی سب ایک امانت ہے جو ضرورت پڑنے پر حقداروں کو پہنچ جائے گی۔“

”خدا کی قسم مجھے اطمینان ہو گیا۔“ واسطی صاحب متاثر لہجے میں بولے اور پھر نجانے کیوں انہوں نے عجیب سی نگاہوں سے شہاب کو دیکھا..... چند لمحات دیکھتے رہے پھر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے۔

کریم سوسائٹی میں ایک نشست کے دوران شہاب نے بینا سے کہا۔

”بینا اس دن واسطی صاحب جب ہم سے احتساب کر رہے تھے تو مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھی۔“

”تو پھر.....“ بینا نے تعجب سے شہاب کو دیکھا۔

”کیا اس قسم کی ٹھنڈی سانسوں کے بارے میں تمہیں کچھ معلومات حاصل ہیں۔“

دولت وصول کی ہے تو آپ مجھے روک دیجئے گا، میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ عدنان واسطی مسکرانے لگے تھے۔

محکمے کے لوگوں کو بہت جلد احساس ہو گیا تھا کہ شہاب ثاقب نادر حیات کی ناک کا بل بن گیا ہے۔ پے در پے ایسے کچھ واقعات ہوئے تھے جن میں شہاب نے کسی کیس میں ہاتھ ڈالا تھا اور نادر حیات نے اس سے پورا تعاون کیا تھا۔ اس شام عدنان واسطی کے گھر پر چائے کی نشست میں یہی موضوع زیر بحث آگیا۔

”ہم دونوں اکثر تمہارے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔“ واسطی صاحب نے کہا۔

”مجھے آپ کی محبت پر پورا اعتماد ہے۔“

”بینا اور میں ایک اہم بات پر غور کرتے ہوئے اس پر متفق ہو گئے ہیں اور آج دوپہر کی بحث میں ہم نے ایک بات طے کی تھی جواب تمہیں بتانا چاہتے ہیں۔“

”ارشاد! شہاب مسکرا کر بولا۔

”شہاب! اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اس دوران تم نے خاصی دولت کمائی ہے۔ مجھے بینا کے بینک بیلنس سے یہ اندازہ ہوتا ہے۔“

”جی ہاں ہمارے پورے گھرانے کے مالی حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔“ شہاب نے جواب دیا۔

”شہاب بہت زیادہ دولت مشکل نہیں بن جاتی۔ عدنان واسطی نے مسکراتے ہوئے کہا۔“

”سر..... اصل میں زیادہ دولت اس وقت مشکل بنتی ہے جب اسے تجویروں میں سمجھایا جائے اور ان تجویروں کو کھول کر نہ دیکھا جائے، بینا آپ کو بتا سکتی ہیں کہ ہم حاصل شدہ دولت تجویروں میں سجا کر نہیں رکھ رہے بلکہ مسلسل اس کے مناسب استعمال کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں، سر ویسے تو بڑے یتیم خانے، رفاہی ادارے اور ایسی نجانے کیا کیا چیزیں کھلی ہوئی ہیں جن میں رفاہی کام ہوتے ہیں، بیواؤں کو سلائی مشینیں اور مالی امداد فراہم کی جاتی ہیں۔ زکوٰۃ کی تقسیم کے ادارے کھل گئے ہیں اور وہاں سے غربا کی مدد ہوتی ہے، لیکن واسطی صاحب لا تعداد افراد وہ ہوتے ہیں جو حقیقی مشکل کا شکار ہوتے ہیں لیکن وہ خود کو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لئے تیار نہیں رکھ سکتے۔ ہمارے سامنے ایسے چند افراد آئے ہیں جن میں ایسے لوگ نگاہوں میں آتے ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ وہ اگر بھیک

ابن اب یوں لگتا ہے کہ جس سے بھی شادی کریں گے وہ ایک مظلوم لڑکی ہوگی۔“
شہاب اور بیٹا نے چونک کر جوہر خان کو دیکھا، بڑی عجیب بات کہہ رہا تھا اور بڑی
نبوس ناک بھی۔ دونوں ہی اس کی اس بات سے متاثر ہوئے تھے، شہاب کہنے لگا۔
”نہیں جوہر خان طریقہ کار الگ الگ ہوتے ہیں پہلے تم پر کچھ منحوس سائے پڑ گئے تھے
اور ان سایوں نے تم سے تمہاری شخصیت چھین لی تھی۔ جوہر خان اکثر بیٹا سے میری بات
بوتی ہے تمہارے بارے میں اور میں بڑی مسرت سے اس سے کہتا ہوں کہ بیٹا انسان کھوجاتا
ہے۔ غلط راستوں سے چلنے والی ہوائیں اسے خود میں لپیٹ لیتی ہیں۔ وہ خود اپنے آپ کو نہیں
سمجھ پاتا، حالانکہ کچھ ہوتا ہے کچھ بن جاتا ہے۔ ہمارا جوہر خان بھی انہی میں سے ایک ہے
برے لوگوں میں پھنس گیا تھا لیکن اس کے اندر چھپی ہوئی وفا اس بات کا اظہار تھی کہ اگر وہ
اچھے لوگوں میں شامل ہو تا تب بھی اتنا ہی اچھا ہوتا جتنا برے لوگوں کے لئے رہا، یہ تو راستے
جک جاتے ہیں جوہر خان، اور وہ تقدیر والے ہوتے ہیں جو بھٹکے ہوئے راستوں سے واپس
آجائیں۔ ارے واہ بیٹا کیا دلچسپ مشغلہ ہاتھ آیا ہے تم ذرا دیکھو جوہر خان کو کیا یہ اس قابل
نہیں ہے کہ ہم اس کی شادی کریں، کریم سوسائٹی کی یہ کوٹھی بھی آباد ہو جائے گی، جوہر
خان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہے گا۔“
”صاحب آج آپ کا موڈ بہت اچھا ہے..... مجھے آپ کے اچھے موڈ پر بہت خوشی
ہو رہی ہے، لیکن سر میں کہہ رہا تھا کہ اگر ہم پیچھے اجاڑ پڑے ہوئے حصے کو درختوں سے
تلاشیں تو کیسا رہے گا یہ کام میں کر لوں گا..... آپ بالکل بے فکر ہیں۔“
”اور اگر ہم اس سامنے والے حصے کو کچھ انسانوں سے سجادیں تو کیسا رہے گا؟“
”کون سے حصے کو صاحب؟“ جوہر خان بولا۔
”یہ جو گیٹ کے برابر سرونٹ کوارٹرز پڑے ہوئے ہیں۔ اگر اس میں ایک ہماری
بیٹری سی بھائی آجائے اور کچھ عرصے کے بعد بھتیجے تو کیا اس میں کوئی حرج ہے۔“
”اچھا لگ رہا ہے صاحب، یہ سب کچھ اچھا لگ رہا ہے۔ کم از کم آپ ہمیں اس قابل
سمجھ رہے ہیں کہ ہم سے مذاق کریں۔“ جوہر خان نے کہا۔
”کیوں بیٹا زندگی کا یہ اہم شعبہ مذاق ہو سکتا ہے تمہاری اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟“
”نہیں یہ بالکل مذاق نہیں ہے۔“

”اطمینان کی ٹھنڈی سانس ہوتی ہے۔“
”نہیں بیٹا اطمینان کی سانس گرم ہوتی ہے۔“
”کیا میں آپ کے تجربے کو چیلنج کروں؟“
”نہ کرو تو اچھا ہے۔“
”تو پھر آپ وضاحت کریں گے اس سانس کی؟“
”اس سانس میں ایک سوال ہوتا ہے ایک طلب ہوتی ہے۔ بیٹا میری طرف سے اس
سانس اس طلب کا جواب دے دینا۔ بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ بیٹا ایک لمحے کے لئے
خاموش ہو گئی۔ وہ شہاب کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، جہی تو اس کے کان کی
لوٹیں سرخ ہو گئیں، لیکن شہاب کی شریر فطرت سے اچھی طرح واقف تھی خود کو سنبھال
کر کہا۔
”کیا جواب دے دوں؟“
”یہی کہ ان ٹھنڈی سانسوں کو صرف ایک تصور نہ بنائیں..... حقیقت کی طرف قدم
بڑھانے کی کوشش کریں۔“
”آپ اچھی ہوئی گفتگو کر رہے ہیں۔“
”سیانوں کا کہنا ہے کہ ہر حالت میں احتیاط قائم رکھی جائے۔“
”بھئی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا شہاب صاحب۔“
”بس تو پھر یہی کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ ہم نے بکا ہے جنون میں نہیں بکا ہے بلکہ عالم
ہوش میں ہیں اور خدا کرے جس کے لئے بکا جا رہا ہے وہ سب کچھ سمجھ جائے۔“ جوہر خان کی
آمد نے بیٹا کو مشکل سے نکال لیا تھا۔ جوہر خان قریب آ کر بولا۔
”صاحب کوئی کام دیں مجھے..... اب یہ بے کاری تکلیف دینے لگی۔“
”جوہر خان شادی کر لو۔“ شہاب نے کہا اور جوہر خان منہ پھاڑ کر حیرت سے اسے
دیکھنے لگا۔
”صاحب میں نے کوئی کام مانگا ہے۔“
”میں نے کام ہی بتایا ہے۔“ شہاب بولا اور جوہر خان مسکرانے لگا، پھر اس نے کہا۔
”کر لیتے صاحب ضرور کر لیتے، مگر زندگی نے ایسے بھیانک نجر بے سے دوچار کیا ہے

”تو پھر کہہ دو نا واسطی صاحب سے۔“ شہاب نے کہا اور بیٹا بوکھلا کر جو ہر خان کو دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ شہاب شرارتوں کے موڈ میں تھا، پھر اس کے بعد بیٹا جو ہر خان سے بات کر کے اس موضوع کو ختم کرنے کی کوشش کرنے لگی، جو ہر خان کچھ دیر کے بعد چلا گیا تو بیٹا نے کہا۔

”میرا مطلب ہے ڈی آئی جی نادر حیات صاحب ہمیں سکون سے تو نہیں بیٹھنے دیں گے۔ بہت جلد کوئی نہ کوئی ذمہ داری ہمارے سپرد کی جانے والی ہے۔۔۔۔۔ آپ دیکھ لیجئے گا۔“

”آہ کاش یہ ذمہ داری ڈی آئی جی نادر حیات صاحب کے بجائے جناب عدنان واسطی میرے سپرد کرتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔“ شہاب نے کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ان دنوں بڑی خاموش زندگی گزر رہی تھی۔ گھر کے حالات بھی پرسکون تھے۔۔۔۔۔ نغیرہ بیگم نے جیسے نیا چولا اوڑھ لیا تھا۔۔۔۔۔ ان کا بڑھاپا کھرتا چلا آ رہا تھا۔۔۔۔۔ واقع حسین اور فائق حسین بھی بڑے مسرور تھے، بہنوں کا معاملہ بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔۔۔۔۔ چھوٹی بہن کا رشتہ لگایا تھا بڑی بہن نے۔۔۔۔۔ اپنے ہی سرسالی خاندان میں، مشورہ بھی کیا تھا اور جب بات شہاب کے کانوں تک پہنچائی گئی تو اس نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

”بڑے بھائی موجود ہیں، بھلا میری رائے کی کیا گنجائش ہے، بڑے بھائی صاحب جو بھی طے کریں گے یہ سمجھ لیجئے کہ وہ میری ہی مرضی ہوگی۔“

”پھر شہاب سوچ لو۔“

”ثریا بھابی درحقیقت میرے سوچنے کی بات نہیں ہے، آپ جو بھی فیصلہ کریں گی آپ یقین کیجئے میں اس میں برابر کا شریک ہوں گا۔ ہاں ایک پیشکش میری طرف سے مستقل ہے۔“ شہاب نے کہا۔

”کیا؟“

”انخراجات کا ڈیپارٹمنٹ مجھے دے دیجئے اور باقی ساری ذمہ داریاں آپ سنبھال لیجئے۔“

”ٹھیک ہے بھئی، وہ مصروف بھی تو رہتا ہے ایسا کرو ثریا سارے معاملات پر غور کر لو۔۔۔۔۔ بہتر ہے ہم بہن کو یہیں سے رخصت کریں۔“

”یہیں سے کیا مطلب بھائی جان؟“ شہاب نے پوچھا۔

”بھئی پچھلے کچھ دنوں سے یہ لوگ بڑا دباؤ ڈال رہے ہیں مجھ پر کہتے ہیں رہائش کے لئے کوئی بہتر جگہ تلاش کروں، بھلا اتنے بڑے افسر کے گھر کی یہ پوزیشن، کیسے مناسب ہے، چنانچہ تلاش شروع کر دی ہے میں نے۔“

”مثلاً۔“ بیٹا نے مسکرا کر کہا۔

”نصف بہتر۔۔۔۔۔ کیا مطلب ہو اس بات کا؟“

بیٹا نے پھر گھبرا کر شہاب کو دیکھا۔

”نہیں واقعی آخر اس کی لغویت کیا ہے۔ مجھے سمجھانے کی کوشش کرو۔“

”پتا نہیں۔“

”تو پھر بن کر دکھاؤ۔“

”جی؟“

”بھئی نصف بہتر کا مطلب یہ ہے کہ آدھا بہتر۔۔۔۔۔ بہتری کے لئے جو بھی کیا جائے ہر مشکل میں کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اب کسی بھی کیس کے سلسلے میں آدھا بہتر میں ہوں آدمی بہتر تم ہو۔۔۔۔۔ دونوں مل کر مکمل بہتر ہو جاتے ہیں، چنانچہ کیا خیال ہے کیوں نہ ہم لوگ اپنی تکمیل کر لیں۔“

بیٹا گردن جھکا کر خاموش ہو گئی۔ شہاب نے کہا۔۔۔۔۔ ”ویسے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب دیکھو نا اتنا کوئی سمجھنے والا بھی تو ہو۔۔۔۔۔ تم نے فوراً سمجھ لیا کہ بے کاری میری ذہنی قوتوں کو خراب کرتی ہے، گھر کے حالات بھی ان دنوں نارمل ہیں۔۔۔۔۔ کوئی تبدیلی نہیں ہے، سب لوگ پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔“

”فکر نہ کریں یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔“

”بخدا۔۔۔۔۔“ شہاب نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

”جی۔“

”زندگی میں مختلف قسم کے طوفان ہوا کرتے ہیں۔ تمہارے یہ الفاظ مجھے خوشی میں

نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا تھا۔
”بیٹھو شہاب، کیسے حالات چل رہے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک سر۔“

”نہیں، تم نے شاید پچھلے دنوں اخبارات کی خبروں پر غور نہیں کیا۔“

”اوہ، کوئی خاص بات سر؟“

”ہاں بہت خاص بات، اعلیٰ پولیس افسروں کے تبادلوں اور رد و بدل کی کہانیاں عام تھیں۔“

”جی ہاں..... وہ تو میں نے دیکھا تھا۔“

”سوچا نہیں تھا۔“

”بس یہ سوچا تھا کہ یہ انتظامی رد و بدل ہے اور یہ ذمے دار لوگوں کا اپنا کام ہے۔“

”بہر حال تمہاری سوچ بھی اپنی جگہ درست تھی، لیکن معاملہ گہرائیوں سے اٹھا ہے۔“

”سمجھا نہیں سر۔“

”بہت مختصر وقت میں کچھ بڑے اور صاحب اثر لوگوں کے جرائم کے خلاف کارروائی ہوئی ہے نہ صرف معمولی کارروائی بلکہ انہیں کیفر کردار تک پہنچایا گیا ہے۔“

”جی۔“ شہاب آہستہ سے بولا۔

”اس کے اثرات تو مرتب ہونے چاہئیں تھے..... چنانچہ اور کیا ہوا اس کی تو کوئی خاص رپورٹ نہیں ہے لیکن میرا تبادلہ ایک اور علاقے میں کر دیا گیا ہے۔“

”جی؟“ شہاب اچھل پڑا۔

”اور تمہیں فوری طور پر تمہارے اس علاقے سے ہٹا کر ہیڈ آفس رپورٹ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے..... شاید کل تک تمہیں نوٹیفکیشن مل جائے۔“

شہاب چند لمحات خاموش رہا، پھر بولا۔ ”سر یہ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اپنی ذرا برابر پروا نہیں ہے..... میں ہر قسم کے حالات سے نمٹ لوں گا، لیکن آپ کے لئے میں افسردہ ہوں..... ذمے داری اور فرض شناسی کا یہ انعام۔“

”نہیں شہاب، یہی ایک دلچسپ پہلو ہے۔“ ڈی آئی جی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا سر؟“

”چھوٹے بھائیوں کو بھی کبھی کبھی کہنے کا حق ملنا چاہئے ناں۔“ شہاب بولا۔
”کیوں نہیں۔“

”کوئی ناراضگی تو مول نہیں لینی پڑے گی؟“
”بالکل نہیں۔“

”اس نے بھی یہی کہا تھا کہ ثاقب حسین نے اس گھر کی ایک ایک اینٹ اپنی محنت کی کمائی سے لگائی ہے، اگر ہم اس گھر کو فروخت کریں گے تو کیا کوئی اس خون کا معاوضہ دے سکتا ہے۔ بھائی جان میری تو یہی رائے ہے کہ اس گھر کو آپ محل بنالیں، لیکن اس گھر کو..... بس مجھے یہاں قطعی جاہل سمجھ لیا جائے تو میرے اوپر بڑی عنایت ہوگی۔“
”گویا تم اس سکونت کو ترک نہیں کرنا چاہتے۔“

”نہیں بھائی جان۔“ شہاب نے کہا اور واقعہ حسین نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا..... شہاب کے ہونٹوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ واقعہ حسین کہنے لگا۔
”ہم تمہارا امتحان لینا چاہتے تھے شہاب۔ دبی دبی زبان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ اتنے بڑے عہدے پر فائز ہونے کے بعد تم شاید اس جگہ کو حقیر سمجھنے لگے ہو گے..... امی جان کا تو کبھی بھی ارادہ نہیں تھا کہ اس سکونت کو ترک کیا جائے لیکن پچھلے دنوں کچھ لوگ جن میں یہ نرپا بیگم بھی شامل ہیں کہنے لگی تھیں کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شہاب ہم لوگوں کی وجہ سے نہ بول رہے ہوں اور ان کے دل میں کچھ اور ہو۔“

”نہیں بھائی جان۔ بڑی معمولی سی بات ہے صرف انسانی سوچ کا فرق اور کچھ نہیں ہے، سر چھپانے کا ٹھکانہ اگر کچھ روایات کا حامل ہو تو بڑی اہمیت رکھتا ہے زمانہ قدیم میں تو لوگ اپنے پڑوسیوں کی وجہ سے اپنے گھروں کو تبدیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے کہ برسوں کی شناسائی ہے۔ میں یہاں بالکل مطمئن ہوں۔“ سب مطمئن ہو گئے، پھر ایک نئے شوٹے نے سرا بھارا۔

ڈی آئی جی نادر حیات کا فون موصول ہوا تھا..... شہاب نے فون ریسیو کیا۔ ”کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو کوٹھی پر آ جاؤ۔“

”حاضر ہوتا ہوں سر۔“ شہاب نے کہا اور برق رفتاری سے تیار ہو کر کوٹھی پہنچ گیا..... ملازموں کو ہدایت کر دی گئی تھی اس لئے شہاب کو فوراً اندر پہنچا دیا گیا..... ڈی آئی جی

”سر..... ایک عرض کروں؟ مجھے اس ملازمت کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مجھے بھی نہیں ہے..... یقین کرو، مجھے بھی نہیں ہے..... بہت کچھ دیا ہے اللہ نے مجھے، لیکن یہ ان سے شکست قبول کر لینے والی بات ہوگی۔ ہماری جنگ قانون سے نہیں قانون شکنوں سے ہے۔ قانون ہمارا ہے ہم اس کا ساتھ کیوں چھوڑیں، بلکہ اگر تم غور کرو تو ایک الگ احساس ہوتا ہے۔ ہمارے قانون کو کچھ صاحب اقتدار لوگوں نے مظلوم بنادیا ہے۔ وہ اس پر ضربیں لگاتے ہیں کیا اس مظلوم قانون کو ہماری ضرورت نہیں ہے۔ تم میرا موقف سمجھ رہے ہو۔“

”جی سر۔“

”اس سے الگ ہو کر ہم بے دست و پا ہو جائیں گے۔ اس میں شامل رہ کر بہت کچھ کر سکیں گے..... شہاب ہمیں جہاں بھی موقع ملا ہم قانون شکنوں پر وار کریں گے..... انہیں پہلے وار میں ٹھنڈا کر دیں گے پھر ہمارا تبادلہ ہو جائے گا اور دوسری جگہ جا کر ہم دوسرے قانون شکن کو شکار کریں گے۔“ ڈی آئی جی صاحب مسکرا کر بولے۔

”نہیں سر..... میں سمجھ رہا ہوں۔“ شہاب آہستہ سے بولا۔

”یہ سب ہوگا، میں نے پہلے سے تمہیں آگاہ کر دیا ہے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہو۔“

”میں تیار ہوں سر۔“

”تھینک یو شہاب۔ ہماری علیحدگی عارضی ہے۔“

”میری طرف سے آپ بالکل بے فکر ہیں سر..... میں حالات سے نمٹ لوں گا۔“

”اب میں مطمئن ہوں۔“ نادر حیات پر سکون لہجے میں بولے..... کچھ دیر تک مزید گفتگو رہی، پھر شہاب وہاں سے رخصت ہو کر چل پڑا..... دوسری منزل فتح محمد کا ڈیرہ تھا۔

”خیریت عزیزاز جان، اس وقت آمد بے معنی نہیں ہو سکتی۔“ فتح محمد نے کہا۔

”جب روح کی تسکین کی ضرورت ہوتی ہے تو روحانی استاد کی طرف ہی رخ کیا جاسکتا ہے۔“

”کانٹوں میں تھپتھپتے ہو، تمہاری مرضی، لیکن یہ حسرت ضرور دل میں ابھرتی ہے کہ کاش وہی ہوتے جو تم تصور کرتے ہو۔ بہر حال کوئی مسئلہ ہے۔“

”دیکھو شہاب، انسان بہت معصوم ہے..... اپنے طور پر وہ خود کو بہت شاطر سمجھتا ہے لیکن قدرت کے کھیل اس کی سمجھ سے باہر ہیں..... میرے لئے یہ نوکری کوئی حیثیت نہیں رکھتی..... میں نے اسے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا تھا اور اللہ کا شکر گزار ہوں کہ آج تک اپنی پسند سے کام کرنے کا موقع ملا ہے..... پچھلے کچھ دنوں سے ایک الجھن کا شکار تھا۔“ نادر حیات صاحب رُک کر سوچنے لگے، پھر بولے۔ ”یوں سمجھو ایک شخص نے مجھے چیلنج کیا تھا..... وہ منشیات کا سمگلر ہے اور اتنا بااثر ہے کہ تم سوچ نہیں سکتے..... اس کے تعلقات بین الاقوامی نوعیت کے ہیں اور وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا..... بہت معمولی سی بات تھی..... میرا اور اس کا سامنا ہو گیا اس نے مجھے ہتے ہوئے سرزنش کی تھی کہ کام کرتے ہوئے ذرا خیال رکھا کروں..... یہ بات میرے دل کو چھ گئی تھی اور میں نے اسے دل میں رکھ لیا تھا، پھر مجھے یہاں فرائض کی بجا آوری کے لئے بھیج دیا گیا اور میں نے یہاں ذمے داری سنبھال لی، لیکن میری آرزو تھی کہ مجھے اس علاقے میں تعینات کیا جائے اور اب ایسا ہو گیا ہے۔“

”ویری گڈ۔“ شہاب دلچسپی سے بولا۔

”یہی میں کہنا چاہتا تھا۔“

”گویا آپ خوشی سے وہاں جانے کے لئے تیار ہیں؟“

”میں نے کہا نا کہ یہ میری خواہش تھی۔“

”اور اب آپ؟“

”ہاں اپنی پسندیدہ شخصیتوں سے دود دہاتھ کرنے کا موقع ملے گا۔“

”لیکن سر، میں آپ کے ساتھ نہیں ہوں گا۔“

”بے شک، وہاں مجھے تمہارے جیسے کسی شخص کی اشد ضرورت ہوگی، لیکن دوسری

دلچسپ بات یہ ہے کہ میرے اور تمہارے گٹھ جوڑ کو خطرناک سمجھا جا رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شہاب پھر چونک پڑا۔

”یہ ایک دلچسپ پہلو ہے، ہم دونوں بلیک لسٹ ہوئے ہیں اور ہمیں الگ کیا جا رہا ہے

لیکن فکر نہ کرو، ہم انہیں مایوس کریں گے۔“

”وہ کیسے سر؟“

”میں کوشش کروں گا کہ تمہیں اپنے پاس بلا لوں۔“

”او کے، میں مطمئن ہوں۔“

”ایک درخواست ہے بیٹا۔“

”ہاں کہئے۔“

”ابھی واسطی صاحب کو مکمل حالات سے آگاہ نہ کرنا۔“

”نہیک ہے۔“ بیٹا نے اعتماد سے کہا۔ اس نے اس کی وجہ بھی نہ پوچھی تھی۔

پھر شہاب ثاقب کو ہیڈ کوارٹر طلب کر لیا گیا۔ اسے نوٹیفکیشن دیا گیا اور ایڈیشنل ڈی

آئی جی صاحب نے اسے اپنے پاس بلایا۔

”مسٹر شہاب ثاقب، آپ کی مدت ملازمت کیا ہے؟“

”سر جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔“ ایڈیشنل ڈی آئی جی کو غیر متوقع جواب ملا۔

”آپ نے ان آٹھ دنوں میں بڑی برق رفتاری دکھائی ہے۔“

”نہیں سر، زمانہ طالب علمی میں جب ٹورنامنٹ ہوتے تھے تو میں ریس میں بھی سب

سے آخری کھلاڑی ہوتا تھا۔ میں نے اپنا یہ اعزاز ہمیشہ قائم رکھا۔“

”آپ شاید مجھے دلچسپ جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ ایڈیشنل ڈی آئی جی

نے ہونٹ سکڑ کر کہا۔

”جی سر۔۔۔۔۔ آپ کی نگاہوں میں جگہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ شہاب

نیاز مندی سے بولا۔

”یہ ڈسپلن کی خلاف ورزی نہیں ہے۔“

”اگر ہے تو معافی چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ دوبارہ یہ نہیں کروں گا۔“

”آپ کو ترقی کیوں ملی؟“

”سر، ایک بزرگ کے وظیفے سے۔“ شہاب نے کہا اور ڈی آئی جی کے گھورنے پر

ہمدی سے بولا۔ ”سر قسم کھا کر کہتا ہوں۔۔۔۔۔ ایسا ہی ہوا تھا آپ معلوم کرا لیجئے۔۔۔۔۔ ان کا نام

نام محمد ہے۔“

ایڈیشنل ڈی آئی جی نے بے اختیار مسکراہٹ روکی تھی، پھر وہ بولے۔ ”اور جو کیس

آپ نے پکڑے ہیں۔۔۔۔۔ جیسے آپ کا تازہ کارنامہ یعنی ساند خانہ اندان کا کیس؟“

”سر اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔“

”ہاں۔“

”بتاؤ؟“ فتح محمد نے کہا اور شہاب نے پوری کہانی سنا دی۔۔۔۔۔ فتح محمد سوچ میں ڈوب گیا

تھا، پھر بولا۔ ”کیا سوچا۔“

”بہت آسان ہے۔۔۔۔۔ وہ کروں گا جو کیا جائے گا اور ایسا ہی کرتا رہوں گا۔۔۔۔۔ میرا تو

مسلک ہی کچھ اور ہے۔ مرشد۔۔۔۔۔ سب سے سمجھوتہ کرو، سب کو خوش رکھو اور اپنا کام کر

جاؤ۔۔۔۔۔ کچھ اور بھی سوچ رہا ہوں مرشد۔“

”کیا؟“

”ایک دارالامان قائم کروں؟ بے پناہوں کے لئے ایک پناہ گاہ جہاں جینے کے آرزو

مندوں کو جینے کا موقع ملے جو کچھ مجھے حاصل ہوا اس میں سے ان کا حصہ نکال لوں۔۔۔۔۔ مجھے ان

کی دعاؤں کے سوا کچھ درکار نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہ بات آپ جانتے ہیں مرشد کہ میں نے اپنے

باپ کے افکار کا مذاق نہیں اڑایا ہے۔۔۔۔۔ وہ مجسم سچائی تھے اور سچ کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔۔۔۔۔

میں اب ان کا مذاق اڑا رہا ہوں جو سچ کے قاتل ہیں۔۔۔۔۔ میں سچ کو سامنے لا کر باطل کو فنا

کرنے کی مقدور بھر کو ششیں کر رہا ہوں۔۔۔۔۔ ناؤر حیات صاحب میرے لئے فکر مند ہیں اور

اسی سوچ کے شکار ہیں کہ میرے راستے مسدود نہیں ہوں گے۔۔۔۔۔ میں نے تو بہت آگے سے

اپنے کام کا آغاز کیا ہے جو لوگ قانون پر حاوی ہو کر اس سے گلو خلاصی حاصل کر لیں گے

انہیں ایک اور عدالت سے سزا ملے گی۔۔۔۔۔ وہ سچ کی عدالت ہوگی اور شہنشاہ اس کا جج ہوگا۔“

”ہاں میں جانتا ہوں۔“

”مجھ سے اتفاق کرتے ہیں؟“

”ہاں۔“

یہی تفصیل شہاب نے بیٹا کو بتائی اور بیٹا کا چہرہ اتر گیا۔

”ہیڈ کوارٹر میں آپ کی کیا ڈیوٹی ہوگی؟“

”معطل کر کے بٹھالیا جائے گا۔ تنزیل کر دی جائے گی اور کیا ہوگا؟“

”آپ کو پسند ہوگا یہ سب کچھ؟“

”بالکل۔۔۔۔۔ مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ ہم بھیڑیوں کے شکاری ہیں بیٹا۔۔۔۔۔ بھیڑیے

شکار ہوتے رہیں اور بس۔“

نہایت کی زینت بنی تھیں..... اس لئے تمام صورت حال انہیں معلوم ہو گئی تھی..... ڈیل او بنگ پر البتہ ان حالات کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا..... اس کے افراد کا بدستور شہنشاہ سے رابطہ رہتا تھا اور ان دنوں کوئی کام نہیں تھا اس لئے وہ عیش کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

پھر ایک دن اسے اعلیٰ افسران کے سامنے پیش کیا گیا..... ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”آپ دوبارہ ایس ایچ او کا عہدہ دیا گیا ہے..... مسٹر شہاب ثاقب، آپ اپنی پسند کے تھانے کا انتخاب کر لیں۔“

”مجھے ہر تھانہ پسند ہے جناب، جہاں مناسب سمجھیں لگا دیں، ڈیوٹی ڈیوٹی ہوتی ہے۔“

”ٹھیک ہے آپ ڈیوٹی افسر سے ملاقات کر لیں۔“

پھر تھانہ بالمرنگر میں شہاب کو تعینات کر دیا گیا..... یہ بھی بدنام علاقہ تھا..... شہاب نے نوشی کے ساتھ پرانے ایس ایچ او سے چارج لیا تھا۔

”شہاب صاحب، بڑے کام کی جگہ ہے..... بس ذرا لوگوں سے بنا کر رکھیں، فائدے میں رہیں گے۔“ شہاب مسکرا کر خاموش ہو گیا تھا..... بہر حال اس نے ایک فیصلہ کیا اور کام شروع کر دیا..... تھانے کے پورے عملے کو مخاطب کر کے اس سے علاقے کے کوائف پوچھے..... ایس آئی گلاب جان کو اس نے گہری نگاہ سے دیکھا تھا..... یہ ایک لمبا ترنگا آدمی تھا..... چہرے سے خشونت برستی تھی، جڑوں کی بناوٹ سے بے رحمی کا اظہار ہوتا تھا..... انٹر میں داخل ہو کر اس نے سلوٹ بھی نہیں کیا تھا اور ایک طرف کھڑے ہو کر مونچھیں روڑتا رہا تھا..... دوسرے لوگوں سے باتیں کر کے شہاب نے اس کی طرف انگلی اٹھائی اور وہ اڑتا ہوا آگے آگیا۔

”کتنے عرصے سے نوکری کر رہے ہو؟“ شہاب نے پوچھا۔

”دس سال سے۔“

”ابھی تک ڈسپن نہیں سیکھا۔“

”سمجھ نہیں صاحب۔“

”سلوٹ نہیں کیا تم نے۔“

”عادت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔

”ہوں۔“ شہاب نے رائٹنگ پیڈ اٹھایا اس پر کوئی تحریر لکھی اور اس کے بعد پرچا گلاب

”کیا مطلب؟“

”ایک چنگی نمک میرے منہ میں ڈال دیجئے اور سمجھ لیجئے کہ زندگی بھر کے لئے آپ کا وفادار بن گیا، پھر کوشش کر لیجئے کہ کوئی آپ کے خلاف ایک لفظ میرے منہ سے سن لے۔“

ڈی آئی جی صاحب اس کے الفاظ کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگے، پھر کچھ سمجھ کر بولے۔ ”گویا اس میں کچھ اور عوامل کارفرما تھے۔“

”پورا کیس سچائیوں پر مبنی ہے۔ کوئی الزام غلط نہیں ہے۔“

”یہ فیصلہ آپ نے کیسے کر لیا؟“

”عدالت نے کیا ہے سر۔“

”کچھ اور حقائق بتانا پسند کریں گے؟“

”نہیں سر۔“ شہاب بولا اور ڈی آئی جی صاحب پھر چونک پڑے۔

”کیا مطلب؟“

”نمک کی چنگی۔“ شہاب نے کہا اور ڈی آئی جی صاحب اسے گھورتے رہے پھر مسکرا کر بولے۔

”ٹھیک ہے مسٹر شہاب..... آپ نے اس گفتگو سے بہت سے عذاب خود پر سے ٹال دیئے ہیں..... اس کا مطلب ہے کہ آپ بہت چالاک انسان ہیں..... ہم آپ کو نمک کی چنگی کھلانا چاہتے ہیں لیکن، پھر آپ کا امتحان ہو گا۔“

”میں امتحان پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا سر۔“

”ہوں، ٹھیک ہے پھر آپ کے بارے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہو گا، لہذا آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔“

شہاب نے گردن خم کر دی، پھر اس نے مثالی فرض شناسی کا ثبوت دیا اور ہر بیگار خوش اسلوبی سے پوری کی..... اسے احساس تھا کہ اس کا جائزہ لیا جا رہا ہے..... اس دوران نادر حیات صاحب چلے گئے تھے اور اس سے مل کر گئے تھے..... بہت سے عہد و پیاں ہوئے تھے اور شہاب نے انہیں خراج عقیدت پیش کر کے رخصت کیا تھا..... پینا سے بدستور ملاقاتیں رہتی تھیں..... عدنان واسطی بھی ان حالات سے بے خبر نہیں رہے تھے..... کورٹ آتے جاتے تھے، محکمہ پولیس کے افراد سے دن رات کی یاد اللہ تھی، پھر نادر حیات کے تبادلے کی خبریں

گلاب جان نے ادھر ادھر دیکھا، کوٹ اتار کر لپیٹا اور ایک طرف پھینک دیا اور پھر ہتھ آہستہ قدموں سے دروازے سے باہر نکل گیا۔
کمرے میں مکمل خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا، شہاب نے باقی لوگوں کی جانب دیکھا

بولوا۔

”اور کمرے کے ڈسپلن کی عادت نہیں ہے۔“ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو شہاب نے کہا۔
”جاؤ ذرا برابر ڈسپلن کی خلاف ورزی نہ ہو ورنہ ایک ایک کو سزا دلوا دوں گا اور جس کا مانع خراب ہو وہ مجھ سے رجوع کرے، میں ایک دماغی ہسپتال کا انچارج بھی رہ چکا ہوں، یٹ آؤٹ۔“ شہاب کی غراہٹ ابھری اور وہ سب باہر نکل گئے۔ تھوڑا سا سکندر ذہن پر چھایا تھا۔ بہر حال انسان ہی تھا اور انسانی فطرت سے مختلف نہیں تھا۔ کسی نہ کسی شکل میں تو طبیعت پر کبیدگی آتی ہی چاہئے تھی، حالانکہ اسے اپنی تنزیل کا افسوس نہیں تھا۔ بے چارے ڈی آئی جی نادر حیات بھی اپنے آپ کو تائب نہیں رکھ پائے تھے اور شکار ہو گئے تھے لیکن نادر حیات بے شک شکار ہو گئے تھے شہاب کو ذرا برابر پروا نہیں تھی بلکہ تھانے کا تجربہ اس تجربے سے بہتر تھا، جو ڈی آئی جی صاحب نے اس کا عہدہ بڑھا کر اسے دیا تھا۔ وہاں سے لوگوں سے رابطہ ختم ہو جاتے تھے اور خاص ہی خاص لوگ علم میں آسکتے تھے، جبکہ تھانے میں ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔

دیر تک بیٹھا وہ گلاب جان کے بارے میں سوچتا رہا، اس سرکش ایس آئی کو صرف عملاتی سزا دینا مناسب نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے ذرا دوسرا طریقہ کار اختیار کرنا پڑے گا۔ غرض یہ کہ نئے تھانے کا چارج شہاب کے لئے ایک دلچسپ تجربہ ثابت ہوا تھا۔ بگڑے ہوئے لوگ ہر محکمے میں ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے برائیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ گلاب جان کے بارے میں شہاب نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اپنی سخت فطرت کی بنا پر وہ لوگوں کے لئے کافی خطرناک ثابت ہوتا ہوگا، لیکن بہر حال اگر تھانہ نہ سنبھالا جاسکا تو پھر انچارج کے بجائے کانسیبل ہو جانا زیادہ بہتر رہے گا۔ یہ نیا چیلنج شہاب نے پوری طرح قبول کر لیا تھا اور یہاں اپنے پاؤں جمانے کے لئے اسے بہت سے اقدامات کرنے تھے، چنانچہ اس نے وہ فہرست سامنے سرکالی جو تھانے کے افراد نے اسے مہیا کی تھی، یہ علاقے کے ان خطرناک لوگوں کی فہرست تھی جن کا تھانے سے بھی تھوڑا بہت رابطہ تھا اور جن کے سلسلے میں محتاط رہنا

جان کی طرف بڑھا دیا۔

”تین دن کے لئے معطل کر دیا ہے میں نے تمہیں، جاؤ ڈسپلن کی عادت ڈالو اور تین دن کے بعد واپس آکر مجھے رپورٹ دو۔“

کمرے میں موجود پولیس والوں کے چہرے عجیب ہو گئے۔ گلاب جان نے کاغذ اٹھایا اور اس کو پڑھنے کے بعد ترش لہجے میں بولا۔

”صاحب جی جس بات کی عادت نہیں ہے، وہ تین دن میں کیسے پڑ سکتی ہے۔“
”ٹھیک۔۔۔۔۔ لاؤ کاغذ مجھے دو۔“ شہاب نے کاغذ آگے بڑھایا اور اس نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کاغذ شہاب کے سامنے ڈال دیا۔ شہاب نے تین دن کی جگہ سات دن لکھا اور پھر اسے موڑ کر واپس پھینکتے ہوئے بولا۔

”تین دن میں عادت نہ پڑے تو سات دن میں عادت ڈالو، آٹھویں دن آکر مجھے رپورٹ دو اور اگر اس کے بعد بھی عادت نہ پڑی تو تمہیں دوبارہ ٹریننگ پر بھیج دیا جائے گا۔“
فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“

گلاب جان کا چہرہ آگ ہو گیا۔ اس نے کاغذ اٹھایا اور ایک لمحے اسے دیکھا پھر اس کے پرزے پرزے کر کے ہتھیلی پر رکھا اور پھونک مار کر اڑا دیا پھر غرائی ہوئی آواز میں بولا۔
”صاحب جی چارج لیتے وقت آپ کو یہ پوچھ لینا چاہئے تھا کہ کون کس مزاج کا بندہ ہے، ہمیں یہ لوگ عزرائیل کہا کرتے ہیں، یہ بات آپ کو معلوم ہونی چاہئے۔“
”ٹھیک۔“ شہاب اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔ میز کے پیچھے سے نکل کر آگے بڑھا، گلاب جان کو دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر اس کے شانوں سے ایس آئی کے پھول نوج لئے اور انہیں ایک طرف اچھال دیا۔ اس کے بعد وہ غرائی ہوئی آواز میں بولا۔
”وردی اتار دو۔“

پولیس کانسیبل، ایک اے ایس آئی اور دو ایس آئی بڑی سنسنی خیز کیفیت محسوس کر رہے تھے۔ شہاب نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”وردی اتار دو۔۔۔۔۔ صرف کوٹ اتار دو، مجھے اس کے لئے مجبور نہ کرو کہ مکمل وردی اترا کر تمہیں یہاں سے باہر نکالوں اور سنو دو بار کہہ چکا ہوں تیسری بار تمہیں حکم عدلی کا مجرم قرار دیا جائے گا۔“

ضروری تھا۔

”کچھ نہیں..... اصل میں یہاں کے لوگوں نے مجھ سے تعاون کرتے ہوئے فی الحال یہاں جرائم کا سلسلہ بند کر رکھا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان دنوں میں ایک بھی کیس نہیں آیا میرے پاس۔“

”دیر ی گز، ویسے تھانے بارہ درری کے بارے میں مجھے علم ہے کہ وہاں جرائم ہونا بند ہو گئے تھے۔“

”یقین کیجئے واسطی صاحب یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ ہوتا ہے..... وہاں رہ کر ان مارے معاملات سے رابطہ ختم ہو گئے تھے..... بہر حال ان میں بھی ایک لطف ہے۔“

”بھئی مجھے تو اب تک وہی عادت پڑی ہوئی ہے، یعنی جب چاہا تم سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کر دیا اب کیا صورت حال ہے؟“

”بالکل مختلف نہیں۔“

”تو پھر میں ملنا چاہتا ہوں تم سے؟“

”سب؟“

”چاہتا تو ابھی ہوں لیکن اگر تمہارے لئے کوئی الجھن ہو تو وقت بھی تم متعین کرو۔“

”نہیں میں حاضر ہو جاتا ہوں سر..... وردی میں آ جاؤں؟“

”ہاں ہاں کیا حرج ہے آ جاؤ، لیکن ایک بات کا خیال رکھنا..... ممکن ہے میرے دفتر کی نگرانی ہو رہی ہے۔“

”ہوں کوئی حرج نہیں ہے میں آ رہا ہوں۔“ شہاب نے کہا اور اس کے بعد ٹیلی فون بند کر دیا لیکن اس کی پیشانی پر غور و فکر کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں..... واسطی صاحب کا یہ کہنا کہ ممکن ہے ان کے دفتر کی نگرانی ہو رہی ہو ذرا تعجب خیز تھا۔ نگرانی کرنے والے کون ہو سکتے ہیں اور پھر اس وارننگ کی کیا ضرورت تھی..... بہر حال پولیس جیپ نکالی اور کسی کو ساتھ لئے بغیر جیپ اسٹارٹ کر کے چل پڑا..... تیز رفتاری سے جیپ ڈرائیو کرتا ہوا وہ واسطی صاحب کے دفتر پہنچ گیا تھا..... واسطی صاحب اور بیٹانے اس کا استقبال کیا۔ واسطی صاحب مسکرا کر بولے۔

”در حقیقت شہاب یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہیں خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں..... یونیفارم میں تم بہت خوبصورت نظر آتے ہو، جبکہ ان دنوں یونیفارم اتار کر ایک عام سے

تھانے میں تیسرا دن تھا، پچھلے دو دنوں میں اس نے کافی کام کیا تھا اپنے علاقے کی حدود میں گشت کیا تھا..... اپنے ماتحتوں سے ساری صورت حال معلوم کی تھی، البتہ کسی سے ملاقات کرنے سے اس نے گریز کیا تھا..... رفتہ رفتہ ہی سارے کام ہو سکتے ہیں..... ایک ساتھ تو سب کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا..... اس دوران بیٹانے صرف فون پر رابطہ رہا تھا..... بیٹانے اس سے صورت حال معلوم کرتی رہی تھی اور شہاب نے اسے بتا دیا تھا کہ سب ٹھیک ہے؟ اس نے بیٹانے سے کہا تھا کہ اسے تھانے کا تجربہ ہے کافی باتیں ہوئی تھیں، بیٹانے اور اب بیٹانے مکمل طور سے رازدار تھی..... اس نے کہا۔

”بیٹانے اسرار موقف تمہیں معلوم ہے..... اصل میں جو اہم مسئلہ تھا وہ یہ تھا کہ میں سرکاری تحفظ چاہتا تھا، یا جو کچھ میں نے اب تک کیا ہے وہ الگ نوعیت کا حامل ہے، میں یہ سب کچھ ایک باقاعدہ پلاننگ کے تحت کرنا چاہتا تھا لیکن جب تک مجھے کوئی ایسی شکل نہ حاصل ہو جاتی جس سے میرا رابطہ باقاعدہ جرائم کی دنیا سے نہ ہو جاتا، کچھ ایسی مشکلات پیش آسکتی تھیں جن سے میں بچنا چاہتا تھا اور اب مجھے یہ آسانی حاصل ہو گئی کہ میں ایک قانونی حیثیت رکھتا ہوں، جہاں تک محکمہ پولیس کا تعلق ہے تو یقین کرو تھانہ میرے لئے اس عہدے سے زیادہ بہتر ہے جو ڈی آئی جی نادر حیات نے مجھے دیا تھا اور جہاں تک ڈی آئی جی صاحب کے معاملات کا تعلق ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے بہت سے قانونی تحفظات مل جاتے تھے لیکن اب یہ بات تم بہتر جانتی ہو کہ جہاں قانونی تحفظات کا فقدان ہو جائے..... میرا دوسرا عمل اس شکل میں شروع ہو جاتا ہے۔“

”میں جانتی ہوں شہاب اور ذرا بھی بد دل نہیں ہوں ان حالات سے۔“ بیٹانے کہا اور اس کے ان الفاظ سے پھر شہاب کے ذہن کے گوشوں میں نجانے کیوں فرحت کی ایک لہر بیدار ہو گئی۔ گویا بیٹانے کے لئے مضطرب بھی ہو سکتی تھی اور اس سے مطمئن بھی۔

تو تیسرا دن تھا..... واسطی صاحب کا فون موصول ہوا..... شہاب نے فون ریسیو کیا اور واسطی صاحب کی آواز پہچان کر مودب ہو گیا۔

”ہیلو واسطی صاحب کہئے کیسے مزاج ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں..... کیا مصروفیت چل رہی ہے آج کل؟“

آدمی لگنے لگتے تھے۔“

”ٹھیک ہے میں تاحیات انکسٹر رہنے کی درخواست دے دوں گا۔“ شہاب نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا، پھر بیٹا سے بولا۔

”مس بیٹا یہاں کی چائے کا جو لطف ہے آپ یقین کریں کہیں اور نہیں آتا۔“

”میں انتظام کرتی ہوں۔“ بیٹا نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی، پھر چائے وغیرہ کے لئے کہہ کر واپس آ بیٹھی۔ شہاب نے کہا۔

”جی واسطی صاحبہ..... پہلی بات تو یہ کہ آپ نے نگرانی کے بارے میں کہا تھا..... بہر حال میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص شخصیت علم میں نہیں آئی۔“

”ممکن ہے یہ صرف میرا خیال ہو، لیکن جو انکشاف میں تم پر کرنے والا ہوں وہ بڑا سنسنی خیز ہے۔“

”ویری گڈ..... پچھلے کئی دنوں سے کوئی سنسنی خیز انکشاف نہیں ہوا تھا، میں خود اس کا منتظر تھا۔“

”شہاب تین حضرات میرے پاس آئے تھے، بہت بڑی شخصیتوں کے مالک ہیں..... ان میں سے ایک طاہری صاحب، دوسرے حکیم شاہ صاحب اور تیسرے ناصر جمال صاحب ہیں..... تینوں ٹاپ کے آدمی ہیں اور ان کے ناموں کے ساتھ بڑے بڑے واقعات وابستہ ہیں۔“

”بالکل میں نے یہ تینوں نام سنے ہوئے ہیں بلکہ ان لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں۔“

”میں تو خیر ان کے سامنے ایک معمولی سی حیثیت رکھتا ہوں بس یوں سمجھ لو کہ چند کیسوں میں تم نے میرے نام کو بھی وہ حیثیت دے دی ہے کہ اتنے بڑے بڑے لوگ مجھ سے آکر میرے دفتر میں ملے۔“

”آمد کی کیا وجہ تھی؟“

”بڑی دلچسپ بڑی سنسنی خیز..... وہ ساند اکیس کے سلسلے میں آئے تھے۔“

”ویری گڈ۔“ شہاب واقعی سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہو گیا۔

”یہ تینوں حضرات نئے نئے اس کیس میں داخل ہوئے ہیں اور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کی اپیلوں میں مجھ سے تعاون چاہتے ہیں۔ طاہری صاحب نے مجھ سے کہا کہ کیا ساند

میں کوئی ایسی صورت حال پیش آگئی تھی جو میں براہ راست اس میں ملوث ہو گیا یا پھر یہ صرف ایک کاروباری عمل تھا..... بہر حال یہ کیونکہ سینئر بھی ہیں اور بڑی حیثیت کے مالک بھی، چنانچہ میں نے اپنا مودبانہ انداز برقرار رکھا اور کہا کہ مقدمہ برائے مقدمہ ہوتا ہے۔ بس مجھے اس سلسلے میں کیس دیا گیا اور میں نے اس کی پیروی کی، حالات و شواہد نے راگ علی ساند کو مجرم قرار دے دیا اور مجھے خوشی ہے کہ میں مجرموں کو سزا دلوانے میں کامیاب ہو گیا۔“ تب ناصر جمال نے کہا۔

”لیکن واسطی صاحب یہ ایک سنجیدہ عمل نہیں تھا، آپ تو بہت پرانے وکیل ہیں، بعض اوقات ہمیں ایسے کیسوں سے گریز کرنا پڑتا ہے جن میں بعد میں ہمارے لئے مصیبتیں خیزی ہو جائیں۔“ تو میں نے مسکرا کر کہا۔

”اگر آپ مجھے سینئر وکیل سمجھتے ہیں ناصر جمال صاحب تو آپ یہ سمجھ لیجئے کہ وکیل سینئر ہو یا جو نیئر، کیس ایک جولاہے کا ہو یا رب پتی کا..... اپنے خلاف کیس لڑنے والے سے ذمہ ہی نفرت کرتے ہیں اور ایک وکیل کے لئے یہ خطرہ ہمیشہ باقی رہتا ہے کہ کون کب اسے نقصان پہنچانے پر قتل جائے۔“ تو ناصر جمال صاحب نے کہا۔

”دیکھئے واسطی صاحب اس کیس میں کچھ ایسے عوامل پیدا ہو گئے ہیں جن کی بنا پر آپ کو ذرا اس اپیل کے سلسلے میں تعاون کرنا پڑے گا جو ہم راگ علی ساند، نور علی ساند اور پیار علی ساند کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ اپیل منظور ہونی چاہئے..... انداز کچھ ایسا تھا کہ مجھے سنہلنا پڑا۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔

”ناصر جمال صاحب میں آپ لوگوں کا جتنا احترام کرتا ہوں اس کے تحت بھلا میری مجال کہ آپ لوگوں کی کسی بات کو کراس کرنے کی کوشش کروں۔“ میرے ان الفاظ پر ناصر جمال صاحب ذرا نرم پڑے اور کہنے لگے۔

”واسطی صاحب بعض معاملات بڑے منافع بخش بھی ہوتے ہیں، اب دیکھئے نا ہماری زندگی تو انہی تمام معاملات میں گزرتی ہے، اب ظاہر ہے ہم یہاں کوئی نیک کام کرنے نہیں بیٹھے ہوئے یہ تو کاروبار ہے..... بڑے لوگوں کو بہر حال نگاہ میں رکھنا چاہئے، معاف کیجئے گا ذرا سی غلطی ہوئی آپ سے۔ راگ علی ساند کے خلاف آپ کو کیس نہیں لینا چاہئے تھا لیکن میں نے ان لوگوں کو یہ سمجھایا ہے کہ اصل کام واسطی صاحب کا نہیں تھا بلکہ اعلیٰ پیمانے پر یہ

”جی بالکل ٹھیک ہے اور اس کے بعد یہ لوگ چلے گئے۔۔۔۔۔ یہ تفصیل میں تمہیں بتانا ضروری سمجھتا تھا۔۔۔۔۔ بیٹا سے میں نے مشورہ کیا کہ کیوں نہ تھانے پہنچ جاؤں۔۔۔۔۔ بیٹا نے کہا کہ بیٹا چارج لیا ہے وہاں جانا مناسب نہیں ہے اس لئے میں نے تمہیں تکلیف دے دی۔“

”آپ نے بہت اچھا کیا کہ مجھے یہاں بلا لیا اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ بہت محتاط بھی ہو گئے ہیں۔ آپ نے مجھ سے غالباً سی لئے کہا تھا کہ نگرانی کی احتیاط کروں۔“

”سو فیصد۔۔۔۔۔ مجھے اب بھی غدشہ ہے۔“

چائے آگئی اور بیٹا چائے بنانے کے لئے اٹھ گئی۔ اس نے ایک کپ شہاب کے سامنے رکھا دوسرا واسطی صاحب کے اور پھر تیسرا کپ لے کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔

چائے کے دوران مکمل خاموشی طاری رہی، عدنان واسطی بھی کچھ سوچ رہا تھا اور شہاب بھی، بیٹا خاموشی سے باری باری دونوں کی صورت دیکھ رہی تھی پھر اس وقت تک خاموشی طاری رہی جب تک چائے کی پیالی سے آخر گھونٹ نہ پی لیا گیا۔ شہاب غالباً اس دوران کچھ سوچ چکا تھا اس نے کہا۔

”کچھ کام کرنے پڑیں گے فوری طور پر، بیٹا آپ کو بھی مصروف ہونا پڑے گا، آپ یوں کریں کہ بستی مہرجان روانہ ہو جائیں، خانم گوہر جہاں آپ کو اچھی طرح پہچانتی ہیں، آپ ان سے میری طرف سے درخواست کریں کہ تھوڑے دن کے لئے وہ بستی مہرجان سے واپس اسی عمارت میں آجائیں جس میں انہوں نے اتنے عرصے قیام کیا ہے، آپ چاہیں تو صورت حال انہیں بتا سکتی ہیں ان سے کہیں کہ بس چند روز اور درکار ہیں اس کے بعد وہ آرام سے اپنی حویلی میں جا کر رہ سکتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں یہ کام کے لیتی ہوں۔“

”واسطی صاحب، اصل میں اگر تھانے کا چارج نہیں لیتا تو شاید اتنی دقت پیش نہ آتی لیکن اس وقت کی مصروفیات ذرا مختلف ہیں۔ اس لئے تھوڑی سی تکلیف میں آپ کو بھی دوں گا۔“

”ایم۔ ایم تو اس بات کے منتظر ہیں کہ تم ہمیں تکلیف دو، بد قسمتی تو یہی ہے کہ ہمیں زبردستی بوڑھا بنایا جا رہا ہے اور ہم سے کوئی کام نہیں لیا جاتا، حالانکہ سچ یہ ہے کہ ہم بوڑھے نہیں ہیں۔“ واسطی صاحب پر مزاح لہجے میں بولے۔ شہاب ہنس پڑا پھر بولا۔

کارروائی ہوئی ہے اور کسی نے ڈی آئی جی صاحب کو میری مراد سابق ڈی آئی جی نادر حیات صاحب سے ہے، اکسایا تھا کہ ساند کے خلاف کام کیا جائے۔۔۔۔۔ ابھی تک یہ بات صیغہ راز میں ہے کہ اکسانے والا کون تھا اور اس کی شخصیت کس قدر پاور میں تھی۔۔۔۔۔ خیر یہ سب پرانی باتیں ہیں آپ کو علم ہو گیا ہو گا کہ ڈی آئی جی نادر حیات صاحب کا ٹرانسفر ہو گیا ہے اور وہ افریقہ تشریف لے گئے۔ واقعی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا، تنزلی پا کر ایک تھانے کا ایس ایچ او بن گیا ہے، یہ ساری کارروائی تو ہوتی ہے لیکن بات ابھی ختم نہیں ہوئی اصل میں ہمیں راگ علی ساند کی اپیل منظور کرانی ہے اور اس کے لئے ہمیں چند لوگوں کا تعاون درکار ہو گا۔۔۔۔۔ نئے سرے سے آپ کو اس کیس میں کچھ کارروائیاں کرنی ہوں گی، معاوضے کا تعین آپ کر لیجئے جو مانگیں گے دیا جائے گا۔ انحراف بالکل نہ کیجئے گا کیونکہ اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔“ میں نے عاجزی سے کہا۔

”ناصر جمال صاحب آپ لوگوں کی شخصیتیں اتنی بڑی ہیں کہ آپ کی کسی بات سے منحرف نہیں ہو سکتا لیکن بس اتنا کرنا ہو گا کہ آپ کو کہہ دوں گا مجھے گائیڈ کر دیجئے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟“

ناصر جمال نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس طرف سے تو آپ بے فکر ہیں جو جائیں آپ کو کسی بڑی مشکل کا شکار نہیں ہونا پڑے گا۔“

”تو پھر جس طرح آپ فرمائیں، میں حاضر ہوں۔“

”ہم بہت جلد ایک پروگرام بنا کر آپ سے رجوع کریں گے، آپ صرف اتنا کریں کہ کل شام تک ہمیں ان لوگوں کے پتے فراہم کر دیں جو اس سلسلے میں ہمیں مطلوب ہوں گے۔۔۔۔۔ مثلاً اعجاز خان جس نے اس مسئلے میں گواہی دی تھی۔ باور شاد وغیرہ باقی ہاشم علی ساند اور گوہر جہاں کے بارے میں تو ہمیں علم ہے، ہم ان سب ہی سے اپیل کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی ناراضگی کو دور کر کے ساند اخاندان کو موت کے منہ سے بچانے کی کوشش کریں۔“

”بہت بہتر۔ اصل میں اس کے بعد فوراً ان سے رابطے منقطع ہو گئے تھے اس لئے میرے پاس ان کا پتا فوری طور پر تو موجود نہیں ہے لیکن جو پتا انہوں نے درج کر لیا ہے میں اسے تلاش کر کے آپ کے حوالے کر دوں گا۔“

”کل شام تک کی بات ہے۔“

آپ کو برقرار رکھنا بے حد ضروری ہے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں مس بینا کہ بات صرف یہ نہیں ہے کہ ہم اپنا کام جاری رکھیں بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ قانون کا سہارا بھی مجھے حاصل رہے، یہ میرے لئے اشد ضروری ہے۔“

”آپ بالکل مطمئن رہیں، ہم سب ہر طرح سے آپ کے ہمراہ ہیں اور آپ کو کسی بھی جگہ تنہائی کا احساس ہونے نہیں دیں گے۔“ بینا نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

”تو پھر میں اجازت چاہتا ہوں۔“ شہاب بولا اور پھر وہ وہاں سے نکل آیا، اسے خود بھی کچھ کام کرنے تھے، چنانچہ سب سے پہلے اس نے بابو ارشاد کے بارے میں فیصلہ کیا، بابو ارشاد کے بارے میں اسے علم ہو چکا تھا کہ وہ یہیں موجود ہے اور بستی نور الہی منتقل نہیں ہوا اس کا موقف تھا کہ یہ لوگ وہاں اتنے ذلیل و خوار ہو چکے ہیں کہ اب اس بستی میں ان کا جانے کو دل نہیں چاہتا، بہر حال یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا اس میں کسی کو اعتراض بھی نہیں ہو سکتا تھا..... شہاب نے آج تک کسی کو اطلاع نہیں دی تھی کہ بابو ارشاد خاندان کو اس نے کیا مالی مدد فراہم کی ہے، لیکن اس خاندان کو مالی مدد کی ضرورت تھی اور شہاب نے اس کا پورا پورا خیال رکھا تھا، بابو ارشاد، عائشہ اور اس نوجوان نے جسے سزا سے نجات دلائی تھی، شہاب کا خیر مقدم کیا، بڑے شکر گزار تھے وہ اس پولیس افسر کے۔ شہاب نے بابو ارشاد کو ساری تفصیل بتائی اور ان سے کہا کہ وہ ان کے عارضی قیام کا بندوبست کر چکا ہے، چنانچہ انہیں تکلیف کرنا ہوگی، لیکن یہ عارضی تکلیف ہوگی اس کے بعد وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہیں منتقل ہو سکتے ہیں۔ بابو ارشاد فوراً ہی تیار ہو گئے تھے..... عائشہ وغیرہ کو ساتھ لے کر شہاب کریم سوسائٹی کو بھی پہنچ گیا جو ہر خان کو ہدایت کی گئی اور یہ لوگ وہاں منتقل ہو گئے، اس کے بعد اعجاز اور رقیہ کا مسئلہ تھا، چنانچہ اس سارے مسئلے کو حل کئے بغیر واپسی نہ ہوئی..... شہاب کا یہی طریقہ تھا کہ کسی مسئلے کا حل پہلے دریافت کر دے اور اس کے بعد اس کے بارے میں سوچو کہ آگے کیا کرنا ہے یا اس حل سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں، اس نے ان تمام لوگوں کو منظر عام سے ہٹا دیا تھا جنہیں اس سلسلے میں کسی بھی شکل میں استعمال کیا جاسکتا تھا، مجبور کر کے ان کے بیانات کی تبدیلی یا پھر ان کا خاتمہ تاکہ وہ عدالت میں پیش ہی نہ ہوں، حالانکہ جتنے بڑے نام ساند اکیس میں اب ملوث ہوئے تھے ان لوگوں سے اسے کسی حماقت کی توقع نہیں تھی کہ یہ کسی بھی طرح کوئی ایسا غیر قانونی قدم اٹھائیں گے، لیکن باقی ساری چیزیں قابل

”آپ کو رانا حبیب کے پاس جانا ہوگا، رانا محفوظ سے ملاقات کر کے آپ اس سے ساری صورت حال بتائیں اور یہ کہیں کہ ہاشم علی ساند خاندان کو بستی نور الہی سے فوراً کہیں ہٹا دیا جائے اس کا انتظام رانا محفوظ ہی کو کرنا ہوگا اس سے یہ بھی کہہ دیں کہ یہ انتہائی ضروری ہے اور اگر اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہ ہوئی تو ان لوگوں کی زندگیوں کو کوئی خطرہ بھی پیش آ سکتا ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ لوگ انہیں راستے سے ہٹانے کی کوششیں کریں گے۔“

”میں وکلاء صاحبان کی بات بالکل نہیں کرتا، لیکن راگ علی ساند انے جس پیمانے پر ان کارروائیوں کا آغاز کیا ہے آپ کو اس کا اندازہ ہے اور پھر وہ جس قسم کا انسان ہے، میرا تو خیال ہے کہ ہر وہ قدم اٹھانے کی کوشش کرے گا جس سے اس کی گلو خلاصی ہو جائے اور سچ بھی ہے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا ہوا شخص ہر وہ کام کر سکتا ہے جس کی توقع نہ کی جاسکے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں، بابو ارشاد کے خاندان اور اعجاز خان کا کیا ہوگا؟“ واسطی صاحب نے کہا۔

”ان دونوں کو میں سنبھالے لیتا ہوں، ان کی آپ فکر نہ کریں، میں دو باتیں سوچ رہا ہوں، یا تو وکلاء صاحبان انہیں عدالت میں پیش کر کے کسی طرح انہیں مجبور کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ خود ہی اپنے بیانات کی نفی کریں اور جہاں تک میرا اندازہ ہے اس کی ذمہ داری وہ کسی شخص پر ڈالیں گے، ممکن ہے وہ ڈی آئی جی نادر حیات صاحب ہوں..... دیکھنا یہ ہے کہ یہ لوگ کس انداز میں قدم اٹھاتے ہیں، بہر طور ان کا کام اپیل کو منظور کرانا ہے..... یہ ہونا نہیں چاہئے باقی ساری باتیں اپنی جگہ لیکن میں نہیں چاہتا کہ ساند خاندان سزا سے بچے۔“

”ٹھیک ہے میں سمجھ رہا ہوں، میں اپنا کام سرانجام دے لیتا ہوں۔“ واسطی صاحب نے کہا۔

”تو مجھے اجازت دیجئے، میں ٹیلی فون پر آپ سے یہ معلوم کروں گا کہ آپ نے اس کام کی تکمیل کر لی یا نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“

”اوکے مس بینا آپ بھی ذرا زحمت کیجئے گا، آئی ایم سوری اس وقت اصل میں اپنے

”یہ نام میرے علم میں آیا ہے۔“
”صرف نام؟“
”جی ہاں۔“

”غلط ہے..... تمہیں اس کی شخصیت کے بارے میں معلوم کرنا چاہئے تھا۔“
”کوئی اہم آدمی ہے۔“
”صرف اہم نہ کہو، انتہائی اہم..... ایک مشورہ دے رہا ہوں بڑا کارآمد ہے۔“
”حکم فرمائیے۔“

”خود جا کر اس سے مل لینا..... سلام دعا کر لینا بہت خوش ہو گا..... دوست بن گیا تو یوں سمجھو بہت سی مشکلات کا حل مل جائے گا۔ بڑے بڑے سیاسی لیڈر، مل اور انور کاروباری لوگ حاضری دیتے ہیں اس کے پاس۔“
”ضرور ملوں گا۔“ شہاب نے کہا۔
”ایک کیس کے سلسلے میں کچھ گفتگو کرنی ہے۔ اصل میں یہ کیس راگ علی ساندکا ہے بستی نور الہی کے راگ علی ساندکا کیس تمہیں یاد ہو گا، ابھی چند ہی روز گزرے ہیں اس کے لئے۔“
”جی سر۔“

”اور سنائے اس سلسلے میں ڈی آئی جی نادر حیات کے ساتھ تمہیں بھی کچھ نقصانات اٹھانے پڑے ہیں۔“

”جیسا کہ میں نے عرض کیا سر ڈی آئی جی صاحب کی عنایت تھی کہ انہوں نے مجھے پیش ڈیویٹیز میں لگا دیا جب کہ میں تھانہ بارہ درمی میں ایس ایچ او کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ بہر حال یہ تو افسروں کی مہربانی تھی کہ انہوں نے مجھے ترقی دی باقی دوسرے افسروں کی بھی مہربانی ہے کہ انہوں نے مجھے واپس یہاں بھجوا دیا لیکن یہ ایک حقیقت ہے جناب کہ میرا تجربہ ابھی نہ ہونے کے برابر ہے، میں تو ابھی بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہوں بجائے اس کے کہ مجھے کوئی بڑا عہدہ دے دیا جائے۔ آپ یقین کیجئے میں یہاں بہت خوش ہوں کیونکہ ابھی میرا ذہن اتنی وسعتیں نہیں پاسکا ہے کہ میں بڑے بڑے کیس دیکھوں۔“
”اس کیس کے سلسلے میں بھی یقیناً ڈی آئی جی نادر حیات صاحب ہی نے تمہیں گائیڈ

عمل ہو سکتی تھیں..... بیانات کسی خاص طریقے سے بدلوائے جاسکتے تھے، کم از کم یہ حصہ محفوظ ہو گیا باقی دیکھنا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے لیکن چونکہ ادھر سے بڑے زور و شور سے کارروائی کا آغاز ہوا تھا، اس لئے یہ لوگ بڑی محنت سے کام کر رہے تھے، اسی شام کوئی چھ بجے کے قریب جبکہ بینا نے ٹیلی فون پر یہ اطلاع دی تھی کہ اسے سوچنا ہوا کام مکمل ہو گیا ہے، باہر سے ایک کار آکر احاطے میں رکی تھی اور پھر طاہری صاحب اتر کر اندر داخل ہوئے تھے..... شہاب نے طاہری صاحب کو پہچان لیا..... شہاب نے بڑے احترام سے انہیں بلا کر بٹھایا اور طاہری صاحب مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے پھر بولے۔
”غالباً آپ کا نام شہاب ثاقب ہے۔“

”جی۔“
”پہلے کبھی آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔“
”جی طاہری صاحب میں تو بہت چھوٹا سا آدمی ہوں، بڑی معمولی شخصیت، آپ بے شک مجھے نہیں جانتے لیکن آپ کو کون نہیں جانتا۔“
”اوہو شکریہ شکریہ، بھئی ہمارا اور آپ کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے، کچھ پرائیویٹ گفتگو کرنی تھی، موقع مل سکے گا؟“

”بسر و چشم۔“ شہاب نے پراڈب لہجے میں کہا۔
”شکریہ۔“ شہاب کے اشارے پر بقیہ افراد باہر نکل گئے تھے۔ شہاب نے ان سے چائے وغیرہ کے بارے میں پوچھا تو طاہری صاحب نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔
”بخدا، حاجت نہیں ورنہ تکلف نہ کرتے کیونکہ نہایت دوستانہ تصورات لے کر یہاں پہنچے ہیں حالانکہ آپ سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن شناسائی حاصل کرنے سے ہی شناسائی ہوتی ہے۔“

”سر، میرے لئے اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اتنی بڑی شخصیت نے مجھے کسی قابل سمجھا۔“

”دیکھو عزیز بڑی ہر شخص کا ایک رنگ ہوتا ہے ایک طریق کار ہوتا ہے۔ کام ایک کرسی پر بیٹھ کر مکمل نہیں ہوتا بلکہ کرسی کے اطراف کا جائزہ بھی لینا ہوتا ہے۔ اس علاقے میں راؤ بونامانی ایک شخص رہتا ہے۔“

دوسرے سے اس مدد کا معاوضہ وصول کر رہے ہیں کیونکہ یہ ہمارا پرویشن ہے، سمجھ رہے ہیں یا آپ؟“

”جی سر کار اگر آپ جیسے لوگوں کا ہاتھ ہمداری پشت پر ہو جائے تب ہی ترقی کر سکتے ہیں بھلا آپ سے انحراف کر کے یا اقدار کا کوئی مینار بنا کر جی سکتے ہیں اس دنیا میں، ناممکن..... قطعی ناممکن۔“

”تمہاری پیشانی پر تحریر ہے کہ ترقی آخر کار تمہارے قدموں میں آکر رہے گی ڈیزر شباب بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر اور فکر ہی مت کرنا ہمارا تمہارا ساتھ رہے گا، بھی دیکھو نا ایک دوسرے کے تعاون ہی سے دنیا چلتی ہے۔ یہ پیسے رکھ لو پہلے گڈی میز پر پڑی اچھی نہیں لگ رہی بعد میں باتیں کریں گے۔“

”جی حضور۔“ شہاب نے نیاز مندی سے ایک لاکھ روپے کے نوٹوں کی گڈی اٹھا کر جیب میں ڈال لی اور طاہری صاحب ہنسنے لگے پھر بولے۔

”انسپکٹر صاحب رشوت کی رقم جیبوں میں نہیں رکھی جاتی، خیال رکھئے گا..... ابھی تو غیر کوئی بات نہیں ہے لیکن تجربے کی زبان سے کہہ رہا ہوں، اس رقم کو اپنے آپ سے جس قدر جلد ہو سکے دور کر دینا چاہئے اور بعد میں سکون سے اس کا حساب کتاب کرنا چاہئے۔ آپ اپنے تھانے میں ایسی کوئی تجوری ضرور بنانی پڑے گی جہاں آپ اپنی اس آمدنی کو منتقل کر سکیں، سمجھ رہے ہیں نا آپ؟“ شہاب کا منہ حیرت سے پھیل گیا..... ایک لمحے کے لئے وہ فونزدہ سا نظر آنے لگا۔ پھر اس نے کہا۔

”جی سر۔“ جی سر۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے مضطربانہ انداز میں دو تین بار جیب پر ہاتھ مارا تھا اور طاہری صاحب نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں، نہیں آپ بالکل مطمئن رہیں یہ کوئی اینٹی کرپشن کا کیس نہیں ہے یہ تو نارسے اور آپ کے درمیان تعاون کا معاملہ ہے، اچھا خیر چھوڑیئے ان باتوں کو تو آپ ذرا ہٹاں لائن آف ایکشن کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتائیے۔“

”بس جناب سب سے پہلے میری ملاقات جیل میں ایسے نوجوانوں سے کرائی گئی جن کا تعلق تھا کہ وہ بے گناہ قیدی ہیں اور جس جرم میں انہیں سزا کرائی گئی ہے انہوں نے وہ جرم نہیں کیا۔“

لائن دی ہوئی؟“

”گائیڈ لائن ہی کیا سر پور اکیس انہی کے اشاروں پر کیا گیا ہے..... سچی بات ہے میں اتنا ذہین انسان نہیں ہوں۔“

”خیر یہ کوئی خاص بات نہیں ہے تجربہ آتے ہی آتا ہے، بہت کچھ دیکھو گے تو سارا مسئلہ یہ ہے کہ راگ علی ساند صاحب کا معاملہ اتنا بگڑا ہوا نہیں تھا، جتنا اسے بگاڑ دیا گیا ہے بیچارے اچھے خاندان کے لوگ ہیں اور سکون کی زندگی گزار رہے تھے کہ یہ بے سکونی درمیان میں آگئی، سود و ست سود شمن، حالانکہ میں نے ساند صاحب سے کہا کہ کوئی ایسا نام منظر عام پر لے کر آئیں جس سے یہ اندازہ ہو کہ کسی نے ان کے خلاف اتنی بڑی سازش کی ہے لیکن اتنے نیک اور نفیس انسان ہیں کہ کسی کا نام لینے پر آمادہ نہیں ہوتے، میں یہ چاہتا ہوں ایس ایچ او صاحب کہ آپ مجھے اپنی لائن آف ایکشن کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتائیں، دیکھئے آپ اپنا فرض پورا کر چکے ہیں آپ نے اپنی دانست میں مجرموں کو کیفر کر دیا تک پہنچا دیا لیکن اگر آپ ہی کو بھنگا دیا گیا ہو تو مجرم کی حیثیت سے منظر عام پر لائے جانے والے مجرم ہی نہ ہوں تو..... میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں شہاب صاحب کہ عدالت میں تھوڑا سا بیان آپ کو دینا ہوگا، ہم آپ کو طلب کریں گے اس لائن آف ایکشن کی تفصیل بتانے کے بعد میں آپ کو گائیڈ کروں گا کہ آپ کو کیا بیان دینا ہے اور سنئے آپ بے شک یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس بیان دینے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے یا آپ کو آپ کا بیان تبدیل کرنے پر کیوں آمادہ کیا جاتا ہے تو اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ رانا صاحب نے ہم لوگوں سے رجوع کر کے بتایا ہے کہ یہ مسئلہ کسی ایسی شخصیت کا کھڑا کیا ہوا ہے جس کا نام وہ نہیں لینا چاہتے کیونکہ وہ شخصیت ان کے اپنے خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور ایس ایچ او صاحب ایک بات کا خیال رکھئے، آپ، ہر کام کا ایک معاوضہ ہوتا ہے ہر کوشش کا ایک جواز ہوتا ہے، میں نے ساند صاحب سے آپ کے لئے تین لاکھ روپے کی منظوری لی ہے۔ یہ ایک لاکھ بطور ایڈوانس آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، پارسیا عبادت گزار بننے کی کوشش نہ کریں وقت یہی ہے ہم لوگ اپنے مسائل سے نمٹنے کے لئے بہر حال کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلاتے ہی ہیں، آپ یہ نہ سوچیں کہ ایک بہت بڑا آدمی آپ کو رشوت دے رہا ہے، یہ تو ایک دوسرے کی مدد ہے، آپ میری مدد کر رہے ہیں میں رانا صاحب کی مدد کر رہا ہوں، ہم سب ایک

اب ہم اس سلسلے میں اپنی کارروائیاں کرتے ہیں تمہاری طرف سے تو پورا پورا یقین ہو گیا اور
ہاں وہ جو وکیس صاحب ہیں جنہوں نے یہ کیس لڑا ہے غالباً عدنان واسطی نام ہے ان کا۔“
”جی.....جی۔“

”وہ بھی پورا پورا تعاون کر رہے ہیں ہم سے، کیس کی نوعیت ہی بدلنا ہوگی۔“
”خادم ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہے۔“ شہاب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے
ہوئے کہا۔

”بس تو یوں سمجھ لو ترقی کے راستے تم پر کھل جائیں گے، اوکے اب اجازت۔“ طاہری
صاحب چلے گئے اور شہاب کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔



کلیم شاہ نے جیل میں راگ علی ساندات ملاقات کی پیار علی ساند ابھی راگ علی ساند
کے ساتھ ملاقات کے کٹھنرے میں آگیا تھا۔ نور علی ساند اب جیل کے ہسپتال میں منتقل
کر دیا گیا تھا کیونکہ اس کے زخم تو ٹھیک ہو گئے تھے لیکن بہر حال آنکھوں کا معاملہ جوں کا توں
تھا بہت برا وقت آپڑا تھا ان پر گو جیل میں انہیں کافی سہولتیں حاصل تھیں، لیکن پھر بھی
جیل جیل ہی ہوتی ہے کلیم شاہ نے ساند کو سلام کیا تو وہ جواب دیئے بغیر گرد آواز میں بولا۔
”اومیاں کیا کر رہے ہو تم لوگ کہیں چوڑے میں ہی نہ مروادینا یہاں نہ دن کو چین
ہے نہ رات کو نیند آتی ہے اور تم لوگ ہو کہ چار چار دن کے بعد چکر لگاتے ہو۔“
”ساندا صاحب، ساند صاحب قانون کو اب اس قدر مذاق بھی نہ سمجھیں آپ سزا
ہوئی ہے بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کو جیل سے نکال لیا جائے۔“
”اومیاں بہت کچھ ہوتا ہے کرنے والا چاہئے، یار تم لوگ تو مجھے عجیب لگ رہے ہو
کہیں فتانہ نہ کروادینا ہمیں۔“

”آپ نے اگر یہی بدحواسیاں جاری رکھیں تو نہ ہم کچھ کر سکیں گے اور آپ بھی کچھ
نہیں کر سکیں گے جو کچھ کیا جا رہا ہے آپ کے لئے ساند صاحب وہ اتنا ہے کہ آپ تصور بھی
نہیں کر سکتے، ہم نے اپنی زندگی میں اتنے پاپڑ کسی کے لئے نہیں نیلے۔“

”میاں بھائی دیکھو میں برے حالات کا شکار ہوں مگر کیا کروں عادتیں وہی بری کی بری
ہوئی ہیں، زبان نہیں رکتی میری، بات مت کرو کہ میری زبان رُک نہ سکے خیر چھوڑو

”یہ ملاقات کس نے کرائی تھی۔“

”ڈی آئی جی نادور صاحب نے۔“

”یہی تو سراسر انہیں مل رہا ڈی آئی جی نادور حیات صاحب کی کوئی براہ راست دشمنی تو تھی
نہیں ان لوگوں سے ویسے کبھی اس سلسلے میں تم نے نادور حیات صاحب سے کوئی سوال کیا۔“
”جی ہاں۔“ شہاب نے جواب دیا۔

”اوہ..... دیری گڈ، کیا کہا انہوں نے؟“

”انہوں نے بس یہی کہا کہ ایک نادر اور بے کس انسان نے ان سے درخواست کی تھی
کہ اس کا بھانجا جو ایک بیوہ اور اندھی ماں کا بیٹا ہے ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا ہے، جبکہ یہ ایک
بہت بڑا سلسلہ ہے اگر وہ کسی غمزہ ماں اور بے کس ماموں کی فریاد سن سکتے ہیں تو اس کیس کی
تفتیش کرائیں۔“

”ہوں..... تو یہ نیکیوں کے پہاڑ کا معاملہ تھا، ویری گڈ، ویری گڈ اس کا مقصد ہے کہ
ہم لوگ جو سراسر تلاش کر رہے ہیں وہ کوئی سرا، سرے سے ہے ہی نہیں..... خیر شہاب
صاحب پھر۔“

”ان لڑکوں سے میں نے معلومات حاصل کیں سب کے سب غریب غرباء کے بیٹے
تھے..... انہوں نے اس بارے میں تفصیل بتائی اور یوں ساند صاحب کا نام سامنے آیا، پھر ہم
نے مزید تفتیش کی اور بستی مہر جان کے واقعے سامنے آئے۔ یوں یہ سلسلہ چلتا چلا گیا، یہاں
تک کہ خانم گوہر جہاں بھی دریافت ہو گئیں جو بدر شاہ کے دونوں بیٹوں کو سنبھالے ہوئے
خاموشی سے زندگی گزار رہی تھیں، ان کی طرف سے کوئی تحریک نہیں تھی، بس وہ ان
بچوں کو زندہ رکھنا چاہتی تھیں، اسی طرح اعجاز خاں بھی ملا۔“ شہاب نے بڑی ذہانت کے
ساتھ پوری کہانی طاہری صاحب کو سنائی اور طاہری صاحب ایک کاغذ پر نوٹس لیتے رہے،
کافی تفصیلات معلوم کرنے کے بعد انہوں نے شہاب سے کہا۔

”ٹھیک ہے، ڈیئر شہاب تم سے رابطہ رہے گا۔“

”ٹھیک ہے سر آپ فکر ہی نہ کریں خادم ہیں آپ کے بھی اور ساند صاحب کے بھی۔“
”ساندا صاحب تو یوں سمجھو کہ تمہیں موتیوں میں تول دیں گے بڑے فراخ دل
انسان ہیں، کیا بیچارہ مصیبت میں پڑا ہے ایک بیٹا بھی شدید زخمی ہو گیا ہے۔ بہر حال ٹھیک ہے

ان باتوں کو یہ بتاؤ کیا ہو رہا ہے میرے لئے۔“

”بہت کچھ کیا گیا ہے لیکن بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

”سناؤ کوئی کہانی سناؤ، پہنچاؤ ہمیں پھانسی کے پھندے تک، اوسناؤ میاں کیا کہانی ہے؟“
”خانم گوہر جہاں بستی مہر جان سے غائب ہو گئی ہے، حالانکہ وہ وہاں پہنچی تھی لیکن اب وہاں نہیں ہے۔ اعجاز خان کا کوئی نام و نشان نہیں ہے، تمہارا بھائی ہاشم علی ساند اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ بستی نور الہی میں موجود نہیں ہے۔ بابور شاد غائب ہے، او میں کہتا ہوں ساند صاحب کیا کیا روگ لگا لئے آپ نے اپنی زندگی کے ساتھ، کہاں گئے یہ لوگ؟“

”میں بتاؤں..... ایں..... میں بتاؤں، یہاں جیل میں رہ کر میں تمہیں باہر کی باتیں بتاؤں، او میاں میرا تو اعتبار اٹھتا جا رہا ہے تم پر۔“

”صبر کریں صبر کریں، بات اصل میں یہ سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ پس پردہ کون ہے جو یہ ڈور ہلا رہا ہے۔“

”جو کوئی بھی ہے باہر نکلے دو مجھے ان حالات سے ذرا نمٹ لینے دو، جان بچ جانے کی امید ہو جانے دو سب منظر عام پر آجائے گا۔“

”ہم آپ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”کرو بھائی کرو۔“ راگ علی ساند نے کہا..... بہت نڈھال نظر آرہا تھا وہ ساری اکڑ سارا کرو فر نکل گیا تھا۔

”اگر اس سلسلے میں ہم آپ کے بھائی ہاشم علی ساند کو ملوث کر لیں تو؟ یہ ظاہر کریں کہ یہ سارا کھیل ہاشم نے کھیلا ہے تو کیسا رہے گا؟“

”ثبوت ہیں تمہارے پاس؟“

”اور بڑے صاحب کیا کہتے ہیں؟“

”نہیں ثبوت تو بے شک نہیں ہیں، لیکن اپیل میں یہ بات سامنے لائی جائے گی۔“

”کون بڑے صاحب؟“

”کلیم شاہ جی عقل کھو بیٹھے ہو کیا کہاں سے گھنٹی بلی ہے، کہاں سے تم لوگوں کو میرے پاس بھیجا گیا ہے۔“

”معافی چاہتے ہیں راگ علی ساند صاحب سمجھ نہیں پایا تھا میں کہ آپ ان بڑے

صاحب کی بات کر رہے ہیں۔“

”کوئی اور بات ہوئی اس طرف سے؟“

”نہیں، بھلا ہماری پہنچ وہاں تک کہاں ہے۔“

”خیر، خیر جہاں سے مدد کی ضرورت ہوگی میں نے پہلے بھی تم لوگوں کو بتا دیا ہے کہ بڑے صاحب سے ان ٹچر ہو کوئی مشکل پیش آئے تو ان سے مشورہ لے لو۔“

”ٹھیک ہے آپ سے بس ملاقات مقصود تھی آج شام کو پانچ بجے ہماری میٹنگ ہے اس میٹنگ میں ہم ٹوٹل لائن آف ایکشن سلیکٹ کر لیں گے اور اس کے بعد کام برق رفتاری سے شروع ہو جائے گا۔“

”او میاں کام موثر ہونا چاہئے، ایک دفعہ یہ سزا ختم کر دو اس کے بعد باہر آؤں گا اور پھر تمہیں دکھاؤں گا کہ راگ علی ساند کیا چیز ہے، اصل میں امید نہیں تھی جو مکھی کھیلی گئی ہے میرے ساتھ جو مکھی۔ کوئی ایک بندہ ہوتا تو دیکھتا سوچتا لیکن..... لیکن او میاں کلیم شاہ صاحب مجھے اطمینان تو دلاتے جاؤ کہ کچھ ہو جائے گا۔“

”ہو گیا ہے راگ علی صاحب ہو گیا ہے، وہ پولیس انسپکٹر اپنے قبضے میں آچکا ہے، بڑا ہلکا پھلکا بیان دے گا وہ وکیل صاحب بھی پوری طرح اپنے قابو میں ہیں..... ہمارے خلاف نہیں جائیں گے..... سب کو سنبھال لیا ہے ہم نے..... آپ بالکل فکر مت کریں ہمارا کام ہے ہم سنبھال لیں گے بس کچھ بیانات آپ کے لئے بھی ہوں گے اور آپ کو وہ کرنا ہوگا، سمجھ رہے ہونا آپ؟“

”جی..... جی، بالکل..... بالکل۔“

”بس تو پھر ذہن میں یہ تمام باتیں رکھئے گا باقی سب ٹھیک ہے، آپ فکر نہ کریں ہم نے آپ سے وعدہ کر لیا ہے وہی ہو گا جو آپ کی خواہش ہوگی، اچھا اب اجازت دیجئے۔“

”ٹھیک ہے مگر کم از کم ایک بندہ تو مل لیا کرو مجھ سے روزانہ، کان لگے رہتے ہیں اس آواز پر کہ ملاقات آئی ہے، ہزاروں کو کھلایا، ہزاروں کو پلایا نجائے کتنوں کو پالا لیکن اب ایک بھی ادھر کا رخ نہیں کرتا، واہ رہی دنیا بڑی عجیب ہے تو۔“

”میں اجازت چاہتا ہوں۔“ کلیم شاہ نے کہا اور اس کے بعد کمرہ ملاقات سے باہر نکل آیا۔



شام کو پانچ بجے تین بہترین دماغ ایک شاندار عمارت میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے، ان کے چہروں پر تشویش کے آثار تھے۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا انسپکٹر کا کہنا ہے کہ ڈی آئی جی نادر حیات صرف انسانی بنیاد پر اس کیس کی جانب متوجہ ہوئے تھے، ایک ایسے شخص نے اس سلسلے میں ان پر انسانی دباؤ ڈالا تھا جس کی اپنی کوئی حیثیت، کوئی آواز نہیں تھی اور انہوں نے جیل میں بند ان چاروں نوجوانوں کی دادرسی کرتے ہوئے اس کیس کو ری اوپن کیا تھا۔ یہ بات کافی حد تک سمجھ میں بھی آتی ہے کیونکہ نادر حیات کا کیریئر ایسا ہی ہے اور اب جب نادر حیات یہاں سے کافی فاصلے پر اپنے نئے مسائل سے اُلجھے ہوئے ہیں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہاں سے کوئی کارروائی کی جارہی ہو اور اس کے علاوہ ساند ا خاندان کا کوئی بھی ایسا جھگڑا ڈی آئی جی صاحب سے نظر نہیں آتا۔۔۔۔۔

اس سلسلے میں ہم پوری چھان بین کر چکے ہیں، چلئے یہ مان لیا کہ نادر حیات صاحب اپنی دانست میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن اب کیا ہو رہا ہے؟ سارے مہروں کا اچانک غائب ہو جانا بے معنی نہیں ہو سکتا۔ مسٹر ناصر جمال اس کے پس پردہ کچھ ہے، طاہری صاحب آپ کیا کہتے ہیں؟“

”میں تو خود حیران ہوں یعنی ہمارے تمام راستے مکمل ہیں لیکن ان لوگوں کا اچانک غائب ہو جانا میرے لئے خود باعث تشویش ہے۔“

”ہمیں واقعات کی نوعیت تھوڑی سی تبدیل کرنی ہوگی، سمجھ رہے ہیں آپ؟“

”مثلاً؟“

”دیکھئے ہاشم علی ساند ابراہ راست ان میں سے کسی معاملے میں ملوث نہیں معلوم ہوتا نہ ہی راگ علی ساند ا کے کیس میں ہاشم علی ساند ا اس کے بیٹے آصف علی ساند ا وغیرہ کا کوئی ہاتھ نظر آتا ہے اور ویسے بھی وہ مرنجان مرنج لوگ ہیں، ہم جائزہ لے چکے ہیں اس بات کا اس لئے ان کی طرف سے تو کسی بڑی کارروائی کا خدشہ ہی نہیں رہتا لیکن ہمیں اپنی اس اپیل کو مضبوط بنانے کے لئے کچھ مضبوط سہارے درکار ہیں، تمام تر معلومات حاصل کرنے سے کچھ پوائنٹس سامنے آئے ہیں۔ مثلاً کچھ عرصے قبل ہاشم علی ساند ا نے اپنی زمینیں راگ علی ساند ا کی زمینوں میں ضم کر دی تھیں اور اپنی رہائش گاہ چھوڑ کر راگ علی ساند ا کی حویلی میں آسا تھا۔۔۔۔۔ اپنے پورے اہل خاندان کے ساتھ ہم اس واقعے کو نقش کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ

”کمال کی بنیاد ہے صاحب، کمال کی بنیاد ہے، ویری گڈ، آخر دماغ ہے آپ کے پاس، کوئی معمولی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر آپ لوگوں نے طے کر لیا۔“

”بالکل، دیکھئے بات اصل میں یہ ہے کہ ہم راگ علی ساند ا کے دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کا ٹھیکہ تولے نہیں رہے ہیں، ہمارا کام تو صرف اتنا سا ہے کہ راگ علی کی اپیل کامیاب ہو جائے، تھوڑے سے شبہات پیدا کر دیئے جائیں تاکہ اسے موت کی سزا نہ ملے۔۔۔۔۔ باقی کچھ اس کے اپنے معاملات ہیں جن میں وہ کام کرے گا، تھوڑی سی مدد ہماری کیا کہتے ہیں۔“

”میںوں سننے لگے تھے اور یہ بات طے ہو چکی تھی کہ آغاز یہیں سے کیا جائے۔“



”یہی تو خرابی ہے صاب، ہم نے ابھی ڈسپلن نہیں سیکھا، ہمارا کھوپڑی خراب ہے، دیکھو صاب ہم برا آدمی نہیں ہے پر کیا بتائے آپ کو ہمارا ایک بیک گراؤنڈ ہے، ہمیں ڈسپلن مت سکھاؤ ہمیں بالکل ڈسپلن نہ سکھاؤ صاب، ورنہ ہم سے خرابی ہو جائے گا، ابی کیا فائدہ وردی پہن کر آپ کو سلوٹ کیا، ہمارے ہاتھ میں بندوق آیا اور بندوق صاف کرتے ہوئے آپ کو گولی لگ گیا، جوان آدمی ہو آپ، ہم نے کبھی ڈسپلن کا پابندی نہیں کیا صاب، آئندہ بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہو گا آپ ہمیں ڈسپلن نہ سکھاؤ، اگر بنا سکتے ہو تو ہمیں آدمی بنا دو۔ ہم کسی کو بلا وجہ قتل نہیں کرنا چاہتے، آپ ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے۔ بندوق تو بندوق ہے غلطی سے چل گیا زیادہ سے زیادہ ہمیں تھوڑا سا سزا ہو جائے گا پر اس سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ہم نے گیارہ قتل کئے ہیں صاب جس علاقے کا رہنے والا ہم ہے، ادھر دشمنی ایمان ہوتی ہے صاب۔ ہمارے دادا سے دشمنی شروع کیا گیا، ہم نے اپنا فرض پورا کرتے ہوئے دشمن کے گیارہ آدمی مارے ابھی ادھر بھی بہت سے لوگ زندہ ہیں اور ہماری طرف بھی، ہم نے اپنا فرض پورا کیا تو ہم کو شہر آنے کا اجازت مل گیا۔ صاب ادھر آیا ہے اپنا کام کرتا ہے خاموشی سے خراب لوگ کو فٹ کر دیتا ہے اچھا لوگ کا خدمت کرتا ہے، ابھی ہم آدمی نہیں ہے تو بولو ہم کیا کرے، دیکھو صاب آپ ہمیں مارو، اتنا مارو صاب کہ ہمیں چوٹ لگے کا احساس ہو۔ اگر آپ ہمیں یہ احساس دلادیا تو ہم آپ کا ایسا غلام بن جائے گا کہ آپ سوچ بھی نہیں سکے گا لیکن صاب آپ نے دشمنی کا بنیاد ڈالا ہے..... اگر آپ نے ہمیں نہیں مارا تو ہم آپ کو مارے گا اور اتنا مارے گا خدا کا قسم کہ آپ کا ہوش قائم نہیں رہے گا۔ ہم کیا کرے ہمارا دماغ ہی خراب ہے صاب، ابھی ہمارا آفیسر مت بنو۔ ہم بھی وردی پہن کر نہیں آیا آپ بھی مت پہنو، ہمیں مارو صاب اور اگر آپ ہمارے ہاتھوں سے خود پٹ گیا تو پھر ہمیں ڈسپلن نہ سکھانا، برداشت کر لینا ہمیں صاب، آپ فیصلہ کرو نہیں تو کاغذ آپ کے پاس ہے۔ ہمیں پھر سپینڈر کرو ہیڈ آفس بھجوادو ہمارا سروس ٹرینٹ کرو صاب جو آپ کر سکتے ہو آپ کرو اور پھر جو ہم کر سکتا ہے وہ ہم کرے گا ابھی دیکھو برامانے کا بات نہیں ہے ہم نے اپنا پرابلم آپ کو بتا دیا ہے صاب، فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے آپ ہمارا بے عزتی کر چکے ہو، ہمیں اتنا چانس دو۔“

شہاب حیرانی سے اس عجیب و غریب شخص کو دیکھ رہا تھا، پھر اس کے ہونٹوں پر

آٹھواں دن تھا گلاب جان کی معطلی کا وقت ختم ہو گیا تھا، وہ تھانے کی عمارت میں آیا اس دوران اس کے پرانے رفقاء نے اس سے ملاقات کی کوششیں کی تھیں، لیکن گلاب جان اپنی رہائش گاہ پر ملا ہی نہیں تھا..... شہاب نے بھی اس کے بارے میں کسی سے کوئی سوال نہیں کیا تھا..... اصل میں ابھی وہ پوری طرح تھانے کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا..... راگ علی ساندانے جس طرح تمام معاملات طے ہو جانے کے بعد ہاتھ پاؤں مارے تھے وہ واقعی ایک نئی بات تھی اور شہاب اس کا گہری نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا..... عدنان واسطی کو اس نے مکمل طور سے تینوں وکلاء کے ساتھ تعاون کی اجازت دے دی تھی۔ مینا بھی خاموش تھی اور شہاب کے چہرے پر چھائے ہوئے سکوت کو دیکھتی رہتی تھی۔ ان دنوں شہاب کی فطرت میں ایک عجیب سی تبدیلی رونما ہوئی تھی اور مینا وغیرہ اسے محسوس کر رہے تھے..... ایسے ہی لمحات میں بد قسمت گلاب جان واپس آیا تھا..... دوسرے لوگ اسے دیکھ کر چونک پڑے تھے..... اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ گلاب جان کی اپنی ایک ہسٹری تھی اور چند افراد اس ہسٹری کو جانتے تھے لیکن نئے انچارج صاحب نے اس بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں کیا تھا تو وہ لوگ کیا کرتے، بہر حال اس وقت سب نے سنسنی خیز نگاہوں سے گلاب جان کو دیکھا تھا جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر ہیجان کے آثار تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کچھ ہونے والا ہے..... گلاب جان کسی سے کوئی گفتگو کئے بغیر شہاب کے کمرے میں داخل ہو گیا..... شہاب کسی فائل پر جھکا ہوا تھا، آنے والے کی آمد کو تو اس نے محسوس کر لیا تھا لیکن نظر فائل کو دیکھنے کے بعد ہی اٹھائی اور گلاب جان کو دیکھا..... گلاب جان نے اسے دیکھ کر دانت نکال دیئے..... باقی لوگ چھپ کر اس سنسنی خیز صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے، گلاب جان نے کہا۔

”ہمارا نام ختم ہو گیا ہے صاب، آپ نے سات دن کے لئے معطل کیا تھا، آج آٹھواں

دن ہے۔“

”ڈیوٹی جوائن کرنے آئے ہو؟“ شہاب نے پوچھا۔

”آپ بولو صاب کیا کرے؟“

”وردی پہن کر آؤ، کمرے میں میرے سامنے پیش ہو ڈسپلن سیکھ لیا ہے یا نہیں۔“

لی تھی اور شہاب کو یقیناً یہ احساس نہیں تھا کہ حملہ اس قدر جلد ہو جائے گا۔ لوگوں کا اندازہ تھا کہ وہ مار کھا گیا لیکن دونوں ہاتھ آستینوں میں پھینے ہونے کے باوجود اچانک ہی شہاب گھوما اور ایک نپلی تلے لات گلاب جان کے سینے پر پوری قوت سے پڑی۔ گلاب جان کے حلق سے چیخ کی آواز نکلی اور وہ اپنا توازن نہ سنبھال پایا اور چاروں شانے چت ہو گیا لیکن اس نے پھر تیلی بلی کی طرح کروٹ بدلی اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا، اس دوران شہاب اپنا کوٹ اتار چکا تھا اور اب آستین کے بٹن کھول رہا تھا..... گلاب جان نے پھر طاقتور بھینسنے کی طرح گردن تھوڑی سی جھکا کر شہاب پر حملہ کیا لیکن اس باو بھی اسے اسی داؤ پر رکھا گیا لیکن لات سینے پر نہیں ماری گئی تھی بلکہ گلاب جان کے بدن کے نچلے حصے کو نشانہ بنایا گیا تھا اور اس لات کی ضرب بھی شاید اتنی ہی طاقتور تھی کہ گلاب جان کے مسلز چڑھ گئے وہ کسی قدر لنگڑائے ہوئے سے انداز میں پیچھے ہٹ گیا۔ شہاب نے آستین اوپر کر لیں اور بازوؤں کو آگے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”دوسری لات میں نے اس لئے تمہارے سینے پر نہیں ماری گلاب جان کہ تمہاری پھلیاں نہ ٹوٹ جائیں۔ آؤ اب میں تیار ہوں اور دیکھ لو میں نے جوتا بھی اتار دیا ہے تاکہ اس کی تختی تمہارے بدن پر زخم نہ بنا جائے۔“ گلاب جان نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا بدن سے شعلے سے اٹھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے، اس نے نشے کے سے عالم میں دونوں ہاتھ پھیلا کر ایک بار پھر شہاب پر حملہ کیا اور اس بار شہاب نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھادیئے تھے تاکہ گلاب جان اس کے بدن کو اپنی گرفت میں لے لے اور گلاب جان نے ایسا ہی کیا، اس نے شہاب کی کمر کے گرد داؤ لگا کر اسے خود سے بھیج لیا۔ شہاب کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اس نے آہستہ آہستہ ہاتھ نیچے کئے اور پھر گلاب جان کے بازوؤں کی گرفت میں اپنے پنجوں سے جگہ بنانے کی کوشش کرنے لگا، اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس گرفت میں داخل کئے اور پھر بازوؤں کی قوت سے گلاب جان کی گرفت کو ختم کرنے لگا اور اس وقت دیکھنے والوں کی آنکھیں شدت حیرت سے پھیل گئیں جب انہوں نے گلاب جان کے ہاتھوں کی گرفت شہاب کی کمر سے ختم ہوتے ہوئے دیکھی شہاب نے یہی نہیں کیا بلکہ اس کی کلائیوں کو اپنی گرفت میں لیا اور انہیں موڑ کر گلاب جان کی کمر پر اس کے دونوں ہاتھ کس دیئے..... گلاب جان نے پوری قوت سے اپنا سر شہاب کے چہرے پر مارنے کی

مسکراہٹ پھیل گئی اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے گلاب جان، مجھے اس تھانے میں اپنا کنٹرول قائم کرنا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ جو لوگ کام کرتے ہیں میرے وفادار ہوں، مجھے اپنا پرالہم بتائیں اور میں ان کی مشکل حل کروں..... ٹھیک ہے میں تمہاری مشکل حل کرنے کو تیار ہوں، تم میرے ہاتھوں سے مار کھانا چاہتے ہو نا؟“

”دو بات بولا صاب، یہ وردی اتارے گا آپ، ہمارا افسر بن کر ہم سے فائٹ نہیں کرے گا، بلکہ دشمن کی طرح سامنے آئے گا اور ہمیں مارے گا، ہم بھی آپ کے ساتھ رعایت نہیں کرے گا صاب، آپ کو ہمارا یہ بات ماننا پڑے گا۔“

”تیار ہوں گلاب جان، چلو کسی مناسب جگہ چلتے ہیں۔“

شہاب اپنی کرسی سے اٹھ گیا اور باہر کھڑے ہوئے تمام لوگوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔ گلاب جان کا تن و توش اور اس کا ماضی سب کے علم میں تھا۔ یہ نرم و نازک سا انسپکٹر اپنی زندگی کا سب سے بدترین کھیل کھیلنے جا رہا تھا۔ ان لوگوں کے خیال میں صرف وردی گلاب جان کے ہاتھ روک سکتی تھی ورنہ وہ ایک خونخوار بھیڑیا اور ایک طاقتور گینڈا تھا۔

دونوں باہر نکل آئے..... تھانے کے عقب میں کو اڑ رہے ہوئے تھے..... درمیان میں کچی جگہ تھی ان کا رخ اسی طرف ہو گیا..... دوسرے لوگ اس قانون گاہ میں غیر قانونی کھیل کے مخالف تھے لیکن کسے روکتے، تھانہ انچارج اپنی جگہ درست تھا کہ اسے یہاں ڈسپلن قائم کرنا تھا..... گلاب جان ذہنی مریض تھا اور اس سے سب ہی خائف رہتے تھے۔ شہاب نے جوتے کے فیتے کھولے جوتا اتار کر ایک طرف ڈال دیا۔ گلاب جان کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ رہی تھیں اس کے اندر ایک بے چینی محسوس کی جا رہی تھی، وہ اپنے شکار پر ٹوٹ پڑنے کے لئے پر تول رہا تھا، ہاتھوں کی مٹھیاں کھل رہی تھیں اور بند ہو رہی تھیں، دانت کچکا رہا تھا، جبروں کے مسلز ابھرے ہوئے تھے آنکھیں کسی خونخوار چیتے کی مانند اپنے شکار پر جمی ہوئی تھیں، یقینی طور پر شہاب کے جسم پر موجود پھول لگے کوٹ نے اسے باز رکھا تھا۔ شاید وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال پاتا۔ شہاب نے کوٹ کے بٹن کھولے اور اسے اتارنے لگا پھر جیسے ہی اس کے شانوں سے کوٹ کھینچا اتر گیا گلاب جان نے وحشی چیتے کی مانند اس پر چھلانگ لگائی اور وہاں موجود لوگوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ گلاب جان کی زنجیر کھل

جان کو پھر زمین سے دے مارا..... زمین بے شک کچی تھی لیکن ٹھوس تھی۔ گلاب جان کی ہڈیاں کڑکڑا گئیں اور وہ ایک بار پھر اپنے بدن کو سانپ کی طرح تل وینے لگا۔

”کھڑے ہو جاؤ..... کھڑے ہو جاؤ گلاب جان۔“ شہاب نے کہا اور جب اس سے نہ کھڑا ہوا گیا تو اس نے گلاب جان کے بال پکڑ کر اسے پوری قوت سے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور پھر ایک ہاتھ اس کی گردن اور شانوں کے ایک مخصوص حصے پر مارا اور گلاب جان کے حلق سے پھر دھاڑ نکل گئی۔ درحقیقت وہ شہاب کو ایک تھپڑ نہ لگا سکا تھا اور شہاب نے اس کی وہ درگت بنادی تھی کہ دیکھنے والے صرف آنکھیں پھاڑ کر ہی رہ جائیں انہیں یقین نہ آئے کہ یہ سب کچھ اس شخص نے، اس شخص کے ساتھ کیا ہے جو کوئی، جوڑ کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ گلاب جان دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلا کر چکر کاٹنے لگا اور اس کے بعد دھڑام سے زمین پر گر گیا، بے ہوش ہو گیا..... شہاب نے اسے دیکھا، آستین سیدھی کیں، ہٹن لگائے، کوٹ جو ایک طرف ڈال دیا تھا اٹھا کر بدن پر پہنا اور پھر دوسرے لوگوں کی طرف رخ کر کے بولا۔

”اسے احتیاط سے اٹھا کر کمرے میں لے جاؤ، اس کے بدن کی مالش کرو ہوش میں لانے کی کوشش کرو، ہوش آجائے تو پانی وغیرہ پلاؤ اس کی حالت بہتر ہونی چاہئے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی جانب چل پڑا۔

ساکت کھڑے لوگ متحرک ہو گئے۔ گلاب جان کو کئی افراد نے مل کر اٹھایا اور بڑے کمرے میں لے گئے۔

”اے ہسپتال لے چلیں؟“ کسی نے کہا۔

”اے ہسپتال داخل ہونا پڑے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”اس نے جتنا کہا ہے اتنا کرو۔ اسے جان چکے ہو۔“

دوسرے ایس آئی نے کہا..... گلاب جان کا جائزہ لیا گیا۔ ہڈیاں نہیں ٹوٹی تھیں لیکن گوشت ہر اس جگہ سے کچل گیا تھا جہاں شہاب کی ضرب پڑی تھی۔

”دیکھ رہے ہو؟“ ایس آئی بولا۔

”اسے کیا ہو گیا تھا..... یہ تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکا۔“

”نہی بات نہیں ہے بس یوں سمجھو اونٹ پہاڑ تلے آگیا تھا۔“

کوشش کی لیکن شہاب نے گردن ایک سمت موڑ لی اور پھر ایک عجیب داؤ لگایا، اس نے گلاب جان کے پکڑے ہوئے ہاتھوں کو نجانے کس طرح جھنکادیا اور خود نیچے جھک گیا..... دوسرے لمحے گلاب جان اس کے شانوں پر تھا اور پھر شہاب نے اسے شانوں پر سے اٹھا کر زمین پر دے پینچا..... گلاب جان کا بدن ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ شہاب نے نیچے جھک کر اس کے دونوں پاؤں پکڑے اور انہیں ایک مخصوص انداز میں موڑ کر پیچھے کر لیا اور خود گلاب جان کی کمر پر سوار ہو گیا۔ گلاب جان کے حلق سے کربناک چیخیں نکلنے لگی تھیں اور دیکھنے والوں کے حلق سے آوازیں نکل گئی تھیں..... گلاب جان جیسے دیو قامت کو اس طرح بے بس کر کے مارنا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی، نیا انسپکٹر جو کوئی بھی تھا درحقیقت تھانے پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے قابل تھا۔ شہاب جانتا تھا کہ گلاب جان جنونی آدمی ہے تھوڑی ہی سی باتوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا اس لئے اس داؤ سے گلاب جان کو اپنی زبان سے شکست تو تسلیم کر انہیں سکتا تھا اور اگر یہ داؤ زیادہ دیر تک لگائے رکھتا تو پھر گلاب جان کی ریڑھ کی ہڈی ہی ختم ہو جاتی اور اس کے بعد وہ ناکارہ ہو جاتا لیکن اس نے یہ کہہ کر گلاب جان کے پاؤں چھوڑے تھے کہ گلاب میں نہیں چاہتا کہ تم جیسا کارآمد آدمی اپنی ریڑھ کی ہڈی سے محروم ہو جائے اور بے بسی سے زمین پر پاؤں رگڑتا رہے، چلو کھڑے ہو جاؤ..... یہ کہہ کر شہاب پیچھے ہٹ گیا تھا..... گلاب جان اس بار اس پھرتی کا مظاہرہ نہیں کر سکا جواب تک کر تا چلا آیا تھا، لیکن وہ کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا، البتہ پیروں اور کمر کے ساتھ جو حشر ہوا تھا وہ اسے کھڑا ہونے میں مدد نہیں دے رہا تھا اور وہ لڑکھڑا رہا تھا..... شہاب نے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔

”میں تمہیں سنبھلنے کا موقع دیتا ہوں اس وقت تم بے بسی کے عالم میں ہو اس لئے میں تم پر وار نہیں کر رہا چلو اپنے آپ کو سنبھال کر مجھ پر وار کرو۔“ گلاب جان نے شراپیوں کی طرح جھومتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ گھونسنوں کی شکل میں گھمائے لیکن اس کی ریڑھ کی ہڈی اور پاؤں اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، وہ آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا۔ شہاب انتظار کرتا رہا پھر بولا۔

”کیا میں تمہارے قریب آ جاؤں؟“ گلاب جان نے شدید وحشت کے عالم میں پھر اسے دیکھا دانت کچکچائے اور اس بار اس نے اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کر کے پھر شہاب پر حملہ کیا، لیکن شہاب نے اسے اسی کی مانند اپنے بازوؤں میں دو بوجا، کمر کو تھوڑا سا خم دیا اور گلاب

”ایک مجرم کی پشت پناہی کی جارہی ہے یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“
”ہاں۔“

”اور وہ اتنا طاقتور ہے کہ انتظامیہ میں تبدیلیاں کرا سکتا ہے آپ کا تھوڑا سا پاؤں پھنسا ہوا ہے اس لئے انہوں نے آپ سے بھی رجوع کیا ہے..... دوسری صورت میں آپ کیا کرتے ڈیڈی۔ زیادہ سے زیادہ اپنے فرض اور نیک نیتی پر شبہ ہو جاتا..... یہ دروازے اب بھی کھلے ہوئے ہیں۔ انہیں فون کر کے بلائیے رقم واپس کیجئے اور کہہ دیجئے کہ آپ حق گوئی کریں گے..... اپنے بیان میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے۔ ڈیڈی آپ کو کوئی نہیں روکے گا۔“
”میں سمجھا نہیں بیٹا؟“

”بہت بری بات ہے ڈیڈی، بہت افسوس ناک بات ہے شہاب پامردی سے حالات کا مقابلہ کر رہا ہے اور میں آپ کو ایک بات بتا دوں نوٹ کر لیجئے سارا راک علی ساند اور اس کے بیٹوں کا قصور ہے وہ کچھ لوگوں کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن شہاب کا فیصلہ اہل ہے میں دعویٰ کرتی ہوں۔“
”ارے بھئی، تم برامان گئیں۔“

”نہیں، ڈیڈی..... آپ کی پریشانی پسند نہیں آئی مجھے..... یہ تو ایک عمل ہے جو ہو رہا ہے میرے خیال میں تو اسے جاری رہنے دیں کیونکہ شہاب یہی چاہتا ہے۔“
”ہاں ہاں تو میں نے کیا کیا ہے..... بس کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“
”سمجھ کر فیصلہ کرنا تو خود پرستی ہے..... اسے کسی پر اعتماد تو نہیں کہا جاسکتا۔“ بیٹا نے کہا..... واسطی صاحب اسے دیکھتے رہے پھر مسکرا دیئے۔
”تجھے اس پر بہت اعتماد ہے۔“

”روحانی حد تک ڈیڈی..... وہ صرف ایک انسان نہیں..... ایک مشن ہے ڈیڈی ایک مشن ہے وہ۔“

”اچھا بابا ٹھیک ہے سوری۔ مگر وہ کیا کر رہا ہے؟“

”خبرور کچھ کر رہا ہوگا اور ہمیں علم نہیں ہے..... اس لئے یہ ضروری ہوگا کہ ہمیں علم نہ ہو..... آپ لوگ اس سے تعاون کر رہے ہیں تو صرف تعاون کریں اور اگر یہ تعاون آپ کے مزاج کے خلاف ہے تو اس سے منع کر دیں، لیکن منع کرنا ضروری ہے تاکہ وہ آپ پر

”اس سے ایک اندازہ ہو گیا ہے وہ یہ کہ احتیاط رکھنی پڑے گی۔ وہ اور ہی آفسر معلوم ہوتا ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ وہ تمام ہدایات یاد کر لو جو اس نے دی ہیں۔ دو باتیں ہیں یا تو ان ہدایات پر عمل کرو یا پھر یہاں سے کسی اور تھانے میں تبادلہ کرالو۔“
”اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔“ بہت دیر کے بعد گلاب جان کو ہوش آیا تھا۔
”کیسی حالت ہے گلاب جان؟“ اس کے سرائی میں آئی نے پوچھا اور گلاب جان نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر آہستہ سے بولا۔
”مجھے میرے گھر پہنچا دو۔“



پراسرار عمل جاری تھا۔ ناصر جمال اور طاہری صاحب وغیرہ کا رابطہ ایک طرف عدنان واسطی سے تھا تو دوسری طرف شہاب سے کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ انہوں نے دونوں کو تعاون پر آمادہ پایا تھا..... واسطی صاحب کو پچاس ہزار روپے دے دیئے گئے تھے جنہیں انہوں نے نیاز مندی سے قبول کر لیا تھا اور ساری رات نہیں سو سکے تھے..... بیٹا ان کی یہ بے کلی محسوس کر رہی تھی۔

ناشتے پر واسطی صاحب نے کہا۔ ”بیٹا!“

”جی ڈیڈی۔“

”کچھ الجھن محسوس کر رہا ہوں بیٹی۔“

”مجھے بتائیے ڈیڈی۔“

”میں نے اپنا ہاتھ کبھی ایسی رقم کی طرف نہیں بڑھایا جو میری جائز فیس کی نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے، میں جانتی ہوں ڈیڈی۔“

”کیا کروں؟“

”خاموشی سے حالات کا تجزیہ کیجئے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو ایسا شہاب کی وجہ سے کرنا پڑا ہے تو مجھے میرے سوال کا جواب دیں۔ فرض کریں ان لوگوں کا معاملہ کسی اور افسر سے ہوتا اور وہ براہ راست آپ سے ملنے تو آپ کیا کرتے۔“
”نہیں میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“

میں اور اُجاگر تھا، لیکن راگ علی خوش نہیں تھا۔

حق داروں کو انعام مل گیا تھا۔ سب کے کام ختم ہو چکے تھے لیکن راگ علی خوش نہیں تھا اس نے اپنے ملازم خاص، بندہ خدا سے کہا۔

”بندہ خدا ایک بات مانتا..... سچ بولے گا؟“

”کیوں نہیں مالک۔“

”ہماری سزا پر بستی میں سوگ منایا گیا تھا؟“

”سوگ۔“ بندہ خدا نے آہستہ سے کہا۔

”بستی والوں نے کالے کپڑے پہنے تھے کیا اس دن بستی میں چولہے نہیں جلے تھے۔“

”ایسا تو نہیں ہوا تھا مالک۔“

”نہیں ہوا تھا؟“

”نہیں مالک۔“

راگ علی زور سے ہنسا پھر بولا اور ہماری رہائی پر دیکھیں چڑھ گئیں، بستی سجادی گئی، لاکھوں لٹا دیئے گئے کیا..... یہ سب مکاری نہیں ہے۔ نہیں بندہ خدا..... یہ سب موت کا کھیل ہے..... سورج کی پوجا ہے..... انہوں نے دیکھا کہ سورج تو پھر چڑھ گیا ہے ہمیں کس نے بچایا جانتا ہے بندہ خدا؟“

”جی مالک؟“

”دولت نے..... ہماری دولت نے۔ کروڑوں خرچ کر کے ہم نے زندگی پائی ہے..... کروڑوں خرچ کر کے جشن منانے والوں کے پاس بہت کچھ ہے۔ کیوں ہے ان کے پاس یہ سب کچھ.....! یہ جشن مناتے ہیں لوگ نہیں، انہیں صرف جشن پسند ہے..... ہمارے بجائے کسی اور کا یہاں داخلہ ہوتا..... ہماری جگہ تو بھی یہ جشن مناتے اس کے اعزاز میں۔ بڑے خوش مزاج لوگ ہیں یہ..... بڑے زندہ دل، مگر وہ سب کہاں گئے۔“

”کون مالک؟“

”ہمارا غلام اعجاز خاں، ہمارا بھائی ہاشم علی اور وہ خادم شاہ کی بیوہ..... سارے کہاں غائب ہو گئے؟“

”میرا کیا ہو گا ڈیڈی میرا کیا ہے گا؟“ نور علی ساندانے فریادی لہجے میں کہا۔

اعتماد کر کے مشکل میں نہ پڑ جائے۔“

”خدا سے اس کے مشن میں کامیاب کرے۔“ واسطی صاحب نے کہا۔



سب منحصر میں تھے..... یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ ساری کارروائی کے پس پردہ کون ہے۔ راستے ہموار تھے بس ایک خوف تھا ایک احساس کہ اگر کوئی طاقتور ہاتھ پس پردہ ہے تو اس کا عمل کیا ہو گا۔ بہر حال اس خطرے کے پیش نگاہ کارروائی تو نہیں روکی جاسکتی تھی۔ ہائی کورٹ کے لئے مدلل موقف تیار کر لیا گیا تھا۔ عدالت عالیہ کو بھٹکانے کے لئے ایک کہانی گھڑی گئی تھی، چنانچہ یہ کہانی منظر عام پر آئی۔

”کچھ ایسے پراسرار عوامل اس پوری کارروائی میں کارفرما رہے جناب عالی کہ ان کی کبھی مدافعت نہیں کی جاسکی۔ چھوٹے بیٹے کا قتل اس کے بعد بستی مہر جان میں دہشت ریزی کا ایک مقصد جو ساندوں سے منسوب کر دیا گیا اور پھر اصل مجرموں کو بے گناہ ثابت کر کے گم کر دیا گیا تاکہ حقائق ضم کر دیئے جائیں..... انہیں آزادی انعام دی گئی۔ ایک ذاتی ملازم اعجاز خاں سے پانچ لاشیں برآمد کرا کے انہیں بھی ساندوں کی کہانی قرار دیا گیا اور اعجاز خاں اپنا پارٹ پلے کر کے منظر عام سے غائب ہو گیا لیکن..... کسی نے جواں سال نور علی ساندانے پر کئے جانے والا ظلم قبول نہیں کیا جسے آنکھوں سے محروم کر دیا گیا..... ایک طاقتور دماغ نے راگ علی ساندانہ کو فنا کرنے کے سارے کام مکمل کر لئے اور کامیابی حاصل کر لی لیکن..... عدالت عالیہ سے رحم کی امید ہے..... وہ سب کینوس سے ہٹ گئے جو مدعی تھے..... فیصلہ عدالت کر سکتی ہے۔“

عدالت نے فیصلہ کیا۔

راگ علی ساندانہ..... پیار علی ساندانہ..... نور علی ساندانہ کی سزائے موت منسوخ کر کے

انہیں بری کیا جاتا ہے۔



دوسری پیشی میں ہی جوہر کھل گئے تھے، چنانچہ حویلی میں اطلاع دے دی گئی تھی کہ راگ علی کے استقبال کی تیاری کر لی جائے..... راگ علی بستی نور الہی میں داخل ہوا تو پوری بستی استقبال کے لئے تیار تھی۔ ساری بستی کو سجایا گیا تھا۔ جشن کا سماں تھا اور یہ سماں حویلی

تیرا؟“ راگ علی ساندانے اندھے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔

”تمہاری دولت میرے کام نہیں آسکتی..... کیا میں یونہی بے نور رہوں گا۔ اس سے اچھا یہ نہیں تھا کہ تم ان ساری کارروائیوں کا الزام مجھ پر لگو اور مجھے پھانسی لگوا دیتے۔“
”نہیں نور علی نہیں، تیری آنکھیں واپس آنی چاہئیں..... کم بختو، فرصت ہی نہیں لینے دیتے..... مصروف رکھتے ہو..... پیار علی انتظام کرو سارے بندوبست کردو۔ ہماری جائیداد اور زمینوں کو سنبھالنے کے..... ہم روشنی کی تلاش میں نکلیں گے..... ہم اپنے بیٹے کے لئے روشنی خریدیں گے۔“

”کہاں سے ڈیڈی؟“ پیار علی نے پوچھا۔

”یورپ، جرمنی، امریکہ یہ جگہ..... جہاں ماہر فن موجود ہیں..... ہم جدید سائنس سے رجوع کریں گے..... ہم اعلان کریں گے کہ نور علی کو آنکھیں دے دو اور اپنی پشتوں کو فکر معاش سے آزاد کر دو..... ہو سکتا ہے کچھ ہو جائے ہم سائنس خریدیں گے۔“
”ابھی تک سائنس نے مصنوعی آنکھ دریافت نہیں کیں ڈیڈی۔“

”نہیں کی تو کریں گے..... دولت کے لئے کریں گے..... اس کے لئے تو سب کچھ ہوتا ہے۔“

”پھر ایک کام کریں ڈیڈی۔“ پیار علی نے کہا۔

”کیا؟“ راگ علی ساندانے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”بستی نور الہی کو چھوڑنا مناسب نہیں ہے ڈیڈی، میں یہاں کے سارے انتظامات سنبھالتا ہوں آپ کچھ لوگوں کو ساتھ لے لیں اور نور علی ساندانے کی آنکھوں کی واپسی کے لئے کارروائی کریں گے۔“ راگ علی ساندانے سرد نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا اور بولا۔

”میں جانتا ہوں کہ تیرے ان الفاظ کے پس پردہ کیا ہے، مجھے پاگل سمجھتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ نور علی کی آنکھوں کے سلسلے میں وہ کچھ نہیں ہو سکے گا ٹھیک سمجھتا ہے تو اور ٹھیک کہتا بھی ہے لیکن بد بختی سے ایک باپ اپنی محبت دولت کے ہاتھوں فروخت نہیں کر سکتا۔“

میں امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا، اندھے بیٹے کو دیکھ کر میری تمام خوشیاں خاک میں ملتی رہیں گی۔ میں اس حد تک جدوجہد کر لینا چاہتا ہوں، جس حد تک میرے لئے ممکن ہو سکے اگر بات پھر بھی نہ بنی تو تقدیر پر شاکر ہو جاؤں گا لیکن تو نے مجھے ان الفاظ سے دکھ دیا

ہے اس کا مطلب ہے کہ تو میری جدوجہد میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔“
”یہ بات نہیں ہے ڈیڈی، اصل میں آپ یہ طے نہیں کر سکتے ہیں کہ آپ کے اصل دشمن کون ہیں وہ سب انڈر گراؤنڈ چلے گئے ہیں ڈیڈی میں آپ کے اثاثوں کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔“

”اتنی قوت تجھ میں ہے، اتنی ذہانت ہے تیرے اندر؟ یہ کیوں نہیں کہتا کہ میرے چلے جانے کے بعد اپنے عیش و عشرت کی زندگی میں آزادی مل جائے گی تجھے، پیار علی..... میں تیری بھی اس خواہش کو پورا کر سکتا ہوں لیکن نا سمجھ ہے تو دشمن ہماری نگاہوں سے روپوش ہے..... میں تجھے ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا پھر میں وہاں تیرے لئے مضطرب رہوں گا، سمجھا..... کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا ہوں میں سوائے چند ملازموں کے..... تین ملازم میرے ساتھ جائیں گے اور تم دونوں ہو گے، سمجھ اور جو بات میں آخری لہجے میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پھر اس میں ترمیم پیش کرنے والا میرا دوست یا عزیز نہیں رہتا، تیاریاں کر جا اور اب ایک لفظ اس سلسلے میں نہ کہنا۔“ راگ علی ساندانے کہا اور پیار علی منہ بنا کر اٹھ گیا۔



ڈبل او گینگ کو نئی ہدایات ملیں..... شہنشاہ نے ٹرانسمیٹر پر سردار علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سردار علی تم لوگ محاصرہ ختم کر دو اور راگ علی ساندانے کی حویلی سے دور ہٹ جاؤ تمہارے پاس گاڑیاں ہونی چاہئیں اور اس کے علاوہ ایک اور خاص ہدایت نوٹ کرو ہمیں اس سلسلے میں نئے سرے سے کام کرنا ہو گا، بیٹا کو میں نے الگ مصروف کر دیا ہے اس لئے بیٹا اس مہم میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکے گی، نئی ہدایات اچھی طرح ذہن نشین کر لو اور اس سلسلے میں تمہیں ڈبل او گینگ کو لیڈ کرنا ہو گا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سننا اور ان ساری تفصیلات کو نوٹ کر لو سردار علی بہت کم ایسے لمحات آئے ہیں جب میں نے تمہیں کسی سلسلے میں خصوصی ہدایات دی ہوں مجھے تم لوگوں پر مکمل اعتماد ہے لیکن اس بار میں تمہیں خاص طور سے چند ہدایات کرنا چاہتا ہوں۔“
”سر میں ہمہ تن گوش ہوں۔“

نئے کاراج تھا..... حویلی کے پچھلے حصے سے سفر کا آغاز کیا گیا تھا اور جب یہ لوگ بیٹھ گئے
بے آواز قیمتی گاڑی خاموشی سے اشارت ہو کر چل پڑی۔ راگ علی ساندہ کے چہرے پر عجیب
سی ویرانی چھائی ہوئی تھی پتا نہیں دولت کے ستون کے سہارے لینے والوں کی زندگی میں
خوشیوں کا کیا تصور ہوتا ہے دولت کا استعمال تو مختلف انداز میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر خدا
اپنی نعمتوں سے کسی بندے کو نواز دے تو کیا وہ ان نعمتوں کو صرف اپنی ہی ملکیت تصور کر کے
خوش رہ سکتا ہے، اپنی خوشیوں میں کسی کی شرکت پتا نہیں کیسی دلی طمانیت کا باعث ہوتی ہے
کاش اس نکتے کو سمجھ لیا جائے اور کچھ خوشیاں بانٹ لی جائیں، لیکن دلوں میں مہر لگ جاتی
ہیں اور دوسروں کے بارے میں سوچنے کے جذبے ختم ہو جاتے ہیں اس کے بعد چہروں پر
مرونی نہ ہو تو پھر کیا ہو۔

سفر جاری رہا، سارا پروگرام طے تھا اور اظہار اس میں کوئی جج نہیں تھی لیکن یہ تو راگ
علی ساندہ کا خیال تھا، پل فضیلہ سے آگے بڑھے تھے کہ اچانک ہی گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری
اور گاڑی کے نائز پھٹ گئے۔ بیک وقت چاروں نائروں کو نشانہ بنایا گیا تھا اور گولیاں اسٹین گنوں
سے برسائی گئی تھیں اس لئے ایک لمحے میں گاڑی بیٹھ گئی..... رحمت اگر اچھا ڈرائیور نہ ہوتا تو
گاڑی ایک لمحے میں قلابازیاں کھا سکتی تھی لیکن رحمت نے فوراً ہی اگ نیشن سوئچ آن
کر دیا..... راگ علی ساندہ، نور علی اور پیار علی وحشت زدہ ہو گئے تھے اندھے نور علی ساندہ کی
آواز ابھری۔

”کیا ہوا یہ..... کیا ہو گیا؟ گولیاں..... گگ گولیاں.....“ راگ علی ساندہ نے بے اختیار
دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا لیکن اسی وقت پٹ پٹ کی ہلکی ہلکی آوازیں ہوئیں اور چھوٹے
پتھوٹے گولے ان کے قریب آکر پھنسنے لگے ان سے سفید دھواں خارج ہوا تھا اور اس دھواں
نے آن کی آن میں چھ افراد کو اپنی پلیٹ میں لے لیا تھا..... انہوں نے اپنے حواس پر قابو پانے
کا کوشش کی لیکن قابو نہیں پاسکے اور آہستہ آہستہ ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئے.....
بارپ کے لئے کیا جانے والا سفر چند ہی میل کے فاصلے پر ختم ہو گیا تھا۔



بینا کو شہاب کا فون موصول ہوا اور اس غیر متوقع فون پر وہ چونک پڑی۔ ”جی شہاب
ماحب۔“

”جو کام میں تمہارے سپرد کر رہا ہوں اس میں کسی بھی قسم کی گنجائش نہیں ہے کام اسی
انداز میں ہونا چاہئے، تمہارے پاس وقت بھی ہے اور تیاریاں کرنے کے لوازمات بھی، تمام
لوگوں کو ہدایت کر دو کوئی تاویل نہیں سنی جائے گی، کام اسی انداز میں ہونا چاہئے، اب جو
ہدایات میں تمہیں دے رہا ہوں انہیں ذہن نشین کر لو۔“

”سر.....“ سردار علی نے مستعدی سے کہا اور اس کے بعد وہ دیر تک شہنشاہ کی آواز
سنتا رہا اور اس کے بتائے ہوئے پوائنٹس ذہن نشین کرتا رہا، تمام تفصیلات سننے کے بعد اس
نے کہا۔

”سر اللہ کی ذات سے پوری پوری امید رکھتے ہیں ہم کہ کام آپ کی ہدایت کے مطابق
ہی ہو گا آپ سے سلسلہ گفتگو منقطع ہونے کے بعد میں فوراً اپنی کارروائیوں کا آغاز کر دوں
گا، آپ مطمئن رہیں وہی سب کچھ ہو گا جو آپ کا حکم ہے۔“
”شکر یہ سردار علی۔“ شہنشاہ نے آہستہ سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔



”کوئی اہتمام نہیں ہو گا عام لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہونا چاہئے کہ ہمارا پروگرام کیا
ہے..... نکت آگئے ہیں ہم رات کو دو بجے نکلیں گے اور سفر کر کے دارالحکومت پہنچ جائیں
گے..... ہوٹل میں کمرہ بک ہے وہاں رات تک قیام کریں گے..... فلائٹ پونے گیارہ بجے
ہے۔ یہ پروگرام صرف ہم تک محدود رہنا چاہئے۔“

”ٹھیک ہے ڈیڈی..... بندہ خدا، انعام شاہ اور رحمت کو ہدایت کر دی گئی ہے۔“ پیار علی
نے بیزار سے کہا اور راگ علی کے پاس سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔

موت سے نجات مل گئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ اب دشمنوں کی تلاش ہوگی اور
وہی کھیل پھر کھیل جائے گا جو بستی مہر جان میں کھیلایا گیا تھا..... اگر اسے یہاں رہنے کی اجازت
مل جاتی تو واپسی پر باپ کو دشمنوں کی موت کی خوشخبری دیتا، لیکن بہر حال راگ علی ساندہ
کے فیصلے تھے وہ انہیں منوانے کی قوت رکھتا تھا۔

رات کو دو بجے رحمت گاڑی لئے تیار تھا..... گاڑی میں سفر کے انتظامات تھے کئی سوٹ
کیس اور بیرون ملک ضروریات کی چیزیں، بندہ خدا اور انعام شاہ، رحمت کے پاس آگے بیٹھے
ہوئے تھے..... نور علی ساندہ، پیار علی اور راگ علی پچھلی نشستوں پر، تاحد نگاہ تاریکی اور

حیثیت رکھتی ہوں۔“

”تھینک یو مینا..... یہ ٹرانسمیٹر بڑے ہال میں لے جاؤ اور اسے سنٹر ٹیبل پر رکھ دو، پھر کچن میں جا کر اپنے لئے کافی بناؤ اور الماری سے دو چیزیں نکال لو۔“

”کیا سر؟“

”گرے ماسک اور اپنی پسند کے کچھ رسالے، ماسک تمہیں اس وقت لگانے ہیں جب ڈبل اوگینگ کے دوسرے ممبر اندر داخل ہوں..... اس سے پہلے رسالے پڑھتی رہو۔“

”او کے سر!“ مینا نے کہا..... پھر اس نے شہنشاہ کی ہدایت پر عمل کیا لیکن بڑے ہال کمرے میں داخل ہو کر وہ حیرت سے اُچھل پڑی۔

یہ کمرہ بدرنگ اور بے نور تھا..... چلی روشنی کا ایک بلب اس کی بے نوری میں اضافہ کر رہا تھا لیکن جو چیز مینا کے دل کو الٹے دے رہی تھی وہ کمرے کے وسط میں بنا پھانسی گھاٹ تھا..... ایک عارضی پلیٹ فارم بنایا گیا تھا اور چھت کے بڑے کڑے میں رسی کا ایک پھندا لٹک رہا تھا، جسے پوری تکنیک کے ساتھ بنایا گیا تھا..... مینا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... اسے اچانک احساس ہوا کہ آج کوئی بہت سنسنی خیز ڈرامہ ہونے والا ہے، مگر کیا؟

بہت دیر تک وہ لرزتی رہی، پھر اس نے کانپتے ہاتھوں سے ٹرانسمیٹر ٹیبل پر رکھا اور دوڑ کر اس بھوت کمرے سے نکل آئی، بدن پسینہ اگل رہا تھا، سر چکر رہا تھا، تنہائی یہ سنسنی اور بڑھار ہی تھی..... دوسرے کمرے میں وہ بہت دیر تک کرسی پر بیٹھی رہی پھر خود کو سنبھال کر اٹھی اور کچن کی طرف چل پڑی..... اس وقت کافی واقعی سکون دے گی۔ اس نے ہدایت کے مطابق چند رسالے بھی اٹھائے تھے۔

کافی بنا کر اس نے کیتلی میں بھری اور چھوٹے کمرے میں ہی آ بیٹھی، حالانکہ یہ خیال بھی تھا کہ ممکن ہے ٹرانسمیٹر پر کوئی اور گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن تھوڑی دیر کے لئے وہ معطل ہو گئی تھی، پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا بہت سے خطرناک حالات میں وہ شہاب کا ساتھ دے چکی تھی، اسے خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے..... یہ تو امتحانات ہیں اگر انہی میں کامیاب نہ ہو سکی تو کیا فائدہ، چنانچہ اس نے کافی کے برتن اٹھائے اور پھر اس بڑے کمرے میں پہنچ گئی..... اصل مسئلہ جو خوف زدہ ہونے کا تھا وہ یہ تھا کہ کوئی بات اس کی سمجھ

”سوری مینا، کچھ کام ہے۔“

”آپ بتائیے شہاب صاحب۔“

”ہیڈ کوآرٹر پہنچنا ہے۔“

”میں پہنچ رہی ہوں۔“

”گھر میں کہہ دینا، شاید پوری رات صرف ہو جائے۔“

”او کے اور کوئی ہدایت؟“

”وہاں ٹرانسمیٹر پر بات ہو جائے گی۔“

”بہتر ہے۔“ مینا نے کہا..... فون بند کر کے اس نے جلدی جلدی تیاریاں کیں..... باہر نکل کر ٹیکسی پکڑی اور چل پڑی..... راستے بھر وہ اس ایمر جنسی کے بارے میں سوچتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہیں کر سکی..... ٹیکسی کو دور ہی رکھا اور اس نے بل ادا کیا اور پھر پیدل چل پڑی..... رات کے پونے دس بج رہے تھے پسماندہ علاقہ تھا..... اس لئے کوئی رونق نہیں تھی..... شدید محنت سے پیٹ پالنے والے دوسرے دن کے لئے خود کو اس مشقت کے قابل بنانے کے لئے آرام کرنے لیت گئے تھے..... ہیڈ کوآرٹر میں داخل ہوتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ڈبل اوگینگ کے دوسرے افراد میں سے کوئی موجود نہیں ہے..... بہر حال اسے شہنشاہ نے یہاں بھیجا تھا..... اس لئے وہ بالکل مطمئن تھی۔ اندر چھوٹے کمرے میں داخل ہو کر اس نے سب سے پہلے الماری سے ٹرانسمیٹر نکال کر میز پر رکھا اور پھر ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گئی ہے۔ کچھ دیر کے بعد اسے ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا اور اس نے جلدی سے ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔

”مس مینا!“

”لیس سر۔“

”تنہا بور ہو رہی ہیں؟“

”بالکل نہیں سر۔“

”آپ کو بہت وقت تنہا گزارنا ہو گا۔“

”میں پوری رات کے لئے تیار ہو کر آئی ہوں۔“

”ذہن میں تجسس تو نہیں ہے۔“

نکابوں سے اس پورے ماحول کو دیکھا اور سامنے کھڑے ہوئے جہنم کے ان چھ فرشتوں کو جو خاموش اور ساکت کھڑے ہوئے تھے..... بہ مشکل تمام وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
 ”یہ لک کیا ہے، کون ہو تم..... لک کون ہو تم؟“

اسی وقت ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا اور ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر ٹرانسمیٹر آن کر دیا..... شہنشاہ کی آواز ابھری۔

”والیم تیز کرو۔“ اور ٹرانسمیٹر پر ابھرنے والی آواز اتنی ہو گئی کہ پورے کمرے میں گونج اُٹھی۔

راگ علی ساند او حشت زدہ نگاہوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا، پھر اس نے دوبارہ کچھ بولنا چاہا لیکن اسی وقت ٹرانسمیٹر سے آواز ابھری۔

”راگ علی ساند۔ میرا نام شہنشاہ ہے..... مکمل تعارف تمہارے لئے بے مقصد ہوگا، کیونکہ اب یہ معلومات بھی تمہاری زندگی کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔ تمہارے لئے سزائے موت متعین کی گئی تھی اور وہ ایک جج کا فیصلہ تھا، راگ علی ساند اور اُس کے بیٹوں نے بستی مہر جان کے بدرشاہ، خادم شاہ اور اس کی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا..... یہ ایک سچ ہے..... پیار علی تم نے پانچ افراد کو زہر دے کر ہلاک کیا تھا یہ بھی سچ ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ تم لوگوں نے کیا ہے وہ تمہیں ضرور یاد آگیا ہوگا۔ تمہاری سزا برقرار رکھی جا رہی ہے۔“

”نہیں..... ہماری اپیل منظور ہو چکی ہے۔“

”تم جانتے ہو، جو کچھ ہوا ہے وہ کیسے ہوا ہے۔“

”تم..... تم کون ہو آخر؟“

”شہنشاہ، وطن کے قانون کا محافظ۔“

”کیا جاتے ہو؟“

”تمہاری موت، کیونکہ تم قانون شکن ہو۔“

”تم یہ نہیں کر سکتے۔“

”نور علی ساندہ..... تمہیں تمہارے جرائم کے سلسلے میں سزائے موت دی جاتی ہے..... تکمیل کی جائے۔“ شہنشاہ کی آواز ابھری اور دو افراد نے نور علی کو اٹھایا..... راگ علی ساندہ اور پیر ملی چیخنے لگے، رونے لگے۔ انہوں نے خوب اُچھل کود مچائی لیکن ڈبل اوگینگ

میں نہیں آرہی تھی..... بہر حال وہ خود کو بہلانے کی کوشش کرتی رہی اور وقت گزرتا رہا..... ٹرانسمیٹر پر کوئی اشارہ موصول نہیں ہوا تھا، بالکل خاموشی طاری تھی، اس نے اپنے آپ کو سالوں میں گم کر لیا..... یہ تنہائی عجیب و غریب شکل اختیار کر گئی تھی..... ذہن کو نجانے کون کون سے واقعات کی جانب منتقل کرنے کی کوشش کی اور اس طرح وقت گزاری کرتی رہی پھر باہر آہٹیں سنائی دیں اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ سارا سامان دوسرے کمرے میں منتقل کیا..... ایک گاڑی اندر داخل ہوئی تھی..... اس نے جلدی سے گرے ماسک پہن لیا، گرے ماسک ایک لمبا وہ تھا جو سر سے پاؤں تک ہوتا تھا اور اس میں پورا وجود چھپ جاتا تھا..... اس نے سنسنی خیز نگاہوں سے گرے ماسک لگائے ہوئے ڈبل او گینگ کے بقیہ ساتھیوں کو دیکھا جو کچھ انسانی جسم اٹھائے ہوئے اندر آرہے تھے۔ ہر ایک کے کاندھے پر ایک بدن لدا ہوا تھا..... وہ خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتی رہی، ہال کمرے کے پاس پہنچ کر وہ لوگ اندر داخل ہو گئے..... تب مینا بھی اندر پہنچ گئی اور اس کے ساتھیوں نے چونک کر اسے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا، وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ مینا ہے..... بہر حال اس کے بعد وہ انتہائی پراسرار انداز میں اپنے کام میں مشغول ہو گئے، مینا نے سحر زدہ نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھا جو بے ہوش تھے اور ایک بار پھر اس کے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑنے لگیں..... راگ علی سانا، نور علی اور پیار علی کو اس نے فوراً پہچان لیا تھا اور اس کا ذہن نجانے کون سے جہانوں کی سیر کرنے لگا تھا..... بدن کی لچکی کو وہ انتہائی حد تک کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن خوف تھا کہ رگ و پے میں اترتا ہی جا رہا تھا۔ ڈبل او گینگ کے بقیہ افراد خاموشی سے اپنے کام میں مصروف تھے..... کسی نے بھی اس سے کسی کام کے لئے نہیں کہا تھا شاید وہ احتیاط سے اپنی آواز تک سامنے نہیں لانا چاہتے تھے، پھر ایک خاص قسم کے اسپرے کی شیشی لائی گئی اور ان کے چہروں پر اسپرے کیا جانے لگا..... ایک ایک کر کے وہ سب ہوش میں آتے چلے گئے..... سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں، لیکن وہ کوئی جنبش نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ اس دوران ان کے ہاتھ پشت سے باندھ دیئے گئے تھے البتہ جیسے ہی وہ ہوش میں آئے۔ ڈبل او گینگ کے آدمیوں نے انہیں گھیٹ گھیٹ کر دیوار کے سہارے بٹھادیا..... راگ علی سانا خوف و دہشت کے عالم میں آنکھیں پھاڑ رہا تھا اور پھر اس کی نظر پھانسی کے پھندے پر پڑی اور اس کے بدن پر تھ جبری طاری ہو گئی۔ اس نے دہشت بھری

کے ممبروں نے انہیں ٹھوکر مار کر مٹا دیا۔ نور علی کو پلیٹ فارم پر چڑھا کر اس کی گردن میں پھندا فٹ کر دیا گیا۔ راگ علی بلک بلک کر رو رہا تھا پھر تختہ کھینچ دیا گیا اور نور علی کا جسم رسی میں پھڑکنے لگا..... راگ علی پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ نور علی کے سر و جسم کو نیچے اتار دیا گیا اور راگ علی بلک پڑا۔

”مجھے..... پہلے مجھے..... آہ پہلے مجھے۔“ اور اس کی خواہش تسلیم کر لی گئی۔ تینوں ملازم پتھر اڑائے ہوئے تھے۔

کچھ دیر کے بعد تینوں لاشیں ایک لائن سے رکھ دی گئیں اور شہنشاہ کی آواز ابھری۔
 ”ان تینوں ملازموں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے..... لاشیں ساتھ رکھی جائیں اور انہیں ان کی تباہ شدہ گاڑی تک پہنچا دیا جائے..... تم لوگ زبان کھولنے کے لئے آزاد ہو۔ جسے چاہو بتا سکتے ہو کہ انہیں شہنشاہ کی عدالت میں پھانسی دی گئی ہے۔ تم بیان دے سکتے ہو جو دل چاہے، اس میں میرے پیغام کا اتنا اضافہ کر لینا۔ یہ میرا وطن ہے، اہل وطن کے لئے وطن کو گلزار بنایا جائے۔ اپنی دولت کا سہارا لے کر انسان کے ساتھ..... جانوروں کا کھیل نہ کھیلا جائے۔ تم دولت سے قانون خرید لو گے، لیکن شہنشاہ کو نہیں خرید سکو گے..... سزا ہر شکل میں تمہارا مقدر ہوگی۔ یہ الفاظ یاد کر لینا۔“

ڈبل اوگینگ کے ممبر لاشوں کو اٹھانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے..... ٹرانسمیٹر پر آواز ابھری۔ ”ڈبل اوون..... یہاں سے جاتے ہوئے تم ڈبل اوسیون کو ایسے مقام پر چھوڑ دینا جہاں سے یہ اپنے گھر جاسکیں۔“

”یس سر۔“

”اوور..... اینڈ آل.....“ ٹرانسمیٹر کے بلب بجھ گئے۔

